ماہِ نو
بیادِ فیض

ابتدائیہ

جب نارِ نمرود پوری طرح بھڑک رہی تھی اور حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکے جانے کا وقت قریب آرہا تھا تو ایک چڑیا اپنی چونچ میں ایک ایک قطرہ پانی لالا کر آگ پر ڈالنے لگی۔ پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا تمہاری اس کوشش سے یہ آسمان چھوتی آگ بجھ پائے گی؟ تو چڑیا نے جواب دیا کہ 'میرے بس میں تو قطرہ قطرہ پانی لا کر آگ پر پھینکنا ہی ہے!'

(ساجدہ اقبال سیّد)

وزارتِ اطلاعات و نشریات کا ادبی جریدہ

مئی، جون 2008ء

چیئرپرسن
ساجدہ اقبال سیّد

مجلسِ ادارت
ناظمہ فرخ، قائم نقوی، ارم ظفر
الطاف حسین، صفدر بلوچ

انتظام
ندا اظہر، سید وقاص اندرابی

تزئین
ارتضیٰ حسین، محمد ناصر،
ضوریز اختر، مظہر عالم

قیمت موجودہ شمارہ -/400 روپے

قیمت عام شمارہ -/15 روپے
زرسالانہ -/150 روپے
طالب علموں کے لئے -/120 روپے

رجسٹرڈ نمبر LRL-81

جلد 61 شمارہ نمبر 5

ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز

218/14 شاہد کالونی وحدت روڈ لاہور

پہلا ایڈیشن : جنوری 2002
دوسرا ایڈیشن : مارچ 2002
تیسرا ایڈیشن : مئی، جون 2008

ادارہ مطبوعات پاکستان نے فریدیہ آرٹ پریس انٹرنیشنل چوک سردار چیل لاہور سے چھپوا کر 218/14 شاہد کالونی وحدت روڈ لاہور سے شائع کیا

ترتیب

مصور:

صادقین، سلیمہ ہاشمی، اسلم کمال، طاہر رشید، محمد صادق، شاہد حسین

اداریہ

''ماہ نو بیادِ فیض''، پہلی بار فروری 2002ء میں شائع ہوا۔ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا پھر دو ماہ بعد دوسرا ایڈیشن چھاپا گیا وہ بھی دنوں میں بک گیا۔

یہ رسالہ ایک ادنیٰ سی کوشش تھی فیض صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی۔ رسالے کو بے پناہ پذیرائی ملی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوا کہ بہت سے حلقوں کی توپوں کے دہانے میری طرف مڑ گئے۔

اس دوران کئی احباب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس رسالے کی اشاعت کے متعلق بروقت اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کارِثواب میں حصہ ڈالنے سے محروم رہے۔ چنانچہ رسالے کے تیسرے ایڈیشن کی تیاریاں شروع کر دی گئیں لیکن دفتر کے چند سُخن ناشناسوں کو سبز چشم عفریت نے اپنے شکنجے میں ایسا جکڑ لیا کہ میری مرضی کے خلاف، مجھے ٹریننگ پر بھیج دیا گیا۔ واپس آئی تو بانگلہ دیش پوسٹنگ ہو گئی (اس میں میری مرضی شامل تھی)۔ قصہ مختصر، حال ہی میں واپس آئی ہوں۔ ادھوری رہ جانے والی خواہش اب پوری ہوئی اور پرچہ، بہت سے اضافوں کے ساتھ، آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ (س۔ا)

Faiz Ahmed Faiz

Office : 27/G - Gulberg II
LAHORE - Phone : 83048
Res : 102-H, Model Town
LAHORE - Phone : 353420
Date ____________

لعل شہباز قلندر

نمی دانم کہ آخر چوں دمِ دیدار می رقصم
مگر نازم بہ ایں ذوقے کہ پیشِ یار می رقصم
تو ہر دم می سرائی نغمہ و ہر بار می رقصم
بہر طرزے کہ رقصانیم اے یار می رقصم

خدا جانے کہ میں کیسے دمِ دیدار رقصاں ہوں
مگر قسمت پہ نازاں ہوں کہ پیشِ یار رقصاں ہوں
تو ہے نغمہ سرا ہر دم تو میں ہر بار رقصاں ہوں
تو جس بھی طرز پر چاہے اسی پر یار رقصاں ہوں
سراپا ہے خرد کی [illegible]
میں گرداگرد اپنے صورتِ پرکار رقصاں ہوں
تو وہ قاتل کہ [illegible] خوں کرے میرا
میں وہ بسمل کہ زیرِ خنجرِ خونخوار رقصاں ہوں
ذرا آ دیکھ جاناں آ کہ میں انبوہِ جانبازاں
بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار رقصاں ہوں
اگر ہوں قطرۂ شبنم تو ہے خار ہی پر پیار
[struck out] ہوں میں وہ قطرۂ شبنم جو نوکِ خار رقصاں ہوں

میں ہوں عثمان مروندی، میں ہوں منصور کا ساتھی،
ملامت کر رہی ہے خلق، میں سرِ دار رقصاں ہوں

فارغ بخاری

نذرِ فیض

قریب رہ کے کبھی حالِ دل سنا بھی نہیں
عجیب شخص تھا، جاتے ہوئے ملا بھی نہیں
کبھی کبھی کی ملاقات بھی غنیمت تھی
ملیں گے کس سے کہ ایسا کوئی رہا بھی نہیں
وہ تھا تو جیسے نگاہیں سجی، سجی سی تھیں
گیا تو اب کسی محفل میں وہ نشہ بھی نہیں
محبتوں کی وہ خوشبو تھی اس کی باتوں میں
کہ جس کا تذکرہ پہلے کبھی سنا بھی نہیں
وہ ہو کے آیا تھا اِک دلفریب منزل سے
ہم اس کی رہگذاروں سے آشنا بھی نہیں
یہ کیسی رُت ہے ہر اِک چہرہ ہے اُداس، اداس
وہ روشنی بھی نہیں ہے وہ اب ہوا بھی نہیں
یہ کیوں نڈھال نظر آرہے ہیں دیوانے
یہ قافلہ تو کبھی دل شکن ہوا بھی نہیں

☆..........☆☆☆..........☆

یونس جاوید

فیض

تری نگاہ میں رہتی تھیں بستیاں محکوم
تو ان کو زندہ کیا، عہدِ نو بہار کے روپ
جو بے زبان تھے انہیں زندگی کے حرف دیئے
انہیں کا جینا، تری زندگی کی خوشبو تھی

......☆☆......

ترے حروف گندھے جب تری بصیرت میں
نکھر کے سامنے آئی تھیں منزلیں فن کی
تو عہد ساز بھی تھا اور عہد سوز بھی تھا
کہ تو نے حرف کو اک اعتبار بخشا تھا
جمال زندہ ، مگر احترام بخشا تھا

......☆☆......

مگر مناظر و حرف جمال و حرمتِ شعر
سبھی رکے ہیں کسی شہرِ بے امان کے بیچ
حروف گم ہیں کہیں ذلتوں کی دلدل میں

......☆☆......

وہی جو کل تھا وہی آج بھی ہے اور کل بھی
محبتوں کا امیں سارا شہر بنجر ہے
ترے سخن کو ترستی ہے زندگی اب تو
تری مہک کی، محبت کی، اب ضرورت ہے
جو خوش جمال ہو تجھ سا نگہ بلند بھی ہو
اسی کے فیضِ تمنا کی اب ضرورت ہے

☆..........☆☆☆..........☆

شفیق سلیمی

حوصلہ بخش شاعر

آج بھی لوگ ہیں وہی سیانے
جن کی پکی بھڑولی میں ہیں دانے
کیسے ہو گا کوئی فیض جاری
کیسے گونجیں خوشی کے ترانے
باد صر صر ہی جب چل رہی ہے
کیسے اُتریں گے موسم سہانے
اڑتے پتوں کے ہاتھوں ہی بھیجے
جتنے پیغام بھیجے صبا نے
فصلِ گل ساری تاراج کر دی
ظلم کی اندھی وحشی ہوا نے
ساری شمعیں ہی جب بُجھ رہی ہیں
کیسے آئیں گے روشن زمانے
وہ جو عیار ہیں باری باری
لوٹتے ہیں وطن کے خزانے
آج کو کل پہ ٹالا کئے ہیں
حیلہ جُو کر کے کیسے بہانے
اے مرے حوصلہ بخش شاعر
جتنے دکھ ہیں تجھے ہیں بتانے
بُھول ایسی بھی کیا ہو گئی ہے
دن نہ پھیرے ہمارے خدا نے
کوئی مژدہ نہ کوئی تسلی
درد بستہ پائیں گے کب تجانے
نبض ڈوبی ہے میرے یقیں کی
وہم دل کو لگے ہیں ستانے
تھام رکھا ہے تیرے علَم کو
چند ہیں اب بھی تیرے دوانے

☆..........☆☆☆..........☆

لطیف ساحل

نئی زندگی، نیا خیال

اِک شخص زمیں پر بکھرا تو تحریر ہوا
اِک شیشہ تھا جو ٹوٹا تو تصویر ہوا
اِک شام نے پایا نور، شفق کی لالی سے
اِک سورج بجھتے بجھتے بھی تنویر ہوا
اِک آنکھ تھی جو کھلتے ہی سب کی آنکھ ہوئی
اِک خواب، حقیقت ہونے پر تعبیر ہوا
کچھ خوابوں کی انجانے میں تجسیم ہوئی
اِک چہرہ تھا جو آنکھوں میں تصویر ہوا
کچھ لوگ تھے جن کے بازو بھی بیگانے تھے
اِک ہاتھ تھا جو اِس بستی کی تقدیر ہوا
جس شخص کا ہر موسم میں اپنا موسم تھا
وہ شخص، بچھڑتے وقت بہت دل گیر ہوا
اب جرم وفا بھی ایک خلش ہے سینے کی
اِک پل کا اُس سے ملنا بھی تعزیر ہوا

☆.........☆☆☆.........☆

ایزد عزیز

فیض

تج کر زُلفوں کے سائے کو
عشق کے سب مفہوم بدل کر
ایک نئی منزل کی جانب
آس نمو کی لئے رواں تھے
اور سرِ مقتل پہنچے تو
سُرخ گلابوں کی خوشبو نے
جھوم کے ہم کو چوم لیا تھا

......☆☆......

سرخ گلابوں کی خوشبو کو
چھوڑ چلے ہیں اِس محفل میں
آنکھوں میں اُمید، سحر کی
جھولی میں دُشنام کے پتھر
اور کفن کے اِک کونے پر
نقش دُعائے اہلِ وفا ہے
اور ہمارے پاس ہی کیا ہے

☆.........☆☆☆.........☆

زاہد مسعود

ایک استقبالیہ نظم

ہجوم اشک تھے شمعِ انتظار بجھے
مثالِ ضبطِ فغاں آج پھر سے قائم ہو
مسافرت کے جزیروں سے لوٹ آیا ہے
اسیرِ صبح کوئی شام شہریاراں میں
آ تجھے آئینوں پہ نقش کریں
ہر ایک عکسِ خفی تیرا ہم پہ کھل جائے
ہمیں یہ زعم رہے گا کہ غم نصیب تری
فصیلِ عمر کے سائے میں دو گھڑی ٹھہرے
پھر اس کے بعد ہمیں حرف کے دریچوں پہ
نگارنی ہیں اسی عہد سبز کی بیلیں
ہیں اسم اسم تہہ سنگ معجزے تیرے
ہوا کے ہاتھ میں اب بھی پیام تیرا ہے

☆..........☆☆☆..........☆

علی بابا تاج

یاد ہے تیرا کہا

(نذر فیض احمد فیضؔ)

تو نے کہا تھا یاد ہے مجھ کو
"بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے"
ہاں، تو لب آزاد ہیں میرے
خواب سراب آدرشی سوچیں
ساتھ رہی ہیں، ساتھ ہیں میرے

تازہ مٹی چاک پہ چپ ہے
گردش کرتے ہاتھ ہیں میرے
دیکھو! سچ کی صورت کیا ہو؟

(سچ زندہ ہے زندہ سچ ہے)

☆..........☆☆☆..........☆

ڈاکٹر نثار ترابی

نذرِ فیض

حکایتِ شبِ ہجراں رقم ہوئی کیسے؟
یہ کس خیال نے لکھی ہے داستانِ الم؟
سحر بھی کنجِ قفس میں اُداس اُتری ہے
جمالِ صبحِ تمنا ہے کن خرابوں میں؟
صدائے گُل کی حقیقت کہاں پہ ٹھہری ہے
ستم کے کوچے میں کوئی تو سر اُٹھا کے چلے
ہوائے دشت میں حرفِ جنوں کی بات کرے
رُخِ حیات پہ ڈھلکی ہوئی ہے رات ابھی

خدا وہ وقت بھی لائے کہ شیشۂ جاں میں
وہ عکس اُترے جو تکمیلِ آرزو کر دے
صبا کی مست خرامی نصیب کس کا ہے؟
نجانے کس کا مقدر بنے نگارِ حیات؟
پلٹ کے دیکھ کہ اب بھی ہے ''نقشِ فریادی''
وہی پیام ہے ''دستِ صبا'' اُٹھائے ہوئے
وہی روش ہے ابھی ''شامِ شہرِ یاراں'' کی
اُسی طرح ہیں ابھی قاتلانِ حرف و سخن

وہی قفس، وہی دار و رسن کا موسم ہے
ستم گروں کا چلن آج بھی نہیں بدلا
مگر یہ کم تو نہیں ہے ترے چراغ کی لو
تمام اہلِ جنوں کو نویدِ عصر ہوئی

علاجِ دل زدگاں اب بھی ''نسخہ ہائے وفا''
ہے چارۂ غمِ دوراں ہوائے نرم سخن
بچھی ہے کشتِ تمنا میں رنگ و بو کی بساط
ہے جوئے فیض رواں، ہے جوئے فیض رواں

☆............☆☆☆............☆

عرفان احمد بیگ

کرشن کی کہانی اور فیضؔ کا گیت

تم کوئی کرشن کی کہانی ہو،
اور میں فیضؔ کا ادھورا گیت
دونوں ہی ایک ماہنامے میں
چھپ گئے ہیں کہیں قریب قریب
ہم کو الفاظ نے سنوارا تھا
ہم کو جذبات نے نکھارا تھا
ہم کو پڑھ کر تمام لوگوں نے
اپنے دل میں سدا اُتارا تھا
لیکن اے دوست! آج ہم دونوں
گندی گلیوں میں کوڑا دانوں میں
بیکار ردی کاغذ ہیں
تم کوئی کرشن کی کہانی تھیں
اور میں فیضؔ کا ادھورا گیت!!!

☆..........☆☆☆..........☆

بیرم غوری

نذرِ فیضؔ

فروغ دار ہوا ذکرِ حسنِ یار چلے
''گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے''
نہ روشنی، نہ حوالہ، نہ خوشبوؤں کا یقیں
یہ کس دیار کو جانا تھا کس دیار چلے
فراخیٔ دلِ حسرت زدہ میں عمر کٹے
کبھی وصال نہ ہو شامِ انتظار چلے

جنوں میں سر بہ گریباں رہے مقدر سے
زوالِ شب نہ ہوا، گشتۂ قرار چلے
قفس میں بادِ صبا کا گلہ نہیں کرتے
خطِ زمیں پہ چلے یا ستارہ وار چلے

☆..........☆☆☆..........☆

مسعود تنہا

نذرِ فیض

اپنے ہنر کا ہر گھڑی صدقہ اُتار کے
دُنیائے کم نگاہ کے گیسو سنوار کے
شاید یہ اب نہ آئے گا ہم کو نظر کبھی
"وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے"

......☆☆......

زمانے بھر کی نگاہوں میں خود کو ہار چلے
قسم خدا کی بہت ہو کے بے قرار چلے
"قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو"
اِدھر بھی آئے کہ ہم کر کے انتظار چلے

......☆☆......

ہر ایک یار مخالف بنا رہا اپنا
اسی لیے تو بہت بے قرار گزری ہے
تجھے بُھلا نہ سکے ہم، تری محبت میں
"اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے"

☆..........☆☆☆..........☆

واصف سجاد

نذرِ فیض

کون لکھے گا سخن حُسنِ دلآرام کے نام
مضطرب رکھے گی انساں کی زبوں حالی کسے

کون اب حلقۂ زنجیر میں رکھے گا زباں
انگلیاں کون ڈبوئے گا لہو میں اپنے

کون ماضی کی روایات کو یوں زندہ کرے
غمِ دوراں کے ہر اِک وار کو شرمندہ کرے

رسن و دار کی توقیر بڑھائے گا کوئی؟
فیض کی طرح یہ افتاد نبھائے گا کوئی؟

ویسی رعنائی گفتار کہاں سے لائیں
تیرے غمخوار، دل زار کہاں سے لائیں

☆..........☆☆☆..........☆

امجد بابر

اکیسویں صدی کا فیض سے سوال

کیا ترے
دیکھے گئے خواب
ابھی تک
شرمندۂ تعبیر ہوئے؟

نذرِ فیض

تُو منفرد ہے
کہ شاعری کے سبھی حوالوں میں معتبر ہے
سفیر ایسا محبتوں کا کہ بے مثل ہے
تُو روشنی کا پیامبر ہے
تُو زندگی کی حقیقتوں کا وہ رازداں ہے
جو بیکراں ہے
یہ سوگ تیرا
جو روگ سب کا بنا ہوا ہے
یہ داستانِ الم جدا ہے
طویل تر، کہ ساعتوں سے ہی ماورا ہے
یہ مختصر، کہ بکھرتے رنگوں کا معجزہ ہے

☆..........☆☆☆..........☆

کاظم جعفری

نذرِ فیض

شبِ غم ہے
کوئی نسخے وفا کے مجھ کو لادے
کوئی لادے مجھے دستِ صبا
دستِ تہِ سنگ اور سرِ وادیٔ سینا
کہ شامِ شہرِ یاراں کی طلب ہے
ضرورت نقشِ فریادی کی ہے یارو
شبِ غم ہے، غلط کرنا ہے غم مجھ کو
مجھے میزان میں سے کچھ حوالے دیکھنے ہیں
متاعِ لوح کی آج خواہش ہے قلم کی بھی
صلیبیں جو دریچے میں تھیں وہ بھی مجھ کو لادو
مرا دل ہے مسافر، شعر کہتا ہوں
مگر یہ بات اکثر سوچتا ہوں
کہ فیضِ شعر کیسے پھیلتا ہے؟!
میں اپنے سارے دفتر اور بیاضیں
کیسے چھپواؤں؟!
کہ بعدِ فیض میں نے بھی تو حصہ ڈالنا ہے
گلستاں کی آبیاری میں
مگر پھر سوچتا ہوں کہ
مرے شعروں میں وہ حدت کہاں ہے؟
مری نظموں میں وہ جدت کہاں ہے؟
کہاں ہیں میری غزلیں اس کی مانند؟
جو میرا رہنما ہے
کہ جس کا فیض جاری ہے مری سوچوں کے اندر

☆..........☆☆☆..........☆

نمود مسلم

فیض کے نام

دشت کی تنہائی سے
زنداں کے روزن سے
ننگے پاؤں چل چل کر
اپنے قاتل کے شایاں
نثار اپنی سوچوں پر
امروز میں فردا کی
وہ چمکتی کوندیں
ہم تلک بھی پہنچی ہیں
آشنا ہوئے ہم سب
یہ فیض تیرا ہے
پہلی سی محبت کا
آنکھ کے ستارے کا
دل کے استعارے کا
جو بھی قصہ زندہ ہے
وہ بھی فیض تیرا ہے
تیرگی میں کرنوں کا
خاشاک میں چنگاری کا
جو دیکھنا لازم ہے
دست افشاں کا نوحہ
مست و رقصاں کا قصہ
پابجولاں بازاروں میں

رات کے اندھیروں میں
جو دیے جلتے ہیں
جن کی ضیا باقی ہے
کچھ ان کتابوں میں
ساعتوں خیالوں میں
جو بھی قصہ زندہ ہے
وہ بھی فیض تیرا ہے

☆..........☆☆☆..........☆

نعیم کاظمی

فیضؔ کے لیے ایک نظم

وہ حرف لوحِ جہان بھی تھا
ادب کا سچا نشان بھی تھا
ورق ورق وہ غزل سرا ہے
نیا جہاں وہ دکھا رہا ہے
نہ حرف اُس کے کبھی مٹیں گے
نہ لفظ اُس کے کبھی بجھیں گے
وہ جا چکا ہے مگر ہے زندہ
ادب پہ اس کا اثر ہے زندہ

☆..........☆☆☆..........☆

عون الحسن غازی

نذر فیضؔ

آج وہ سخن ور
ہم میں نہیں ہے
جو خون کو سیاہی سمجھ کر بہایا کرتا تھا
بنجر زمین پر لفظوں کی طاقت سے
خوش رنگ پھول کھلایا کرتا تھا
کڑکتی دھوپ میں
ساون کی رم جھم، رم جھم بوندوں کے
خواب دکھایا کرتا تھا
اک نئی طرز فغاں سکھایا کرتا تھا
ہاں، آج وہ ہم میں نہیں ہے
جو تاریک آنکھوں میں
آس و امید کے
دیپ جلایا کرتا تھا

☆..........☆☆☆..........☆

ماہ نو بیادِ فیض کی تقریبِ رونمائی کی تصویری جھلکیاں

مشتاق احمد یوسفی، پروفیسر مسعود خواجہ، ساجدہ اقبال سید، محسن احسان، منو بھائی

، آئی اے رحمٰن اور طاہر محمد خان ادبی ریفرنس میں مقالے پڑھ رہے ہیں

مشتاق احمد یوسفی خطاب کر رہے ہیں۔ سٹیج پر افتخار عارف، ساجدہ اقبال سیّد اور شعیب ہاشمی

مینا شانی اور نیرہ نور کلامِ فیض سنا رہی ہیں

سرفراز اقبال، ساجدہ اقبال سیّد، منّو بھائی، سجاد حیدر ملک اور ارشد محمود

سید اقبال حسین، ساجدہ اقبال سیّد، آئی اے رحمٰن، احمد فراز

، مشتاق احمد یوسفی، سرفراز اقبال، طاہر محمد خان اور پرتو روہیلہ

سلیمہ ہاشمی، ساجدہ اقبال سیّد، مختار محمود الحق، شعیب ہاشمی اور خالد سعید بٹ

عبدالرحمٰن انجم

بنام فیضؔ

وہ شخص پُر بہار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
اک عہد جس کا پیار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
جو حرف آگہی سے سدا آشنا رہا
لفظوں کا شہسوار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
جیون کی ہر بساط کو پیرایہ مل گیا
سوچوں کا زرنگار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
وہ مست، اپنی ذات کی درویشیوں میں گُم
صد وجہِ افتخار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
ملکِ سخن میں وسعتِ افکار کا امیں
فطرت کا غمگسار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
آنکھوں کو خدوخال سے محروم کر کے وہ
جانے کو بیقرار تھا، ہم سے جُدا ہُوا
ہاں! فیضؔ کا تھا مشغلہ منظر تراشنا
انجمؔ! وہ شاہکار تھا، ہم سے جُدا ہُوا

☆..........☆☆☆..........☆

ساجد گل

بیادِ فیضؔ

اے شبِ تار مری آنکھ کے جلتے ہوئے آنسو لے کر
تو کسی یاد کے منظر کو سجا دے
رہرو! خواب کے تلووں میں ہیں چھالے
تو کسی شبنمی لمس کو مرہم ہی بنا دے
اے شبِ تار
ترے درد سے واقف ہوں مگر، سُن
اپنی تقدیر کی زُلفِ سیہ کھول کے پھر بھی
باندھ کسی ٹوٹے ہوئے تارے کو کبھی ایسے
وہ مری بینائی سے محروم زمیں سے
کہیں اُوپر ٹھہرے۔
اپنی بجھتی ہوئی شمع سے
اسے روشن رکھے!!

☆..........☆☆☆..........☆

اسد اعوان

فیض احمد فیضؔ کی نذر

اہلِ نظر اُداس ہیں، دلبر اُداس ہیں
اقلیمِ آگہی کے سخنور اُداس ہیں
اک بار آکے پی کہ ترے بعد آج تک
"ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں"

......☆☆......

تیرے جلو میں چلے تیرے ہمسفر ٹھہرے
دیارِ لفظ و معانی میں دیدہ ور ٹھہرے
جنہیں زمانے نے سمجھا ہے عضوِ ناکارہ
"پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے"

......☆☆......

لیکن بدل گئے ہیں سبھی کے مزاج فیضؔ
"بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ"
تجھ سے بچھڑ کے جینا پڑا ہے کہ عشق میں
حائل ہوئے ہیں دہر کے رسم و رواج فیضؔ

☆..........☆☆☆..........☆

قائم نقوی

فیضؔ سے......

تجھ کو عظیم کہتے ہیں
نام تیرا لے لے کر
دھرتی کے محکوموں کو
عبث درس دیتے ہیں
کیا تیری یہ خواہش تھی
کیا تیرا افسانہ تھا
خواب تیرا کیسا تھا
ان کی دسترس میں بس
نام تیرا باقی ہے
تیرے پیروکاروں نے
نام تجھ سے جوڑا ہے
تیرے نام کی مالا
جپتے جپتے پھرتے ہیں
آخر سو ہی جاتے ہیں
اتنا کچھ کر کے بھی
تیرا دم تو بھرتے ہیں
پر کیا وہ تیرے جیسے ہیں
تیری سوچ نہ سوچیں
تیرے خواب نہ بیچیں
تیرا نام ہی بیچیں

☆..........☆☆☆..........☆

فیضؔ کی انفرادیت

احتشام حسین

بعض مخلص اور دیانتدار لوگوں کے اظہار عقائد میں ایک ایسی منزل بھی آتی ہے، جہاں زاہد تنگ نظر ان پر کفر کا فتویٰ لگاتا ہے اور مسلمان کو کافر قرار دے کر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یا پھر وہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کچھ دل موہ لینے والی ادائیں اپنا کام کر جاتی ہیں اور کفر و اسلام کی چھان بین کرنے کے بجائے کافر اور مسلمان دونوں ان کا ہاتھ چومنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جب مسلمان دوسروں سے اپنی علیحدگی ظاہر کرنے کیلئے ان میں صرف کفر تلاش کرتا ہے اور کافر ساری انسانی خصوصیات کو نظر انداز کر کے اپنی بیزاری کے جواز کیلئے دوسروں میں صرف اسلام کی جستجو کرتا ہے تو چاہے حقیقت کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے، اندھے جذبۂ منافرت کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں صرف چند مشترک پہلوؤں پر نظر رکھ کر کفر میں اسلام اور اسلام میں کفر کا جلوہ دیکھ لینے کی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں نقطۂ نظر جذباتی ہیں لیکن پہلے نقطۂ نظر سے منافرت اور دوسرے سے رواداری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے میں غالباً ''دوسری شکل'' زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں کم سے کم ناانصافی اور بیزاری کی صورت تو نہیں پیدا ہوتی بلکہ لطف اندوزی اور ہمدردانہ تنقید کیلئے زمین ہموار ہوتی ہے۔

فیضؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے وقت تمہید کے طور پر یہ چند سطریں بے اختیار قلم سے نکل گئیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شاعری پر تنقید کیلئے قلم اٹھانے والوں میں سے اکثر کا کفر ٹوٹا ہے اور ترقی پسندی کو آنکھ بند کر کے کوسنے والوں نے بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ان کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نہیں جنہیں صرف تذکیر اور تانیث، واحد اور جمع، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کی چند غلطیاں ڈھونڈ نکالنے کے بعد فیضؔ کے اشعار کی ساری معنوی سحر کاری اور باطنی گہرائی ہیچ نظر آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ قابلِ معافی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو زبان کے تخلیقی استعمال اور اظہار کے پُر پیچ آہنگ سے واقف ہی نہیں ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر ناقدوں نے بہت سے عیوب نکالنے کے بعد بھی فیضؔ کے ہنر سینہ کاوی کی داد دی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ پڑھنے والے کس بات سے متاثر ہوتے ہیں اور فیضؔ کی غزلوں یا نظموں میں انہیں کیا ملتا ہے؟ کچھ خاص خیالات؟ خاص طرزِ اظہار؟ خاص قسم کے اشارات اور علامات؟ کوئی ایسا نیا پن جو متوجہ کرتا ہے؟ کوئی ایسی جذباتی فضا جو ہم آہنگی کے دائرے میں داخل کرتی ہے؟ کوئی ذہنی یگانگی جو ہم خیالی اور ہم سفری کا احساس پیدا کرتی ہے؟ یہ باتیں بھی ہو سکتی ہیں اور ایسی ادبی اور فنی قدریں بھی جو احساسِ مسرت پیدا کر کے آسودگی بخشتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ساری باتیں مل کر کیف اندوزی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ لیکن کوئی ان میں سے کسی ایک ہی بات کو پا کر مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ شاعری کا اصل مقصد اس کیلئے وہی ہوتا ہے۔ اور دوسرا دوسری بات دیکھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں شاعری کا بنیادی کام اسی بات کی تکمیل ہے جو اسے پسند ہے۔ اس طرح ذوق کی انفرادیت

شاعری کے اصل مقصد کے مطابق ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر اور شاعر کی ذات سے نجی تعلق کی بنیادوں پر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا معیار قائم ہوجاتا ہے اسے محض ذوق کے ابتدائی نقوش سمجھنا درست نہیں کیونکہ اکثر تنقید فن کے اعلیٰ اصول بھی انہی تعصبات کی پشت پناہی کیلئے توجیہہ اور تاویل کا کام دیتے ہیں۔ بہت اعلیٰ پائے کے تنقیدی شعور سے بس یہ ہوجاتا ہے کہ نگاہ میں تھوڑی سی معروضیت اور فلسفیانہ پرکھ اور اصول وروایاتِ فن کی روشنی میں اظہار اور ترسیل کی صلاحیت کو جانچنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے اور اسی سے تعصبات اور تاویلات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور اگر ایک گروہ ان کی ایک بات کو ناپسند کرتا ہے تو دوسری بات کو پسند کرتا ہے۔ اگر ایک خیال سے اختلاف ہوتا ہے تو دوسرا اپنے ذہن اور دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے۔ اگر کہیں ایک ادبی یا لسانی سقم نظر آتا ہے تو دوایسی خوبصورت ترکیبیں سامعہ پر چھا جاتی ہیں جن سے پہلی غلطی کا وزن بہت کم ہوجاتا ہے۔ اس طرح فیض کی پسندیدگی کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور ان کا شعورِ فن شعروادب سے مختلف قسم کے مطالبات کرنے والوں کو بہ یک وقت متوجہ اور متاثر کرتا ہے۔

ویسے تو کسی شاعر کو عام طور سے پسند کرنے میں متعدد منفی اور مثبت اثرات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذوق کی سطح پسندیدگی کے مدارج قائم کرسکتی ہے۔ لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا وجود ذوق اور فکر کی مختلف سطحوں کو یکساں طور پر نہ سہی پھر بھی ہموار کرتا ہے اور کچھ ایسی بنیادی قدریں پیش نگاہ کردیتا ہے جن سے احساسِ جمال اور احساسِ سود وزیاں دونوں کی تسکین ہوتی ہے۔ میرے خیال میں فیض کی شاعری یہی صورت فراہم کرتی ہے۔ اس لئے مختلف الخیال نقاد اور قاری انہیں شاعرانہ اور فکری دونوں حیثیتوں سے کہیں اپنے سے قریب ہی پاتے ہیں۔ انفرادیت سے جنم لینے کے باوجود یہ وہ خاص قسم کی آفاقیت اور ہمہ گیری ہے جو فن اور زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے وجود میں آتی ہے۔ فن کے تقاضے روایت اور بغاوت، کلاسیکیت اور رومانیت، طرزِ اظہار کی مانوس فضا اور نئے پن کی آمیزش چاہتے ہیں۔ اور زندگی کے تقاضے انفرادیت اور اجتماعیت، ہنگامی انقلابات اور دائمی انسانی ارتقا، حقائق اور خواب، آزادی اور ضبط ونظم کے درمیان ایسا توازن چاہتے ہیں، جو انسانی اور تہذیبی اقدار کو درہم برہم نہ کردے اور اگر کرے بھی تو اس جدوجہد کا مظہر بن کر، جو بہتری اور برتری کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ فیض کی شاعری کی ہیئت اور مواد میں آفاقیت کے یہی عناصر ہیں اور یہ مختصر مضمون انہی کی نشاندہی کی کوشش ہے۔

فیض ہی کا نہیں ہر شاعر کا مطالعہ کرنے والا سب سے پہلے یہ چاہتا ہے کہ وہ جب شعر پڑھ رہا ہو تو اسے صرف شعر ہی نہیں بلکہ ایسے شعر پڑھنے کو ملیں جو محض الفاظ کا ذخیرہ نہ ہوں، محض عروض کی واقف کاری سے وجود میں نہ آگئے ہوں، محض مترنم مصرعے یا بامعنی بول نہ ہوں بلکہ اس احساس اور ادراک کی ترسیل کرتے ہوں جو شاعر اور قاری کے درمیان کسی داخلی واردات کے ذریعے خارجی رشتہ اور رابطہ قائم کردیں۔ یہ رشتہ جتنا قوی اور جتنے زیادہ لوگوں سے ہوگا۔ شاعر اتنا ہی ہردلعزیز ہوگا فیض کی شاعری انہی حیثیتوں سے شاعرانہ ہے۔ بالکل ابتدائی تخلیقات کو چھوڑ کر جن میں اکثر و بیشتر پر یا تو انگریزی رومانی شاعری کا اثر نمایاں ہے یا روایتی غزل سرائی کا انداز پیدا ہوگیا ہے ان کا مختصر سرمایۂ شاعری، خیال اور اظہار، جذبہ اور ذہن، خارجیت اور داخلیت کے توازن کی حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے۔ یہ ریاض مشق سخن سے نہیں تہذیب نفس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سراغ مجھے ''نقشِ فریادی'' کے دیباچہ میں ملا۔ بعض حصے اس لئے نقل کردیتا ہوں کہ فیض کی بعد کی شاعری اسی اجمال کی تفصیل اور اسی خیال کی تکمیل ہے۔ آج سے کچھ برس پہلے یہ الفاظ اواخرِ 1941ء یا اوائلِ 1942ء میں لکھے گئے ہوں گے ''ایک مخصوص جذبے کے زیراثر اشعار خودبخود وارد ہوتے تھے لیکن اب مضامین کیلئے تجسس کرنا پڑتا ہے علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں۔

ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ اس منفرد اور مخصوص تجربہ کیلئے کوئی موزوں پیرائیہ بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بے کار بھی۔ اول تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے پھر ان کی پیچیدگی کو دیانتداری سے ادا کرنے کیلئے کوئی تسلی بخش پیرائیہ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں شاعر کے ذہن کا عجز ہے۔ ایک کامل اور قادر الکلام شاعر کی طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے۔ اسے اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آ جاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتی ہے لیکن ایسے شعراء کی تعداد بہت محدود ہے ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کیلئے کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریق اظہار کو۔ ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے۔ اہل محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں انہیں حذف نہ کرنے کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکز دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیش نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے فارمولے تلاش کرنا پڑتے ہیں اور یہی وہ وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا، بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے اور بس۔''

میں نے تقریباً پورا دیباچہ نقل کر دیا لیکن فیضؔ کی انفرادیت کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری تھا شاید ہی اردو کے کسی اور شاعر نے اتنی کم جگہ میں اور اتنی سادگی سے اپنے نظریہ شاعری کو ایسے خوبصورت اعتراف کی شکل میں پیش کیا ہو۔ اس میں فیضؔ کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا پتہ بھی مل جاتا ہے اور خیال و بیان کی ان پیچیدہ تہوں کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے جو زندگی کا شعور حاصل ہو جانے اور انہیں فن کے سانچے میں پیش کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

''دستِ صبا'' کے دیباچے میں یہ شعور اور گہرا اور واضح اور زیادہ توانا ہو گیا ہے لیکن اس کی بنیاد ''نقشِ فریادی'' کی اشاعت ہی کے وقت پڑ چکی تھی۔ یہ بات فطری تھی کہ بدلتے ہوئے حالات سے اس کے مشاہدہ' تصورات اور عقائد میں زیادہ توانائی' گہرائی، قوت اور بصیرت پیدا ہوتی چنانچہ اس کا مظاہرہ ''دست صبا'' اور ''زندان نامہ'' کی فنی اور فکری پختگی سے ہوتا ہے لیکن چونکہ حالات بدلنے کے باوجود بنیادی طور پر ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکے تھے اس لئے ان کا مجاہدہ جاری رہا اور امید و بیم کی ان منزلوں سے گذرتا رہا جو ان کی اور ان کے نصب العین کی راہ میں آئیں۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

موجودہ دور کے قاری کیلئے شاعری بہ یک وقت جذباتی اور ذہنی عمل بن گئی ہے اور وہ ہر شاعر کے یہاں اپنے جذبات، اپنے تعصبات، اپنے خیالات اور اپنی دنیا تلاش کرنے لگتا ہے۔ ایک ایسے سماج میں جس کو سیاسی، تہذیبی اور جذباتی وحدت نصیب نہیں جس کے افراد بنیادی مسائل حیات سے ناواقف اور انتخاب اقدار کے معاملے میں کورانہ تقلید کے عادی ہیں جن کے ماضی اور حال میں رابطہ ٹوٹ رہا ہے اور مستقبل کی تصویر ٹھیک سے بن نہیں پا

رہی ہے۔ ایسے سماج میں شاعر اور قاری کی اندرونی اور بیرونی دنیا میں ہم آہنگی کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہیں تاہم فیض نے زندگی اور فن کی طرف جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اس ہم آہنگی کو ڈھونڈ نکالنے کی ایک مخلصانہ کوشش معلوم ہوتی ہے۔

یہی بات انہوں نے اپنے دونوں دیباچوں اور بعض نثری مضامین میں ظاہر کی ہے۔ انہوں نے اپنے اندر اور باہر کی دنیا کو حالات اور انقلابات کے گہرے شعور کی وساطت سے فطری طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کیلئے چھوڑ دیا ہے اور قلب و دماغ کی اس دوئی کو مٹانے کی سعی کی ہے جو غیر فطری مطالبے کرتی ہے۔ انسان کے اندر جو جذباتی کائنات آباد ہے نہ تو وہ غیر حقیقی ہے اور نہ وہ نظام عقل جو بے نتیجہ داخلیت اور طفلانہ جذباتیت سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ فیض نے مادی زندگی کے پُر پیچ روابط پر نظر رکھ کر اپنے شعور کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ فن کے دائرے میں موضوع اور معروض کا فرق کم سے کم رہ گیا ہے۔ فرد کے جذبات سماج کے صحت مند جذبات بن گئے ہیں اور فرد کا شعور سماج کا شعور نظر آنے لگا ہے۔ یہاں نہ تو کسی کو یہ شکایت ہو سکتی ہے کہ انفرادی جذبات اور تجربات کو نظر انداز کیا گیا اور نہ یہ کہ شعور کے دروازے بند کر کے صرف اعصاب کی پکار پر کان لگا دیئے گئے ہیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوا ہے کہ بہت سی ذہنی اور جذباتی الجھنوں میں گرفتار ہونے کے باوجود نہ تو وہ خود کسی قسم کے اختلال کا شکار ہوئے ہیں نہ ہی ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والا کسی ایسے ردعمل سے دوچار ہوتا ہے جو غیر فطری ہو۔ فیض نے موجودہ عہد کے بعض دوسرے شعراء کی ہیئت اور اسلوب میں غیر معمولی تجربے کر کے وہ انوکھا پن نہیں پیدا کیا جس سے اکثر شعریت کے فقدان یا نقص کی تلافی کی کوشش کی جاتی ہے ان کے خیالات اور انداز بیان دونوں میں اتنی شعریت موجود ہوتی ہے کہ انہیں تجربوں کے ذریعہ سے اپنے موضوع یا ہیئت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسا نہیں کہ وہ تجربہ کی اہمیت یا اس کے فنکارانہ حق کے منکر ہیں، کیونکہ جن نظموں میں انہوں نے مروّجہ اسالیب سے انحراف کیا ہے وہاں بھی اکثر پڑھنے والے کی توجہ اس تجربہ، انحراف یا اسلوب پر نہیں ہوتی بلکہ موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے تاثر کا جادو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور قاری غیر محسوس طور پر اس تجربہ یا انحراف کو اظہار کا ناگزیر جز سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ ان کے کلام سے وہی شخص غیر متاثر رہ سکتا ہے جو شاعری کو بڑے محدود اور منفرد انداز میں دیکھتا ہو۔ جو ہیت اور اسلوب کے تجربوں کو محض تجربہ ہونے کی حیثیت سے اولیت دیتا ہو، جو ان تمام ذہنی اور جذباتی موضوعات سے نفرت کرتا ہو جنہیں بالعموم صحت مند انسان پسند کرتے رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے اور کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو وہ زندگی کے تمام مظاہر کو اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ یکساں حسن کاری سے پیش نہیں کر سکتا۔ شاعر کا یہ کام بھی نہیں ہے اسے تو انہی باتوں کو پیش کرنا چاہئے جو انفرادی طور پر اس کے تصور حیات میں کسی قدر کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اپنی ذات، اپنے جذبات، اپنے ذہن، اپنے ضمیر سے سچائی برتتے اور اپنے قارئین کو ان راہوں میں بھٹکنے سے بچانے کیلئے جنہیں وہ ٹھیک نہیں سمجھتا شاعر کو مظاہر حیات میں سے انفرادی اور سماجی پہلوؤں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے فیض نے دیانتداری سے یہی کیا ہے۔ اپنی عملی زندگی اور اپنی ادبی اور شاعرانہ کاوشوں میں انہوں نے تہذیب اور زندگی کی جن قدروں کو اپنایا ہے وہ ان کے شعوری انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ اور انہیں فیض نے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے جہاں یہ صورت پیدا ہوتی ہے وہاں فن اور زندگی ایک ہو جاتے ہیں اور شاعری تبلیغ کی منزل سے بہت آگے نکل جاتی ہے اور اسے تبلیغ کہنے والا دور سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں میں نے فیض کی شاعری کے بعض بنیادی پہلوؤں کی طرف

اشارتاً متوجہ کیا ہے۔ اس لئے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اب مطلب واضح کرنے کیلئے میں ان کی دو مختصر نظمیں مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کی انفرادیت کا وہ پہلو نمایاں ہو سکے جس پر میں زور دے رہا ہوں۔ ایک نظم ''یاد'' ہے اور دوسری ایک غزل کہیں بغیر عنوان کے شائع ہوئی تھی، میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں یادوں کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب
اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم، مدھم
دُور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ، قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

(یاد)

دوسری نظم جسے شاید کچھ لوگ غزل مسلسل کہیں یہ ہے۔

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح
صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح
پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح
یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح
جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح
ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

جو شخص اردو شاعری کی روایات، اشاریت اور بلیغ ایمائیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ بڑی آسانی سے یہ سمجھ لے گا کہ پہلی نظم دوسری نظم سے مختلف ہے۔ وضاحت کے طور پر پہلی کو عشقیہ اور دوسری کو سیاسی کہا جا سکتا ہے دونوں کے محرکات بالکل مختلف ہیں۔ دونوں کی دنیائیں الگ الگ ہیں یہی ہونا بھی چاہئے تھا ایک کا موضوع خالصتاً داخلی ہے دوسرے کا قطعاً خارجی۔ لیکن فیضؔ نے کیا کیا ہے۔ پہلی نظم کے لمحہ حال کو ماضی اور مستقبل میں اس طرح پھیلایا ہے کہ ہجر کی بکھری ہوئی کڑیاں خیال کے ایک لمحہ میں مرکوز ہو گئی ہیں۔ ایک ایسے لمحے میں جو ابھی وجود میں نہیں آیا لیکن جسے شاعر کی قوت تخیل نے موجود کر دیا ہے۔ شاید یہ ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے جس میں واقعات کے خارجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ علامات اور استعارات کی بلاغت نے ایک دنیا کی تخلیق کی ہے جس میں گذرے ہوئے وصل اور قربت کے مناظر بھی ہیں اور وقفے بھی جن میں کھو کر یہ مناظر سائے اور سراب کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ فیضؔ کا ذاتی تجربہ محبت کا آفاقی تجربہ ہے اور نجی ہونے کے باوجود وسیع المعنی استعاروں میں بیان ہوا ہے۔ اس لئے اظہار کی انفرادیت میں بھی جامعیت اور آفاقیت ہے۔

دوسری نظم وقت کی شاہراہ پر صرف دو منزلوں یعنی ماضی اور حال کا سفر کرتی ہے۔ دیکھنے میں مختصر ہے لیکن درحقیقت اسی کے اندر کئی جگ بیت جاتے ہیں جن میں تجربوں کے بہت سے نقش بنتے اور مٹتے ہیں۔ یہ بھی انفرادی تجربوں ہی کی کہانی ہے۔ داخلی کم اور خارجی زیادہ۔ لیکن، سب شعور اور فن کی بھٹی میں پگھل کر ایک عظیم الشان نقش میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کہانی کو پھیلایا جائے تو ایک داستان بن سکتی ہے جس کا نتیجہ ابھی مستقبل میں ہے۔ مختصراً کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک دیوانۂ شوق جس نے ماضی میں بڑی آشفتہ سری دکھائی تھی، بہت سے زخم کھائے اور بہت سے داغوں کا سودا کیا تھا آج پھر اچانک فصلِ گل کی آمد محسوس کر رہا ہے، گذرے زمانے میں اس کے بہت سے ساتھی تھے اور سب مل کر غموں کی شراب پی لیا کرتے تھے۔ آج وہ اچھی خاصی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ فصلِ گل کا جو دام بچھایا جا رہا ہے یا جس کا وہ مشتاق ہے اس کے حاصل

کرنے کیلئے پھر اسی جنون گم گشتہ کی ضرورت ہے۔ طریقِ کار کیا ہو اور بہار کے قاتلوں (یا صرف ایک قاتل) سے کس طرح نمٹا جائے۔ یہ بات واضح نہیں ہے کیوں کہ قاتل مطلق العنان اور خود مختار ہے اس کی محبت اور مہربانی بھی جان لیوا ہو سکتی ہے۔ اس کی آزردگی سبب، وقت اور انصاف کی پابند نہیں نہ جانے اس کے جاسوس اسے کیا خبریں اور کس طرح دیں۔ ایسی کڑی نگرانی ہے کہ زبان تو زبان دل کے دھڑکنے کی صدا بھی وہاں تک پہنچا دی جاتی ہے۔ بڑی ہوشیاری بڑی سوجھ بوجھ اور بڑے ضبط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔۔۔ یہ کس کی داستان ہے اور کس عہد کی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

قفس کے در پر کئی بار آہٹ ہوئی مگر در نہیں کھلا سحر کی روشنی کئی بار دکھائی دی لیکن اُجالا داغ، داغ تھا پھر بھی وہ وارفتہ شوق فصلِ گل کا منتظر ہے۔ فیض نے یہی کہانی بارہ مصرعوں میں کہی ہے اور کیسی بلیغ اشاریت کے ساتھ کیسی ایمائی ندرت کے ساتھ لفظوں میں وہ توانائی ہے جسے جوہری کہہ سکتے ہیں۔ اظہار میں وہ انفرادیت ہے جس کے اندر سے فیض کا شعور بول رہا ہے۔ باہر کی دنیا اور دل کی دنیا میں مکمل ہم آہنگی ہے اور تغزل نے اس میں ایسی نشتریت پیدا کر دی ہے کہ فصلِ گل کا ہر تمنائی اس کی چُبھن محسوس کر سکتا ہے۔ یہی فیض کا فن ہے اور یہی ان کا شعور، یہی ان کے کلام کی انفرادیت ہے اور یہی آفاقیت۔ یہ شاعری کسی کی نقل نہیں ہے۔ یہ شعورِ حیات و شعورِ ذات کا نتیجہ ہے۔ یہ طرزِ اظہار تخلیقی کرب سے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اظہار کو خیال سے الگ کرنا، پھول سے اس کی خوشبو اور رنگ کا الگ کرنا ہوگا۔

فیض نے اپنے انسان دوست خیالات' زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِ عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں قلم بند کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے آسانی کے ساتھ باہر نہیں نکل سکیں گے۔

☆☆☆☆☆

"میں جہاں جاتی ہوں لوگ کہتے ہیں "اے فیض دی کڑی اے" بعد میں میرا نام لیتے ہیں اور کام! بس پھر فاف ہوتے ہیں۔ میں نے ابا سے صبر سیکھا ہے اور پیار کرنا سیکھا ہے۔ دراصل میں ان کے معاملے میں Emotional ہوں۔ ان کے بغیر مجھے اپنا گرد و پیش پھیکا نظر آتا ہے۔ میری زندگی میں ان کا بڑا دخل ہے۔ ابا صبر کی ختم نہ ہونے والی ایک گہری کان ہیں اور پیار ان کے جسم و جان میں میرے خیال میں خون کی بجائے محبت کا، پیار کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ وہ کہتے ہیں جتنا لوگوں سے پیار کرو گے وہ اُس سے بڑھ کر تمہیں پیار کریں گے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ زندگی کی کدورتیں اور نفرتیں محبت کے اس دریا میں ڈبو دوں جو مجھے ابا سے ملا ہے اور پھر ساری انسانیت سے والہانہ پیار کروں۔"

(منیزہ ہاشمی)
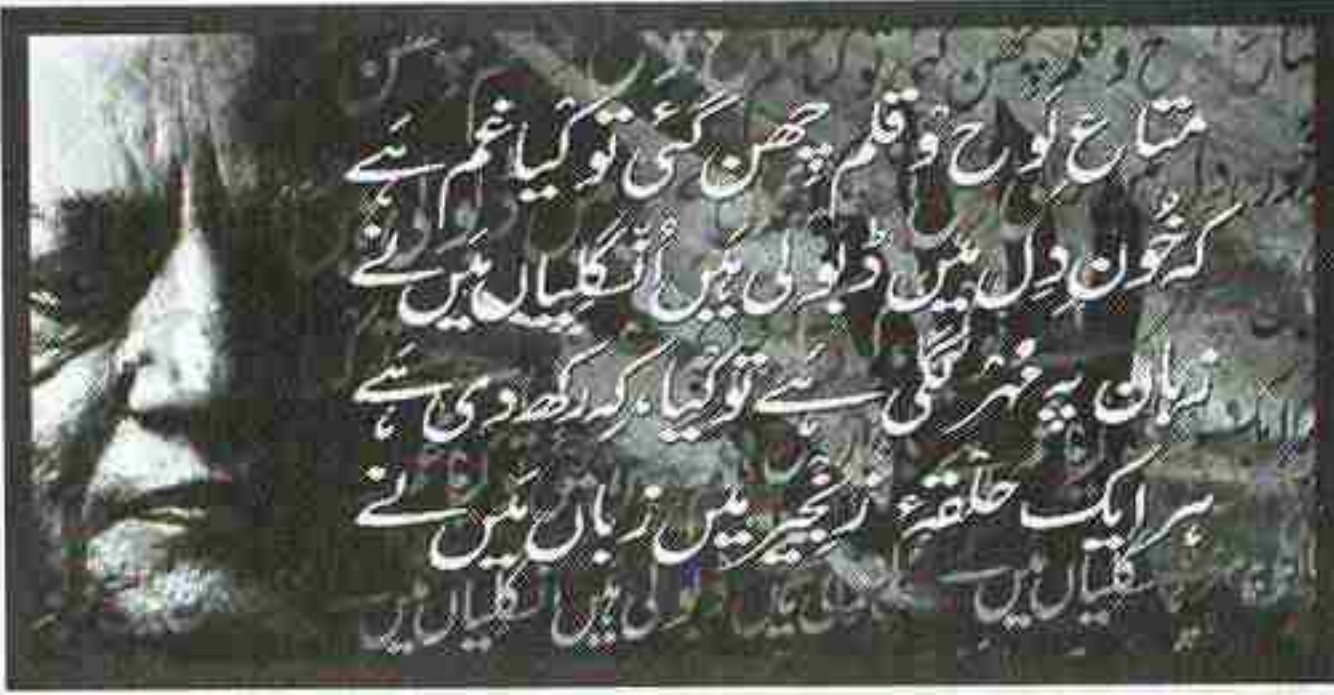
عمل۔ خدا بخش ابڑو

فیضؔ کے بارے میں

(ایک گفتگو)

پروفیسر کرار حسین

یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ فیضؔ فاؤنڈیشن کی پہلی تقریب میں شریک ہونے کا مجھے موقع ملا۔ فیضؔ فاؤنڈیشن دراصل فیضؔ صاحب سے ملاقات کی ایک صورت ہے۔ اب فیضؔ صاحب ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہوگئے ہیں۔ وہ تاریخ جو مردہ نہیں ہوا کرتی بلکہ جو ذہنی زندگی ہوا کرتی ہے، جسے ہم Living past کہتے ہیں، جس سے ہمارا حال متشکل ہوتا ہے، ہماری اس زندگی کا ایک Living impulse، ایک زندہ حرکت۔ ایسے موقعوں پر جب ہم ایسے آدمی کی یاد میں تقریب مناتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش اس لحاظ سے کرتے ہیں کہ اس کا ہماری تاریخ کے اندر، ہمارے ذہنوں کے اندر، ہماری جو کلچرل زندگی ہے اس کے اندر کیا حصہ ہے۔ فیضؔ صاحب عظیم شاعر تھے۔ فیضؔ صاحب عظیم انسان تھے۔ اب ایسی شخصیت اور ایسے شخص کی یاد منانا، اس کے اندر ایک چیلنج کی سی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ ایک Stimulus کی سی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو سوچتا ہے اپنی زندگی کو سوچتا ہے اس میں یہ سوچتا ہے کہ فیضؔ صاحب کا، جو ہماری روایت چلی آرہی ہے شعر کی، پوئٹری کی، اس کے اندر کیا حصہ تھا۔ یہ جو ہماری روایت ہے اور ہماری ذہنی زندگی ہے، جو ہماری کلچرل زندگی ہے، یہ بات سوچنی ہوتی ہے کہ فیضؔ صاحب کے فن کے متعلق کیا تصورات تھے؟ کبھی کبھی اور مسئلوں کی طرف نگاہ جاتی ہے کہ ایک آدمی کے نظریات اور عقیدوں کا اس کے فن اور اس کی شخصیت سے کیا تعلق ہے؟ اس بارے میں جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے دماغ میں کچھ ایسے سوال آتے ہیں کہ یہ شخص جو ہماری زندگی کا اتنا قریبی حصہ بن گیا، اس کا آدرش کیا تھا؟ اس آدرش کے معنی کیا تھے؟ یہ کہ اس کا، اس سوسائٹی سے، جس سوسائٹی کے اندر وہ رہتا تھا، کیا تعلق تھا؟ انسانیت سے اس نے کیا حاصل کیا اور انسانیت کو اس نے کیا دیا؟ تو اس قسم کے سوالات اس کی شاعری کے متعلق اور شخصیت کے متعلق ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ شاعری جو ہے، وہ بھی اس شخصیت کا ہی آئینہ ہوتی ہے۔ فیضؔ عظیم شاعر تھے اور وہ اس لیے عظیم شاعر تھے کہ عظیم انسان تھے۔ ان کی جو انسانیت تھی، اس کا ایک عکس، اس کا اظہار ان کی شاعری تھی۔

شعر کی روایت پر جس وقت ہم غور کرتے ہیں، تو اختصار کے ساتھ میں یہ عرض کردوں کہ ہماری کلاسیکی شاعری کی تین قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ شاعری کے اندر قصیدہ ہوتا ہے، شاعری کے اندر مثنوی ہوتی ہے اور شاعری کے اندر غزل ہوتی ہے۔ یہ تین قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ یہ جو دو قسمیں قصیدے اور مثنوی کی ہیں، ان کو تو مختصراً ایک ایک لفظ، ایک ایک فقرے میں بیان کروں گا کہ قصیدے کا تعلق ہمارے دربار سے تھا اور ہمارے اس معاشرے کے جو دو ستون تھے، ان میں ایک ستون دربار تھا اور دوسرا ستون خانقاہ تھی۔ ان دونوں کی کش مکش سے ہمارے کلچر اور ہماری زندگی کی روایت صورت پاتی تھی۔ ہمارے تمام ادب پر دربار کا اثر نظر آئے گا، یا دوسری طرف تصوف کا اور درویشی کا اثر نظر آئے گا۔ تو قصیدہ جو تھا، اس کا دربار سے تعلق تھا کیوں کہ دربار صرف

ایڈمنسٹریشن کی جگہ نہیں تھی، بلکہ دربار جو تھا، وہ ایک کلچر کا سنٹر بھی تھا اور بالکل جس طرح دربار کی شان و شوکت ہوتی تھی، اس طرح سے شاعر بھی اپنے الفاظ کی شان و شوکت سے دربار سجانا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے بادشاہ کی شخصیت نہیں ہوتی تھی، بلکہ بادشاہ کا جو تصور رہتا، وہ اللہ تعالیٰ کی پرچھائیں، اللہ تعالیٰ کا ظل، اللہ تعالیٰ کا سایہ تھا، وہ جو مرکز ہے اس تمام کی تمام دنیاوی زندگی کا۔ وہ اپنی شاعری میں انہی صفات کو، سخاوت کو اور شجاعت کو اُبھارا کرتا تھا۔ چونکہ اس کے پیچھے خود اللہ تعالیٰ کا تصور رہتا، اس لیے ان میں نعت اور منقبت بھی آجایا کرتی تھی۔ تو یہ گویا قصیدے کی صورت تھی جس میں شان و شوکت اور علمیت کا اظہار ہوتا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ الفاظ کے ذریعے ایک دربار تیار کیا جاتا تھا۔ اب مثنوی جو تھی وہ ہماری داستانیں تھیں اور قصوں کی ہمارے ہاں ہمیشہ بڑی اہمیت رہی ہے۔ ہمارا تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی کتاب میں قصے بیان کرتا ہے اور قصص کا لفظ آتا ہے۔ وہاں تمثیل جو ہے تو وہ حق ہے اللہ تعالیٰ کے بیان کرنے کا۔ رومانس کی مثنویاں ہوتی تھیں، فلسفے کی اور اخلاق کی حکائتیں ہوتی تھیں۔ اب ہمارے صوفیائے کرام جو تھے، ان کا بہت سا کلام ان مثنویوں سے ملتا ہوا ہوتا تھا، وہ صوفیاء پنجاب کے ہوں، یوپی کے ہوں، سندھ کے ہوں یا کہیں کے بھی ہوں۔ ان داستانوں میں محبت چلتی تھی۔ ان کے اندر حقیقت تھی، ان داستانوں کے اندر مجاز اور حقیقت، سب کا سب آجاتا تھا۔ تو یہ ایک ہماری صنف تھی۔ ایک صنف دربار سے تعلق رکھنے والی تھی اور ایک عام آدمیوں اور خانقاہوں سے تعلق رکھنے والی۔

ان کے علاوہ ہماری غزل تھی اور غزل جو تھی، وہ ایک مرکزی فارم تھی۔ ہمارے فیض صاحب اس روایت کے بڑے زبردست حامی اور زمانہ حال کے لحاظ سے اس روایت کو ازسرِ نو زندگی بخشنے والی بڑی شخصیت تھے۔ غزل ہمارے کلچر کی رُوح ہے۔ غزل کی روایت یہ ہے کہ اس میں مکروریا اور فریب جیسی تمام چیزوں سے شدید نفرت نظر آتی ہے۔ نفاق سے نفرت نظر آتی ہے۔ اس کے اندر دھوم دھڑکے اور ظاہرداری سے زبردست نفرت نظر آتی ہے۔ اب یہ دیکھو کہ ہماری غزل کے اندر زاہد کا اور واعظ کا کیا مقام ہے۔ یہ سب کے سب اس فریب، ریاکاری، ظاہرداری اور دھوم دھڑکے کی علامت ہیں جس سے نفرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ غزل کی جان جو تھی وہ محبت اور عشق تھی اور عشق جو ہے تو وہ Going out of one's self ہے اپنے آپ سے باہر جانا، اپنے رشتے طے کرنا، انسان سے رشتے طے کرنا، خدا سے رشتے طے کرنا۔ چنانچہ آپ نے مجاز اور حقیقت کا ذکر سنا ہوگا کہ فلاں چیز کے مجاز میں یہ معنی ہیں اور حقیقت میں یہ معنی ہیں۔ صوفیاء کا جو تصوف تھا، دراصل وہ انسان دوستی تھا وہ تمام چیزیں جو آدمی کو آدمی سے علیحدہ کرتی ہیں انسان کا انسان سے رشتہ قطع کرتی ہیں، ان سے زیادہ بلند تھا۔ میں نے پہلی خصوصیت جو بتائی، اس کی علامت بتایا شیخ کو، واعظ کو، زاہد کو، محتسب کو۔

اب یہ دیکھیں کہ ہماری غزل کی روایت کے اندر کافر کا کیا مطلب ہوگیا۔ ہماری غزل عالمگیر انسانیت کی قائل ہے۔ دیر اور کعبے سے بھی بلند اُٹھی ہوئی ہے۔ ہماری پرانی غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے نظریے کے مطابق دنیا بدلتی نہیں ہے۔ ہر چیز کا اپنا ایک مقام موجود ہے۔ ظلم جو ہے تو وہ رہے گا۔ ظلم تو ایسا ہے کہ آسمان سے باہر ہم کہاں جائیں گے، اور جو آسمان کا مقام ہے ہماری شاعری میں، ہماری کلاسیکی شاعری میں، وہ سب کو معلوم ہے۔ کون سی سرزمین ایسی ہے جس کے اوپر آسمان نہیں ہے۔ یہ دنیا بدلتی نہیں ہے۔ دوسری دنیا ہے جو آدمی کی رُوح کی دنیا ہے۔ زمین کی دنیا میں تو انسان ہیچ ہے مگر اس دنیا کے اندر اس کی انا بڑی اونچی ہے۔ یہاں اس کے اندر تعلّی آجاتی ہے، مقام انسانیت آجاتا ہے۔ انسان کے صحیح وقار کا مقام آجاتا ہے۔ اس دنیا کے اندر آدمی کی عظمت ہے، بلکہ آدمی 'کُل' ہوجاتا ہے، یعنی انسان جو ہے تو وہی کل ہوتا ہے۔ اس دنیا میں، جو پولیٹکل دنیا ہے، جو زمینی دنیا ہے، یہاں ہمارا جو رویہ ہے وہ یا تو آسمان سے

شکایتوں کے اندر ظاہر ہوتا ہے اور یا ظلم کی شکایتوں کے اندر ظاہر ہوجاتا ہے یا اگر اس سے Dissent ہوا تو وہ وحشت کی صورت ہوتی ہے، جس کا مقام یا تو قید خانہ ہوتا ہے یا صحرا ہوتا ہے۔ تو قید خانہ اور صحرا جو ہیں گویا وہ Dissent ہیں، اس دنیا کے خلاف یعنی آزادی کا سانس لینا، یا اس دنیا سے دامن اپنا بچانا۔ ایک شوق شہادت ایک شہادت کا جذبہ، تو شہادت کا جذبہ جو ہے وہ بھی ہماری کلاسیکی شاعری کے اندر بہت زیادہ ہے۔

گویا ہماری کلاسیکی شاعری کے اندر یہ رویے پائے جاتے ہیں۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس سے جس قسم کا کلچر پیدا ہوا، اس کے اندر ایک وقار تھا، ایک وضع داری تھی۔ یہ ذہن بنا کہ حادثات کو تو ہم نہیں بدل سکتے، حادثات تو ہوتے رہیں گے، لیکن ہم ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ہم ان کا کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ یہ تمام حوادث ہماری شرافت کو، ہماری مروّت کو، ہماری وضع داری کو، ان چیزوں کو نہیں بدل سکتے۔ یہ گویا ایک Passivity تھی، ایک انفعالیت تھی مگر یہ بڑی حسین انفعالیت تھی۔ اس کلچر کی ایک خصوصیت تھی زبان سیکھنے کا سلیقہ۔ ہماری انڈو مسلم سوسائٹی میں اگر آپ دیکھیں تو اس میں زبان کی صحت اور صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، یعنی زبان کے اندر ایک شوخی پیدا کرنا، زبان کے اندر ایک حسن پیدا کرنا۔ اس کو آپ ایسا سمجھ لیں کہ جیسے تصوف کا ریاض ہوتا ہے، تو یہ کلچر کا ریاض تھا، یعنی آدمی بات کیسے کرتا ہے۔ آدمی جو پہچانا جائے گا تو اپنے لہجے سے پہچانا جائے گا کہ کیسی زبان استعمال کرتا ہے۔ یہاں بھی بالکل تصوف کی طرح پیری مریدی ہوتی ہے۔ یہاں استاد اور شاگرد کا تعلق ہوتا ہے۔ کوئی شخص جب شاگرد بنتا ہے کسی استاد کا، تو وہ جا کر استاد کو مٹھائی پیش کرتا ہے، دستار پیش کرتا ہے۔ تو اس قسم کی عقیدت مندیاں یہاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ایک روایت ہماری چلی آرہی تھی کلاسیکی شاعری کی اور اس روایت میں عرفان کی، معرفت کی، مرکزی جگہ تھی۔ یوں سمجھ لو کہ وہ ایک کامن بیک گراؤنڈ تھا تمام کا تمام اس شعری روایت کا۔ زمانے کی حیثیت بدلی، جب طرزِ احساس بدلا تو بہت ساری باتیں مختلف ہوگئیں۔ اب یہ ہوا کہ بجائے اس عرفان کے انقلاب نے جگہ لے لی۔ اب یہ نہیں رہا کہ یہ دنیا جو ہے، بدل نہیں سکتی۔ اس جدید طرزِ احساس کے اندر یہ ہوا کہ ہر جگہ انقلاب ہی انقلاب کا احساس آنے لگا کہ ہم دنیا کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ ایسی ہی رہے گی۔ یہ بات اتنی پھیلی کہ وہ چیزیں جو ٹھوس حقیقت تھیں، ان کے اندر بھی تبدیلی آگئی اور ایک تبدیلی یہ آئی کہ دین اور مذہب جو ایک حقیقت تھی اور جو حق تھا، اس کو بھی ایک نظریے میں تبدیل کر دیا گیا، وہ بھی ایک نظریہ بن گیا۔ اب لوگوں نے ایک خواب دیکھا کہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ظلم برقرار رہے۔ ایک امن کا خواب دیکھا، ایک ظلم کی مخالفت کا خواب دیکھا۔ تو اس قلندری اور درویشی کی جگہ اب ایک کمٹ منٹ آگئی کہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا جائے۔ اب زمانے کی غالب حیثیت بدلنی شروع ہوئی، یعنی اس میں اب تقدس اور عرفان کی جگہ انقلاب آگیا۔ اب یہ ہوا کہ زمانہ بدل سکتا ہے۔ امن کا خواب لوگوں نے دیکھا۔ ظلم کی مخالفت لوگوں نے دیکھی۔ اب قلندری اور درویشی اس میں ٹھہری کہ کسی بڑے مقصد کے لیے آدمی اپنے آپ کو وقف کردے۔

اس تمہید کے بعد آپ فیضؔ صاحب اور ان کی شاعری کو دیکھیں۔ ظاہر ہے، فیضؔ کی شاعری اور فیضؔ کی شخصیت سے کون واقف نہیں ہے۔ فیضؔ کے ہاں وہ قدیم روایت تو قائم رہی، زبان کا وہ لوچ بھی قائم رہا، لیکن اس میں اب ایک ڈائریکشن پیدا ہوگئی۔ ورنہ اس سے پہلے غزل جو تھی، اس کی Diversity کبھی کبھی انتشار کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ اب اس کی بجائے ایک مقصدیت پیدا ہوگئی، ایک سمت اس کے اندر پیدا ہوگئی۔ اس سمت کے پیدا ہونے میں ایک سوچ اور حسن کے ساتھ، زبان کے اندر ایک طاقت پیدا ہوئی۔ امیجز وہی رہے لیکن ان کے معنی بدل گئے۔ شہادت بھی ہے، قید خانہ بھی ہے، صحرا بھی ہے، سب کچھ ہے مگر سیاق و

سیاق چونکہ بدل گیا ہے اس لیے اس کے معنی بھی تمام کے تمام بدل گئے۔ اس میں زمانے کی حسیت داخل ہوگئی۔ ایک اور بات میں عرض کروں کہ روایت زندہ ہی اسی طرح رہتی ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں اندرونی تبدیلیاں آتی رہیں۔ زندہ شے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ایک Entity ہوتی ہے، ایک شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے اندر تبدیلی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ تو یہی کیفیت ادبی روایت کی بھی ہوتی ہے۔ اس کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ جب روایت میں اندرونی تبدیلی آنی بند ہو جائے اور دوسرا نقش پہلے کے مثل ہو جائے تو وہ روایت مردہ ہو جاتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح روایت زندہ بھی رہتی ہے اور وہ مر بھی جاتی ہے۔

اب اسی روایت کے اندر میں نے کلاسیکی شاعری کے متعلق بتایا۔ اب اس زمانے میں جس وقت ہم شعر کا ذکر کرتے ہیں، بالخصوص اُردو شعر کا تو ظاہر ہے کہ ایک زبردست نام اقبالؔ کا سامنے آتا ہے۔ ہم اقبالؔ کی شاعری اور ان کی شخصیت کا جب تصور کرتے ہیں تو مجھے لا محالہ انگریزی ادب کی روایت کے اندر جو ملٹن کا پیغام تھا اور جو اس کی حیثیت تھی، مجھے کچھ ایسی بات نظر آتی ہے۔ یعنی جو روایت چل رہی ہے، جو راستہ چل رہا ہے، اس روایت سے ذرا ہٹ کے، شان دار اور عظیم الشان تعمیر بنائی گئی ہے۔ جیسے ''پیراڈائز لاسٹ'' اور ''پیراڈائز ری گینڈ'' اقبالؔ کے یہاں تعمیر میں بڑی آرکیٹکچرل خصوصیات ہیں، جیسے ایک ٹاور ہو مگر غزل کی روایت کا جو راستہ ہے اس سے ذرا ہٹ کے۔ ہاں! ذرا ہٹ کے تو ٹھیک ہے لیکن اس کا اثر اتنا پڑ رہا ہے اس روایت پر، اس ادبی اور شعری روایت پر کہ اب اس کے بعد یہ ناممکن ہوگیا کہ ادبی روایت وہی رہ جائے جو پہلے تھی۔ اس کے اندر تبدیلیاں آئیں گی۔ اس کے اندر کچھ مقصدیت آئے گی۔ اس کے اندر پیغام آئیں گے، یا اس سے کچھ ری ایکشن ہوگا۔ آدمی اپنے اندر اترنا شروع کرے گا۔ پیغام اور مقصد سب کو بے معنی سمجھنے لگے گا۔ تبدیلی شروع تو غالبؔ میں ہوگئی تھی لیکن نمایاں تبدیلی اقبالؔ کے اندر نظر آتی ہے۔ اب فیضؔ، شعر کو اسی روایت کے اندر لائے، لیکن اب یہ بدلی ہوئی چیز تھی۔ اس کے اندر ہمارے زمانے کی حسیت سموئی ہوئی ہے۔ اب ہمارا زمانہ اس کے اندر بول رہا ہے۔ یہ شاعری ہمارے زمانے سے خطاب کر رہی ہے۔ اقبالؔ اور فیضؔ کو سامنے رکھیں تو ایک رویے کا فرق بھی ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ کا کلام دیکھو تو اس کے اندر اگر بحثِ بھی ہے تو وہ کہہ رہا ہے کہ میرے دم سے دنیا کا اندھیرا دور ہو جائے اور دنیا میں اُجالا ہو جائے۔ شاعر کو دیکھو تو کبھی تو وہ محفل کی شمع ہے، کبھی وہ محفل کا ساقی ہے، محفل اُجڑ گئی ہے، اس کے باوجود ساقی موجود ہے۔ کبھی شاعر کا مقام یہ ہے کہ جو کارواں راستے سے ہٹ گیا ہے، اس کو پھر راستے پر لا رہا ہے۔

گویا یہاں شاعر کی حیثیت ایک استاد کی ہے، لوگوں سے علیحدہ۔ ان کے ایک راہنما کی۔ یہ کہیں کہیں ایک Obsession کی حد تک ہے۔ اس لیے کہ قوم کی رہنمائی میں تو بہت سی باتیں آ جاتی ہیں کہ کون سی باتوں کی ضرورت ہے۔ کون سی باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کون سا ان کا مستقبل ہوگا۔ یہ رویہ اس کے اندر آ جاتا ہے، اقبالؔ کو جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں ہمیں اپنائیت محسوس ہوتی ہے، بلکہ یہی ہوتا ہے جیسے استاد کچھ ہمیں بتا رہا ہے۔ وہ کچھ ڈانٹتا بھی جاتا ہے۔ ہم سے کچھ شکایت بھی ہے، کچھ محبت بھی ہے۔ شفیق استاد ہے مگر استادوں کی طرح سے ذرا سختی بھی مزاج کے اندر ہے، لیکن یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ ہم میں سے ہی ہے۔ ایک فاصلہ برقرار رہتا ہے۔ لیکن فیضؔ صاحب کی شاعری میں جو رویہ نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آؤ چلیں! سب کے ساتھ چلیں! میں اکیلا نہیں جاتا، بلکہ تم بھی ساتھ چلو! ایک اپنائیت کا، ایک کامریڈ ہونے کا احساس ہے۔ میرا بھی وہ مقصد ہے تو آؤ ساتھ چلیں! تو اس میں بڑی محبت اور اپنائیت پیدا ہو جاتی ہے بالکل جیسے کہ وہ ہم میں سے ہے اور قافلے کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ راستہ بتا رہا ہے کہ کارواں کا یہ راستہ ہے اور تم اس راستے سے بھٹک گئے ہو۔

چونکہ اقبالؔ کے سامنے مسلمانوں کا

ایک مقصد اور اسلام کے وژن کے ساتھ پوری انسانیت سے خطاب تھا، اس لئے انہیں دنیا میں جہاں سے بھی فکری مواد ملا، اسے جمع کر کے ایک بڑی شان دار عمارت تعمیر کر دی، بڑی بارعب عمارت۔ اس کے اندر کہیں کہیں تو فلسفہ اور شعر ایک ہوگئے ہیں۔ جو مواد ہے، ان کے وژن کا حصہ بن گیا ہے۔ کہیں کہیں کچھ رخنے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ بھی نظر آنے لگتا ہے کہ یہ تو بالکل ایک فلسفہ ہوگیا۔ اس لیے کہ شاعر اپنی قوم کا ٹیچر بھی ہے اور راہنما بھی ہے۔ اسے راہنمائی کی دُھن میں جہاں سے بھی مواد حاصل ہو رہا ہے اور جو بھی اس کے لیے مفید مطلب ہے وہ اسے لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ تو اس میں کہیں کہیں رخنے بھی نظر آجاتے ہیں۔ کہیں کہیں تضادات بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں آدمی چونک کر یہ کہنے لگتا ہے کہ یہ بات تو فلاں جگہ پر انہوں نے ایسے کہی تھی، اب وہ اس طرح کہہ رہے ہیں۔ تو یہ بات نظر آنے لگتی ہے۔ گویا اس طرح اپنے مقصد کی خاطر یہ سب کیا جاتا ہے۔ غزل کا جہاں تک تعلق ہے تو اُردو غزل کی جو روایت تھی، اب وہ بدل گئی ہے، اب فارسی کی پرانی غزل، یا اُردو کی پرانی غزل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ زبان کے سلسلے میں جب ہم اقبالؔ کا تصور کرتے ہیں تو انگریزی شاعر ملٹن کا خیال آتا ہے۔ ملٹن کی زبان کے متعلق ایک جگہ ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا تھا کہ "He wrote no language"۔ ملٹن زبان نہیں لکھ رہا تھا، بلکہ وہ جو عمارت تعمیر کر رہا تھا، اس کے لیے پلستر اور چونا وغیرہ استعمال کر رہا تھا۔ یہ بات اقبالؔ کے اندر بھی آپ دیکھیں گے کہ بات کہنا ہے۔ فارسی میں کہی جائے تو، اُردو میں کہی جائے تو۔ جس طریقے سے بھی کہی جائے، کہنا مقصد ہے۔

اب جب ہم فیضؔ کی طرف آتے ہیں تو فیضؔ صاحب کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک آئیڈیالوجی کے قائل تھے۔ وہ آئیڈیالوجی کے علم بردار تھے۔ وہ ٹھیک ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کا کلام آپ نے بھی پڑھا ہے، ہم نے بھی پڑھا ہے لیکن آپ نے کبھی محسوس کیا کہ وہ آئیڈیالوجی کہیں Obtrusive ہوگئی ہے؟ یا فیضؔ صاحب اس آئیڈیالوجی کی وکالت کر رہے ہیں، یا اس آئیڈیالوجی کے فلسفیانہ نکات بتا رہے ہیں۔ وہ اتنی گھل مل گئی ہے کہ Under current کی طرح کسی جگہ نظر نہیں آتی، Un-obtrusive ہوگئی ہے۔ آئیڈیالوجی کے بارے میں بعض لوگوں کا جھگڑا فیضؔ صاحب سے شروع ہوتا ہے، لیکن ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ ان شعروں میں تمہیں کون سی بات بُری معلوم ہوتی ہے، جو بات تمہیں ناگوار گزری ہے، اس بات کا تو اس داستان میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ ان کی آئیڈیالوجی تو ان کے وژن کے اندر، ان کی نظر کے اندر گھل مل گئی ہے۔ زبان کا جہاں تک تعلق ہے، وہ اس طرح ہے کہ یہاں زبان کو اور علامتوں کو تخلیق کیا جاتا ہے۔ ان کے اندر نئے امکانات تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ شاعر لفظوں کا آرٹسٹ بھی ہوتا ہے اور شاعر کے اندر خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبان کے جو امکانات ہیں، وہ دریافت کرے۔ ایک بڑے شاعر کی تخلیق دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری زبان کے اندر اس صداقت کا امکان بھی تھا جسے شاعر نے دریافت کر کے نمایاں کیا ہے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے کہ انقلاب کا نعرہ لگ گیا تھا لیکن ہمارے جو انقلابی شاعر تھے، مجازؔ وغیرہ۔ جن کے بڑے نمائندے جناب جوشؔ ہیں، ان کے اندر رومانیت نمایاں تھی۔ ان کے ہاں انقلاب اور رومان کی دو الگ الگ لہریں چل رہی تھیں۔ وہ کبھی عورت سے کہتے ہیں کہ اپنے آنچل کو پرچم بنا لو تو اچھا ہے اور کبھی گاؤں کی عورتوں کو آئیڈیالائز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ پتا بھی نہیں چلتا کہ انہوں نے کبھی گاؤں کی کسی عورت کو دیکھا بھی ہے یا نہیں۔ اسے ایک رومانٹک فینٹسی کہا جاسکتا ہے۔ جوشؔ صاحب کے کلام کے اندر بھی یہی ہے۔ جوشؔ صاحب بہت بڑے شاعر ہیں، بلکہ ان کے اندر جو انرجی ہے، اس کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمیوں میں جن پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے اندر جن کی طاقت ہے۔

مجھے جوشؔ صاحب بہت اچھے لگتے ہیں اور جوشؔ صاحب پر پیار سا بھی آتا ہے۔ کیوں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن کی طاقت والا آدمی ہے، لیکن بچوں کی سی سادگی ہے اس میں۔ اس سادگی میں کبھی وہ عقل کا جھنڈا اُٹھائے ہوتے ہیں اور کبھی انقلاب کا جھنڈا۔ وہ محبت بھی جب کرتے ہیں تو انقلابی سی محبت ہوتی ہے، بلکہ انقلاب کے غازی کی سی محبت ہوتی ہے۔ اب غازی کی کیسی محبت ہوتی ہے یہ آپ سوچ لیجیے، لیکن ہمارے فیضؔ صاحب کے اندر آپ یہ دیکھیں گے کہ جسے غمِ جاناں اور غمِ دوراں کہا جاتا ہے، اس کی ایک ہی لہر ہے۔ دونوں دائرے مل کر ایک لہر میں چل رہے ہیں۔ اس میں زمینی محبت بھی آئی، عورتوں سے محبت بھی آئی اور حسین دنیا سے محبت بھی، یہ تمام کی تمام محبتیں آئیں اور یہ محبت ایک وسیع دائرے کے اندر پھیلی۔ اقبالؔ کا عشق تو عقل کے خلاف جہاد کرنے کے لیے اتنے زبردست طریقے سے چلا کہ وہ یہ بھول گئے کہ زمین پر عورتیں بھی رہتی ہیں۔ یہ خصوصیت ملٹن کے اندر بھی ہے۔ کسی اتنے بڑے شاعر نے کبھی عورت کو اس طرح فراموش نہیں کیا۔ عورت ان کے لیے خود ایک مسئلہ بن گئی۔ ان کا عشق جو تھا، اس کا زمینی تعلق، یعنی عورت سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ تو اس طرح جب ہم اپنی روایت کو دیکھتے ہیں، اور اس کے ماضی کو دیکھتے ہیں، اور اس زمانے کی روایت کو دیکھتے ہیں، یعنی جب ہم ان تین شاعروں جناب اقبالؔ، جناب جوشؔ اور جناب فیضؔ کو ساتھ رکھ دیتے ہیں تو پھر ہمیں فیضؔ کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔

فیضؔ صاحب عربی بھی اچھی جانتے تھے۔ انگریزی اور مغربی ادب کے تو استاد تھے ہی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُردو کے شاعر ہونے کے لیے یہ بہت اچھا کمبی نیشن ہے۔ عربی تو میں نہیں کہتا، لیکن اُردو شاعر کے لیے فارسی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ فارسی ہمارے کلچر کی ضرورت ہے۔ عاقبت سنوارنے کے لیے عربی بھی سیکھنی چاہیے، جیسے کہ ہم سیکھ رہے ہیں، لیکن ایک کلچر کی جو روایت چل رہی ہے، اس کے لیے فارسی سے واقف ہونا اور ایک مغربی زبان، خاص طور سے انگریزی ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اُردو کا کوئی اچھا ادیب یا شاعر ایسا نہیں ہے جو مغرب سے متاثر نہ ہوا ہو۔ یہاں میں پاکستانی شاعروں سے، یا جو شاعر ہونے کی تمنا رکھتے ہیں، ان کی ٹریننگ کے لئے میں ان سے کہوں گا کہ اپنے ہاں کے صوفیا کا جو کلام ہے اور جسے ہم نے کبھی شعوری ادب نہیں سمجھا، یہ صوفی شعراء جو سندھ کے ہیں، پنجاب کے ہیں، سرحد کے ہیں، ان کو پڑھ کر ضرور دیکھنا چاہیے۔ یہ بات ان لوگوں سے کہی جا رہی ہے جو شاعری کو واقعی سنجیدگی کے ساتھ لیتے ہیں، جو اسے وقتی کھیل نہیں سمجھتے۔ فیضؔ صاحب کے کلام میں انگریزی کے رومانٹک شاعروں کا بہت زیادہ اثر نظر آتا ہے۔ رومانٹک شاعروں کا زمانہ وہ تھا جب ہم سب (جنہوں نے انگریزی ادب پڑھا) کے آئیڈیل بھی رومانٹک تھے۔ خاص طور سے شیلےؔ اور بائرنؔ۔ ان کا اثر فیضؔ صاحب پر بھی پڑا۔ اس طرح کے اثر کو قبول کرنا ایک ایسا فعل ہے کہ اس میں آدمی کی حقیقت کھل جاتی ہے، یعنی جو آدمی چھوٹے ظرف کا ہوتا ہے اور جس کی روایت میں اپنی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی، وہ تو اس کے اندر بہہ جاتا ہے۔ ہمیں اپنی تنقید کے اندر اس کے نمونے مل جاتے ہیں کہ اس میں بڑے بڑے مغربی لوگوں کے نام لکھے جاتے ہیں اور سمجھ لیا جاتا ہے کہ بس اب سند مل گئی۔ اب زبان کو، اور اپنی شاعری کو بھی، وہ انہی اُصولوں پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ زندہ تنقید کسی نہ کسی مسئلے کا جواب ہوتی ہے۔ وہ مسئلہ جو اس ادب سے اور اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف تنقید کے اندر ہی نہیں، بلکہ مغرب کے ہاں جو رجحان پیدا ہوئے، ہم انہیں بھی اپنانا شروع کر دیتے ہیں، مثلاً یورپ ایک دور سے گزر چکا ہے، خوش حالی کے دور سے۔ اب وہاں صنعتی عہد نہیں ہے، مابعد صنعتی عہد ہے۔ پورے کا پورا چکر مکمل ہو گیا ہے۔ اس کی حقیقت بھی انہوں نے دیکھ لی اور خوش حالی کی حقیقت بھی انہوں نے دیکھ لی۔ اس کا کھوکھلا پن بھی لوگوں نے دیکھ لیا۔ اس کی معنویت بھی

دیکھ لی۔ اس کی لامقصدیت بھی لوگوں نے دیکھ لی۔ اس کا بے معنی ہونا بھی لوگوں نے دیکھ لیا اور پھر جنگیں بھی دیکھ لیں۔ اس کا نتیجہ، تباہ کاری بھی دیکھ لی۔ یہ بھی دیکھ لیا کہ اب دنیا تباہ کاری کے کنارے کھڑی ہے۔

پہلے حقیقت کی مثلث کچھ اس طرح تھی کہ میں اور تو اور اس مثلث کا مرکز، یعنی اللہ۔ نشاۃ ثانیہ میں وہ مرکز ختم ہو گیا اور صرف میں اور تو رہ گئے، اور اب وہ تو بھی ختم ہو گیا اور ہم اپنے اندر داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اب ایک خاص قسم کی داخلیت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ بجائے اس کے کہ ہم اس بات میں حقیقت تلاش کریں کہ میرا اور مجھ سے باہر کی جو دنیا ہے، اس کا کیا ایکشن اور ری ایکشن ہو رہا ہے، ہم نے اپنے اندر ٹٹولنا شروع کر دیا۔ آج کل مغرب کے اوپر جو دور گزر رہا ہے، وہ سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ جو ہماری دنیا ہے، یہ جو تیسری دنیا ہے، جو ابھی ابھی غلامی سے آزاد ہوئی ہے، جسے اس دنیا کو بنانا ہے، جسے کچھ سوچنا ہے، جس کی زندگی کے پیٹرن میں ایک گیپ پڑ چکا ہے، جسے نیا پیٹرن تراشنا ہے، اپنے مسئلوں کو حل کرنا ہے، اگر انہوں نے مغرب کے رویے اپنانا شروع کیے تو کام ہو گیا ان کا۔ مغرب والے جن چیزوں کو آزما چکے ہمارے لیے ان کے اندر بہت کشش ہے۔ ہم باولوں کی طرح ان کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جو اس سے متاثر ہوتے ہیں، ان کی اپنی روایت کے متعلق ٹریننگ کافی نہیں ہوتی۔ ان کا ظرف خود کم زور ہوتا ہے۔ وہ اس سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

یہ باتیں اپنی نگاہ میں رکھ کر فیض صاحب کو دیکھیں اور یہ دیکھیں کہ فیض صاحب پر کیسے اثرات تھے۔ ایک زمانہ سامنے ہے۔ اس زمانے کے کچھ مسئلے ہیں۔ فیض صاحب کے ہاں ایک مقصد کے لیے کمٹ منٹ ہے۔ اس کمٹ منٹ سے ان کے کلام میں جان پیدا ہوئی۔ ایک سمت پیدا ہوئی، لیکن اس کمٹ منٹ کے اندر ایک Detachment ہے، یعنی اپنے آپ کو اپنے آپ سے علیحدہ کر کے پھر دیکھتا ہے آدمی، کہ یہ تجربہ کیسا ہے۔ اس طرح نظریہ، انسانیت کے روپ میں بدل کر تجربہ بنتا ہے اور پھر وہ نظریہ، نظر میں تبدیل ہو جاتا ہے، وژن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یعنی بیک وقت انتہائی کمٹ منٹ اور Detachment کہ اپنے آپ سے دور کھڑے ہو کر اس کے معنی سمجھنا کہ یہ تجربہ کیا ہے؟ یہ دنیا کیا ہے؟ اس کی معنویت کیا ہے؟ فیض صاحب کے ہاں ایک کمٹ منٹ بھی ہے اور کمٹ منٹ کے ساتھ ایک Detachment بھی آ جاتی ہے۔ جہاں تک مضمون کا تعلق ہے، وہاں کمٹ منٹ ہے اور جہاں فن کا تعلق ہے وہاں Detachment ہے۔ اس کو تصوف کی زبان میں یوں سمجھئے کہ دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک جہاد اور ایک معرفت، یا عرفان۔ جب جہاد میں عرفان کی رُوح بھی آ جاتی ہے تو اس کش مکش کے اندر ایک معنویت پیدا ہو جاتی ہے، ایک بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم ان دونوں کو ایک ساتھ ہی سمجھتے ہیں کہ جہاد اس معنویت یا اس عرفان کے بغیر ایک تشدد ہے اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بصیرت اور عرفان بغیر جہاد محض جذباتیت ہے، یعنی جس عرفان کے اندر یا معرفت کے اندر یا جس وژن کے اندر جدوجہد اور جہاد کی رُوح نہ ہو تو وہ ایسے ہے جیسے ریڑھ کی ہڈی کمزور ہو۔ فیض صاحب کے کلام میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں یعنی جہاد کا جذبہ بھی ہے اور جو Insight ہے، وہ بھی آ گئی ہے اور اسی حرارت اور روشنی سے زبان اپنے آپ بدلتی ہوئی، خیالات سے ہم آہنگ ہوتی گئی ہے۔

اب یہ سوال کہ فیض صاحب ایک عظیم انسان تھے۔ تو عظیم انسان کے ساتھ اگر ان کے آدرش کو اور ان کے پیغام کو بھی سمجھنا چاہیں تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ دنیا بہت حسین ہے، بہت ہی حسین ہے۔ یہ دنیا اتنی حسین ہے کہ اس کے حسن کا حساب کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کا احتساب کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان اس کے حسن کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ انسانی جسم ایک مقدس چیز ہے۔ ایک تقدس اور ایک پاکیزگی اس کے اندر پیدا ہو گئی ہے۔ اس حسین دنیا کی، اس باغ کی، جو بہار ہے، وہ محبت ہے۔ پہلی حقیقت تو یہ ہوئی۔ دوسری حقیقت جو ہمارے

فیض احباب کے ساتھ

فیض احباب کے ساتھ

ڈاکٹر حسن رضوی، امجد اسلام امجد، شبنم شکیل، ملاحت، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، خالد احمد
فیض احمد فیض، ڈاکٹر سعادت سعید، منیر نیازی، عطاء الحق قاسمی

فیضؔ، احباب اور اہلِ خانہ کے ہمراہ

سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی نے آدمی کا کیا کردیا ہے؟ کیا بنا رکھا ہے؟ اس دنیا کے اندر کیسا استبداد ہے، استحصال ہے؟ جسم بھی بک رہے ہیں۔ عزت بھی بک رہی ہے۔ ایمان بھی بک رہے ہیں اور بک سب کا رہا ہے۔ کسی کا جسم بکتا ہے، کسی کی محبت بکتی ہے اور کسی کا ایمان بک رہا ہے۔ دشواری یہ آگئی ہے کہ اپنے تن کو سلامت رکھو تو ایمان بک جاتا ہے۔ اس طرح یہ استحصال چل رہا ہے۔ اس حسین دنیا کو اور اس کے حسین لوگوں کو کیا بنا رکھا ہے؟ شاعر کو اس کا بڑا زبردست دکھ ہے۔ وہ دور کھڑے ہو کر ان کے لیے اپنے اندر ترحم کا جذبہ پیدا کرنے کے بجائے، اپنے آپ کو ان کے اندر شامل کرتا ہے۔ یہاں ہماری محبت اس نہ مٹنے والے بشر کے ساتھ ہوگئی ہے جسے طاقت میں اندھے ہمیشہ کچلتے چلے آئے ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ ہم کچلے ہوئے لوگوں کے اوپر ترس کھا رہے ہیں یا رحم کھا رہے ہیں بلکہ ہمارے اندر ان کے لیے احترام پیدا ہوا۔ وہ لوگ ایسے نظر آنے لگے کہ تاریخ کے امین بھی ہیں، مستقبل کے امین بھی ہیں، انہیں تم حقیر مت سمجھو انہیں تم مظلومین میں سے مت سمجھو، زمین کے مالک بھی ہیں۔ یہاں شاعر ترحم کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان کے ساتھ Identify کرتا ہے اور پھر چونکہ اسے یقین ہے اس بات کا کہ یہ دنیا بدلے گی، امن قائم ہوگا۔ ظلم خواہ کتنا ہی پہاڑ کی طرح نظر آئے لیکن یہ کٹے گا۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ انسانیت کا یہ حصہ جو مظلومین کا ہے، اس پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہت بڑے ہیں۔ یہ بہت عظیم ہیں۔ یہ اس قابل نہیں ہیں کہ آپ ان پر ترس کھائیں بلکہ اگر ہو سکے تو آپ ان کے ساتھ مل جائیں۔ اپنے آپ کو ان کے ساتھ Identify کریں۔ یہ اس لیے کہ اس دنیا کا صحیح حسن نمایاں ہو جائے تا کہ انسانیت کا تقدس برقرار رہے۔ یہ جو انسانیت کی تحقیر اور تذلیل ہو رہی ہے۔ یہ جو انسانیت کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی آدمی، کسی مقدس اور پاک چیز کی بے حرمتی کی جائے۔ یہ درست ہے کہ اس کام میں تکلیفیں آئیں گی۔ کوئے یار کے ساتھ سوئے دار بھی چلنا پڑے گا، لیکن یہ تو ہوتا ہی آیا ہے، بلکہ اصل راستہ ادھر ہی سے ہو کر جاتا ہے۔ اس کے اندر قید ہو، دار ہو تو اس سے اس کا بانکپن اور نکھرتا ہے۔ گویا یہ فیض کا پیغام ہے ہمارے نام، انسانیت کے نام۔ ان کے تمام کلام کو مجموعی حیثیت سے جب ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں تو اسی طرح کا آدرش فیض کا ہمارے سامنے ابھرتا ہے۔

اب ایک سوال، جو آخر میں کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آخر ان کا اپنی سوسائٹی سے کیا تعلق ہے؟ اس لیے کہ حبِ وطن کے دعوے دار بہت سارے ہیں اور اگر زمین سے محبت انسان سے محبت ہے، تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ زمین کی محبت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اب اس کے اندر یہ ہے کہ وطن دوستی یا حبِ وطن جنگ کے پروپیگنڈے کو نہیں کہتے۔ اپنی زمین یا اپنی سوسائٹی سے محبت کرنا نفرت کا گیت نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں تکبر کیا جائے اور کہا جائے کہ ہم یوں ہیں اور ہم یوں ہیں، جیسے اور لوگ بہت حقیر ہیں، بلکہ اس ذہنیت نے تو دنیا کے اندر تباہی مچا رکھی ہے، دنیا کے اندر قیامت برپا کر رکھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قسم کا حب وطن دکھانا، انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ اس چیز کو حبِ وطن، وطن سے دوستی اور اپنے لوگوں سے دوستی نہیں کہا جا سکتا۔ وطن سے جو دوستی ہوتی ہے، وہ ہمیشہ انسانیت کے حوالے سے ہوتی ہے۔ جس چیز سے آپ کو محبت ہے، اس کے دکھوں کو اپنانا ہوتا ہے۔ اس کی خدمت کرنا ہوتی ہے، اس کی زندگی کی سطح کو بلند کرنا ہوتا ہے۔ محبت کا تقاضہ یہ ہے۔ یہ جہاد جہاد جو کہتے پھرتے ہیں تو جہاد کی بھی پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرے کو عدل اور احسان کی بنیاد پر قائم کرو۔ اگر وہ معاشرہ عدل اور احسان کی بنیاد پر قائم ہے تو اس کی خاطر جان دینا ایک معنی رکھتا ہے۔ ورنہ تو یہ ہے کہ بھیڑوں کے اوپر بھی جب کوئی بھیڑیا حملہ کرتا ہے تو وہ جمع ہو کر اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔ یہ تو ان کی سرشت ہے۔ یہ کوئی اخلاقی سطح تو نہیں ہے۔ اس جہالت اور تنگ نظری سے انسان کو اوپر اٹھنا چاہیے کہ اگر آپ، اور آپ کا غنیم، لڑ رہے ہیں تو آپ کی طرف

سے جو بھی مارا جائے وہ شہید اور دوسری طرف سے جو مارا جائے وہ جہنم میں چلا گیا۔ ہماری ادبی روایت میں اس احساس کی بات بھی چلتی ہے۔ ہماری شاعری میں ہوس اور عشق کا فرق شروع سے بتایا گیا ہے۔ رقیب روسیاہ کا اور عاشق صادق کا فرق۔ ہم جس سے عشق کرتے ہیں اگر اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو لائق شرم ہو تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ عاشق کے دل میں کیسی تڑپ اور کیسی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہی بتا سکتا ہے جس نے اتنا شدید عشق کیا ہو۔ ان گلیوں میں جن پر شاعر اپنی جان نثار کرنا چاہے، اگر ان گلیوں کی کیفیت یہ ہو جائے کہ آدمی سر اُٹھا کر بھی نہ چل سکے تو آدمی تڑپ اُٹھتا ہے۔ یہ کس قسم کی تڑپ ہوتی ہے کہ محبوب سے قطع تعلق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس تکلیف کا اندازہ عاشق صادق ہی کر سکتا ہے۔ یہ ہوس پیشہ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ رقیب رُوسیاہ اس تکلیف کو نہیں سمجھ سکتا۔

آخر میں بس ایک فقرہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی سوسائٹی اور اپنی قوم کے لیے بڑی بات یہ دیکھنی ہوتی ہے کہ انسانیت کے لیے اس میں کیا معنی ہیں؟ کیا پیغام ہے اس کے پاس؟ زندگی کا کون سا پیٹرن اس نے ابھارا ہے؟ اس پیٹرن کے اندر کتنا حق اور کتنا حسن ہے؟ کم نظر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم یا کسی معاشرے کی جو بقا ہے، وہ بہت ساری فوجیں اکٹھی کرنے میں اور بہت سارے ہتھیاروں کو اکٹھا کرنے میں اور بہت سارا مال و دولت اکٹھا کرنے میں ہے۔ میں عرض کروں گا کہ جس وقت قوموں پر زوال آتا ہے تو اس وقت مال و دولت کی کمی نہیں ہوتی، بلکہ بہت زیادہ مال و دولت ہوتا ہے۔ ہندوستان پر جب غیروں کا قبضہ ہوا، اس وقت اسے سونے کی چڑیا کہا کرتے تھے، اس کے خزانوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ نہ آدمیوں کی کمی ہوتی ہے نہ سپاہیوں کی اور نہ ہی سپاہیوں کے اندر ہمت کی کمی ہوتی ہے۔ ہمت بھی بہت ان کے اندر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی جنگیں ہوئیں، وہاں ہمارے بزرگ جو لڑ رہے تھے، وہ بزدل نہیں تھے، مگر جب کسی معاشرے کے پاس دنیا کے لیے اور انسانیت کے لیے کوئی پیغام نہیں رہتا، جب اس کے اندر سے Living Word بلند نہیں ہوتا، جب اس کے اندر سے کوئی زندہ لفظ بلند نہیں ہوتا تو وہ قوم حرف غلط کی طرح مٹا دی جاتی ہے۔ اور فیض صاحب وہ شاعر ہیں جنہوں نے ہمیں زندہ لفظ دیا۔ فیض زندہ لفظ کے شاعر ہیں۔

☆..........☆☆☆..........☆

''ایک خاص بات یہ ہوئی کہ جب ہم لوگ ڈھاکہ پہنچے تو سارا شہر آیا ہوا تھا اور نعرے لگ رہے تھے پاکستان زندہ باد۔ جب واپس آئے تو کرفیو لگا ہوا تھا۔ سڑکیں سنسان، نہ آدم نہ آدم زاد۔ ایئرپورٹ پر گارڈ البتہ موجود تھی۔ وہاں ہمیں جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ پھر گارڈ تیار ہوئی پھر Dismiss ہوئی۔ ہم نے ملک جعفر سے کہا سگریٹ ہو جائے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد سگریٹ پینے کی اجازت ملی۔ بھٹو صاحب آ گئے اور ہم گھر کو لوٹے۔

(فیض احمد فیض)

بیادِ فیض

اندر کمار گجرال

فیض نے ایک دفعہ لکھا تھا۔

اب کوئی پوچھے بھی ہم سے تو کیا شرح حالات کریں
دل ٹھہرے تو درد سنائیں اور درد تھمے تو بات کریں

دسمبر 1983ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے لئے مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ پرانے دوستوں سے ملاقات کی خواہش اور اپنا پرانا وطن دیکھنے کی پرزور کشش کھینچ کر تین ہفتوں کے لئے وہاں لے گئی لیکن جانے سے تشنگی بڑھی، کم نہیں ہوئی۔

لاہور سے میرا رشتہ خاص طور پر بہت گہرا تھا۔ اسی شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر جوانی کا بیشتر حصہ کٹا تھا۔ وہی یونیورسٹی کی پرانی بلڈنگ، وہی میرا کالج ہاسٹل، وہی مزنگ روڈ پر واقع میرے سسرال کی کوٹھی جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس شام کی یادیں عود کر آئیں۔ جب بارات میں فیض اور مظہر علی باراتی تھے۔ یہ بات فیض کو بھی نہ بھولی تھی۔ میری بیوی سے ملتے ہی پوچھا "اپنا گھر دیکھ آئی ہونا"۔

لاہور میں وہ تاریخی بریڈ لا ہال بھی اور لاجپت رائے بھون بھی تھے جہاں بقول مجاز۔

فطرت نے سکھائی تھی ہم کو
افتاد یہاں پرواز یہاں
گائے تھے وفا کے گیت یہاں
چھیڑا تھا جنوں کا ساز یہاں

اور اسی جنون نے فیض سے ملاقات بھی کروائی تھی۔ اسلام آباد میں کانفرنس ختم ہوئی تو پشاور ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ فون پر بات تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اطلاع ملتے ہی فیض اور ایلس ہمارے ہوٹل آ گئے۔ یوں تو ان کی دعوت تھی کہ دونوں ان کے ہاں ٹھہریں۔ لیکن ان کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا شہر سے باہر اور ہم ڈھیروں دوستوں سے ملنے کے خواہشمند بھی تھے اور اس سے زیادہ خواہش تھی ان گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے کی جو جانی پہچانی تھیں۔ یوں بھی فطرتاً فیض ظاہری تکلفات سے پرہیز کرتے تھے ہماری معذرت کی وجوہات ان کو معقول لگیں۔

ان دنوں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم بھی لاہور میں میچ کھیلنے گئی تھی۔ ہمارے سفیر کیبر نے ان کے اعزاز میں ہمارے ہی ہوٹل میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ جوں ہی ان کو معلوم ہوا کہ فیض اور ایلس میرے کمرہ میں ہیں تو بمع عملہ آ گئے فیض سے پہلے ان کی ملاقات تو نہ تھی۔ لیکن اس بہانہ سے ان کا تعارف ہو گیا اور ہم سب تھوڑی دیر میں پارٹی میں جا پہنچے۔ پارٹی تو پرہیزگاروں کی تھی۔ ہر قسم کے کباب حاضر تھے لیکن پاکستانی قوانین شراب بندی پر مصر تھے۔ کافی دیر تک فیض کوکا کولا قسم کے ڈرنکس پر صبر کرتے رہے۔

ماسکو کے بعد فیض سے میری ملاقات کوئی دو برس بعد ہو رہی تھی۔ چہرہ کچھ ڈھلا ہوا تھا اور چال بھی معمول سے دھیمی۔ میں نے ایلس سے وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں۔ ڈاکٹروں نے قلب کے متعلق وہم ڈالا تھا لیکن اب ان کو تسلی ہو گئی ہے اور فیض حسب عادت سگریٹ کی جھڑی لگا رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی پہلی دفعہ تو تھی نہیں کہ ڈاکٹروں نے ان کو کچھ "ٹمپرنس" کی صلاح دی تھی۔ ماسکو میں بھی ایک دفعہ ڈاکٹروں نے ان کو ہسپتال میں بند کر دیا تھا۔ یوں تو ان کے لئے

وہاں کا قیام اچھا تھا۔ ڈاکٹر زیڈ اے احمد، ہاجرہ بیگم، پی سی جوشی بھی ان دنوں وہیں تھے اور ہسپتال میں ان کی آپس میں خوب جمتی تھی۔ ایک دن مجھ سے فون پر کہنے لگے ''بھائی جب ملنے آؤ گے تو ہماری پیاس کا دھیان کرتے آنا'' میں نے کہا ''غضب کر رہے ہیں آپ، ڈاکٹروں نے آپ کو سختی سے منع کر رکھا ہے''۔ ''ارے بھائی تم بھی خوب ہو ڈاکٹروں نے مجھے منع کیا ہے آپ کو نہیں اور یوں بھی ڈاکٹر احمد براماں رہے ہیں''۔ لیکن غضب تو یہ ہوا ہے کہ ان کو موت اس وقت آئی جب تقریباً ایک برس سے وہ مکمل پرہیز گار ہو گئے تھے اور وہ لوگ جو انہیں حال ہی میں لندن میں مل کر آئے تھے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اس وقت پہلے سے زیادہ صحت مند لگ رہے تھے۔

اگلے دن شام کو ہم دونوں کھانے کے لئے ان کے گھر پہنچے۔ ایلس نے صرف اپنی دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو بلایا تھا۔ سلیمہ اور منیزہ بہت پہلے بھی ہمارے پاس آ چکی تھیں جب وہ بہت چھوٹی تھیں۔ اب تو ان کے بچے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ فیض کو تو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ سے ہی بوتل سے دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی ہندوستانی وہسکی حاضر تھی۔ ''ارے''۔ میں نے پوچھا ''یہ کیسے؟ ہم تو سنتے ہیں کہ قانون اب گھروں کے اندر بھی محتسب بھجوا دیتا ہے اور پھر یہ ہندوستانی وہسکی یہاں کیسے پہنچی'' ''ارے سب چلتا ہے میاں۔ ہم اور کون سے حکم مان رہے ہیں جو اس پر پابند رہیں''۔ کراچی میں کسی نے ایک لطیفہ سنایا تھا کہ'' اکیلے پینا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ضیاء صاحب کے راج میں اب دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ لیکن بڑی پارٹی میں آسانی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ پارٹی کے سائز کے حساب سے حسب رتبہ کسی فوجی افسر کو بھی مدعو کر لیجئے''۔ اس دن بات زیادہ تر سیاسی موضوعات پر ہی رہی۔ بدلتے ہوئے حالات میں پاکستان ہندوستان تعلقات وغیرہ، روس کی افغانستان میں آمد کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف تھا۔ بایاں طبقہ اس میں خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی نظر میں یہ سب نہ ہوتا اگر حکومتِ پاکستان امریکہ کی آلۂ کار نہ بنتی اور سوشلسٹ انقلاب کو تڑوانے کی کوشش میں شریک نہ ہوتی۔ ایک اور سوچ زیادہ تھی کہ اس موقع پر پاکستانی پروگریسو عناصر کو بھارت سے تعلقات سدھارنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان ہی دنوں فیض بیروت سے لوٹے تھے۔ وہاں کی بدحالی نے ان کے من پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس زمانہ کی نظمیں اس کرب کا اظہار کرتی ہیں۔ اس شام ہم نے ان سے فلسطینی بچے کے نام ''لوری'' سنی۔

ابھی کچھ ماہ پہلے دہلی میں ہم لوگوں نے مل کر فیض کے 70 ویں جنم دن کا جشن منایا تھا۔ فیض صاحب کے داماد ہاشمی صاحب کہنے لگے کہ'' اس کا اثر پاکستان کے لوگوں پر بہت گہرا تھا۔ مہینوں لوگ ہندوستان کے لوگوں کی جمہوریت اور لبرل سماج کی باتیں کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے ہندوستانی ٹی وی کے اس پروگرام کی کیسٹس بھی بنالی تھیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی بھی سنیئے۔ فیض تو یہاں تھے نہیں۔ یہاں بھی ایک جنم دن کمیٹی بنائی گئی۔ خبر نکلتے ہی اس کے سب ارکان میرے ساتھ گرفتار کر لئے گئے اور ہم نے جنم دن پرانی انارکلی کے تھانے کے گندے سیل میں گزارا'' اور پھر وہ بتانے لگے کہ'' اسی تھانے میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ساتھ نہ جانے کیوں پولیس والے، ایک نوجوان مولوی کو بھی پکڑ لائے تھے وہ بے چارہ پریشانی میں بہت رو رہا تھا اور بار بار کہتا تھا کہ میں تو جنرل صاحب کا حامی ہوں مجھے پکڑنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ ارے صاحب ہم سب بھی تو ضیاء صاحب کے مداح اور حامی تھے لیکن کل رات کچھ فوجی افسروں نے ضیاء صاحب کو باہر کر دیا ہے۔ اس لئے ان کے سب حامی پکڑے جا رہے ہیں۔ باہر کھڑا سنتری سن رہا تھا وہ بھاگا تھانیدار کو بتانے۔ تھانیدار نے کسی کو فوراً فون کیا۔ جواب میں ڈانٹ پڑی تو ہمارے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''آپ کا مذاق ہم کو تو چوپٹ ہی کرنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ افسر مہربان تھا'' یہ ہماری آخری

ملاقات تھی۔ اگلے دن ہم واپس دہلی آرہے تھے۔ پچھلے سال میں نے ان کو انبالہ کے مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے لکھا لیکن قلبی دورہ آپڑا اس لئے یہاں آنے کی بجائے ہسپتال داخل ہوگئے۔ مظہر نے ان کی بیماری کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی وہ نظم بھی جو انہوں نے میو ہسپتال میں لکھی تھی۔ حسب معمول اس میں کرب بھی تھا اور عزم بھی۔

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا، نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شائد
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر، نہ اک مہر، نہ اک ربط، نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن میرے دل، یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

فیض کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمت اور عزم ہمیشہ اُمید کی طرف لے جاتے ہیں۔

لمبی قید اور یہ ڈر کہ پھانسی کی سزا نہ ہو جائے، اس رجحان کو کم نہ کر پائے بلکہ ان کی شاعری کو چار چاند لگاتے رہے۔ "لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے"۔ یوں تو راولپنڈی کیس سے پہلے بھی سب کی طرح کئی دفعہ ان پر بھی مایوسی کا دور نظر آتا ہے، مگر بہت کم۔ جیسے:

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں کیوں آس لگائے بیٹھے ہو۔

لیکن ان کی شاعری کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس دکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دکھ درد کی کہانی ہے۔ جسے وہ خوبصورتی سے اپنے آپ میں سمیٹ کر اور نکھار کر پیش کر دیتے ہیں۔ فیض کے اس زبانی lyricism اور انقلاب نے ہی ہماری پیڑھی کو ان کی طرف کھینچا تھا۔ اب تو بات بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی لڑائی پورے زوروں پر تھی کہنا مشکل تھا کہ آخر میں ہٹلر ہارے گا یا جیتے گا۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو پورا وشواس تھا کہ اس کی تکمیل کی گھڑی آپہنچی ہے میں اس زمانہ میں کالج کے آخری دنوں میں تھا۔ لیکن پڑھائی سے بھی زیادہ اُلجھاؤ، بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ تھا اور اس ناطے ہمیں جیل بندی ہوئی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کے سیاسی خواب آزادی سے بھی اگلے پڑاؤ کی سوچتے تھے اسی لئے وقتی سماجی رشتوں، ادب اور انقلاب کے باہمی اثرات پر اکثر بحث رہتی تھی۔ اسی زمانہ میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی اُبھر کر سامنے آرہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں فیض کے خصوصی انداز کا بہت چرچا تھا۔

اچانک ہی ہمارے کالج میں خبر آئی کہ فیض امرتسر چھوڑ کر لاہور ہمارے ہی کالج میں انگریزی ادب کے لیکچرر ہوکر آرہے ہیں۔ حیرانی ہوئی کیونکہ ہمارا کالج سرکاری تھا اور ہمارے پرنسپل انگریز تھے۔ لیکن تھے بڑے کھلے دماغ کے آدمی۔ ان کو تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی تھی۔ شائد اس لئے فیض کے چناؤ میں ان کو کوئی پس و پیش نہ تھا۔ کسی حد تک غائبانہ ملاقات تو تھی ہی، تھوڑے ہی دنوں میں ہمارا رشتہ شاگرد، اُستاد کی حد پھلانگ گیا اور اور ایک لمبی دوستی کی بنیاد پڑی۔

Adolescence میں کئی کھچاؤ میں ایک ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کے لئے انقلاب کے کئی معنی تھے اس میں دلیش دوستی بھی تھی، سماجی رشتوں کو بدل دینے کا عزم بھی تھا نئی قسم کی شاعری سے دلچسپی بھی تھی۔ اس پیڑھی میں ہمارے ساحر اور سردار جعفری جیسے دوست اپنی ہونہاری دکھا رہے تھے لیکن ان سب چہروں اور رجحانوں میں رومانیت کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اسی لئے فیض کی اس وقت کی شاعری ہماری ان تمام جذباتی کشمکشوں کی ترجمانی کرتی تھی اور دل میں اُتر جاتی تھی ہمارا کوئی بھی ساتھی یا دوست ایسا نہ ہوگا جس کو "نقش فریادی" یاد نہ ہو یا روزمرہ کے مشغلوں میں "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" کی بات نہ کرتا ہو۔

فیض کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی

سادہ اور عام فہم زبان بھی تھی۔ اسی زمانے میں Caudwell کی کتاب۔ "Studies in a dying culture" شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ آج بھی یاد آتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ شاعری ایک رومان بھی ہے کیونکہ اس کا رشتہ زبان اور سماج سے ہے اس لئے ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی بات فیض نے اپنے ڈھنگ سے پیش کردی ہے۔

اسی زمانہ میں John Freeman کی سوانح حیات New Testament کا بھی چرچا ہوا اور اس نے بائیں بازو کے دانشوروں میں ایک Negative قسم کی ہلچل پیدا کردی۔ Freeman ایک منحرف کمیونسٹ تھے۔ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے متعلق رائے میں شدید اختلاف تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک واقعہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا تھا۔ اپنے یونیورسٹی کے دنوں میں ان کی ملاقات ایک خوبصورت لڑکی سے ہوئی جس نے ان سے ایک دن پوچھا کہ کالج چھوڑنے کے بعد آپ کیا کریں گے "شاعری اور انقلاب"۔ لڑکی کو یہ خیال بڑا خوبصورت نظر آیا لیکن اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اُبھرتی محبت کو چھوڑ کر کسی خوشحال نوجوان سے شادی کرلی جائے۔ فیض بھی تو شاعری اور انقلاب کو اپنا چکے تھے۔ لیکن ان کی قسمت Freeman سے بہتر تھی یہ خبر کہ فیض ایک انگریز عورت سے شادی کررہے ہیں اور وہ بھی انگلستان گئے بنا بڑی عجیب لگی۔ لیکن اس میں بھی فیض کا اپنا انوکھا پن تھا۔ ایلس اپنی بہن مسز تاثیر سے ملنے امرتسر آئی ہوئی تھیں کہ فیض سے ملاقات ہوگئی۔ ہم خیالی نے پیار کے رشتے کو مضبوط و مستحکم کردیا۔ جس زمانے میں فیض لاہور آئے اس وقت تاثیر سری نگر میں پرنسپل ہو کر چلے گئے تھے اس لئے شادی وہاں رچائی گئی اور نکاح شیخ عبداللہ مرحوم نے پڑھوایا۔ بعد کے سالوں میں شیخ صاحب اس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ شادی میں کشمیر نیشنل فرنٹ کے تمام سرکردہ رہبر شامل ہوئے تھے۔ صادق صاحب اور بخشی غلام محمد کے ساتھ فیض کی دوستی اسی وقت شروع ہوئی۔ فیض کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایلس جیسی رفیقہ حیات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس ڈھنگ اور جس بانکپن سے بیگم فیض نے مشکل کے دن کاٹے وہ ان کی قابل رشک ہمت کا ثبوت ہیں۔ فیض کی جنگ میں شمولیت سے بائیں بازو کے فنکار اور بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پہلی بات نازی بربریت کو ہرانے کی ہے اور ہٹلر کی فتح کے پس منظر میں کوئی انقلابی اور ترقی پسند طاقت اس اصلیت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ یہ سوچ فیض اور مظہر علی جیسے حساس لوگوں کو فوج میں لے گئی اور فیض کالج کی نوکری چھوڑ کر دہلی آئے اور میں کالج کی تعلیم ختم کرکے کراچی چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لئے دہلی آیا۔ اس زمانے میں نئی دہلی بھی کچھ اور تھی۔ رات کو "بلیک آؤٹ" ہوتا تھا اور انڈیا گیٹ کے اس طرف تو تھا ہی جنگل۔ فیض صاحب کو گھر ملا تھا لودھی اسٹیٹ میں۔ رات کو ان کے ساتھ کھانا تو میں نے مان لیا، لیکن تانگے پر وہاں پہنچتے پہنچتے پسینہ نکل گیا۔

پھر پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ وطن بدر ہوکر دہلی آگئے فیض واپس لاہور چلے گئے۔ کچھ عرصے کے لئے رشتے معطل ہوگئے۔ اب فیض کی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ میاں افتخار الدین نے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کا اجراء کیا۔ فیض اور مظہر علی اس کے ایڈیٹر اور جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں لوگ یہ سن کر ان پر رشک کرنے لگے۔ یہاں تو دن رات مکانوں کی الاٹمنٹ اور راشن کارڈوں کی گردش میں کٹتے تھے اور وہ نئے ملک میں نئی قدروں کے رجحان بنا رہے تھے لیکن نہ ان ہی کی وہ حالت بہت دنوں رہی اور نہ اپنی۔ ایوب خان کا راج آیا تو "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کو سرکار نے دبوچ لیا اور اب بھی وہ سرکاری ٹرسٹ کی ملکیت میں ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد راولپنڈی سازش کیس کا ڈرامہ رچایا گیا۔ فیض اور سجاد ظہیر لمبے عرصہ کے لئے جیل میں بند ہوگئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد میاں افتخار انتقال فرما گئے۔

وہ اپنے وقت میں بڑے ٹھاٹھ کے انسان تھے۔ آکسفورڈ میں پڑھتے پڑھتے انقلابی

بن گئے۔ واپس آنے کے بعد پنجاب کانگریس کے صدر جواہر لال جی کے ساتھ ان کا نہایت قریبی رشتہ تھا۔ میرے والد اور وہ جیل میں دوبارہ اکٹھے ہوئے تھے ان کا رشتہ فیض، محمود علی، مظہر علی اور ہم جیسے Leftist لوگوں کے ساتھ بہت گہرا تھا۔ فیض کو ان کی موت کا بہت رنج ہوا اور جیل سے انہوں نے لکھا۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

جب ہم لوگوں نے یہاں اس شعر کو سنا تو ہندوستان کی سیاست ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ کانگریس دو حصوں میں بٹ رہی تھی جس دن اندرا جی کو کانگریس سے نکال دیا گیا تو میں نے ان کو یہی شعر لکھ کر بھیج دیا۔ ان کو بہت بھایا۔ گو ان کو شعر یاد کرنے کی مہارت تو نہ تھی، پھر بھی کئی دفعہ کہہ دیتی تھیں "کیا تھا وہ فیض کا شعر"

فیض کا رشتہ پنڈت جی اور اندرا جی سے بہت قریب کا تھا۔ 1958ء میں جب فیض دہلی آئے تو پنڈت جی نے پوری شام ان کے ساتھ گزاری۔ 1971ء کے بعد پاکستان میں حالات نے پلٹا کھایا۔ بھٹو کے دور میں فیض آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر بنے تو دہلی آئے۔ میں ان دنوں انفارمیشن براڈ کاسٹنگ کا منسٹر تھا۔ کہنے لگے "دو کام کرو، ایک تو شیلا بھاٹیہ کا مقبول اوپیرا Opera 'ہیر رانجھا' اور دوسرے اپنے بھائی ستیش گجرال کی تصویروں کی نمائش پاکستان بھجواؤ" میں نے کہا کہ "اصولاً تو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے کہ آپ دہلی ٹی وی پر اپنا پورا پروگرام نشر کر دیں"۔ فیض صاحب نے تو اپنی بات پوری کر دی لیکن نہ ہی شیلا بھاٹیہ کا اوپیرا اور نہ ہی ستیش گجرال پاکستان جا پائے۔ ابھی تعلقات ہی کچھ ایسے تھے اور دن بدن بھٹو صاحب کے اطوار بدل رہے تھے۔

فیض اس سے مایوس ہو رہے تھے لیکن کوشش میں تھے کہ بھٹو اور ان کے مصاحب آگے آنے والے دنوں کو دیکھیں۔ فیض ان لوگوں میں تھے جو محسوس کرتے تھے کہ بھٹو اپنی غلطیوں سے صرف فوجی راج کی راہ ہی ہموار کر رہے ہیں۔ یہ ہو کر ہی رہا۔ لیکن ہمارے ہاں بھی تاریخ ایک صفحہ اُلٹ کر ایمرجنسی لے آئی۔ فیض نے سوچا کہ شاید ایمرجنسی صرف بائیں بازو کو توڑنے کے لئے لائی گئی ہے لیکن وہ جلد ہی اس کے تیور سمجھنے لگے۔ جب ملے فیض نے کہا "یہ تم نے خوب کیا۔ پاکستان کو جمہوری راہ پر لانے کے بجائے تم لوگ ہی ڈھلک گئے۔"

جنرل ضیاء کا زمانہ آیا تو پھر سے دل میں گھٹن بڑھی اور دانشوروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ فیض تو کسی طرح نکل کر ماسکو آ گئے لیکن ایلس اور بچوں کو بہت دیر تک مشکلوں سے گزرنا پڑا تب تک ایمرجنسی کے دور نے مجھے بھی ماسکو دھکیل دیا تھا۔ فیض جب ملے تو انہوں نے کہا کہ:
"ستم سکھلائے گا رسمِ وفا ایسے نہیں ہوتا"
اور ان کی نظم "میرے دل میرے مسافر" تو بس دل میں ہی اُتر گئی۔ ہم کو تو ان کی وطن بدری کا بہت فائدہ ہوا۔ ہندوستان کا سفارتخانہ ان کا دوسرا گھر تھا اور اکثر شام کو ہمارے ہاں آ جایا کرتے تھے ایک دن کہا بسمل کی نظم "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" نے آزادی کی جدوجہد میں مجاہدوں کی صفوں کو گرما دیا تھا۔ تب فیض نے بتایا کہ اس زمین پر انہوں نے بھی ایک نظم کہی ہے۔

سرفروشی کے انداز بدلے گئے
دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا
فیض کیا جانیے یار کس آس پر
منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں
دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آ گیا

اب تو کئی دفعہ شام کو جب شعر و شاعری کی مجلس جمتی تو پاکستان اور بنگلہ دیش کے ڈپلومیٹ بھی ہمیں نوازتے۔ بھارت میں موجود پاکستان کے سفیر ڈاکٹر ہمایوں خان سے بھی اسی دور میں ملاقات ہوئی۔ فیض کی اُردو زبان کو ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو بین الاقوامی زبان بنا دیا۔ روس میں ان کے بہت سے مداح تھے جن کو فیض کی شاعری نے زندگی کا ایک اور ہی رُخ دکھایا ہے۔ ایک مرتبہ ہماری ہندی بھاشا

کے چوٹی کے کوی بچن جی ماسکو آئے۔ اس شام تو باقاعدہ مشاعرہ ہوا بڑی رات تک بچن جی نئی اور پرانی کویتائیں سناتے رہے۔ فیض اپنی باری بھی خوبصورتی سے نبھاتے رہے۔ اس دن کا ایک شعر آج بھی دماغ میں گھومتا ہے۔

سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے
ہم نے دل میں سجالئے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے
زہر سے دھولئے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

فیض کے ماسکو کے قیام کے دوران ہی ان کو عالمگیر میگزین لوٹس Lotus کی ایڈیٹری سونپی گئی۔ اس لئے ان کو زیادہ عرصہ بیروت میں ہی رہنا پڑتا تھا۔ اسی اثناء میں ایلس بھی آگئیں۔ بیروت کی غارت گری کا فیض کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔

چاند پھر آج بھی نہیں نکلا
کتنی حسرت تھی ان کے آنے کی

یہ جاننا مشکل ہے کہ فیض چپکے سے مرگئے ہوں گے۔ یقیناً انہوں نے فرشتۂ اجل سے بھی پوچھا ہوگا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

لیکن بات ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ فیض کی شاعری اور سوچ کو نیا موڑ دینے میں محمود الظفر اور رشید جہاں کا بہت ہاتھ تھا۔ انہی دونوں نے ان کو کوئے یار سے نکال کر سوئے دار کا راستہ سمجھایا تھا میں ابھی ماسکو گیا ہی تھا کہ فیض کا پیغام ملا ''رشید جہاں کی قبر پر میری طرف سے بھی پھول چڑھادینا'' دسمبر کی برفیلی سردی میں ہم دونوں میاں بیوی نے ان کی قبر ڈھونڈ نکالی اور وہاں پہنچ کر فیض صاحب اور رشید جہاں یادگاری کمیٹی کی طرف سے ہم نے ہدیہ کے پھول چڑھائے۔

فیض شاعر تو تھے ہی لیکن ایک پیارے دوست اور خوبصورت انسان بھی تھے۔ یہ خلاء کبھی پورا نہ ہوگا۔

☆..........☆☆☆..........☆

''مجیب ہمیں بڑے تپاک سے ملا۔ بغل گیر ہوا۔ کہنے لگا فیض بھائی کچھ لکھیں۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ کہنے لگا فیض بھائی ہمارے بارے میں بھی تو لکھیں۔ ہم نے مجیب سے وعدہ کیا کہ ضرور لکھیں گے اور پھر بھی وہاں کے دورے کی جو مایوسی اور دل شکنی ہم ساتھ لائے تھے وہ نظم ہوگئی:۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

نظم ہم نے جہاز میں لکھی اور پھر دہیں، سب سے پہلے ملک صاحب کو سنائی بعد میں ہم نے مجیب کو بھی بھجوادی تھی۔''

(فیض احمد فیض)

فیض احمد فیض۔۔۔شاعر یا جادوگر

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

فیض احمد فیض کی شاعری اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ، نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ جدید اردو شاعری کے ان بانیوں میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کی دیوی کا پجاری بننے کے بجائے اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فن اور نظریۂ ادب کے بہت سے معرکوں میں اس قدر ثابت قدم رہے ہیں کہ وہ اب محض اپنے رنگ ہی کی وجہ سے مثالی شخصیت نہیں ہیں بلکہ انکی فکر کا فنی رُوپ بھی قابلِ تقلید رُوپ بن چکا ہے۔

فیض نے اپنی منفرد شناخت کیلئے جس رنگ کو بطور خاص کلچر کیا ہے وہ اس قدر سادہ، پراسرار، مؤثر اور پیچیدہ ہے کہ وہ اپنے شعروں میں، ایک جادوگر کی طرح، کسی بھی ایک عنصر کی افراط سے، اور کبھی دوسرے عنصر کی تفریط سے بہت عجیب وغریب کام لے لیتے ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں اور کیا حاصل کر پائے ہیں، ان کے تخلیقی کرب کی نوعیت کیا ہے۔ یہ سب بڑے اہم موضوعات ہیں لیکن فیض کا جواب، نہ ہوتے بھی، بڑی حد تک یہی ہے کہ:

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

فیض نے شاعری کی مشرقی روایت کے ساتھ مغربی روایت کے تجرباتی اور حسیاتی رنگ کی کچھ اس طرح آمیزش کی ہے کہ وہ مغربی اور مشرقی روایت کیلئے بیک وقت قابل قبول ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس دور میں اردو زبان کا سب سے معروف اور مؤثر شاعر کون ہے تو اس کا جواب وہی ہے جو ہم جانتے ہیں۔

جب ''نقشِ فریادی''، ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' کے بعد ''دستِ تہِ سنگ'' شائع ہوا تو بہت سے محبانِ فیض نے اپنے ممدوح سے اظہارِ عقیدت کا یہ طریقہ نکالا "ہاں مجموعہ اچھا ہے لیکن ''نقشِ فریادی'' والی بات کہاں" اگر ساٹھ سالہ شاعر کے چوتھے مجموعہ کا استقبال اس طرح کیا جائے کہ اسے تیس سال پہلے کے مجموعہ کی یاد دلائی جائے تو حساس طبیعت پر کیا کچھ نہ گزرنا چاہئے۔ فیض انگریزی روایت کے بڑے اچھے نباض ہونے کے ناطے کنائیوں اور اشاروں کی زبان کے بڑے اچھے کاریگر بھی ہیں اور پارکھ بھی۔ لیکن ہمارے درمیان ایسے نقادوں کی کمی نہیں ہے جو اس نوع کی ہجوگوئی میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنے غیر معیاری اور ناقص پیمانوں کی مدد سے قدآور شعراء کا قدکم کرتے رہتے ہیں کہ شاید تاریخ ادب میں ان کی نیش عقربی محفوظ ہو جائے۔ کچھ ایسے ادباء بھی ادب دوستی کے فریضہ پر گامزن ہیں جنھوں نے وطن دشمنی اور وطن دوستی کے مابین فرق مٹانے کی ٹھانی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایسی وطن دوستی کو تسلیم کروانا چاہتے ہیں جو وطن کے حق میں نقصان دہ ہے۔ صریحی طور پر نقصان دہ ہے۔ وہ اصل فن اور التباس فن کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دینے پر اس درجہ کمربستہ ہیں کہ شاعری اور ناشاعری کے سارے فرق مٹتے چلے جارہے ہیں۔

لیکن فیض احمد فیض ''دستِ تہِ سنگ'' کے بعد ''سرِ وادیٔ سینا'' (1971) کی جانب اس پامردی کے ساتھ آگے بڑھے کہ ان کا فن' بعض نقادوں کی آرا کے برخلاف گہرا اور

خوبصورت ہوتا چلا گیا۔ جن حضرات نے ''سرِ وادیٔ سینا'' کی اشاعت پر اس وجہ سے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا کہ فیض کی شاعرانہ توانائی مآل کار ختم ہو کر رہ گئی اور پھر ''شام شہر یاراں'' کی اشاعت پر اپنی بدگمانیوں کو مبارک باد دی تھی وہ فیض کے تازہ ترین مجموعہ کلام ''مرے دل مرے مسافر'' کی اشاعت کے بعد فرطِ حیرت سے چکرا گئے اور دیکھا کہ شاعر۔۔بڑا شاعر۔۔ بعض اوقات اس قدر زبردست چھلانگ مارتا ہے کہ وہ اپنے آخری دور کے کلام میں اپنے فن کی ساری بلندیوں کو بیک وقت پیش کر دیتا ہے۔ فیض دو بڑی روایتوں کے طرحدار شاعر ہیں وہ اپنے امیج (Image) سے زیادہ اپنی حقیقت پر نازاں ہیں اور اپنے چاہنے والوں کی بے پناہ چاہت پر گلو گیر بھی کہ فیض کے سامنے بلند نام ہی رہتے ہیں۔ وہ اپنا قد پہچانتے ہیں بڑے بڑے ناموں کا قد بھی۔ وہ تحسین و تعریف میں غلو کے حد درجہ خلاف ہیں۔ ہاں وہ اپنی شاعری، اپنی روایات اور اپنے عوام سے حد درجہ پیار کرتے ہیں اور وہ کسرِ نفسی سے کام نہیں لیتے۔۔۔''سرِ وادیٔ سینا'' کے انتساب کی یہ سطریں گواہ ہیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن۔ جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

فیض کلرکوں، کرم خوردہ دلوں، زبانوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں، ریل بانوں، کارخانوں کے بھوکے جیالوں، بادشاہ جہاں، بلکتے دہقانوں، دکھی ماؤں اور بلکتے بچوں کی قسمت پر آنسو بہاتے ہوئے جب حسیناؤں کی طرف آتے ہیں تو کچھ اور بھی فیاض اور آزردہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ یہ کہنے کا یارا رکھتے ہیں کہ:

ان حسیناؤں کے نام

جن کی آنکھوں کے گل

چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار

کھل کھل کے مرجھا گئے ہیں

ان بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبت ریا کار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں

فیض کی شاعری میں یہی وہ جز رس ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ معاشرے کے تمام خدوخال پر نظر رکھتے ہیں وہ حرکت اور جمود کے اسباب و علل پر تاریخ دان کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ خوشی کی بات پر چہکتے ہیں اور پژمردگی کی نشانیوں پر آزردہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ زندگی کی تفہیم چاہتے ہیں اور تقدیس بھی۔ زندگی کا علم ہی محبت و عمل کا جواز ہے۔ یہ انتساب ہنوز 'نا تمام' ہے۔ اس لئے کہ فیض کے عرفان حقیقت اور حالات کی ستم ظریفیوں میں ملاپ ممکن نہیں ہے۔ یہ انتساب 1971 کے پر آشوب ایام کی یاد دلاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ اس پر ناک بھوں چڑھانا چاہیں تو بے شک وہ حق پر ہوں گے۔ یہ انتساب جس قدر سچا ہے اسی قدر کڑوا بھی۔ لیکن شاعری میں کڑواہٹ اور بدصورتی بھی مباح بلکہ خوبصورت ہو جاتی ہے۔ یہ انتساب فیض کی وطن دوستی کا ایک ایسا مظہر فیکٹریوں، کھیتوں، کھلیانوں، چوراہوں اور دانش گاہوں پر آویزاں ہے۔ یہ مظہر ان حسین لوگوں کی یاد دلاتا رہے گا، جو آنے والے دنوں کے سفیر بن چکے ہیں۔ لیکن دوستی اور دردمندی کی حکایتیں زندہ رہتی ہیں۔ ان سے پناہ ملنی مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتی ہے۔ جب ناصر کاظمی مندرجہ ذیل شعر کہتے ہیں:۔

گلی گلی میری یاد بچھی ہے پیارے رستہ دیکھ کے چل

مجھ سے اگر اتنی وحشت ہے میری حدوں سے دور نکل

تو یہ شعر ناصر کاظمی پر بھی صادق آتا ہے اور فیض پر بھی۔ اچھا شعر کسی ایک کی میراث نہیں ہوتا۔ فیض کی حدوں سے دور نکلنا امر محال ہے۔ وہ بطور شاعر حد درجے کے تکمیلیت پسند (perfectionist) ہیں، وہ شعر کیا کہتے ہیں، حرف و معنی کی دلچسپ شطرنج کھیلتے

ہیں۔ فیض نے جدید اردو زبان میں علاقہ علاقہ کی خوبصورت شاعری پر تخلیقی ردعمل فراہم کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ اپنے حسین وجمیل امیجز (images) کی خوش کن پچی کاری کے باوجود اپنی شعری روایت کے اس درجہ پاسدار ہیں کہ روایت بھی فیض پر بجاطور پر فخر کرے گی فیض وہبی (Oracular) شاعری کے پرچارک نہیں۔ وہ اپنی فکری سطروں میں ایک ایک لفظ اس طرح سجاتے ہیں جیسے زردوزی کی مدد سے اپنی فکر کی تزئین کر رہے ہوں۔ ان کے مزاج میں اس قدر موسیقیت ہے کہ وہ انقلاب کی زبان کیلئے بھی راگ (Symphony) کا سہارا لیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے انقلاب اور شاعری علم موسیقی سے یک گونہ مناسبت رکھتے ہوں۔ فیض حسن ترتیب کے قائل ہیں۔ دو دہائی قبل فیض کی شاعری کے خلاف فنی سطح پر اٹھنے والے طوفان کا مقصد ہی یہ تھا کہ فیض کے اثرات سے باہر نکلا جائے۔ فیض کے خلاف بغاوت کا علم بڑے کروفر سے بلند کیا گیا تھا لیکن نتیجہ وہی نکلا جو متوقع تھا۔ فیض نے جدید اردو شاعری میں جس لہجہ اور فنی پختگی کا سہارا لیا ہے وہ اس درجہ قاتل ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔

"سر وادئ سینا" اور "شام شہر یاراں" کے علاوہ فیض کے اگلے مجموعہ کلام "مرے دل مرے مسافر" کے مشمولات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس صدی کے چوتھے عشرے کے وسط میں "نقش فریادی" سے شروع ہونے والا سفر بلندیوں کی جانب گامزن ہے۔ "شام شہر یاراں" اس سفر میں زیادہ اہم مجموعہ کلام نہ ہوتے ہوئے بھی "مرے دل مرے مسافر" کی موجودہ دور میں تفہیم کیلئے اشد ضروری ہے۔

فیض نے اپنی شاعری میں محبت واخلاص کے جس چمن کی آبیاری کی ہے، وہ ایک مہیم احساس ملال کے باعث زرد پتوں اور درد کی انجمن سے عبارت نظر آتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ بہار سے ناامید ہیں۔ ان کی شاعری میں اس قدر کلوروفل ہے کہ وہ زرد پتوں میں زندگی کی کارفرمائی دیکھ سکتے ہیں۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ بعض حضرات نے طے کر لیا ہو کہ وہ فیض کی شاعری کے اس مسیحائی رخ کی جلوہ آرائی قبول نہیں کریں گے۔ فیض، محبت اور دوستی کے شاعر ہیں۔ انسانی اقدار کی بالادستی کے شاعر ہیں۔

کوئی یار جاں سے گذرا کوئی ہوش سے نہ گذرا
یہ ندیم یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

فیض کی وطن دوستی کا پرچم بین الاقوامیت پر کھلتا ہے، فیض نے عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں متعدد نظمیں کہی ہیں، لیکن وہ مندرجہ ذیل اشعار کے بھی خالق ہیں:

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غمگسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا
ہم ایسے سادہ دلوں کی نیازمندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

کمال یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار کہنے والا شاعر "سر وادئ سینا" کی جانب آتا ہے تو چشم زدن میں طویل فاصلہ طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

پھر برق فروزاں ہے سر وادئ سینا
اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفا کرو اس لوح پہ شاید
مابین من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسم ستم حکمت خاصان زمیں ہے
تائید ستم مصلحت مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرار اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

کیا فلسطینی حریت پسند اور ان کے حامی اس نظم کے شاعر کے نظریاتی اور فنی خلوص سے انکار کر سکتے ہیں؟ فیض احمد فیض اپنی فکری اساس کے ساتھ پوری طرح متحد ہیں شاعری فیض کیلئے مشغلہ ہے نہ مشاعرے لوٹنے کا حربہ۔ یہ ایک سنجیدہ کام ہے۔ جو جام جم بھی ہے اور جام جہاں نما بھی جبھی تو وہ "حذر کرو مرے تن سے" میں کہتے ہیں کہ:

سجے تو کیسے سجے قتل عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا

نظم آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور فیض جلد ہی اس مقام پر آ جاتے ہیں جہاں وہ

اپنے منفرد ہونے کا اعلان اس طرح کرتے ہیں:

حذر کرو میرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ میرا تن وہ چوب صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول

یہ دور فیض کی شاعری کا اہم ترین دور تھا۔ کچھ ادبی بزرگوں کا خیال ہے کہ فیض خود کو دوہرا رہے تھے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں فیض اپنے قارئین کو آہستہ آہستہ اس شاعری کیلئے تیار کر رہے تھے جو موجودہ دور کی شعری بلندیوں سے آنکھیں ملاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے مجموعہ ''شام شہر یاراں'' کی نظم ''امید سحر کی بات سنو'' ملاحظہ فرمایئے:

جگر دریدہ ہوں چاک جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو

امیدِ سحر کی خواہش پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ درست ہے کہ فیض انقلابی شاعر ہونے کا مدعی نہیں ہے۔ وہ اول وآخر شاعر ہے:

کبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، کبھی راحتیں کبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا کوئی شام ہجر کی مدتیں
جو تمہاری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں
مری جان آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

یہ اشعار سراسر روایتی ہیں لیکن شاعر اس درجہ شعوری ہے کہ وہ فنی التزامات کی بھول بھلیوں پر دسترس ہی کو شاعری نہیں سمجھتا۔ وہ اگر امیدِ سحر کی بات کرتا ہے تو:

''جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو''

جیسی دردانگیز سطر بھی لکھ سکتا ہے لیکن یہ سب بسترِ خواب سے جگانے کی کاوشیں ہیں۔

فیض احمد فیض نے وطن اور محبوب کو اس قدر مستقل مزاجی کے ساتھ موضوعِ سخن بنایا ہے کہ وہ ایک کے ساتھ وصل کی حالت میں بھی دوسرے کے ساتھ حالت فراق میں پائے جاتے ہیں۔ یہ فیض کا اپنا تجربہ ہے۔ اگر بعض شعراء کے یہاں مثالی محبت کیلئے قابلِ صدرشک وطن کی شرط نہیں ہے تو اس مسئلہ پر گفتگو بیکار ہے۔ لیکن خوب سے خوب تر کی خواہش پر کیونکر قدغن لگائی جاسکتی ہے اور وہ بھی جمہوری اقدار کے دعوے دار معاشرے میں۔ فیض کی شاعری میں لیلائے وطن ہی موضوعِ سخن ہے۔ وہ محبتوں کا راج چاہتے ہیں وہ محبت جیسے مقدس رشتے کی تقدیس کے لئے ایک ایسی جنت ارضی کا خواب دیکھتے ہیں جہاں کی حسینائیں بے محبت ریاکار جذبات کا شکار نہ ہوں۔ وہ اپنے گلشن سے اس درجہ محبت کرتے ہیں کہ خود گلشن بھی فیض کی شاعری کے پھولوں پر نثار ہے۔ فیض کی مشکل یہ ہے کہ ان کی دروں بین جمال پسندی، معروضی حقائق کی کھردراہٹوں کے ملاپ کے باوجود بے سمت وجودیت کا روپ نہیں دھارتی۔ وہ اپنی شناخت پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے حوالوں کے ساتھ ان کے ہاں حب الوطنی ایک بامعنی احساس کا نام ہے جس کی صداقت معروضی طور پر بھی پرکھی جاسکتی ہے اور لہجے کی گھلاوٹ کے ذریعہ بھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اردو شاعری کے جس دور میں زندہ ہیں وہ فیض کا دور ہے اس کے احساس جمال اور حسنِ تناسب کا دور ہے۔ یہ مستقبل سے باہم پیوست ہونے کا دور ہے۔ وہ فنکار اور معاشرے جو مستقبل کے ساتھ مذاق نہیں کرتے آنے والی نسلوں کیلئے زندگی کا حوصلہ اور رومانس ودیعت کر جاتے ہیں۔

فیض احمد فیض کی شاعری مستقبل آفرینی کے عمل کی شاعری ہے۔ یہ سرتاسر حسن کی شاعری ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جس شعری دور میں زندہ ہیں وہ فیض سے عبارت ہے وہ شاعر کیا ہے، جادوگر ہے۔

فیض لندن میں

مرے دل مرے مسافر

خالد حسن

لندن ہی ایک ایسا شہر ہے جہاں فیض صاحب بار بار آتے ہیں۔ محض ایک مرتبہ انہوں نے دیارِ غیر میں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا جب بھی نگاہ انتخاب لندن پر پڑی۔ یہ 1961ء وغیرہ کی بات ہے لیکن فیض صاحب پھر یہاں سے واپس چلے گئے۔ ان کی نظم۔

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

اس زمانے میں لکھی گئی تھی۔ میں یہ تصور کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نظم لندن کے کسی PUB میں عالم تنہائی میں لکھی گئی۔

لیکن فیض صاحب اور تنہا! موصوف کبھی لندن میں اکیلے نہیں ہوتے آشنا اور نا آشنا بھانت بھانت کے لوگ انہیں گھیرے رہتے ہیں میں آج تک دونوں اقسام کا فرق نہ پہچان سکا کیونکہ فیض صاحب کسی کو اجنبی سمجھتے ہی نہیں۔ اپنے دوستوں، دشمنوں اور اجنبیوں کے لئے ان کی گرمجوشی اور درد مندی لندن کی بارش کی طرح ہے جو سب پر یکساں برستی ہے۔ لندن کے گلی کوچوں سے ان کی شدید جانکاری اور ناموں اور چہروں کو یاد رکھنے کی صلاحیت کی طرح ان کا سنس آف ڈائریکشن بھی خاصا حیران کن ہے۔ لندن ایک لا متناہی شہر ہے خصوصاً اگر آپ اس میں کھو جائیں جو میرے ساتھ بالخصوص اس کے مشرقی اور جنوب مغربی حصوں میں اکثر ہوتا رہا ہے۔ چند سال قبل، فیض صاحب کو کرسٹل پیلس سے آگے ایک صاحب کے گھر پہنچاتے ہوئے میں راستہ بھول گیا نقشے کے مطالعے نے مزید گڑبڑا دیا بحیثیت ایک دیرینہ لندن نواسی کچھ دیر تک تو میں نے ظاہر کیا کہ راستے سے بخوبی واقف ہوں مگر فیض صاحب ذرا بے نیازی سے سامنے کا جائزہ لے کر بولے "ناک کی سیدھ میں نکل جاؤ۔ پھر اس طرف مڑو۔ پھر اُدھر" اور ان کی ہدایت پر چل کر ہم واقعی عین منزل پر جا پہنچے۔

سال گذشتہ موصوف کو بائی گیٹ لے جا رہا تھا دوہری شاہراہ پر پہنچ کر پھر بھٹکا خیال تھا فیض صاحب نے نوٹس نہ کیا ہوگا کہنے لگے۔ "بھئی اگر تم داہنی طرف نہ مڑے تو آکسفورڈ پہنچ جاؤ گے" فیض صاحب اپنے ایام جوانی سے یہاں آتے رہے ہیں میں بہت سے حضرات کو جانتا ہوں جن کی واقفیت اتنی ہونی چاہیے مگر وہ آپ کو نائٹس برج سے ریجنٹ اسٹریٹ تک نہیں پہنچا سکتے۔

اس موسم سرما میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے فیض صاحب کے مانوس لندن کو ان کے لئے بدل کے رکھ دیا۔ شاید وہ اب بار بار یہاں آنا پسند بھی نہ کریں ان کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنا مشکل ہے کہ ایک چہیتا دوست جس کی وجہ سے لندن ان کے لئے اتنا کچھ تھا، ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اس فروری کے ایک یخ بستہ دن محمد افضل اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ فیض ہمیشہ مرحوم کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ محض کچھ عرصہ قبل انہوں نے ماجد علی اور زہرہ نگاہ کے نائٹس برج والے فلیٹ میں قیام کرنا شروع کیا تھا۔ میرا خیال ہے چونکہ محمد افضل کی صحت خراب رہنے لگی تھی فیض صاحب ان پر اپنی میزبانی کا بوجھ نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ پچھلی گرمیوں میں جب وہ کینیڈا گئے الیس افضل کے ہاں ٹھہریں۔ میں افضل سے لاہور

میں واقف نہ تھا کیونکہ وہ میرے زمانے سے قبل پاکستان کو خیر باد کہہ چکے تھے لیکن ان کے متعلق سن رکھا تھا۔ ٹریڈ یونین تحریک میں ان کے بہادرانہ حصہ کی اہمیت سے بھی باخبر تھا ملاقات پر کلبیت آمیز حسِ مزاح کا مالک اکل کھرا شخص پایا، خاموش طبع اور چڑ چڑا۔

میں نے فیض صاحب سے پوچھا...... "بھئی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ دراصل افضل بیچارہ کافی مدت سے بیمار رہنے لگا ہے اس وجہ سے اسے اپنے معمولات میں ردو بدل کرنا پڑا علاج معالجے اور پرہیز وغیرہ کی وجہ سے ذرا جھنجھلاتا ہے، حقیقت میں بہت مختلف انسان ہے پہلے تو بالکل شعلہ جوالہ تھا اور بیحد کمیٹڈ......"

مغربی ممالک میں افضل جیسے متعدد لوگوں سے مل چکا ہوں۔ ایسے اُصول پرست لوگ جو پاکستان کو ایک ترقی پسند اور روشن خیال ملک دیکھنا چاہتے تھے مگر جنہوں نے مایوس ہوکر پردیس میں سکونت اختیار کرلی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی کلبیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ مالی حالات روشن تر ہوتے گئے لیکن کسی نہ کسی طور پر بحیثیت انسان ان کا قد کم ہوگیا۔ افضل بھی انہیں لوگوں میں سے تھے۔ لیکن فیض صاحب سے ان کی دوستی بہت گمبھیر تھی۔ دونوں ایک کمرے میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھ کر بھی ایک دوسرے سے گویا رہ سکتے تھے۔ ایک پرانی اور شدید دوستی ہی اس نوع کی کیمیا کی تخلیق کرسکتی ہے۔

افضل وفات پا چکے تھے فیض صاحب اس وقت لندن ہی میں تھے میں وہاں موجود نہ تھا اس لئے مجھے معلوم نہیں انہوں نے اس صدمے کو کس طرح سہا۔ ایک دوست کا کہنا ہے کہ ٹوٹ سے گئے۔ چپ لگ گئی۔ اسی اُداسی کے عالم میں بیروت واپس گئے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ جب صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے رحلت فرمائی تب بھی فیض صاحب کا یہی حال ہوا تھا۔ ایک عجیب قسم کی خاموشی میں مبتلا ہوگئے تھے، ایسی صابر خاموشی جسے بے پایاں الم جنم دیتا ہے۔ میں نے صوفی صاحب کا تذکرہ چھیڑا۔ ان کا انداز ان کے ساتھ گزاری ہوئی شامیں، ان کی شاعری، ان کا مزاح، ان کا افلاس جس میں انہوں نے ساری عمر گزاری اور جسے انہوں نے ایک درویشانہ صوفیانہ رنگ میں قبول کر لیا تھا۔ صوفی صاحب کے متعلق کہنے کو اتنا کچھ تھا وہ فرداً فرداً ہم سب کے لئے اتنے کچھ تھے۔

بالآخر فیض صاحب نے بات کی، کہنے لگے "ہم لوگ محض عطائی تھے Amateurs صوفی صاحب اُستادِ فن تھے۔ ماسٹر، جب بھی کوئی شک شبہ ہوتا ان کے پاس پہنچتے۔ زبان محاورہ، ڈکشن، Syntax۔ روزمرہ بتانے والے تھے، چلے گئے۔ اب کس کے پاس جایا جائے گا۔"

فیض صاحب جیسا کہ ان کے احباب کو معلوم ہے کبھی "میں" استعمال نہیں کرتے یا تو وہ غیر شخصی "ہم" کہتے تھے انگریزی کا Third person indefinite جو وہ کہہ رہے تھے۔ یا۔ When one was in doubt one would go to him ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کا اپنا استاد دنیا سے اُٹھ گیا جس کے قول فیصل پر وہ اعتماد کرتے تھے اور فن شاعری پر حرف آخر سمجھ کر وہ قبول کرسکتے تھے۔

فیض صاحب لندن پہنچ کر چند لوگوں کو فون کرتے۔ میں انتہائی انکسار کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے میں ریسیور اُٹھاتا ہوں۔ "ہلو؟" میں پوچھتا "بھئی فیض" میں سارے کام کاج چھوڑ کر فیض سے ملنے کے لئے پہنچتا ہوں۔ فیض صاحب سے ملاقات میں جو اعزاز اور سربلندی مضمر ہے مجھے اس پر ہمیشہ سے فخر رہا ہے۔

فیض صاحب بے پایاں خلوص اور محبت کے آدمی ہیں، بغض وعناد اور کینے سے نا آشنا۔ افسانہ نگار اشفاق احمد نے ایک بار ان کو ملنگ صوفی کا لقب دیا تھا۔ ساری عمر جس قدر گالیاں فیض صاحب کو دی گئی ہیں جتنا ان کو بدنام کیا گیا ہے اور جس طرح انہوں نے اس لعنت ملامت کا کبھی جواب نہیں دیا اس کی بنا پر ان کو یقیناً ایک صوفی سلسلے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

فیض صاحب کو خوب معلوم ہے کہ جو

لوگ ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لئے پیش پیش رہتے ہیں وہی ان کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کمینی اور گھٹیا باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے لندن میں مجھ سے فرمایا کہ فیض بحیثیت شاعر گھٹتا چاند ہیں۔ اب ان کے پاس کچھ کہنے کو نہیں رہا اور جو کہہ رہے ہیں بری طرح کہہ رہے ہیں۔ چند روز بعد ہی میں نے ان صاحب کو خوشامدانہ عجز کے ساتھ فیض صاحب کے قدموں میں بیٹھے دیکھا۔ اس شام بی بی سی کی ایک خوشگوار محفل میں مَیں نے فیض صاحب سے اس شخص کی منافقت کا ذکر کیا مسکرا کر بولے "پریشان مت ہو اس قسم کی باتیں میں پچھلے چالیس سال سے سنتا آرہا ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا"

"لیکن آپ کو پتہ ہے ایسے لوگ کس قدر ریاکاری کرتے ہیں؟" میں نے دہرایا چونکہ فیض کسی کو بُرا نہیں کہتے، نہ غیبت میں شامل ہوتے ہیں اس لئے مسکرا کر خاموش رہے۔ فیض صاحب کی بے پناہ قوت برداشت کا مظاہرہ بھی لندن میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک صاحب ہیں متواتر بے تکان بولتے ہیں اور ہر موضوع پر بولتے ہیں جو بات ان کے ذہن میں آجائے اس پر لامتناہی تقریر شروع کریں گے۔ سوویت فارن پالیسی، انگلستان کا بیہودہ موسم، تازہ ترین کامیڈی "No sex please we are British...." کوئی بھی موضوع ہو انہیں بولنے سے غرض۔ ایک روز بی بی سی کلب میں انہوں نے فیض صاحب کو پکڑ لیا۔ دو گھنٹے تک فیض صاحب نے نہایت صبر و استقلال کے ساتھ انہیں جھیلا۔ اسی طرح لندن میں اُردو کے شاعروں سے بھی ان کا پالا پڑتا ہے ایک شاعر نے اپنے مجموعۂ کلام (جو اپنے خرچ سے لندن میں چھپوایا تھا) کے جشن اجرا کی متعدد تقریبیں منعقد کیں۔ یہ حضرت فیض صاحب پر بھی کرم کرتے ہیں اور فیض صاحب نہایت صبر، سکون اور حیرت انگیز اخلاق کے ساتھ ان کا کلام بلاغت نظام سنتے رہتے ہیں۔

فیض صاحب عموماً سیاستدانوں کے مداح نہیں ہیں۔ ان کے متعلق خوش فہمیاں نہیں رکھتے (ان کا خوب تجربہ ہے) لیکن چند ہستیاں مستثنیٰ ہیں۔ میاں افتخار الدین سے ان کا بہت گہرا رابطہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے میاں صاحب نے محسوس کرلیا تھا کہ پاکستان کس سمت جارہا ہے۔ انہوں نے تبھی جدوجہد کی کوشش کی لیکن ایسے لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے، جن کا واحد مقصد ذاتی مفاد، بددیانتی، حصول اقتدار تھا میاں افتخار الدین کی کاوش ناکام رہی۔ اگر پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد آزاد پاکستان پارٹی مسلم لیگ کے ملبے پر استوار کرنے کے مواقع دیے جاتے تو آج ملک کی تاریخ مختلف ہوتی، فیض صاحب سہروردی کے متعلق بڑے پیار سے بات کرتے ہیں۔ میں نے ان کو یاد دلایا کہ سہروردی کے انتقال کے موقع پر ایک مغربی اخبار نے (مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا ہے) لکھا تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کو دو کڑیوں نے ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا تھا ایک حسین شہید سہروردی اور دوسری پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز۔ اخبار نے مزید لکھا کہ پتہ نہیں پی آئی اے دونوں حصوں کو کب تک اکٹھا رکھ سکے گا۔ ممتاز حسن مرحوم کہا کرتے تھے۔ اگر یہ West Wing ہے اور وہ East Wing تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چڑیا کہاں ہے؟

میں نے بھی ان سے پوچھا کہ ان کو اس سوال کا جواب معلوم تھا۔ خاموش رہے۔ فیض صاحب نے ایسا لگتا ہے ساری زندگی دوستیاں استوار رکھنے میں گزاری۔ ایک دفعہ جو ان کے حلقہ احباب میں شامل ہوجاتا اس کے لئے ان کی محبت میں کبھی کمی نہیں آتی۔ لندن میں ایک شام ہمیشہ فیض الحسن چودھری کے ساتھ گزارتے۔ پچھلی مرتبہ جب فیض صاحب کی لڑکیاں بھی لاہور سے آئی ہوئی تھیں فیض الحسن صاحب کے ہاں Ealing میں ایک طویل شام گزاری۔ بیروت میں فیض صاحب کی طبیعت ناساز رہ چکی تھی میڈیکل ٹسٹ ٹھیک نکلے مگر ڈاکٹروں نے شراب اور سگریٹ کا کوٹا مقرر کر دیا چنانچہ فیض الحسن کے ہاں ایلس، سلیمہ اور منیزہ فیض صاحب کی چوکیداری میں مصروف تھیں۔

فیض صاحب بے تحاشا سگریٹ پیتے ہیں۔ جو برانڈ مل جائے۔ تیزی سے چند کش لے کر سگریٹ راکھدانی میں بجھا کر فوراً دوسرا لگا لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ تقریباً غیر شعوری طور پر سگریٹ پیتے ہیں اور اس سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔

لیکن اس شام ایلس، سلیمہ اور منیزہ کی کڑی نگرانی کی وجہ سے موصوف کے اسٹائل میں فرق آ رہا تھا۔ ''ابو بیروت میں خاصے بیمار پڑ گئے تھے'' سلیمہ نے کہا ''بھئی کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی'' فیض صاحب نے جواب دیا وہ اپنے متعلق ہمیشہ اس گول مول غیر واضح انداز سے بات کرتے ہیں گویا کسی اور کا تذکرہ ہو۔

پچھلے جاڑوں میں ماجد علی کے ہاں ایک بقراط فیض صاحب کو بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا یعنی فیض صاحب کا روسیوں پر کتنا گہرا اثر ہے کہنے لگے کہ فیض صاحب کو چاہیے روسیوں سے فرمائیں کہ افغانستان سے واپس چلے آؤ یا Diego Garcia پر بم گرا دو یا اسی قسم کی انٹ شنٹ۔ فیض صاحب نے کہا ''روسی سیاست پر سنجیدہ گفتگو یا سیاسی پیچ محض پارٹی ممبروں تک محدود رکھتے ہیں۔ میں پارٹی ممبر نہیں ہوں۔ کبھی نہیں رہا۔ یہ ان کے لئے بہت اہم چیز ہے۔ اگر آپ برادر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں تو آپ سے ان کا برتاؤ مختلف ہوگا۔ تب آپ ان سے ایک دوسری سطح پر بات کریں گے آپ اسے ان کا Hang-up کہیں یا کچھ اور بہرحال پارٹی ان کے لئے فوقیت رکھتی ہے میری وہ بہت عزت کرتے ہیں، اخلاق سے پیش آتے ہیں کیونکہ میں ایک شاعر ہوں اور لینن پرائز حاصل کر چکا ہوں لیکن سیاسی گفتگو وہ پارٹی ممبروں کے ساتھ ہی کرتے ہیں''۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ فیض صاحب اپنی مرضی سے ماسکو کے چکر لگاتے رہتے ہونگے۔ جواب دیا۔ ''نہیں بھئی روسی بڑے پر تکلف لوگ ہیں اور ان معاملات میں ضابطے کے پابند جب وہ باقاعدہ مدعو کریں تبھی کوئی وہاں جاتا ہے ایسا نہیں کہ آپ ماسکو ایئر پورٹ پر جا اترے اور فون کیا ''او بھائی ساشا۔ میں آ گیا آ کر مجھے پک کر لو لاؤنج میں بیٹھا ہوں''

میں فیض صاحب کو اپنے بچپن سے جانتا ہوں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی وساطت سے۔ تاثیر میرے والد ڈاکٹر نور حسین کشمیری کے پرانے اور گہرے دوست تھے۔ بچپن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ جب فیض صاحب گلمرگ میں ہمارے ہاں آئے تھے۔ اب ہمارے درمیان ایک نوع کا باپ بیٹے کا رشتہ استوار ہو چکا ہے۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں تقسیم کے بعد ہم لوگ سیالکوٹ میں آ بسے جو فیض صاحب سے تعلق خاطر کی ایک اور کڑی ہے۔ یہ شہر فیض صاحب کی رگ و پے میں بسا ہوا ہے۔ یہیں وہ پلے بڑھے، سکول اور کالج گئے۔ وہیں انہوں نے مولوی میر حسن اور مولوی ابراہیم سے قرآن، حدیث اور فقہ کا درس لیا، لندن میں مجھے بتایا کہ مولوی ابراہیم اس وقت ہندوستان کے جید ترین علماء میں سے تھے۔

فیض صاحب نے بچپن میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا اور تقریباً نصف حصہ حفظ کر لیا اب بھی وہ ہمارے آدھے سے زیادہ ملاؤں سے کلام مجید کا بہتر علم رکھتے ہیں اور اس کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔

چند سال قبل وہ سیالکوٹ واپس جانا چاہتے تھے اس شہر کی اندھیری پیچدار، پتھریلی گلیوں کے لئے شدید نوسٹیلجیا ہے، اہل سیالکوٹ اب بھی ان کو اپنا بیٹا گردانتے ہیں، فیض کے لڑکپن کے اِک چہیتے دوست خواجہ فیروز الدین فیض کا چند سال قبل انتقال ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم نے فیض کا نام تک اپنے نام میں شامل کر لیا تھا۔ ویسے سیالکوٹ میں وہ اپنے انگریزی نما انداز اور گورے چٹے رنگ کی وجہ سے فیروز نامی کہلاتے تھے۔ لندن میں ایک بار مجھے فیض صاحب نے بتایا کہ کالج میں ان کا ایک مضمون ایسا عمدہ سمجھا گیا تھا کہ اسے نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور مضمون علمیت سے بھرپور رقم کیا لیکن اسے بہت کم نمبر ملے ان کے انگریز استاد نے کہا ''پہلا مضمون جو تم نے لکھا اور بجنل تھا اس مرتبہ تم نے دوسروں

فیض احمد فیض اور فراز۔
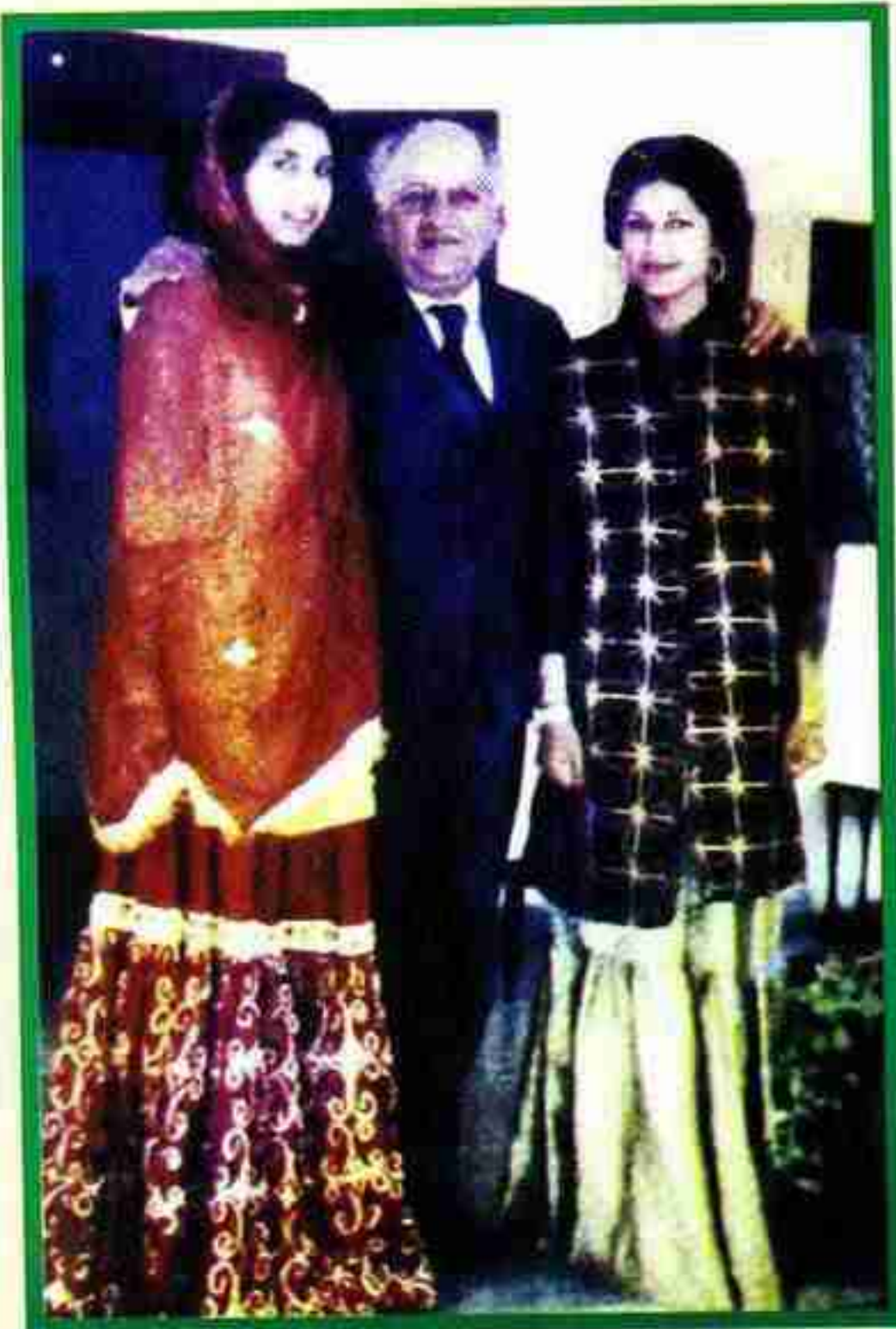
فیض احمد فیض، ثمینہ اور غزالہ سرفراز اقبال کی بیٹیاں

فیض احمد فیض اور سرفراز اقبال۔

جن کا دیں پیروئ کذب و ریا ہے اُن کو ہمت کفر ملے ، جرأتِ تحقیق ملے

جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

کے خیالات دہرادیے ایسا نہ کرو، اور یجبل ذہن و دماغ کے مالک ہو۔ دوسروں کی تقلید نہ کرو۔"

میرا خیال ہے فیض نے کبھی دوسروں کی کہی ہوئی باتیں نہ دہرائیں۔ میں نے اکثر ان سے کہا ہے کہ کلاسیکل اُردو شاعروں کا ایک انتخاب تیار کریں۔ انہوں نے کیا تھا۔ لیکن اس کا مسودہ (نقل موجود نہیں تھی) ایک خاتون لے گئی جو نیویارک میں رہتی تھیں پھر ان محترمہ نے شادی کر لی اور مسودہ گنوا دیا۔ ثابت ہوا کہ شاعری اور شادی ایک دوسرے کو راس نہیں آتے۔

فیض صاحب اقبالؔ کے بہت زبردست معتقد ہیں۔ لیکن زندہ پائندہ اقبالؔ کے۔ اس اقبالؔ کے نہیں جسے قلم فروشوں، بوگس ناقدوں اور خود ساختہ نظریہ پرستوں نے ایک قدیم ڈھانچے میں تبدیل کر دیا ہے۔ فیض صاحب اکثر کہتے ہیں کہ وہ ایک طویل دیباچے کے ساتھ انتخاب اقبالؔ شائع کریں گے۔ ان کا کہنا ہے "اسلام اور دوسرے بنیادی سوالات پر علامہ مرحوم کے اصل نظریات ان کی انگریزی تحریروں میں موجود ہیں غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ان خیالات کو انگریزی میں قلم بند کیا تا کہ وہ رجعت پسندوں کی دسترس سے باہر رہیں۔" گو اب رجعت پسندوں کی اکثریت ہمارے ہاں انگریزی بولتی ہے!

فیض صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ ان کے بچپن میں ان کے والد ان کو انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے سالانہ جلسے میں لے گئے تھے علامہ اقبالؔ بھی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے فیض سے تلاوت قرآن کروائی گئی "میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے ایک اونچی میز پر کھڑا کیا گیا۔ جب میں تلاوت کر چکا تو اقبالؔ نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا تم اچھے ذہین بچے ہو۔ میرے والد کو علامہ مرحوم سے نیاز حاصل تھا۔"

فیض بہت تنہا ہیں۔ انہیں پاکستان بے حد یاد آتا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں دوسرے ملکوں میں انہوں نے جتنے آفر ٹھکرائے ہیں وہ ان سے کمتر انسانوں کو للچا سکتے تھے۔ گزشتہ سال دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی ان کے وزٹنگ پروفیسر شپ قبول کرنے کے لئے مصر رہی انہوں نے مستقل انکار کیا۔ "ہندوستان تھوڑے دنوں کے لئے جانا دوسری بات ہے" انہوں نے مجھ سے کہا "لیکن اس قسم کی پیش کش قبول کرنا ہمیشہ کے لئے خود اختیاری جلاوطنی کے مترادف ہوگا۔"

پچھلے سال ایک روز فیض صاحب نے مجھے فون کیا کہ صبح ان کو پک کراؤں۔ "بھئی کل آجانا۔ ہاں بھئی کوئی گیارہ بجے" وہ ہیروڈز کے قریب ماجد علی کے ہاں مقیم تھے۔ فیض صاحب کو میں نے کبھی شاپنگ کرتے نہیں دیکھا، لندن آئے ہوئے کسی پاکستانی کے لئے کہنا کہ وہ خریداری نہیں کرتا اسے یقیناً نوبل پرائز کا حقدار بنا سکتا ہے۔

میں وقت مقررہ پر پہنچا "چلو پکچر دیکھ آئیں" فیض بولے، میں حیرت زدہ رہ گیا میں نے کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ آپ سینما بھی دیکھتے ہیں۔" آپ سینما عموماً نہیں دیکھتے نا۔ میرا مطلب ہے کہ..." میں نے ہڑبڑا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ بیروت میں کسی اور دلچسپی کے فقدان کی وجہ سے موصوف کو سینما دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

اب ہم گھر سے نکلے مگر ہر جگہ پکچر شروع ہو چکی تھی یا بہت دیر میں شروع ہونے والی تھی، اسی طرح آوارہ گردی کرتے ہم نے خود کو یوسٹن روڈ پر پایا۔ طے کیا کہ کچھ کھایا جائے۔ فیض صاحب بولے وہ ایک جگہ جانتے ہیں جہاں بڑھیا چاٹ، حلوہ پوری اور اصلی پنجابی لسی ملتی ہے۔ چنانچہ ہم لوگ ایک ریسٹوران میں پہنچے کہ نام اس کا "دیوانہ" تھا فیض صاحب نہایت محظوظ ہوئے۔ بھئی واہ کیا نام پایا ہے۔ "دیوانہ!" اور میں نے سوچا کہ اس لفظ "دیوانہ" نے اُردو فارسی شاعری میں کس قدر اودھم مچائی ہے اور یہ آفت جوتنے میں خود فیض صاحب کا کتنا ہاتھ ہے!

فیض صاحب کی معیت میں انسان کو اجنبیوں سے نہایت پرتپاک علیک سلیک کی عادت پڑ جاتی ہے فیض سب سے اس طرح ملتے ہیں گویا برسوں کا یارانہ ہے۔ نام یاد رہے نہ رہے چہرے نہیں بھولتے۔

لندن میں پاکستان کے لئے ان کا

نوسٹلجیا زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ، ریسٹوران، پرانے ایریل نالے۔ پاکستان خصوصاً لاہور کے نوسٹلجیا کے ارتفاع کی خاطر ایسی جگہوں پر جاتے ہیں جو بقول بی بی سی والے اطہر علی ''خالص مزنگ'' کی ہیں مشرقی لندن کا ''لاہور کباب ہاؤس'' اسی قسم کا ایک ''مزنگ'' ہے ماسکو میں ان کی سترویں سالگرہ منائی جانے والی تھی وہاں جاتے ہوئے لندن میں رُکے تو فرمائش کی، ''لاہور کباب ہاؤس'' چلو۔

مشرقی لندن میں میرے دوست رہتے ہیں۔ ڈار اور دُرّانی، ڈار سیالکوٹ کا ایک لمبا تڑنگا خوبصورت کشمیری ہول سیل گارمنٹ ٹریڈ مین ہے۔ اپنے محلے کا دادا بھی ہے اور فیض بھگت بھی، میں نے فون کیا۔ رات گئے پہنچے مگر ڈار نے ''لاہور کباب ہاؤس'' کھلوا دیا۔ بالکل لاہور کا سا لطف آ گیا بس اس کی کسر تھی کہ لاہور میں ہوتے تو باہر نکل کر مولا بخش سے ایک ایک بنارسی پان بنوا کر کھاتے۔

اس سے قبل درانی، کہ پوستین اور چرمی ملبوسات کا تاجر ہے ہم کو ایسٹ لندن کے مشہورے خانے Jack the Ripper میں لے گیا تھا۔ یہ علاقہ جیک کے زمانے سے اب تک زیادہ نہیں بدلا ہے۔ اندرون اخبارات کے عکس آویزاں ہیں جن میں مسٹر جیک کی سرجنوں جیسی مہارت کے کارناموں کی خبریں شائع ہوئی تھیں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ یہ دیوانہ قاتل کون تھا کیونکہ وہ کبھی پکڑا نہ جا سکا لیکن اہل ایسٹ لندن نے اسے یاد رکھا ہے۔ ہم نے اس کے نام کا جام پیا اور فیض صاحب نے اس نامور جنٹلمین کے نام کی تختی، کارناموں کی تفصیلات اور چیزیں ملاحظہ کیں۔ ہم سب متفق تھے کہ بہر حال وہ جنٹلمین ضرور تھا اور خطاب یافتہ! برطانوی اپر کلاس زندہ باد!!

''انجیل میں جو عمر طبعی لکھی ہے آپ اس کو پہنچ چکے'' میں نے کہا (فیض اپنی سترویں سالگرہ سے چند ہفتے قبل لندن آئے تھے) کسی نے دریافت کیا وہ خوش رو نوجوان خاتون کون تھیں جن کے ساتھ کل آپ لنچ نوش جاں کر رہے تھے۔

''اس سے قبل کہ اس خاتون کا اتہ پتہ بتاؤں آپ حضرات کو آگاہ کرتا ہوں کہ میں اس شعبے سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔'' کسی نے ان کے اعلان پر کان نہ دھرا۔ عورتوں کو فیض صاحب نے ہمیشہ مسحور کیا۔ میاں بیوی بدر اور نسرین کے ہاں قیام کرتے ہیں سلیم شاہد بھی برمنگھم میں موجود ہیں (پتہ نہیں کتنوں کو حفیظ ہوشیار پوری مرحوم کی وہ غزل یاد ہے جو کہا جاتا ہے کہ سلیم شاہد یا رضی ترمذی یا دونوں نے انسپائر کی تھی یا ان کے نام معنون کی گئی تھی) ضیاء محی الدین مع ناہید اسی شہر میں ہے اور ٹیلی ویژن پر اپنا شو Here and now پیش کرتا ہے۔ اس بار میں نے فیض صاحب کو برمنگھم لے جانے کی پیشکش کی بولے۔ ''آکسفورڈ کے راستے چلیں وہاں ایک ہمدم دیرینہ کو بھی دیکھ لیں گے۔ میں ہمیشہ ان سے ملنے کا ارادہ کرتا رہا ہوں''

گیارہ بجے صبح لندن سے چلے برفباری شروع ہو گئی اور میری کار میں اسنو ٹائرز نہ تھے۔ سفر خاصا دشوار گزار تھا مگر فیض صاحب نے پرواہ نہ کی (ایلس نے ایک بار بتایا کہ ایک رات بیروت میں ان کے پڑوس کے مکان میں بم پھٹا فیض جاگے نظر دوڑا کر دیکھا کہ کمرے صحیح وسالم ہیں اور فوراً پھر سو گئے)

آکسفورڈ کے اس پریشان کن راستے میں میں نے تاج ملتانی کی گائی ہوئی خواجہ فرید کی کافیاں کیسیٹ پلیر میں لگا دیں ہم کافیاں سنتے رہے اور برف گرا کی۔ اچانک فیض صاحب نے کہا ''یہ اعلیٰ درجے کی شاعری ہے''۔ جی ہاں اس میں ایک مصرع ہے ''عشق ہے ای سدا بہار'' میں نے کہا۔

فیض بہت متاثر تھے میں نے ٹیپ دوبارہ لگایا۔ ''غور سے سنو'' فیض صاحب نے کہا ''تم کو پتہ چلے گا کہ پنجاب کے اس عظیم شاعر نے عربی اور فارسی الفاظ کس افراط سے استعمال کیے ہیں، اس نکتے کو نجم حسین سید قسم کے لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں اور پنجابی زبان کی تطہیر پر مصر ہیں ان کو ان استادوں کا کلام پڑھنا چاہیے''

میں نے کہا۔ ''خواجہ فرید نے اپنی ایک کافی میں ایک انگریزی لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ ڈکھاں دی اپیل اے......'' ''یہی تو

بات ہے ساری"۔ فیض نے جواب دیا "شاعر کے لئے اہم ترین شے شاعری ہے وہ نہ گرامر کا ماہر ہے نہ فرہنگ نویس ہے۔ زبان اس کے لئے اوزار ہے، ایک مصالحہ جسے وہ اپنی تخلیق کے لئے استعمال میں لاتا ہے زبان اس کے زیر نگیں ہے وہ زبان کا غلام نہیں۔

ہم صحیح وسالم آکسفورڈ پہنچے۔ خواجہ فرید نے برف کے جھکڑ میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ منظر اور ماحول ان کے ان تپتے ریگستانوں سے اتنا مختلف تھا جہاں انہوں نے اتنی شدت احساس اور آب وتاب والی شاعری تخلیق کی تھی۔ ہم حبیب فیض کا مکان تلاش کر کے وہاں پہنچے وہ ایک معمر خاتون نکلیں جو دوران جنگ دلی میں رہ چکی تھیں برطانوی مصنف گائی ونٹ Guywint سے شادی کر لی تھی شوہر کا چند سال قبل انتقال ہو گیا ان کی لڑکی اندرا جوشی مشہور ایکٹرس ہے۔

مسز ونٹ بہت دلپذیر خاتون ہیں بدھ مذہب اختیار کر چکی ہیں۔ آکسفورڈ میں بدھ ازم اور مذہب کے تقابلی مطالعے کے مضامین پڑھاتی ہیں۔ گیان دھیان کی ماہر ہیں۔ وہ اور فیض صاحب پرانے وقتوں کی باتیں کرتے رہے۔ ڈبل روٹی اور پنیر کھایا "مسز ونٹ جوانی میں حسین رہی ہونگی۔ میں نے کہا۔

"ہاں تھیں" فیض صاحب نے بعد میں بتایا "جوانی میں خاصا تہلکہ مچا رکھا تھا"

برمنگھم میں بھی فیض صاحب کا قبیلہ زوروں میں جا رہا تھا آمد کی خبر پھیلی اور یار لوگوں کا تانتا بندھ گیا OPEC کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا مگر فیض صاحب کا فیضانِ محبت عام اور لامتناہی ہے۔ سترویں سالگرہ سے ذرا قبل میں نے اور اطہر علی نے فیض صاحب کے ساتھ ایک بڑی جذباتی شام گزاری، ہم نائیٹس برج کے ایک شراب خانے Turk's Head میں گئے۔ وہ بڑا آرام دہ PUB ہے جہاں جاڑوں میں آتشدان میں آج بھی لکڑی کے کندے جلائے جاتے ہیں۔ اس شام فیض صاحب کی شدید آرزو تھی کہ کاش وہ اس وقت لاہور میں ہوتے "چڑیاں کیا کہتی ہیں؟" اطہر علی نے پوچھا "جو کہتی ہیں زیادہ کارآمد نہیں۔ کہتی ہیں جو آپ کی اصل مرضی ہو وہی کیجئے"

شام گزرتی گئی۔ فیض صاحب لاہور کو نہ بھول سکے۔ "وہاں سب میرے دوست ہیں" عبداللہ ملک اور حمید اختر اور مظہر علی خان اور طاہرہ اور سید واجد علی کا تذکرہ کرتے رہے (واجد علی نے ایک مرتبہ عابد علی کی مدد سے فیض صاحب کو "اعزازی شیعہ" بنا دیا تھا کربلا گامے شاہ لے جا کر فیض صاحب کے اپنے تصنیف کردہ نہایت زوردار مرثیے پڑھوائے تھے)۔ اور بہت سا لاہور ان کی ہڈیوں میں رچا ہوا ہے وہ ہمیشہ ان کے لئے ان کا روشنیوں کا شہر تھا اور رہیگا۔

میں نے کہا۔ "آپ کو احساس ہے لوگ آپ کو کتنا چاہتے ہیں۔ آپ یعنی فیض ایک شاعر نہیں ہیں اس سے کہیں زیادہ بہت کچھ ہیں"

شام گہری ہو رہی تھی اور ہم اداس ہوتے جا رہے تھے اور تب میں نے دیکھا فیض صاحب کی آنکھیں نم ہوئیں اور ان کی آواز بدل گئی۔

"اچھا" انہوں نے ذرا دقت سے کہا "پتہ نہیں لوگوں کی محبت میرے حصے میں اتنی کیوں آئی ہے"۔

"One is only a poet after all"

ہم خاموش رہے۔ فیض صاحب لاہور نہیں گئے ماسکو میں ان کا جنم دن منایا گیا۔ بیروت میں ان کے جشن سالگرہ کا انتظام یاسر عرفات نے کیا لیکن وہ لاہور جانا چاہتے تھے پھر معلوم کر کے بے حد متاثر ہوئے کہ پاکستان خصوصاً لاہور میں ان کا جشن سالگرہ منایا گیا تھا۔

مجھے انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"It is not that one has no fight left. It is only that I am not as young as I once was, and it is difficult to take physical punishment when you are older. The soul is willing but the body is not"

آزادی، مساوات، انصاف اور

انسانیت کے لئے فیض صاحب کی شدید وابستگی کا شعلہ ہمیشہ بیحد تابناک رہا ہے۔ وہ ہمیشہ کے مرد مجاہد ہیں لیکن ہر شخص کا جدوجہد کا طریقہ مختلف ہے چند Hack شاعروں کی طرح ہر موقع کے لحاظ سے ''ملی موسیقی'' کی دھنوں پر کھٹ سے ترانے لکھ ڈالنا اگر شاعری اور حب الوطنی ہے تو فیض صاحب نہ محب وطن ہیں نہ شاعر۔ لیکن فیض احمد فیض سے زیادہ گہرے سوز و گداز اور دیش بھگتی اور رجائیت سے شرابور شاعری کس نے کی ہے؟ اور 1965ء کی لڑائی کے بارے میں انکا گیت ''اٹھو اب ماٹی سے اب اٹھو جاگو میرے لال'' تو ایک شاہکار ہے۔

اس وقت شاعر اور انسان فیض احمد فیض کے دفاع کا موقع نہیں ہے۔ ان کو دفاع کی ضرورت نہیں اور شاعر فیض کو انسان فیض سے جدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن ڈاکٹر ایوب مرزا نے یہی کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فیض احمد فیض دراصل انقلابی نہیں ہیں۔ محض ایک شاعر ہیں اور ان کے چند Committed دوستوں نے جن کو وہ ''نہ'' نہیں کہہ سکتے تھے، ہر حکومت کے دور میں کسی نہ کسی قضیے میں پھنسوا دیا۔ ڈاکٹر مرزا کی فیض صاحب سے انسیت سے قطع نظر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب فیض احمد فیض کے فلسفہ حیات ہی سے لاعلم ہیں کیونکہ فیض صاحب کی شاعری اور جس طور سے انہوں نے زندگی گزاری ہے۔ ان دونوں چیزوں میں حد فاصل کھینچنا ناممکن ہے۔

''واپسی پر جہاز میں میرے ساتھ آغا شاہی بھی تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ فائنل بات کیا ہوئی۔ آغا شاہی نے بتایا کہ کوئی کیمونیکے جاری نہیں ہوا۔ Entire onus is on Mujib۔ معاملہ صاف تھا کہ کسی مسئلے پر Agreement نہیں ہوا۔ بھٹو کہتے رہے جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ میری حکومت سے نہیں ہوئیں Let us forget مگر مجیب کی ایک ہی رٹ تھی جو ہم کہتے ہیں وہ مان لو ورنہ گھر جاؤ۔ ہمارا خیال تھا کہ بات پہلے سے صاف ہو چکی ہے اور Simla Agreement کی طرح کا کوئی معاملہ ہو جائے گا وہ چاہتا تھا کہ اسی مرحلہ پر تمام لین دین طے ہو تو تعلقات بحال کرنے کی بات آگے بڑھائے۔ بھٹو صاحب نے کہا ایسا نہیں ہوا کرتا۔ ایک متفقہ مشترکہ کمیٹی تشکیل دے لیتے ہیں۔ یہ کمیٹی تمام حساب کتاب کی چھان بین کرے گی اور پھر جس کا جتنا نکلتا ہے وہ دے دیا جائے اور سر دست تعلقات بحال کر لئے جائیں۔ سفارتی تعلقات کی بھی ابتداء کر دی جائے۔ مجیب نہیں مانا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ پہلے حساب بعد میں تعلقات۔ اس پر بھٹو صاحب نہیں مانے۔''

(فیض احمد فیض)

فیض......ایک نثر نگار

سحر انصاری

شاعری کی طرح فیض کی نثر بھی کیت میں زیادہ نہیں ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''میزان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شعری مجموعوں کے دیباچے اور چند اُردو مضامین ہیں جو فیض نے اپنے دورۂ انگلستان و یورپ کے دوران پاکستان کے بعض روزناموں اور ہفت روزوں کے لئے سُپرد قلم کئے تھے۔ یہ مضامین مختصر ہیں لیکن تنوع کے اعتبار سے تقریباً تمام اہم موضوعات پر محیط ہیں۔ ان مضامین میں فکر اور اسلوب کے وہ تمام تر اجزا موجود ہیں جن کی روشنی میں فیض کی شخصیت اور مسائل کی جانب ان کی توجہ کے براہِ راست زاویے نظر آتے ہیں۔ فیض نے ''میزان'' کے دیباچے میں چند سطریں لکھ کر ان مضامین کی نوعیت واضح کر دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور اس میں تخاطب علماء سے نہیں بلکہ عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فیض کے ان مضامین میں رسمی اور روایتی تنقید کا انداز نہیں ملتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں سے بیشتر مضامین ان کی جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔ یہ اس لئے وقیع اور اہم ہیں کہ بنیادی طور پر فیض کو ''ان تنقیدی عقائد سے اب بھی اتفاق ہے''۔ دراصل یہ مضامین ایک ذمہ دار اور سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے بہت سارے مسائل اُبھرتے ہیں۔ جس کا منصب، شعر گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنا بھی ہے اور شاعر کے قلم سے نثر غالباً اسی صورت میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ فرما ہوتی ہے جب وہ اپنے بعض خیالات کو نظم میں من و عن پیش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ تخیل اور تعقل سے آراستہ اور ایجاز و اختصار کے پیراہن میں ملبوس نظر آنے والے اشعار جب فکر و عمل اور مسائل کے ہجوم کو دیکھ کر اظہار کے لئے وسعت بیاں کے طالب ہوتے ہیں تو تحریر کی وہ صنف معرض وجود میں آتی ہے جسے یونان میں ''حرف برہنہ'' کہا جاتا تھا۔ وہ ساری قطعیت اور معروضیت اس حرف برہنہ میں سمٹ آتی ہے جسے شعر کی حجاب اندر حجاب معنویت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

فیض کے نثری مضامین کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک کامیاب نثر نگار کی طرح کسی موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا ہے۔ اپنے ذہن میں جزئیات اور تمام باریک سے باریک تفصیلات کو مرتب کیا ہے اور اس کے بعد خیال کو تحریر کے میکانکی عمل سے گزارا ہے۔ انفرادی زاویوں کو اُجاگر کرنے کے لئے فیض کو اپنے ذہن کے عکس بین کے سینکڑوں زاویے بدلنے پڑے ہوں گے تا آنکہ خیالات کے رنگ برنگے شیشے کے ٹکڑوں کی ایک ایسی انوکھی، فطری اور بیساختہ ترتیب عمل میں آگئی کہ اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آپ سرسری نہیں گزر سکتے۔ اس عمل کے بعد معرضِ تحریر میں آنے والی نثر میں مصنف کے خیال کی رو الفاظ اور آپ کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ خود کو خیال

کے تمام نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔تحریر میں یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ کے بجائے خیال کی اہمیت کو محسوس کر کے موضوع کی اچھی طرح تطہیر کر لی گئی ہو۔فیضؔ اس عمل کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے خیال کے مسئلے پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور اس کو وہ تحریر کی اثر آفرینی اور بے ساختگی کا بنیادی عنصر سمجھتے ہیں۔خیال اور تشبیہہ واستعارے کی وضاحت انہوں نے یوں کی ہے کہ "شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اس کا مضمون یا خیال ہے۔اور اگر یہ منزل بالکل تجرید ہے تو راستے کی رنگینی اسے دلفریب نہیں بنا سکتی، پس تشبیہہ واستعارہ شعر یا ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں"۔

تحریر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آسان الفاظ استعمال کرنے سے تحریر قابلِ فہم اور سلیس ہو جاتی ہے۔یہ نظریہ دراصل حقیقت سے بہت دور ہے آج کل یہ رجحان عام ہے کہ بیشتر فارسی یا عربی کے الفاظ پر مشتمل عبارت کو مشکل اور گنجلک سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ خود فیضؔ کے الفاظ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ "جہاں کوئی فارسی ترکیب آئی تحریر میں پیچیدگی پیدا ہو گئی اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ہندی بھاشا میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے بہت سلیس ہے اور فارسی میں تو گویا خاقانی اور بیدلؔ کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا"۔فیضؔ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بنیادی چیز خیال کی صفائی ہے۔عبارت مغلق اور پیچیدہ، بے لطف اور سپاٹ اسی صورت ہوتی ہے جب لکھنے والے کے ذہن میں خیال اُلجھا ہوا ہو۔تحریر کی روانی کے بارے میں فیضؔ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ روانی "معانی کی موزوں نشست کا مسئلہ ہے، الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیدائش نہیں، ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے" اب اس پورے مؤقف کی تفصیل جاننے کے لئے یہ عبارت پیشِ نظر رکھئے اس میں آپ کو ایک نثر نگار کا سوچتا ہوا ذہن ملے گا۔جسے اپنے قاری تک واقعی کچھ پہنچانا ہے اور جس نے ان خیالات کے نشیب وفراز کا فشار برداشت کیا ہے جو ایک قدرتی چشمے کی طرح سطحِ سنگ کو توڑ کر باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہے:

"اگر خیال لکھنے والے کے ذہن میں صاف ہے اور اس نے اسے سہولت سے آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی تحریر میں فارسی کے بجائے لاطینی تراکیب ہوں تو بھی ہم اسے سلیس ہی کہیں گے، البتہ امکان یہ ہے کہ اگر الفاظ زیادہ مانوس ہوں تو مضمون زیادہ آسانی سے ہم تک پہنچے گا۔۔۔لیکن یہ امکان ہے، شرط نہیں ہے، سلاست اور روانی کے متعلق ہمارے تنقیدی خیال میں نقص یہ ہے کہ ہم نے مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا ہے"۔

فیضؔ مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر کی حیثیت سے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اس لئے ایک اچھے نثر نگار کی طرح ان کی تحریر میں ثقیل الفاظ، قطعیت، معروضیت اور تخلیقی تصرف بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک جگہ موضوع اور طرز ادا پر بحث کرتے ہوئے الفاظ اور معانی کی نسبت سے انہوں نے خیال اور موضوع کی اہمیت ظاہر کی ہے۔"اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا اصل میں ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ان میں دوئی کا تصرف غلط ہے، الفاظ اور ان کے معانی الگ الگ اور یکے بعد دیگرے نہیں، ایک ساتھ اور بیک وقت ہم تک پہنچتے ہیں۔اگر کسی کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ہے تو اس کا طرز بیان کیا کرے گا اور اگر اسے بیان پر قدرت نہیں تو ہمیں یہ کھوج کیسے ملے گا کہ حضرت کیا کہنا چاہتے تھے"۔

فیضؔ نے اپنے مضامین میں ہر جگہ یہی کوشش کی ہے کہ موضوع کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعہ ان حضرات تک پہنچا دیں جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں۔اس کوشش میں ان کا انداز بندھے ٹکے اُصولوں کا پابند نہیں ہے۔

فیضؔ نے نثر میں اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا پورا کام لیا ہے۔لیکن نثر "شعری نثر" ہونے کے بجائے معروضی اور تخلیقی نثر ہے۔اُصولوں اور مسائل کی بحثوں میں بھی انہوں نے اپنا جمالیاتی شعور برقرار رکھا ہے۔ویسے بھی عام طور پر بعض اہم ناقدوں اور نثر نگاروں کی رائے ہے کہ ایک اچھا شاعر ہی اچھی نثر اور اچھی

تنقید لکھ سکتا ہے۔ تعصب اور جانبداری کو بالائے طاق رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات خاصی واضح ہے، دراصل وجدان اور منطق، تخیل اور تعقل، جذبے اور تجربے، مشاہدے اور محاکے کے تمام نشیب وفراز کا ایک تخلیقی ذہن کو غیر تخلیقی ذہن کے مقابلے میں زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔

کولرج، میتھیو آرنلڈ اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ سے قطع نظر خود اُردو میں غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ اور اقبالؔ سے لے کر خورشید الاسلام، آل احمد سرور، میراجی، عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی اور جون ایلیا نے نثر کے جمالیاتی اور تخلیقی ادب کو اپنے اپنے انداز میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(اُردو میں "خوبصورت نثر" کی ایک شاندار مثال محمد حسین آزاد، مہدی الافادی، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کی تحریریں ہیں۔ لیکن ان حضرات نے نوک پلک سے درست انشا پردازی اور زبان کے ظاہری رنگ وروپ پر اس قدر توجہ دی ہے کہ معروضیت اور قطعیت مفقود ہو کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے ان حضرات کو "رومانی نثر نگار" کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کسی کی گپ پر وحی کا گمان ہونا، ممکن ہے تحریر کا کوئی خاص وصف ہو لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے اس میں وحی کو وحی اور گپ کو گپ ہی معلوم ہونا چاہئے)

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ فیضؔ نے نثر لکھتے وقت تخلیقی ذہانت سے پورا کام لیا ہے۔ وجدان سے خیال اور الفاظ تک ایک تخلیقی ذہن کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تصویر فیضؔ نے کمال خوبی سے پیش کی ہے اور اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی ذہن میں ہم کیوں امتیاز کرتے ہیں۔ اگر کسی غیر تخلیقی ذہن سے یا ایسے تخلیقی ذہن سے جس نے خود اپنی اقلیم فن کا سفر بھی مکمل نہ کیا ہو، دریافت کیا جائے کہ خیال اور جذبہ اپنی تجریدی نوعیت سے گزر کر مخصوص الفاظ کے قالب میں منتقل ہو کر دوبارہ اثر انگیزی کی منزل تک پہنچنے میں کن کن مراحل سے گزرتا ہے تو شاید وہ اس کا یہ جواب دے کہ تخلیقی عمل کا تجزیہ ناممکن ہے۔ وجدانی طریق کار کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر خیال اپنی ایک تصویر رکھتا ہے جو لفظ، رنگ یا خطوط کی صورت میں کاغذ، کینوس یا پتھر پر منتقل ہو جاتا ہے۔

بعض سنجیدہ فکر شاعروں نے خیال اور جذبے بلکہ خود تخلیقی عمل کی بہت مؤثر انداز میں تصویر کشی کی ہے اور تجرید کو تجسیم کی منزل پر لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک ایسی ہی کامیاب کوشش فیضؔ کی ایک تحریر میں ملتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے انہوں نے تخیل کی وضاحت کی ہے کہ "تخیل بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے خواہ فن کی صورت میں اس کا اظہار ہو یا نہ ہو۔ اس عمل کو ہم تخلیقی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے توسط سے جو ذہنی تجربہ مرتب ہوتا ہے اس کی صورت اور ماہیت اسی عمل سے ایجاد ہوتی ہے اور خارجی یا داخلی دنیا میں اس کی اور کوئی نظیر نہیں ملتی"۔۔۔ "تخیل کسی مخصوص مشاہدے، یاد، تصور یا جذبے کا سا منفرد اور الگ تھلگ ذہنی عمل نہیں ہوتا بلکہ ان سب سے مرکب ایک کیفیت ہے جو ان سب اجزا میں شامل اور جس میں یہ سب اجزا شامل ہوتے ہیں"

اس نظری بحث کی مزید تفہیم کی غرض سے فیضؔ نے مصحفیؔ کا ایک شعر منتخب کیا ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے خاص اسلوب میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا!

جرس، غنچہ، صدا، نسیم، قافلہ، بہار اپنی فطری اور حقیقی صورت میں شاعر کے مشاہدے سے متعلق ہیں۔ شاعر کے ذہن میں ان کے تصور کا وجود اس کی یادداشت سے وابستہ ہے، بہار کے حسن اور پائیداری سے شیفتگی اور سرمستی کی تلقین میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج ہے، الفاظ کا انتخاب نشست اور صوتی ترتیب شاعر کی صناعت اور فنی اکتساب کا اظہار ہیں لیکن ان میں سے کوئی جزو بھی بجائے خود مصحفیؔ کا شعر نہیں ہے۔ وہ عمل جس سے شاعر نے غنچے کو جرس، غنچے کے چٹکنے کو اس جرس کی صدا تختۂ گل کو چھٹتا ہوا قافلہ اور چلتی ہوا کو مسافر بنا کر یہ کارواں اپنی منزل کو روانہ کیا ہے۔ تخیل ہی کا عمل ہے، اس

عمل سے پہلے غنچے اور جرس کے تصورات یا (Images) میں رشتہ پیدا ہوا۔ اس رشتے سے غنچے کے چٹکنے سے جرس کی صدا کا ناتا بندھا، ایسے بہت سے غنچے مل کر نوبہار بنے۔ جرس اور غنچے کے تخیلی رشتے کی ایک بڑی کڑی اس بہار سے جا ملی اور اسے قافلہ بنا دیا اور پھر یہی زنجیر نسیم کو مسافر کے پیکر میں کشاں کشاں ساتھ کھینچ لائی۔ شاعر کے تخیل نے پہلے اپنے مشاہدے اور یادداشت سے یہ سب تصورات چھانٹ کر الگ کئے، پھر ان میں ایسے معانی ایجاد کئے جن کا عالمِ موجودات میں کوئی وجود نہیں، اس شیرازہ بندی کے بعد ایک نیا مجموعہ مرتب کیا اور اس کے گرد و پیش ان جذبات کی فضا قائم کی، جو مشاہدے اور یادداشت نے نجانے کب سے ان تصورات سے وابستہ کر رکھی تھی، تب کہیں جا کر ان سب عناصر اور ان کے مجموعے کو وہ الفاظ نصیب ہوئے جو مصحفی کا شعر ہے۔"

تخلیق اور تخیل کے رشتوں کی وضاحت سے قطع نظر اس طویل اقتباس میں فیض کی کئی حیثیتیں سامنے آئی ہیں۔ قاری، شاعر، مفکر اور نثر نگار۔ ان سب کی ایک مخصوص سطح ہے اور ان سب کی آمیزش اور فیض کی شخصیت کے پرتو سے پیدا ہونے والی چیز وہ عبارت ہے جس میں تخلیقی مطالعے کا عکس اور تخلیقی نثر نگاری کا عنصر منفرد انداز میں کارفرما نظر آتا ہے۔

ادب کی نظری اور عملی تنقید پر بھی فیض نے غور و خوض کیا ہے۔ ان موضوعات پر انہوں نے ایک خاص انداز سے قلم اُٹھایا ہے اور ایسی باتیں پیش کی ہیں جو پیشہ ور ناقدین کی تحریروں کے مطالعہ یا اُردو تنقید کے مزاج پر غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہماری زبان میں تنقید کے اُصول کس طرح مرتب کئے جاتے ہیں۔ الفاظ اصطلاحات اور محاکے کا کیا انداز ہے۔ کیا ہماری مروّجہ تنقید سے تنقید کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور اس طرح کے بہت سے سوالات خود فیض نے اپنے مضامین میں ان سے کئے ہیں اور اپنے ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے ان کے جواب بھی دیئے ہیں اس طرح ان کے تنقیدی مضامین میں خود ان کے تنقیدی نظریات بھی سامنے آگئے ہیں جن کے بارے میں فیض کا کہنا ہے کہ "ان تنقیدی عقائد سے مجھے اب بھی اتفاق ہے"

فیض نے "ہماری تنقیدی اصطلاحات" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے۔

"ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسب ضرورت تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتیں۔ یہ زبان کے عجز پہ طعن نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی لغت موجود ہی نہیں۔ یا اس میں ایسے الفاظ کی کمی ہے کہ جو مختلف تنقیدی تصورات کو ادا کر سکیں، اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اختلاف اور ابہام موجود ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہوگئی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کی فنی یا قدری اہمیت بہت واضح نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ پرکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و معائب ہیں بھی یا نہیں اگر ہیں تو کیوں ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے، خلوص ہے، جدت ہے وغیرہ وغیرہ تو نہ اس سے شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور نہ اس کے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے"

یہ بات ہماری زبان کے بیشتر تنقیدی مضامین پر صادق آتی ہے۔ کسی ایک لفظ یا اصطلاح کا مفہوم ہماری تنقید میں متعین نہیں ہے۔ چند ایک جدت طراز نقاد دو چار اصطلاحیں سب سے ہٹ کر ایجاد کرتے ہیں تو بقیہ حضرات اپنے بے شمار مضامین میں جا و بے جا طور پر انہیں استعمال کر کے ان کی اہمیت اور اثر آفرینی کی قوّت کو کم کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فیض نے تنقیدی مضامین میں مروجہ تنقیدی اصطلاحوں اور مسائل پر قلم اُٹھاتے ہوئے سیاسی اور سماجی اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ یہی خوبی فیض کی گفتگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے مؤقف کی وضاحت کے لئے سرمایہ داری

نظام، جاگیرداری نظام، استحصال، پرولتاری، بورژوائی، آمریت، فاشسیت وغیرہ قسم کی پٹی پٹائی فرسودہ اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے ہیں چنانچہ علمی موعظت کے بے روح اظہار کے بجائے روزمرہ زندگی سے الفاظ اور اصطلاحیں اخذ کرکے اپنی بات کو زیادہ مؤثر بنانے کے فن سے فیضؔ بخوبی واقف ہیں، اس لئے ان کی تحریر مؤثر اور شارع عام سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مشینی انداز گفتگو کے بجائے ان کی تحریر اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہ راست الفاظ ہوتے ہیں جن میں زندگی، حرارت اور توانائی اور روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوتا جاتا ہے کہ ایک نظریے اور ایک مخصوص فکر کو انہوں نے اپنی ذات میں تحلیل کرلیا ہے۔ مسائل کے بارے میں ان کا تجزیہ اتنا مکمل ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا ''کتابی علم'' کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام و تفہیم کی فضا میں لکھتے اور بات چیت کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی نثر **Laboured** یا آزردہ نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ جہاں کہیں وہ مجلسی آداب کے ضرورت سے زیادہ پابند ہوکر سوچتے یا لکھتے ہیں وہاں ان کی تحریر میں ایک نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی زیادہ تر وہ نہیں ہوتے جو وہ بے تکلفانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی تحریر میں وہ روانی اور قطعیت ہوتی ہے جو نظری مسائل پر لکھتے وقت نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع ان کے ہاں بہت کم آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو انداز کلام کچھ ایسا ہوجاتا ہے:

''اورینٹل کالج کے اساتذہ اور طلبائے قدیم کی جماعت میں اصحاب علم و دانش کے بہت سے نام مرقوم ہیں۔ اس جماعت کی کسی تقریب میں شرکت بھی اعزاز سے کم نہیں۔ صدارت کا منصب تو روئے باید کے علاوہ اور بھی بہت سے کمالات چاہتا ہے۔ ارباب انجمن کی اس مرحمت اور جناب صدر استقبالیہ کے کرم گستر الفاظ کے لئے میں انتہائی احسان مند ہوں۔ تاہم اس مشفقانہ غلط بخشی کا بھید مجھ پر نہیں کھل سکا، مجھے اپنے کرم فرماؤں سے زنہار یہ گمان نہیں کہ مسند صدارت کے لئے ان کے انتخاب میں طنز ملیح کا کوئی پہلو نمایاں ہے''

مضمون خواہ کسی موضوع پر ہو فیضؔ اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفس موضوع شروع ہی سے آپ کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے اور آپ ہمہ تن توجہ بن کر اس بحث میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اکثر مضامین میں ان کا طرز اظہار منطقیانہ ہے۔ وہ چند اصول مرتب کرکے گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ دلیلوں اور سوالوں سے اپنی ہی قائم کردہ دلیلوں اور سوالوں کا جواب دیتے اور موضوع کے پرت کھولتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ وہ یک لخت پردہ کشائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ چہرۂ معانی سے آہستہ آہستہ نقاب اُٹھانا انہیں زیادہ پسند ہے۔ وہ نگاہوں کو خیرہ کردینے والی روشنی کے بجائے مہتاب کی ہلکی ہلکی پھوار کے زیادہ دلدادہ ہیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو بھی ہے وہ عام زندگی میں بہت کم سخن، شرمیلے اور دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی ایک طرح کا دھیما پن پایا جاتا ہے۔ لیکن اس دھیمے پن سے استدلال کی کمزوری یا بیان کی نقاہت کے بجائے شرافت اور فنکارانہ انکسار مترشح ہوتا ہے۔

فیضؔ کے ادبی فیصلوں سے، اُصولوں کی بنیاد پر تو نہیں البتہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے فیضؔ کی ذاتی رائے یہ ہو ''حسرت موہانی کے بعد بہت کم شعراء ایسے ہونگے جنہیں غزل کے مزاج سے ایسی صحیح مناسبت نصیب ہو جیسی ''خم کاکل'' (سیفؔ کا مجموعہ کلام) میں ملتی ہے'' لیکن جہاں تک شعر کے مزاج اور شاعر کی ذہنی تعمیر کو سمجھنے کا تعلق ہے اس منزل میں فیضؔ نے خاصا ذمہ دار رویہ اختیار کیا ہے اور ایسے موقعوں پر ان کی آراء بہت جچی تلی اور محتاط ہوتی ہیں اور اس منزل پر پہنچ کر ان سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔

مثلاً سیف ہی کے بارے میں لکھتے ہوئے آگے چل کر اپنے موقف کی یوں وضاحت کردی

ہے۔" اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ حسرت کے بعد سیفؔ ہی ہمارا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے یا سیفؔ سے بہتر غزل کہی نہیں گئی۔ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں غزلیات کا ایسا مجموعہ مشکل ہی سے ہاتھ آئے گا جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا مسلسل اور ہموار اظہار ہو جیسا کہ سیفؔ کے کلام میں ہے" اسی طرح جوشؔ ملیح آبادی کو انقلابی شاعری کی حیثیت سے پرکھتے ہوئے پہلے انہوں نے انقلابی شاعر کا مفہوم متعین کیا ہے اور اسی مفہوم کی روشنی میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جوشؔ کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب کو وہ نمایاں فرق کا حامل سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ "صحیح انقلابی شاعر وہی ہے جو اشتراکی عقائد کے مطابق ہے" کیونکہ آج کل عام طور سے "اصطلاحی معنوں میں انقلابی نظریئے سے اشتراکی نظریہ مراد لیا جاتا ہے۔" فیضؔ کے خیال میں جوشؔ نے کامیاب ترقی پسند نظمیں لکھیں ہیں لیکن ہر ترقی پسند تحریر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں ہے۔ اسی لئے فیضؔ نے جوشؔ کے کلام کے نظریاتی پہلو پر غور کرتے ہوئے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے جوشؔ کے کلام کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا ہے، وہ اس کے افادی اثرات کے قائل ہیں، اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جوشؔ نے مروجہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور "کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا، ہمیشہ جرأت اور دلیری چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوشؔ کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی" اس طرح شررؔ، پریم چندؔ، نظیرؔ، حالیؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور اردو ناول پر ان کے مضامین پڑھ کر فیضؔ کے استدلال اور مؤقف سے اختلاف کے باوجود، جو بہر حال ذاتی ہے، ان کے تجزیاتی اسلوب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فیضؔ کی نثر اکثر و بیشتر شاداب، شگفتہ، واضح اور برمحل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔ تحریر میں طنز و ظرافت کی یہ آمیزش سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر ابھر آتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"اگر آپ اپنی شکایتیں بڑھئی کے پاس لے کر جائیں تو کیا اس جواب سے آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ صاحب آپ کے سب اعتراضات 'غیر کرسیانہ' ہیں"۔

"موجودہ اردو شاعری کی ایک علامت تو، یہ علامات کا لفظ ہی ہے، ذرا غور کیجئے اگر آپ آج سے پہلے کسی سے یہ پوچھتے کہ کیوں جی، آپ کی شاعری کی علامات کیا ہیں؟ تو آپ کو جواب ملتا۔ شاعری کی علامات؟ لاحول ولاقوۃ، شاعری نہ ہوئی طاعون ہوا"

"جمالیات کے شیدائی اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ سماجی مفاد اور سماجی اہمیت ایک شاعر کے لئے مہمل اور بیکار باتیں ہیں، کسی نقاد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تلامیذ رحمٰن کو اپنی غیر شاعرانہ روزمرہ زندگی کے مسائل میں الجھانے کی کوشش کرے"

"اہل نظر کو یہ الجھن اس لئے پیش ہے کہ ان کا کاروبار اس شے سے بندھا ہے جسے اب سے پہلے کلچر یا تہذیب آج کل 'ثقافت' کہتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ اسی بات پر غور فرمایئے کہ ہم نے ایسی لطیف شے کے لئے ایسا 'ثقیف' لفظ کیوں چنا ہے۔ محض اس لئے کہ یہ لفظ کوفہ و بغداد کا باشندہ ہے اور اس لئے معتبر ہے"

"ہمارے فنی اور تہذیبی کاروبار کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے بزرگوں کی آنکھ بچا کر سگریٹ پی جاتی ہے"

"سنان و خنجر، شمشیر و سناں، تیر اور کمند وغیرہ وغیرہ زیادہ دیکھنے میں نہیں آتے۔ عاشقی کی دنیا میں Disarmament (تخفیف اسلحہ) ہو چکی ہے"

ادبی تنقید کے ضمن میں فیضؔ نے قدما اور معاصرین میں سے بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف ادب کی تنقید کے لئے ایک الگ اسلوب ایجاد کیا ہے بلکہ مصنف اور تصنیف دونوں کا جائزہ لیتے وقت اس کے

سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اس صورت میں ادیب یا شاعر معاشرے یا زندگی سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے کے بجائے زندگی کے سارے عوامل سے متاثر ہوتا اور ایک حساس اور ذمہ دار معاشرتی اکائی کی حیثیت سے جدوجہد حیات میں حصہ لیتا نظر آتا ہے۔ اس طرح مصنف کی تحریر میں محض ''رُوحِ عصر'' کا لفظ استعمال کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جانے کے بجائے انہوں نے خود رُوحِ عصر کو پیش کر دیا ہے۔ آپ احساس کی شدت سے گزر کر اس سماجی اکائی کے ذہن تک پہنچیں جس نے کچھ محسوس کیا اور اس احساس کو آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جو باتیں نظری مسائل کے ضمن میں تخلیق اور تنقید سے متعلق انہوں نے سوچی ہیں۔ ان کی مزید وضاحت ان کے ادبی مضامین میں ملتی ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے فیض نے الفاظ کی ترتیب اور انتخاب میں بیشتر اوقات ذمہ داری سے کام لیا ہے اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لئے کلچر یافتہ، اہمیت اور نااہمیت، تجزیات کا تجزیہ، جذباتی وفاداری اور اسی قسم کی بہت سی تراکیب وضع کی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں نظم کی طرح نثر میں بھی وہ بعض ایسی غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو فیض یا کسی بھی قابلِ تقلید شاعر یا ادیب کے لئے مناسب نہیں۔

آخر میں ایک بہت اہم مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ ہے کلچر یا تہذیب کا مسئلہ۔ فیض انسانی تاریخ کے مادی اور جدلیاتی عمل سے باخبر ہیں۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے برصغیر کے مخصوص حوالے کے ساتھ بین الاقوامی اور عالمی مسائل کا جائزہ لیا ہے اس ضمن میں انہوں نے نہ صرف بعض بنیادی سوالات کے جوابات دیئے بلکہ خود بہت سے سوال اُٹھا کر قاری اور اہلِ قلم کو سوچنے کی طرف مائل کیا ہے۔ ہر باشعور ادیب تخیل، تعقل، جذبہ، فکر، ذریعہ اظہار، الفاظ، وجدان، تجربہ، مشاہدہ زمان و مکان، عدم، موجود جیسے فلسفیانہ اور طبیعاتی و مابعد الطبیعاتی موضوعات کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن اقتصادی قوتوں کو اہمیت دینے اور مذہب کے تصور سے الگ ایک قومی تہذیب کے امکانات پر غور و خوض کرنے والے ادیب کے لئے سب سے اہم مسئلہ اس علاقے کی تہذیب کا ہے جس کے اجتماعی شعور کا وہ ایک حصہ ہے اور جہاں ماضی کے رشتوں میں وہ حال کے لئے تانے بانے تلاش کر سکتا ہے۔ مغرب میں تو خیر کلچر یا تہذیب کی تمام بحثیں کسی نہ کسی عنوان جاری رہتی ہیں اور ان دنوں وہاں سائنسی کلچر اور مسلم کلچر پر بحث کی جا رہی ہے۔ لیکن برصغیر کا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ تقسیم پاک و ہند سے قبل ہندو مفکر ہندو کلچر اور مسلم مفکر مسلم کلچر کا مفہوم متعین کرنے کی فکر میں منہمک تھے تا کہ وہ قومی نظریئے کا جواز پیدا ہو سکے۔ ان تحریروں کا خاصا اثر ہوا جو ''مسلم کلچر ان انڈیا'' اور ''ہندو کلچر ان انڈیا'' جیسے عنوانات کے تحت منظرِ عام پر آئی تھیں۔ لیکن ان میں غور و فکر کی ٹھوس بنیاد اور سائنسی اندازِ نظر مفقود تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کلچر کے مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور و خوض کیا گیا ہے اگرچہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوئی ہے اور چند سوالات ابھی تک تشنہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان ایک ایسی نظریاتی مملکت ہے جس کا تاریخی رشتہ موہنجوڈارو، ہڑپہ، ٹیکسلا، کوٹ ڈیجی اور مینا لمتی سے ملتا ہے۔ اس مملکت میں مختلف علاقائی کلچر اور ان کے باشندوں کے جذباتی ردِ عمل موجود ہیں۔ یہ سب علاقائی قومیتیں اسلام کے نام پر متحد ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن کلچر کا مسئلہ ذرا مختلف چیز ہے اور اس پر ذرا مختلف نوعیت سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف علاقائی زبانوں، لباسوں اور علاقائی تہذیبوں کے دیگر مظاہر کے باہمی ارتباط و اختلاط سے ایک نیا کلچر پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا نام پاکستانی کلچر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کلچر صرف حال یا مستقبل کا نام نہیں ہے۔ اس کا ماضی سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ کلچر کا حال، درخت کا تنا اور مستقبل اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں لیکن ماضی درخت کی وہ جڑیں ہیں جو مٹی میں دور تک پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان جڑوں

سے درخت کو الگ کر کے درخت کا وجود قائم نہیں کیا جاسکتا اور جس طرح کسی کیمیاوی یا طبعی عمل کے ذریعہ درخت کو نئی جڑوں کی مدد سے جڑوں کے بغیر زندہ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح کلچر کے ماضی کو اپنانے کے لئے کسی شعوری کوشش سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلچر کو عقلی بنیاد پر منتخب نہیں کیا جاسکتا۔ صدیوں پرانی روایات سے قوموں کے کچھ تاریخی اور جذباتی رشتے ہوتے ہیں اور یہ سارے رشتے ایک نامیاتی تسلسل میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک درخت میں کسی دوسرے درخت کی پیوندکاری سے پیوندی پتے اور پیوندی پھل پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ جو شکل و صورت ذائقے اور دیگر خصوصیات میں بہت انوکھے اور منفرد ہونگے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اصل درخت کی جڑیں یعنی کلچر کا ماضی مصنوعی نہ ہو۔ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ سیاسی اعتبار سے اس مملکت کی پانچ ہزار سالہ تہذیب میں موہنجوداڑو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے بعد سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد اور مغل تہذیب میں کس طرح ایک ربط، تسلسل اور توازن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ماضی کے ان مختلف النوع حقائق کو ایک نوع کی حقیقت کا مظہر کس طرح کہا جاسکتا ہے؟

ان میں سے بیشتر سوال خود فیض کے ذہن میں بھی فطری طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ فیض نے تہذیب کے مباحث کو ان مضامین میں پیش کیا ہے جو تہذیب یا پاکستانی تہذیب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے دیگر مضامین میں بھی جو ادب اور نظریے سے تعلق رکھتے ہیں تہذیب یا کلچر کے موضوع سے متعلق سوالات اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کلچر کے موضوع سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے اور وہ کسی نہ کسی عنوان پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ تہذیب کا کلچر ان کے نزدیک "اقدار (Values) کا وہ نظام ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے"۔ تہذیب کے مسئلے کو فیض ایک سہ العادی استعارے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، انہوں نے سب سے پہلے تہذیب کے طول و عرض پر گہرائی سے بحث کی ہے یعنی تہذیب کی تاریخی عمر، اس کی علاقائی یا جغرافیائی حدود اور مختلف قومی طبقوں اور عوام میں اس تہذیب کا نفوذ اور رسائی۔ پاکستان کی قومی تہذیب کے موضوع پر لکھتے وقت وہ سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ "پاکستانی قوم کیا چیز ہے؟" اور اس کا جواب فیض کے پاس یہ ہے کہ "یہ سوال تہذیبی نہیں سیاسی ہے۔" اس کے بعد تجزیے کی پہلی منزل یعنی ہماری تہذیب کے نقطۂ آغاز کے سوال کا فیض نے اس انداز سے جائزہ لیا ہے:

"پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی بسم اللہ کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کے تہذیبی تاریخ کی عمر پانچ ہزار سال سے اوپر ہے چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے شروع کریں اگر یہ صورت ہمیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ بھی اپنانا ہوگا جو سیاتی ادوار میں ویدک، برہمنی، یونانی اور بدھ معاشروں نے پیدا کیا۔ اس میں اُلجھن یہ ہے کہ ہمیں اپنے فنی اور تہذیبی تصور اور تخیل میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ، برصغیرہند میں مسلمانوں کے دور سے شروع کریں۔ اس میں یہ اُلجھن ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم، وطن یا تہذیب کے نمائندہ نہ تھے۔ ان میں عرب بھی تھے، ایرانی بھی، تورانی بھی، افغانی بھی۔ ہر ایک کی تہذیب الگ اور تاریخ جدا، مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اشتراک اور طویل تاریخی اختلاط کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ ضرور ہیں۔ لیکن کوئی ترک، عرب تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں، نہ کوئی عرب، ایرانی تہذیب و تاریخ قبول کرتا ہے پھر ان تہذیبوں کی ابتدا زمانہ قبل اسلام میں ہوئی ہے اور ان کے موجودہ نام لیوا اس قدیم وراثت سے نہ منکر ہیں نہ شرمسار"

اس تجزیے میں فکر کے ساتھ ساتھ فیض کا وہ مخصوص اسلوب نثر نگاری اپنی انتہائی نکھری ہوئی صورت میں نمایاں ہے جس کے اساسی اجزا کی تعمیر شعور اور احساس کے باہمی

امتزاج اور متوازن ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔اس بحث میں جغرافیائی حدود کے مسئلے پر اس انداز سے غوروخوض کرنے کے بعد وہ جغرافیائی حدود کو بھی تہذیب کی بحث میں ایک مزاحم عنصر سمجھتے ہیں۔البتہ اس بحث کی تیسری اور آخری شق یعنی تہذیب یا کلچر کی گہرائی کے سوال میں انہیں اس مسئلے کا حل اساسی دکھائی دیتا ہے۔کیونکہ ''اس کا انحصار بیشتر سماجی یا معاشرتی نظام پر ہوتا ہے۔ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ کسی معاشرے میں علم وفن، تہذیب و شائستگی زندگی کی دوسری نعمتوں کی طرح ایک بہت ہی محدود طبقے سے مخصوص ہوں اور یوں بھی ممکن ہے کہ قومی معاشرہ بہت غیر مساوی، اور اس کے مختلف طبقوں میں بہت دوری نہ ہو''

فیض نے اس مسئلے کو بھی اصلاحی زبان کا شکار ہوئے بغیر حل کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کا مسئلہ صرف اس کے عنصر ثالث ہی پر ارتکاز توجہ کے بعد حل ہوسکتا ہے۔اس کے بعد ماضی اور حال کے بہت سے رشتوں سے ہم خود کو ہم آہنگ کرسکیں گے اور وہ تہذیب عالم وجود میں آسکے گی جس سے نہ ہم منکر ہوں گے اور نہ شرمسار۔

تہذیب جیسے مسئلے پر سوچتے وقت ایک ایسے مصنف اور مفکر کے جو نہ ماہر سماجیات ہے اور نہ ماہر بشریات ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اور لوگ اس مسئلے کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور سرے سے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس وقت ان لوگوں کے چہرے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگتے ہیں۔''جو تہذیب یا فن کا نام سنتے ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ اس شے کے فوائد بیان کیجئے اس سے قومی خزانہ میں کتنا پیسہ آتا ہے، زرمبادلہ میں کیا بچت ہوتی ہے، گندم کی پیداوار میں کیا اضافہ ہوتا ہے۔''

فیض نے اس سوال کا جواب غور کرنے کے بعد یوں دیا ہے ''ان بزرگوں کی خدمت میں یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ قومی تہذیب کی تشکیل سے یہ سب کچھ تو شاید نہیں ہوتا لیکن اس کے بغیر ان میں سے یقیناً کچھ بھی نہیں ہوتا وہ اس لئے کہ اپنا قومی مقام پہچاننے کی اولین شرط یہی ہے۔''

مثالی کلچر کی تکوین کے لئے فیض کے ذہن میں کچھ باتیں بہت واضح ہیں اور انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ انہیں بیان بھی کیا ہے۔ان کے خیال میں ہمیں مثالی کلچر کے قیام اور اس کی ترقی کے لئے ایک دوہرے عمل کی ضرورت ہے یعنی ''(۱) کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے'' ''(۲) عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کرسکیں۔'' اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے۔''(۱) سماجی اقدار کی تربیت موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے۔(۲) ان اقدار کو عوام کے لئے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے''

فیض کی نثر کے مطالعے سے مجموعی تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ شعروادب کے مسائل ہوں یا تہذیب اور انسانی افکار کے مباحث فیض ان موضوعات پر اس وقت قلم اُٹھاتے ہیں جب ان کے ذہن میں موضوع کی نہ صرف جزئیات واضح ہو جائیں بلکہ وہ ان جزئیات کی ایک مجموعی تصویر بھی مؤثر اور مکمل الفاظ کے ذریعے آپ تک پہنچا سکیں۔اسی لئے فیض کی نثر میں ایک انفرادی اسلوب نظر آتا ہے۔لیکن اس اسلوب کو ہم اُردو کے اسالیب نثر میں تاریخی یا تنقیدی اعتبار سے کیا درجہ دیں گے؟ اس کا فیصلہ فی الحال مشکل ہے اس لئے کہ شبلی یا حالی کی طرح فیض کی نثر کا ابھی کوئی ''اعتبار'' قائم نہیں ہوا ہے۔تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ فیض کی نثر ہمارے اپنے دور کی نثر ہے، جس میں ''رومان'' یا انقلاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے بقول فیض صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی نہیں کہ ''ترا جسم ایک ہجوم ریشم وکمخواب ہے سلمٰی'' یا ''انقلاب زندہ باد''

عہد جدید میں لکھنے والا ایک ایسی حساس سماجی اکائی ہے جو اگر عاشق ہے تو اسے صرف ''محبوبہ کے حسن اور اپنی بیقراری کا احساس نہیں ہوتا۔بلکہ غم روزگار، گناہ کا خوف، جسم کی تشنگی، رُوح کی تنہائی، اپنی بے بضاعتی کا احساس اور ایسی ہی کئی ایک باتیں اس کے تجربے میں شامل ہوتی ہیں۔سماج اور انقلاب پر غور کرتا ہے تو یہ بھی ایسی سیدھی بات معلوم نہیں

ہوتی۔ اس کے اپنے طبقے کا مستقبل، مختلف سماجی قوتوں کے باہمی داؤ پیچ، بین الاقوامی مہرہ بازی اور کئی ایسے اُلجھاؤ دکھائی دیتے ہیں۔"

دورِ جدید کے اس مسلسل کرب اور شدید کشمکش سے گزرنے اور اس سے آگاہ ہو جانے کے بعد آگہی کا جبر سہنے کے لئے منزل یا نروان سے بے نیاز ہو کر لمحۂ موجود کی منطق پر خلوص اور سچائی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ ذات کے تمام گوشوں میں جھانکنے اور نظام زندگی کے گرداں سیاروں کو دانش وفکر کی دوربینوں سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس سارے مشاہدے کو احساس کی وسعت میں جذب کر کے الفاظ کے محسوس پیکر تراشنے پڑتے ہیں۔ یہ سارا عمل نظام زندگی کو دیکھنے کا عمل ہے۔ جس کے بارے میں خود فیض کا یہ کہنا ہے کہ:

"نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دُور دراز، اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے اُبلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کنتا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں قائم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے، اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔"

"فیض ہمارے دور کی معتوب ترین اور محبوب ترین شخصیت ہیں۔ معتوب اربابِ اقتدار کے نزدیک اور محبوب ہند و پاکستان کے عوام کے نزدیک۔ خواہ وہ قید و بند میں اسیر ہوں یا ملک بدر ہوں۔ وہ ہند و پاکستان کے عوام کی آنکھ کا تارہ بنے رہے۔ انتقال کے بعد بھی آج تک ان کی یاد برِ عظیم کے ان کروڑوں پڑھنے والوں کو مسحور کیے ہوئے ہے۔

فیض زندگی بھر شہرت اور خود نمائی سے بچتے رہے مگر جہاں بھی گئے وہاں ان کے مداحوں اور عاشقوں نے ان پر بے پناہ عقیدت اور محبت نچھاور کی۔ حد یہ ہے کہ جیل خانے کی زندگی میں بھی ان کے چاہنے والوں میں مشتاق احمد گورمانی جیسے لوگ تھے جو کہ گورنر پنجاب ہونے کے باوجود انہیں جیل سے بلواتے اور ان کی زبانی ان کا تازہ کلام سنتے اور سر دھنتے۔ ایسی والہانہ محبتیں اسی قدر والہانہ نفرتوں کے ساتھ فیض کے حصے میں آئی تھیں۔"

(محمد حسن)

بیروت میں فیض احمد فیضؔ، یاسر عرفات اور دیگر

راج کھوسلہ، سنجے دت، سنیل دت، نرگس، فیض احمد فیضؔ، خواجہ احمد عباس اور دیگر احباب

فیض احمد فیضؔ اور مجروحؔ سلطان پوری

صوفی تبسمؔ اور فیض احمد فیضؔ راولپنڈی کے ادیبوں کے ساتھ

امین مغل، قمر یورش، فیض احمد فیض، خرم خلیق، آزاد کوثری

فیض احمد فیض اور راشد حسن رانا

سلمیٰ صدیقی، کرشن چندر اور فیض

سید محمد جعفری، قیوم نظر، حفیظ کاردار، فیض احمد فیض، کلیم عثمانی، حبیب جالب، ناصر کاظمی، صوفی تبسم، احسان دانش، ثاقب زیروی
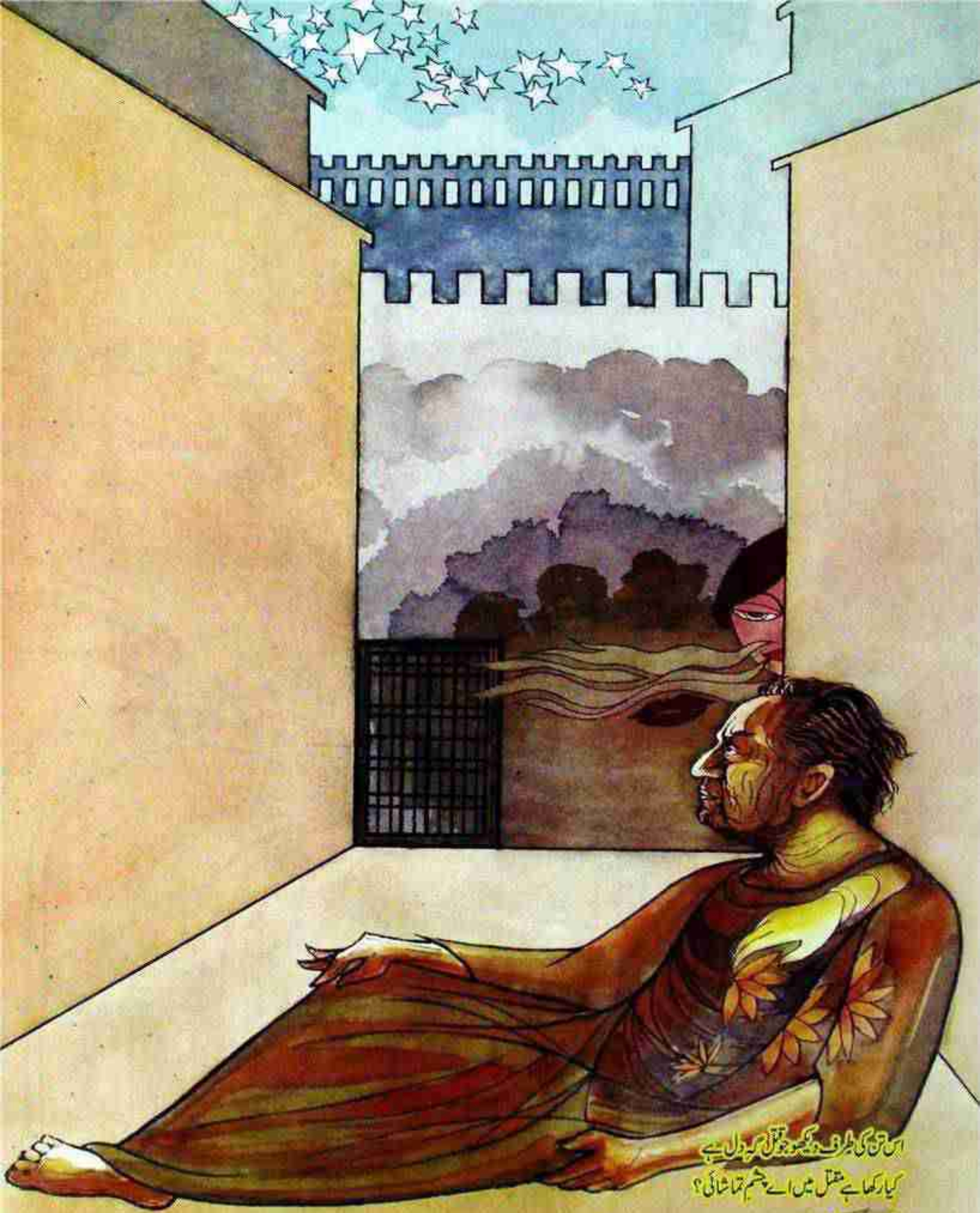
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی؟
عمل: اسلم کمال
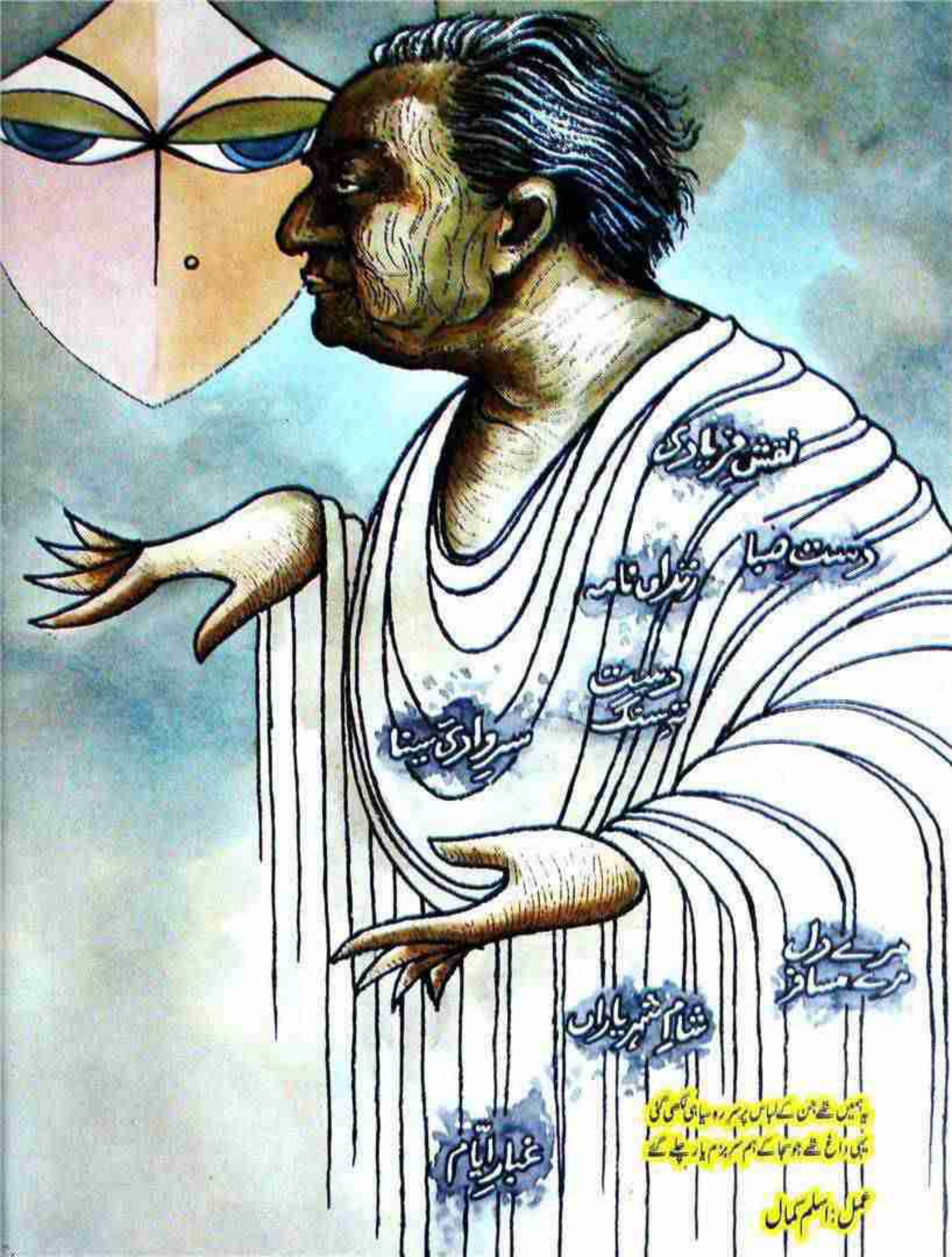
نقشِ فریادی
دستِ صبا
زنداں نامہ
دستِ تہِ سنگ
سرِ وادیٔ سینا
مرے دل مرے مسافر
شامِ شہرِ یاراں
غبارِ ایام
ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
عمل: اسلم کمال

حمدِ باری

پروفیسر فتح محمد ملک

فیضؔ کی بیٹی راوی ہیں کہ ایک صبح فیضؔ نے سب کو اکٹھا کیا اور یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ آؤ دعا مانگیں، بیٹی نے متعجب ہو کر پوچھا کہ نماز تو پڑھی نہیں پھر دُعا کیوں مانگیں؟ مگر فیضؔ اس حیرت و استعجاب کا خیال کیے بغیر اپنی نظم "دُعا" پڑھنے لگے۔ بیٹی کے اُٹھائے ہوئے سوال کو فیضؔ نے شاید اس وجہ سے سنا ان سنا کر دیا تھا کہ اس کا جواب تو صدیوں پہلے حضرت سلطان باہو دے گئے تھے۔

عاشق پڑھن نماز پریم دی جیں وچ حرف نہ کوئی ہُو
جیبہ نہ ہلّے، ہونٹھ نہ پھڑکن، خاص نمازی سوئی ہُو

ماضی قریب تک ہماری ادبی اور روحانی تاریخ میں حمدیہ اور دعائیہ شاعری کو ایک منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ منصورؔ حلاج سے لے کر علامہ اقبالؔ تک ہماری شعری اور فکری روایت میں اظہار کے رنگا رنگ پیرایوں اور ہیئت کے متنوع سانچوں میں کہی گئیں دعائیہ نظمیں شعر و حکمت کے ایک انمول خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نظم "دُعا" کی تخلیق فیضؔ کی جذباتی و فکری سرگزشت کے ایک اہم موڑ پر عمل میں آئی ہے۔ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت اور اپنی جبلی حوصلہ مندی کی بدولت فیضؔ اس انداز کی شاعری کو بھی انقلاب آشنا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ قدرت نے انہیں بڑی فیاضی کے ساتھ صبر و استقلال کی نعمت بخشی تھی۔ چنانچہ وہ گلہ بھی کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شکر ادا کر رہے ہوں۔ زمانے کے ستم کو کرم بنا لینے اور زندگی کی کلفتوں کو نعمتیں سمجھ لینے کا یہ انداز قید خانے سے ایلس فیضؔ کے نام اُن کے خطوط میں بڑے نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ ایک خط میں قید و بندگی کی واردات کو یوں منکشف کرتے ہیں:

"ان طویل اور بے رنگ شب و روز میں جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور موت سے پرے کسی غیر مادی دنیا میں داخل ہو چکے ہیں وہیں یکا یک ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب زندگی سے اپنی یگانگت اور وحدت وجود کا بہت شدت سے احساس ہوتا ہے"

وہ تنگ دستی کا ذکر بھی اک عجیب سیر چشمی کے ساتھ کرتے ہیں:

"خیر ہمیں اب بھی اتنا کچھ میسر ہے کہ شکر ادا کرنا چاہیئے مجھے تو اب سے پہلے کبھی ایسا سکونِ قلب میسر نہیں ہوا۔ کم از کم اس طرح کا سکون جو اس وقت ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دنیا سے کوئی شکایت نہیں رہی بلکہ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ یہ جیل خانہ ختم کرنے سے پہلے ہم کہیں ولی اللہ نہ بن جائیں اس لئے کہ اب کوئی بات کوئی چیز بُری نہیں لگتی۔ سارے جھوٹ، سارے فریب، وہ ساری تہمتیں جن پر پہلے دل کڑھا کرتا تھا، اب یاد کرو تو صرف ہنسی آتی ہے اور ایک طرح سے دل خوش ہوتا ہے"

شادی کی سالگرہ پر وہ اپنی رفیقۂ حیات سے دُور، جیل کی تیرہ و تار فضا میں محبوس ہیں مگر اس عدم آباد جدائی میں بھی جذبات و احساسات کا یہ عالم ہے:

"آؤ، ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں۔ یہ دس برس ایسی دولت ہیں جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر کسی کا عقبی یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ

حق و صداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی رہزن نہیں لوٹ سکتا، نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔ شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں"

اپنی تخلیقی زندگی کے ایک طویل اور زرخیز دور میں فیضؔ اس گہرے دینی احساس سے شعوری سطح پر روگردانی اور مادی ہمہ اوست کی استدلالی سطح پر ثنا خوانی میں کوشاں رہے ہیں۔ اس دور کی ابتدا فیضؔ کے آغازِ شباب کا وہ زمانہ ہے جب اُن کے دل میں ناکامیِ محبت کے غم نے چھاؤنی چھائی تھی اور ان کی دنیا میں اقتصادی بدحالی نے ڈیرے ڈالے تھے۔ دل اور دنیا دونوں کی بربادی سے انہیں "یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ دل و دماغ کے سبھی راستے بند ہو گئے ہیں" اس کربناک ذہنی کیفیت کا عکس "نقشِ فریادی" میں حصہ اوّل کی ایک نظم "یاس" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

رحمتِ گریۂ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

یاس کی اس تہہ در تہہ تاریکی میں محمود الظفر اور رشید جہاں کی رفاقت مینارۂ نور ثابت ہوئی، فیضؔ اپنی ذات سے باہر نکلے اور اشتراکی منشور کی روشنی میں غمِ جہاں کا حساب کرنے میں یوں منہمک ہوئے کہ ان کی باطنی زندگی کے چند مطالبات فراموش ہو کر رہ گئے۔ فیضؔ ۱۹۶۷ء تک اپنی ذات میں سرگرمِ کار صوفیانہ احساس سے شعوری طور پر کنی کاٹتے نظر آتے ہیں۔ نعمتِ زیست کا شکرانہ ادا کرتے وقت بھی وہ ذاتِ باری کی بجائے ملکۂ شہرِ زندگی کو مخاطب کرتے ہیں۔

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگدستی کا کیا گلہ کیجے

☆☆......

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد
دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

☆☆......

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

یہ بات معنی خیز ہے کہ پایانِ عمر شائع ہونے والی کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں فیضؔ نے اس نظم کا عنوان "حمد" کی بجائے "زندگی" کر دیا ہے۔ فکر و احساس میں اس تبدیلی کی جڑیں ۱۹۶۷ء کی اس واردات میں پوشیدہ ہیں جس میں کوئی مسیحا بھی ایفائے عہد کو نہ پہنچ سکا تھا۔ یہ سال ہمارے ترقی پسند دانشوروں پر بہت بھاری تھا۔ یہ وہ ظالم سال ہے جب عرب اسرائیل جنگ میں رُوس نے صدر ناصر کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا اور احمد ندیم قاسمی نے تڑپ کر سوال اُٹھایا تھا کہ۔

اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورو؟
اب تو اُس سمت بھی ظلمت ہے
جہاں شب کے الاؤ میں نہا کر
مرے سورج کو نکلنا تھا مگر بجھنے تھے
اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں ہوتا ہے
اب تو جب ذکر کرو تو رِ سحر کا
تو پلک اُٹھتی ہے دنیا کہ کہاں ہوتا ہے
اب تو اُس شب کی سیاہی نے ہمیں گھیر لیا ہے
کہ جہاں چاند تو کیا کوئی ستارہ بھی نہیں جی سکتا
اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورو؟

(روشنی کی تلاش)

اس جنگ کے پس منظر میں تخلیق ہونے والی نظم "سرِ وادیٔ سینا" فیضؔ کی تخلیقی زندگی میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں فیضؔ نے پہلی بار کھل کر اپنی اسلامی شناخت کا اثبات کیا ہے۔ یہ فنی و فکری نشوونما کسی ترمیمِ نظر کا نتیجہ ہرگز نہیں بلکہ اپنے انقلابی مسلک پر ثابت قدمی کا ثمر ہے۔ چونکہ یہاں فیضؔ کے اوّلین اور فوری مخاطب مظلوم مسلمان ہیں اس لئے وہ نہ صرف انقلابی کشمکش کی مصوری

قصص القرآن سے برآمد ہونے والی سچائیوں کی
روشنی میں کرتے ہیں بلکہ اُن کے علائم و رموز اور
امیجری بھی قرآن حکیم سے ماخوذ ہیں۔ یوں
موضوع اور طرزِ ادا، ہر دو اعتبار سے یہ نظم ہماری
انقلابی شاعری کی اُس روایت سے مربوط ہو گئی
ہے جو اقبال کی نظموں "لینن خدا کے حضور میں"
اور "فرشتوں کا گیت" میں جلوہ گر ہے۔ فیض خدا
کے عشق کا دم بھرنے والوں کو مژدہ دیتے ہیں کہ:

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا
(سرِ وادیٔ سینا)

فلسطینیوں کے جہادِ حریت میں
خدا کا جلوہ دیکھتے ہوئے وہ منصورِ حلاج کی
صوفیانہ روایت کو از سرِ نو زندہ کرنے کی دعوت
دیتے ہیں۔

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے
(سرِ وادیٔ سینا)

انکار کا یہ فرمان اقبال کا ردِ ملوکیت اور
انکارِ ملائیت کا وہی آتشیں پیغام ہے جس پر دنیائے
اسلام نے اب تک اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمروداں بزن

اور

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ
دنیائے اسلام صدیوں سے اس فتنہ میں گرفتار
چلی آ رہی ہے اور یہ اس فتنۂ عظیم ہی کا شاخسانہ
ہے کہ مسلمان رفتہ رفتہ جرأت اندیشہ سے
بے نصیب اور حریتِ عمل سے محروم ہو کر
غیروں کا محکوم بن گیا۔ اقبال نے تقسیم فلسطین
سے متعلق رائل کمیشن کی رپورٹ پر اپنے
۳ جولائی ۱۹۳۷ء کے بیان میں عربوں کو مشورہ
دیا تھا کہ وہ نہ تو مغربی استعمار سے بھلائی کی توقع
رکھیں اور نہ ہی اپنے سلاطین و شیوخ کی مساعی
پر تکیہ کریں۔ اگر فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود
میں ہے تو سلاطین کا عمل آزادیٔ ضمیر کی بجائے
تخت و تاج کی سلامتی کے تقاضوں کے تابع
ہے۔ چنانچہ فلسطینیوں کی نجات عرب عوام کی
اجتماعی خودی کی پرورش میں مضمر ہے۔ فیض بھی
خاصانِ زمین کی حکمتِ فرعونی اور مفتیٔ دیں کی
پیرویٔ کذب و ریا کے خلاف بغاوت کا درس
دیتے ہوئے دل کو مصفا دیکھنے کی تمنا کرتے
ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ لوحِ دل کے مصفا ہوتے
ہی اس پر ظل اللہ کی اطاعت کا صدیوں پرانا نقشِ
باطل محو ہو جائے گا اور اس کی جگہ وہ نیا حرف "لا"
نمودار ہو سکے گا جس کی معنویت پا جانے کے بعد
انسان جملہ موجودات کا فرمانروا بن جاتا ہے۔

فیض کی دعا مستجاب ہوئی نتیجہ یہ کہ نظم
کا دوسرا حصہ اس صحیفے کے حرفِ اول پر مشتمل
ہے جو ہر کس و ناکس زمیں پر، دلِ گدایانِ
اجمعیں پر فلک سے اُتر رہا ہے اور جس کے
نورِ صیقل کے اعجاز سے بندگانِ بے کس کی خودی
بیدار ہو رہی ہے اور وہ کارواں در کارواں میدانِ
جہاد میں اُتر رہے ہیں۔

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہو گا

قضیۂ زمین کو برسرِ زمین چکانے کی

خاطر فیضؔ خدا کے سارے عاشقوں کو وادیٔ سینا میں گرم معرکۂ کارزار کی طرف بلاتے ہیں۔

اے دیدۂ بینا

اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے؟

.........پندار جنوں

حوصلۂ راہ عدم ہے کہ نہیں ہے؟

خدا کے باقی عاشقوں کی بات تو خدا ہی جانتا ہے مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ فیضؔ کے پندار جنوں نے بالآخر انہیں فلسطینی جہادِ حریت میں شمولیت پر مجبور کر دیا۔ مشاہدے سے مجاہدے تک کا یہ سفر نظم "عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا" کا موضوع ہے۔ نظم کے آخری بند میں منزل عشق پر فیضؔ کے تنہا پہنچنے کا منظر دیدنی ہے۔

لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ

جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے

اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا

دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے

گلو میں کبھی طوق کا واہمہ

کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر

اور پھر ایک دن عشق انہی کی طرح

رسن در گلو، پابجولاں ہمیں

اُسی قافلے میں کشاں لے چلا

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان برپا اس جنگ میں دیدارِ حقیقت سے فیضؔ کو وہ بابِ قبول کھلا نظر آیا جس پر برسوں پہلے نظم "یاس" میں بند ہونے کا گمان ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء ہی کے یوم آزادی پر انہوں نے نظم "دعا" لکھی بھی اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ با جماعت مانگی بھی۔ اقبالؔ نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے موضوع پر اپنے ایک خطبے میں دعا کو انسان کا ایک جبلی اور فکری تقاضا قرار دیا ہے۔ اُن کے نزدیک انسان اپنے باطن میں محبت اور رفاقت کی شدید آرزو رکھتا ہے اور اس خاموش کائنات میں اپنی تمناؤں کا جواب مانگتا ہے۔ چنانچہ دعا میں وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے ہمکلام ہو کر گویا اپنی شخصیت کے ایک محدود سے جزیرے کو اچانک ناپیدا کنار زندگی سے مربوط پاتا ہے۔ دعا کے ذریعے جہاں انسان حقیقتِ مطلق کے ساتھ براہ راست ہم کنار ہو جاتا ہے، وہاں وہ وحدت انسانی کا انقلابی عرفان بھی حاصل کرتا ہے۔ اسلام میں عبادت اور دعا کو جماعت سے اس لئے وابستہ کر دیا گیا کہ اسلامی عبادات کی رُوح سراسر معاشرتی ہے...... اب آیئے فیضؔ کے ساتھ "دعا" مانگیں۔

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی

ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں

ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا

کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

یہاں اگر ایک طرف ذات باری کا وہ تصور جلوہ گر ہے جو ہمارے صوفیائے کرام کے پیشِ نظر رہا ہے تو دوسری جانب دعا کی رُوح سراسر معاشرتی ہے۔

آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی

زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے

وہ جنہیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں

ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں

اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے

جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں

ان کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے ان کو

ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے

جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو

دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

(سرِ وادیٔ سینا)

یہ دعا رسمی نہیں بلکہ انقلاب آفریں ہے۔ شاعر کی تمام تر تمنائیں دوسروں کی نجات دیدہ و دل کے لئے وقف ہیں۔ اپنے لئے اگر کوئی تمنا ہے تو فقط یہ کہ۔

عشق کا سرِ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے

آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے

حرفِ حق دل میں کھٹکتا جو کانٹے کی طرح

آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

نظم کے آخری بند پر پہنچتا ہوں تو حسین ابن منصور حلاج کی دعائیں کانوں میں گونجنے لگتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فیضؔ مسلمانوں کی شعری روایت کے مرکزی آہنگ پر

نغمہ گر ہوں۔ یہ فکری اور شعری روایت اُس دانا و بینا اور قادر و عادل خدا کے تصور سے پھوٹی ہے جس کے ابدی پیغام کو اقبالؔ نے ذیل کے دو مصرعوں میں سمو دیا ہے۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

فیضؔ اپنے دورِ آخر میں اسی روایت کو شعوری طور پر اپنانے اور تازہ تر انقلابی معنویت سے آشنا کرنے میں کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس تخلیقی کاوش کا بہترین ثمر "وبقیٰ وجہ ربک" ہے۔ فنی و فکری ہر دو اعتبار سے یہ نظم خود فیضؔ کی شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہاں فیضؔ سہلِ ممتنع میں جبر و استبداد پر مظلوم انسانیت کی آخری فتح کی بشارت دیتے ہیں اور ایک ترانۂ حریت ایسا لکھتے ہیں جس کا رزمیہ آہنگ اُس وعدۂ حق سے عبارت ہے جو لوحِ ازل میں مرقوم ہے اور جس کے مطابق اس یوم الحساب کی نمود ناگزیر ہے جب ظلم و ستم کے پہاڑ رُوئی کی مانند اُڑ جائیں گے اور جب ارضِ خدا کے کعبے کو میر و سلطان کے بتوں سے پاک کر کے مردودِ حرم اہلِ صفا کی تکریم کی جائے گی اور پھر......

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

......☆☆......

ذات باری کے اس عارفانہ تصور نے ارضی خداؤں کی نفی اور خلقِ خدا کی سربلندی کے جس انقلابی مسلک کو جنم دیا ہے اُس کی جڑیں ہماری تہذیب و تاریخ کی اندرونی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ چنانچہ فیضؔ، ذات باری کی حمد و ثناء اور اپنی انقلابی جد و جہد میں کوئی تضاد نہیں دیکھتے بلکہ آخر آخر، اُن کے ہاں حمدِ باری اور ترانۂ انقلاب ایک ہی حقیقت کے دو رُخ بن جاتے ہیں۔ فیضؔ ہی کی ایک اور دعائیہ نظم "مرے درد کو جو زباں ملے" سے الفاظ مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ اب کہیں آ کر فیضؔ نے اپنی ذات کا نشان پایا۔ نتیجہ یہ کہ اب وہ اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کی دینی اساس کو فخر و مسرت کے ساتھ یاد کرنے لگتے ہیں، ماورائی احساسات اور صوفیانہ واردات ہی نہیں بلکہ محنت کشوں کی حکمرانی اور سلطانیٔ جمہور کے تصورات کو بھی قرآنی سیاق و سباق میں بیان کرنے لگتے ہیں اور دستِ صبا کی "دو آوازیں" "مرے دل مرے مسافر" میں "تین آوازیں" بن جاتی ہیں۔ اب ظالموں اور ظلم کے خلاف سینہ سپر خلقِ خدا کی آوازوں کے ساتھ ساتھ ایک تیسری آواز............"ندائے غیب" بھی سنائی دینے لگتی ہے اس تیسری آواز سے فیضؔ کی شاعری میں طلسمات کا ایک نیا در کھلتا ہے۔

لمسِ جانانہ لئے، مستیٔ پیمانہ لئے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب

☆..........☆☆☆..........☆

فیضؔ صاحب: کچھ باتیں کچھ یادیں

سجاد حیدر ملک

جب سے حکم ہوا کہ فیضؔ صاحب کے بارے میں لکھوں، میں ایک مخمصے میں پڑ گیا ہوں۔ فیضؔ صاحب سے ایک مختصر سی مدت کے تعلقات پر اگر لکھتا ہوں تو اس میں دو قباحتیں ہیں۔ جہاں یہ میری خوش بختی تھی کہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود مجھے فیضؔ صاحب جیسی بھرپور شخصیت سے نزدیک ہونا نصیب ہوا تو اس میں میری اپنی ذات اگر نہیں تو کم از کم ''میں'' یعنی ذاتی صیغے کا استعمال ضرور بار بار ہوگا جس کی نفی کرتے کرتے ایک عمر بیت گئی اور کامیابی ذرہ برابر بھی نہ ہوئی۔ دوسری یہ کہ فیضؔ صاحب سے ان کی زندگی میں محبت کرنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی اور ان میں سے اکثر کے وسائل اور فضائل مجھ ناچیز سے کہیں زیادہ تھے۔ اب وہ میری یہ تحریر دیکھ کر غیض و غضب سے بھر جائیں گے اور بقول شکسپیئر حسد کے سبز چشم عفریت کے جال میں پھنس جائیں گے۔

ابتداء میں ایک معذرت اور بھی کرنا ہے۔ فیضؔ صاحب کی طبیعت میں توازن اور تحمل اتنا زیادہ تھا کہ اپنی کہنے کی بجائے دوسروں کی سننے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے اور ایسی ایسی باتیں سن کر برداشت کرتے چلے جاتے کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اول تو مخاطب کو ٹوک دیتا اور اس پر بھی اگر وہ باز نہ آتا تو نہایت درشتی سے منہ بند کرنے کو کہہ دیتا۔ ان کے اس رویے کا ایک اثر یہ تھا کہ ان سے بات کرنے والا اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا کہ وہ فیضؔ صاحب کے علم میں اضافہ کر رہا ہے۔

میرا تعلق فیضؔ صاحب سے اپنے دوست ڈاکٹر محمد ایوب مرزا کے واسطے سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۶۴ء میں انگلستان میں سات سال قیام کرنے کے بعد پاکستان آئے تھے۔ راولپنڈی میں سید پور روڈ پر بنی چوک سے آگے انہوں نے ایک مطب قائم کیا۔ چائلڈ سپیشلسٹ کے طور پر خاصے مشہور ہو گئے۔ لیکن فیضؔ صاحب سے ان کا تعلق انگلستان میں ہی قائم ہوا اور پھر انہی کے کہنے پر وہ پاکستان آئے اور یہاں اپنی جائیداد بنائی، بچوں کو پڑھایا، فیضؔ صاحب پر ایک عمدہ کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' تحریر کی۔ آزاد نثری شاعری بھی کی اور مجھ سے ان کا ایک ایسا ربط قائم ہوا کہ روز ایک مرتبہ ملاقات ضرور ہوتی اور کہیں جانا ہوتا تو میرے بغیر نہ جاتے۔ (وہ اب واپس برطانیہ جا چکے ہیں۔)

۱۹۷۲ء سے فیضؔ صاحب اسلام آباد میں مقیم تھے اور پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے چیئرمین تھے۔ اکثر ملاقات اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ پر ہی ہوتی اور ایسی ملاقاتوں میں ڈاکٹر ایوب مرزا ساتھ ہوتے۔

فیضؔ صاحب کے دوسرے دوستوں کی طرح میری کبھی یہ خواہش نہ ہوئی کہ ان کی معلومات میں اضافہ کروں۔ اس کے برعکس میں اکثر ان سے ایسی بات کرتا جس میں اشتعال اور غصہ دلانے والی تحریک ہوتی، لیکن وہ کبھی تیوری پر بل نہ لاتے، غصے میں آنا تو دور کی بات ہے۔ راولپنڈی پریس کلب میں ایک جلسے کے بعد وہ جب باہر نکلے، میں نے انہیں باتوں میں لگا لیا۔ ان دنوں ہمارے دوست فتح محمد ملک نے فیضؔ صاحب پہ ایک مضمون ''فیض کی دو آوازیں'' لکھا تھا جو ایک ادبی جریدے

میں شائع ہو چکا تھا۔ میں نے عرض کیا: ''فتح محمد ملک نے آپ کو رومانوی شاعر کہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے!'' ''ہاں بھئی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم کہاں کے انقلابی ہیں؟'' ان کے اس جواب نے مجھے بہت مایوس کیا کہ میرے اشتعال دلانے کے منصوبے پر پانی پھر گیا تھا۔ ملک صاحب کے مضمون میں دوسری بات یہ تھی کہ فیض احمد فیض ایک غنائی شاعر ہیں۔ ملک صاحب کے نزدیک یہ خوبی تھی یا خرابی، معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن اس سلسلے میں فیض صاحب سے جب بھی گفتگو ہوئی انہوں نے فرمایا کہ ''علامہ اقبال کے ہاں جو موسیقیت ہے وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک انقلابی شاعر ہونے کا تعلق ہے تو وہ تو حبیب جالب ہیں''۔

یوں فیض صاحب نے اپنے آپ کو کسی بھی مسابقت یا موازنے سے بچا لیا تھا۔ عرصہ ہوا انہیں لینن ایوارڈ مل چکا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اپنے مقام، شخصیت اور شاعری کے بارے میں کسی شک اور شبے میں مبتلا نہیں تھے اور زندگی کا سفر ایک تیقن کے بل بوتے پر طے کر رہے تھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور وہ ان چند لوگوں میں شمار کیے جاتے جنہیں ان کی زندگی میں ہی بے حد عزت اور شہرت نصیب ہوئی۔ حکومت کے لیے ایسے شخص کو اپنے عہدے سے ہٹانا ایک مشکل اور اہانت آمیز کام تھا۔ حکومت کے لیے ایسا کرنا ضروری بھی تھا کہ اس حیثیت کا شخص ان کے لئے ہر جائز و ناجائز کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو کے وزیر ثقافت عبدالحفیظ پیرزادہ نے ایک راستہ نکالا کہ نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ایک آئین ترتیب دیا جس میں وزیر ثقافت بلحاظ عہدہ چیئرمین قرار پایا جس کے ماتحت کونسل کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل ہوگا۔ ظاہر ہے فیض صاحب کے لیے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ قابل قبول نہیں تھا اس لیے انہوں نے اپنا استعفیٰ حکومت کو پیش کر دیا۔ اس طرح حکومت پاکستان نے ایک ایسے شخص سے اپنی جان چھڑوالی جو بین الاقوامی شہرت کے لحاظ سے چند حلقوں میں سربراہ حکومت سے بھی بالاتر حیثیت کا مالک تھا۔

میرے لیے اس قصے میں ستم ظریفی کا پہلو یہ تھا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا کے کہنے پر فیض صاحب نے میرا نام کونسل میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے حکومت کو بھیج دیا تھا۔ میں خوش تھا کہ فیض صاحب کے سائے میں کام کرنے کا موقع ملے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم نے مجھے کونسل میں کام کرنے کی اجازت دی تو فیض صاحب کونسل کی سربراہی سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے کبھی کسی پریشانی یا تشویش کا اظہار نہ کیا اور کسی بھی ایسے شخص سے طرز عمل میں فرق نہ آنے دیا جو اس معاملہ کے ذمہ دار تھے۔

اس عرصے میں فیض صاحب سے طویل ملاقاتیں رہیں۔ ایک دن میں اور ایوب مرزا سہ پہر کو ان کے ہاں پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد اور لوگ بھی آ گئے اور ہم کاروں میں مندرہ اور گوجر خان کے درمیان ایک درگاہ پر پہنچے۔ وہاں کے متولیوں نے فیض صاحب کا استقبال کیا اور ایک مختصر سی رسم میں فیض صاحب کے سر پر دستار رکھی۔ وہاں سے اُٹھ کر جب ہم کار میں بیٹھے تو فیض صاحب نے کہا: ''لو بھئی آج یہ بھی ہونا تھا''۔ وہاں سے ہم لوگ ایک قافلے کی صورت گوجر خان کے بلدیہ ہال میں پہنچے۔ فیض صاحب نے جلسے کی صدارت کی اور اپنی غزل بھی سنائی۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

واپسی پر سب لوگ اسلام آباد گئے جہاں اُستاد سلامت علی اور نزاکت علی کے ساتھ رات گئے تک موسیقی کی محفل ہوئی۔

میں ان دنوں اصغر مال روڈ کے گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا تھا اور ''پاکستان ٹائمز'' میں ثقافتی کالم لکھتا تھا۔ کالج کے پرنسپل انور عباس صاحب نے میرے ذمے ایک کام لگایا کہ کالج میں اساتذہ کے لیے کسی بڑی شخصیت کے لیکچر کا انتظام کروں۔ سب سے پہلے لیکچر کچھ عرصہ پہلے جناب ایرک سپرین (بعد میں اعجاز سپرین) نے دیا تھا۔ میں نے فیض صاحب

سے عرض کیا تو انہوں نے فوراً میری درخواست کو قبول فرمایا اور ثقافت پر آسان زبان میں زود فہم اور بصیرت افروز باتیں کیں۔ میں نے تعارفی جملوں میں عرض کیا کہ فیض صاحب کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ فیض صاحب میرے اس جملے سے بے حد خوش ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک کسی بھی انسان کی اس سے زیادہ تعریف نہیں ہوسکتی کہ اس کے قول اور فعل میں تضاد نہ ہو۔ مجھے بعد میں یاد آیا کہ ایک بار میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ان کے نزدیک تاریخ انسانی میں عظیم ترین ہستی کون ہے؟ ''بھئی وہ تو حضرت محمدؐ ہیں!'' انہوں نے جواب دیا۔ ''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔ ''بھئی وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے''۔ فیض صاحب نے کہا۔

نہایت سادہ الفاظ میں بہت بڑی بات کہنے میں فیض صاحب کا شاید ہی کوئی ثانی ہو۔ راولپنڈی میں ایجوکیٹرز کلب والوں نے گورکی کی یاد میں ایک شام کا اہتمام کیا۔ فیض صاحب نے تقریر کرنا تھی اور فیڈرل گورنمنٹ کالج فار ویمن کے ایک چھوٹے سے کمرے میں دانشوروں اور سفارت کاروں کی خاصی تعداد موجود تھی۔

فیض صاحب نے کہا ''ابتدائی ادب اور لوک ادب ایک عوامی اور اجتماعی دانش کا حامل ہے جس کے مصنف ہونے کا دعویٰ کوئی ایک شخص نہیں کرسکتا لیکن تاریخ کبھی کبھی کوئی ایک ایسا فرد پیدا کرتی ہے۔ جس میں لوک ادب کی اجتماعی دانش سموئی ہوتی ہے۔ گورکی ایک ایسا ہی شخص تھا''۔ جب تالیاں بج چکیں تو روسی سفیر نے فیض صاحب سے کہا کہ یہی تقریر وہ ماسکو میں دو دن کے بعد کریں گے۔ اس پر فیض صاحب نے کہا کہ ''میرے پاس تو کوئی فالتو پاجامہ بھی نہیں، سفر کی تیاری کیسے ہوگی''۔ سفیر نے جواب دیا کہ ''یہ سب کچھ ہو جائے گا''۔

۱۹۷۶ء میں فیض صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ کی تقریبات کا آغاز بھی ایجوکیٹرز کلب راولپنڈی سے ہوا۔ اس میں ایوب مرزا سے فیض صاحب نے خاص طور پر کچھ پڑھنے کو کہا۔ حسب معمول مرزا صاحب نے مجھ سے مشورہ طلب کیا اور میں نے ان سے فیض صاحب سے کچھ محفلوں کا حال احوال بیان کرنے کو کہا اور مرزا صاحب نے اپنے بے تکلف انداز میں بہت سی باتیں کہہ دیں جو آپ کو اس مضمون میں مل رہی ہیں۔ مرزا صاحب اپنے بیان کی سادگی سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے میرے مشورے کے خلاف اپنے دوست اور میرے بھی دوست یونس منصور کو اپنا مضمون دکھایا۔ یونس منصور اس زمانے میں ٹی وی میں سکرپٹ ایڈیٹر تھے۔ سہ پہر کو جب ڈاکٹر ایوب مرزا نے یونس منصور کے ہاتھوں اپنی تحریر کو مفرّس اُردو میں تبدیل ہوتے دیکھا تو گھبرا کر مضمون ان سے لے آئے اور تقریب میں اسے اپنے انداز میں ہی پڑھ کر سنایا۔ فیض صاحب نے بے حد پسند کیا۔ بعد میں یہی مضمون لاہور کی ایک تقریب میں پڑھنے کو کہا۔ میں اور ایوب مرزا فلیٹیز میں ہونے والی تقریب میں شامل ہونے کی غرض سے لاہور گئے۔ گاڑی ڈاکٹر خالد سعید بٹ کی تھی اور وہ اسے چلا بھی اپنے ہی انداز میں رہے تھے۔ بلا مبالغہ ہم چھ بجے صبح راولپنڈی سے چلے اور نو بجے صبح لاہور پہنچ گئے۔ فیض صاحب کے ہاں ناشتہ کیا۔ دوپہر صادقین کے ساتھ اوپن ایئر تھیٹر میں گزاری اور شام فلیٹیز چلے گئے۔ وہاں جلسہ بھرپور تھا۔ اختر الرحمٰن سٹیج سکریٹری تھے اور کشور ناہید بار بار آ کر بتاتیں کہ ڈاکٹر تمہاری باری آنے والی ہے۔ حتیٰ کہ جلسہ ختم ہوگیا اور ڈاکٹر ایوب مرزا کا نام نہیں پکارا گیا۔ مدتوں بعد لاہور آنے کا تجربہ نہایت تلخ رہا اور اس جلسے میں ڈاکٹر کے مضمون نہ پڑھنے کی وجہ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ رات کو فیض صاحب کے ہاں جشن تھا اور فیض صاحب نہایت پشیمان اور ہماری خاطرداری میں بے چین اور رات وہیں گزارنے پر مُصر۔ لیکن ہم ان سے رخصت لے کر رات تین بجے لاہور سے چلے اور صبح چھ بجے راولپنڈی آگئے۔ ایوب مرزا اس واقعے سے یوں متاثر ہوئے کہ فیض صاحب کے ساتھ اپنی تمام محفلوں کی داستان لکھنے بیٹھ گئے اور مکمل کر کے ہی دم لیا۔ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کا مسودہ فیض صاحب نے خود دیکھا اور پسند کیا۔ بہرحال اپنی طرز کی یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ ان دونوں باتوں کا اندازہ مجھے بعد میں ایک اور واقعے سے ہوا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ایک سہ رکنی وفد سوویت یونین بھیجا گیا۔ اس سرکاری وفد میں میرے ساتھ کراچی کے عرفان حسین اور وزارت ثقافت کے مختار احمد تھے۔ جب ہم ماسکو پہنچے تو ہماری پہلی سرکاری مصروفیت یہ تھی کہ پاکستان کے سفیر کی خدمت میں سلام عرض کریں۔ سفیر صاحب کا نام بھی سجاد حیدر تھا اور میں نے جب اپنا تعارف ان کے ہم نام ہونے کی حیثیت سے کرایا تو سفارت خانے کے ایک افسر اندر آئے اور کہنے لگے کہ "فیض صاحب آئے ہیں"۔ ہمارے لیے ان کی آمد خوشی کا باعث تھی لیکن ہمیں دیکھ کر فیض صاحب حیران رہ گئے اور وہ بار بار کہتے: "بھئی آپ لوگ یہاں کیسے آ گئے؟"۔

بعد میں سب سے پہلی بات جو انہوں نے مجھ سے دریافت کی وہ یہ تھی کہ ایوب مرزا نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کی کچھ جلدیں میرے ہاتھ بھجوائیں یا نہیں؟ مجھے اس بات کا کچھ پتا نہیں تھا اور جب میں واپس راولپنڈی آیا تو ایوب مرزا نے بتایا کہ وہ کتاب کی کچھ جلدیں لے کر ہوائی اڈے پہنچے تھے مگر دیر ہو چکی تھی اور ہم لوگ جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔

میرا خیال ہے کہ فیض صاحب اس کتاب کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کرانا چاہتے تھے اور یہ کام ماسکو میں ہی ہو سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی شاعری کو وسیع تر بنیادوں پر تسلیم کیا جائے اور ماسکو سے ان کی وابستگی شاید اس طرح کی شہرت کے آڑے آ رہی تھی۔ ایک بار ایک محفل میں میں نے روس کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ اب بھی روس کے حق میں کیوں بات کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ روس کی پالیسیوں کے حق میں نہیں لیکن روس سے وابستگی ختم نہیں کر سکتے۔

"آخر کیوں؟"

"بھئی یہ ہماری جوانی کا رومانس ہے"۔

سیاسی طور پر وہ کسی بھی پارٹی سے وابستہ نہیں تھے لیکن فلسفیانہ سطح پر وہ سوشلزم کی طرف مائل تھے۔ ان کی شاعری ہمیشہ ظلم کے خلاف ایک احتجاج کی شکل اختیار کیے رہی لیکن اس احتجاج میں تغزل اور روایتی شاعری کا رچاؤ اتنا گہرا ہے کہ قاری کو لذت اور چاشنی کا احساس رہتا ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ محدود رہا لیکن اس محدود دائرے میں رہ کر انہوں نے زبان کے تمام تر امکانات سے بھرپور فائدہ اُٹھایا یہاں تک کہ اپنے بعد آنے والے شاعروں کے لیے اب روایت میں کچھ نہیں چھوڑا۔ اب یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کو یا تو بالکل بدل ڈالیں یا کسی اور لہجے میں بات کریں۔ اگر اس میں کوئی کامیاب ہوا تو وہ اختر حسین جعفری تھے۔ لیکن یہ بات میں نقاد حضرات پر چھوڑتا ہوں کہ یہ مضمون کسی صورت بھی تنقیدی نہیں ہے۔ فیض صاحب کا احسان یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور لوگوں کو ایک نئی زبان اور لہجے سے آشنا کیا جو روایت میں رچ کر بھی نیا لگتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے روایت میں جان ڈال دی اور اس میں ایسی بات کہی جس کی وہ متحمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

انہوں نے تمام عمر مخالف ہواؤں کا سامنا کیا اور اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انتخابات کے موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی جس کے آخری چار مصرعے یہ تھے۔

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

یہ مصرعے اب بھی موجودہ صورت حال پر صادق آتے ہیں۔ زندگی کی مشکلات کے باوجود وہ قسمت کے دھنی تھے۔ عزت اور شہرت کے ساتھ انہیں آرام و آسائش کی زندگی نصیب ہوئی۔

وہ زندگی میں اگر خوش قسمت تھے تو موت میں اس سے بھی زیادہ خوش نصیب نکلے۔ ۱۹۸۴ء میں اگر وہ افغانستان میں روس کی آمد سے خوش نہیں تھے تو انہیں ۱۹۸۹ء کے وہ دن دیکھنا نہیں پڑے جب سوویت یونین پارہ پارہ ہو کر رہ گئی اور ماسکو کے قائد امریکہ کے دست نگر نظر آنے لگے۔

روس سے ان کی وابستگی کے پیشِ نظر

اور بنیاد پرستی اور مذہبی رجحانات کے احیاء کے ساتھ یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ فیض صاحب کی شاعری اور شہرت اب طاقِ نسیاں کی زینت بن جائیں گی۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کی شاعری روایت کی جن مضبوط بنیادوں پر قائم ہے وہ جب تک قائم ہیں ان کی شاعری بھی زندہ رہے گی۔ ہمارے نقاد حضرات ہر دو چار برس کے بعد میراجی، ن م راشد اور مجید امجد جیسے غیر روایتی اور باصلاحیت شاعروں کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں فیض صاحب کے بارے میں ایسی کسی کوشش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ان کے اشعار زبان سے ایسی نرمی اور روانی سے ادا ہوتے ہیں جو اب تک غالبؔ اور اقبالؔ کا خاصہ رہا ہے۔ فیض ان کے جانشین ہیں اور رہیں گے!

☆..........☆☆☆..........☆

''میں نے کتاب کا مسودہ فیض صاحب کی خدمت میں پیش کیا تا کہ کوئی بات واقعاتی لحاظ سے غیر حقیقی اور غیر مستند ☆☆ نہ ہو۔ فیض صاحب کے اندر ایڈیٹری عود کر آئی اور انہوں نے مسودے پر جی کھول کر قلم چلایا۔ کہنے لگے، بھئی ''زندہ'' حضرات کی دل آزاری ٹھیک نہیں اور ''مردہ'' لوگوں کے بارے میں فرمایا ''وہ تو مر گئے۔ گڑے مردے اُکھاڑنے سے کیا فائدہ؟''

(ایوب مرزا) ☆

☆۔ ڈاکٹر ایوب مرزا پنڈی کے ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر جو فیض اور ان کے قریبی دوستوں بیگم سرفراز اقبال، عابد علی شاہ، آئی۔ اے۔ رحمان، ملک جعفر، حمید اختر اور عبداللہ ملک وغیرہ کی محفلوں میں شریک رہتے تھے اور تمام گفتگو، کبھی یادوں میں، کبھی ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کرتے چلے جاتے تھے اور پھر انہوں نے ان یادوں پر مبنی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' مرتب کی۔

☆☆۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہاں سوانح نگار صاحب یہ بھی بتا دیتے کہ فیض صاحب کو ایک نظر دکھانے کے بعد انہوں نے مسودے میں جگہ جگہ ردوبدل اور اضافے کئے جس کے نتیجے میں کتاب بڑی حد تک غیر حقیقی اور غیر مستند ہو گئی! (س،ا)

ہارٹ اٹیک

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے

ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا،

ہر بُنِ مو سے ٹپکنا چاہا

اور کہیں دور ترے صحن میں گویا

پتا پتا مرے افسردہ لہو میں دُھل کر

حسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا

میرے ویرانۂ تن میں گویا

سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کُھل کر

سلسلہ وار پتا دینے لگیں

رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا

اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں

ایک پل آخری لمحہ تری دلداری کا

درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا

ہم نے چاہا بھی، مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

بلا تبصرہ

فیض نامہ

کلاسیک

فروری ۲۰۰۳ء

فروری ۲۰۰۲ء

(ادارہ)

مرے دل..... مرے مسافر۔ فیضؔ صاحب

کشور ناہید

لوگ میرے ہونٹوں اور آنکھوں کی بے حجابی کی بات کرتے تھے مگر اب جبکہ میرے گھٹنوں تک میں پانی اُتر آیا ہے، مجھے چلتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، مجھے اپنے گزشتہ بھاگتے لمحات یاد آتے ہیں۔

وہ زندگی کا پہلا دن تھا کہ کالج سے گھر اور گھر سے کالج کی سائیکل میں دراڑ آیا۔ ہم لوگ فرسٹ ایئر میں تھے۔ مس ڈاکٹر رفعت رشید اور مسز ایلس فیض ہم لڑکیوں کا گروپ لے کر ایک گاؤں میں گئیں۔ ہمیں رات بھی ایک ٹینٹ میں رہنا تھا۔ کام کیا تھا۔ اس گاؤں کی لڑکیوں کو منہ دھلانے، کنگھی کرنے اور ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے اور ہنسنے کا حوصلہ دینا تھا۔

ہم بہت خوش تھے۔ لڑکیوں کے جالے بنے بال اور آنکھوں کی پلکوں تک جھلکتی مٹی کو نلکے کے پانی کے نیچے دھوتے ہوئے۔ ان لڑکیوں کی چیخیں اور ہماری کلکاریاں آمیز ہو رہی تھیں۔ مائیں پلنگوں پہ بیٹھی، بڑی بوڑھیاں حقہ پیتی اور دوسری لڑکیاں ادھ کھلے منہ سے ہمیں دیکھتی اور بیچ بیچ میں ہنستی جا رہی تھیں۔

پھر ہم نے ان لڑکیوں کے بالوں کی کنگھی کی، چٹیا باندھی اور اب ہم سب کے ذمے تھا کہ ہر ایک گھر میں دو دو لڑکیاں جھاڑو دیں، گلی کی نالیاں صاف کریں اور واپس آ کر اپنے ٹینٹ میں اتنا کھانا بنائیں کہ ان لڑکیوں کو بھی کچھ کھلا سکیں۔

بڑی مشکل سے کچھ لڑکیوں کو پلیٹ میں سالن ڈال کر روٹی سے کھانے پر راضی کیا کہ سوکھی روٹی اور لسی کے علاوہ، کھانے کا کوئی اور ذائقہ ان کی زندگی میں شامل نہیں تھا۔

ہمارا بڑا جی کر رہا تھا کہ اب لڑکیوں کو بلا کر ڈھولکی منگوائیں اور مل کر لوک گیت گائیں۔ مسز فیض نے منع کیا اور مس رفعت رشید نے کہا کہ ان بچیوں کو کہانیاں سناؤ۔ مجھ جیسی لڑکی نے اپنی ماں سے کہانی سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو نمازیں پڑھ رہی ہوتی تھیں اور بڑی بہنیں اپنی کتابیں۔ ہم تو بس آسمان پہ تاروں کی بدلتی جگہیں دیکھتے دیکھتے سو جاتے تھے۔ مگر دوسری لڑکیوں نے کہانیاں سنائیں۔ کسی نے جن کی، کسی نے محبت کی اور کسی نے پری کی۔

یہ تھا تعلق کا آغاز مسز فیض سے۔ میں نے ان کو سائیکل پر پاکستان ٹائمز کے دفتر جاتے اور پاکستان ٹائمز میں بچوں کے صفحے کے لیے چھوٹے چھوٹے مضمون ان کو بھیجتے ہوئے اس لیے تعارف کے مراحل طے کیے تھے کہ فیض صاحب تک پہنچنا چاہتی تھی۔

کیا جانتی تھی میں فیض صاحب کے بارے میں۔ بس اتنا کہ ایک کتاب "نقشِ فریادی" مجھے زبانی یاد تھی۔ بس اتنا کہ وہ کسی بغاوت کیس میں جیل میں تھے۔ بس اتنا کہ ان سے ملنا، میرے اندر ایک جنون کی طرح رواں تھا۔

ابھی میرا فرسٹ ایئر ختم ہوا تو کالج میں سلیمہ، فیض صاحب کی بڑی بیٹی نے داخلہ لیا۔ میں اس سے ملتی نہیں تھی کہ ہم سینئر کلاس کے طالب علم تھے۔ مگر میں اُسے دیکھتی۔ وہ اس زمانے میں بھی کبھی کبھی جینز پہن کر آتی تھی۔ میں نے ایلس کو کرتہ شلوار اور ساڑھی میں دیکھا تھا۔ کبھی جینز یا مغربی لباس میں نہیں۔

پھر اچانک یوں ہوا کہ فیض صاحب

میرے گھر تک آ گئے۔ یہ اچانک کیسے ہوا۔ مجھے شمع تاثیر کے مشاعرے میں جانا تھا۔ فیض صاحب نے صدارت کرنی تھی۔ صوفی تبسم مہمان خاص تھے اور میرے قریبی گھر میں رہنے کے باعث، انہوں نے کہا تھا کہ ہم تمہیں لیتے جائیں گے۔ پھر اس ہم کا مطلب یہ تھا کہ فیض صاحب بھی ہوں گے۔ یہ تصور میں بھی نہیں تھا۔

گھر والوں نے میری چھوٹی بہن کو ساتھ کر دیا۔ میں نے معلوم نہیں کس کو فوٹو اُتارنے کو کہا۔ میری بغل میں برقعہ تھا اور ہم چاروں کی تصویر نے میرے قرب کی بنیادی اینٹ رکھ دی تھی۔ یہ بات ہے ۱۹۵۶ء کی۔

اب صوفی صاحب کا گھر ہوتا، بخاری صاحب، ڈاکٹر حمید جو فلاسفی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے، فیض صاحب اور پھر کبھی اعجاز بٹالوی، کبھی ستنام محمود، کبھی سرکاری افسران، سب جمع ہوتے۔ میں گھر پہ لائبریری جانے کا بہانہ بناتی اور اس محفل میں سرکتی سرکتی زمین پر بیٹھ کر ان کی گفتگو سنتی۔ مجھے پانی اور گلاس لانے کو کہا بھی نہ جاتا تو بھی میں بھاگ بھاگ کر یہ کام کرتی۔ یہی گُن تھا جس نے مجھے ان سب کی چہیتی بنا دیا تھا۔ میں تو اس خاندان، ان محفلوں کا حصہ بن چکی تھی۔ میں حیرت سے ستنام محمود کو ان سب کے درمیان بلاتکلف گفتگو کرتے اور ہنستے ہوئے دیکھتی۔ فیض صاحب کو خاموشی سے سگریٹ کے دھوئیں کو بھی آہستگی سے آزاد کرتے دیکھتی۔

بخاری صاحب کو شعری تلازموں پر دھواں دھار گفتگو کرتے دیکھتی۔ یہیں پہلی ملاقات پنڈت ہری چند اختر سے ہوئی، بڑے بخاری صاحب سے ہوئی، جگن ناتھ آزاد سے، ایران کے بہت سے شاعروں سے اور اس زمانے کے نوجوان لکھنے والوں یعنی ناصر کاظمی، شہزاد احمد اور ایک آدھ دفعہ سید سبط حسن سے ملاقات ہوئی۔

سید صاحب اس زمانے میں فیروز سنز میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کرتے تھے اور بعد میں لیل و نہار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان سے ملاقات ہوئی اور میری پہلی غزل شائع ہوئی۔ ہر چند اس سے پہلے اسی شمع تاثیر کے مشاعرے والی نظم، جس کو پہلا انعام ملا تھا۔ میرزا ادیب، ادب لطیف کے لیے لے کر گئے تھے اور یوں وہ نظم شائع ہوئی تھی۔

اُسی زمانے میں صوفی تبسم، خانۂ فرہنگ ایران کے منتظم اعلیٰ لگ گئے۔ اب جب بھی جوش صاحب خانۂ فرہنگ ایران آتے تو یہ شام کا وقت ہوتا۔ یہیں ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور جب انہیں میری شاعری کی خبر پہنچی تو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ البتہ جب میں نے کہا ''ارشاد فرمایئے، کیا کھانا لگا دوں''۔ جھٹ بولے ''ہمارے یہاں تو پان لگائے جاتے ہیں''۔ میں پھر بولی ''اچھا تو کھانا نکال دوں''۔ تڑ سے جواب دیا ''گھر سے نکالا کرتے ہیں''۔ میں نے زچ ہو کر کہا ''اچھا اب کھانا کھا ہی لیجیے''۔

فیض صاحب جب بھی جوش صاحب کے سامنے ہوتے، میں نے ان کو جوش صاحب سے کوئی علمی بحث کرتے نہیں سنا تھا۔ فیض علمی بحث، ہمیشہ صوفی صاحب کے ساتھ کیا کرتے تھے اور وہ بھی فارسی کی تراکیب کے حوالے سے یا پھر میں نے اس زمانے میں تقریباً روز ہی فیض صاحب کو صوفی صاحب کے گھر دیکھا کہ جب وہ کلام اقبال (فارسی) کا اُردو ترجمہ کر رہے تھے اور صلاح و مشورے کے لیے آتے تھے۔ اب میں بڑی ہو گئی تھی اور کبھی کبھار میں بھی ایک آدھ فقرہ بول لیتی تھی۔

مگر جب ۱۹۶۰ء میں اچانک میری شادی ہو گئی تو اس حادثے کو بتانے کے لیے میں ریڈیو پاکستان کے سامنے والے شملہ پہاڑی کے اوپر والے گھر میں، صبح ناشتے کے وقت پہنچ گئی۔ فیض صاحب اور مسز فیض کھانے کی میز پر تھے۔ میری گھبراہٹ اور نوکری کی فوری ضرورت کو رونے والی آواز میں سن کر، شاید فیض صاحب نے ہی میر نسیم محمود جو ڈائریکٹر جنرل لوکل گورنمنٹ تھے، کو کہا کہ مجھے نوکر رکھ لیں کہ انہیں اپنے ''دیہات سدھار'' پرچے کے لیے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر چاہیے تھا۔

یہاں میری تہری نوکری شروع ہوئی۔ صبح پانچ بجے اُٹھ کر ناشتہ اور گھر کی صفائی، سات بجے بس کے ذریعہ یونیورسٹی، ۱۱ بجے یونیورسٹی سے کمن آباد دفتر، ۴ بجے شام دفتر سے

گھر، پھر وہی ہوم ورک اور باورچی خانہ۔

اب صوفی صاحب کو شامیں آباد کرنے کے لیے ایک اور گھر مل گیا تھا۔ مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ ایک کمرے کا گھر، اس نے کس کس بڑی شخصیت کو لطف و شادمانی نہیں بخشی، مگر سب گروپ اس زمانے ہی میں الگ الگ آتے تھے۔ صوفی صاحب کے ساتھ فیض صاحب، سرفراز صاحب، مسعود پرویز، خواجہ خورشید انور، ڈاکٹر حمید الدین اور شیر محمد صاحب کے علاوہ میر نسیم محمود اور ستنام محمود ضرور ہوتے تھے۔

احمد راہی کے ساتھ، اے حمید، شاد امرتسری، عدم صاحب، ظہیر کاشمیری، غفور بٹ اور نجانے کتنے فلم سے متعلق لوگ آجاتے تھے۔ کبھی یہ نشست ہمارے گھر اور کبھی تہہ خانے میں غفور بٹ کے گھر اور دفتر میں ہوا کرتی تھی۔

فیض صاحب بیچ بیچ میں لمبے وقفے کے لیے غائب ہوجاتے تھے۔ جب وہ لینن انعام لینے کے لیے گئے تو ان کی واپسی پہ جشن کیا گیا۔ جب وہ بیروت سے مستقل واپس آئے تو ہم نے ان کی سالگرہ کا پروگرام بنایا۔ انہوں نے پورے پروگرام کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دی۔ لوگ آتے تھے میرے دفتر، پوچھتے تھے "ہمارے سپرد سالگرہ کا کوئی کام"۔ میں کہتی "اقبال بانو کے ملتان سے آنے، ٹھہرنے اور گانے کا خرچ آپ کے سپرد"۔ وہ کہتے "بجا"۔ اب دوسرے صاحب آتے "کوئی ذمہ داری"۔ "جی آپ ہوٹل میں ایک ہزار لوگوں کی چائے کا بل دے دیجئے گا"۔ اب ایک اور صاحب داخل ہوئے "میرے لیے کیا خدمت"۔ "آپ شام کو پچاس لوگوں کے لیے فراواں کھانے کا انتظام کر دیجئے"۔ کوئی اور صاحب آئے "میں کیا خدمت کرسکتا ہوں"۔ "آج شام کی شراب آپ کے ذمے ہے"۔

نہ مجھے معلوم ہوا، ان لوگوں کا نام کیا ہے، نہ انہوں نے مجھ سے نام پوچھا۔ نہ میں نے ان کو یاد دہانی کروائی۔ نہ انہوں نے اس کا موقع دیا۔ ارشد محمود، نیرہ یا ٹینا کا تلفظ اور گائیکی کا مرحلہ یا مسئلہ طے کرنا، شعیب ہاشمی کا کام تھا۔ البتہ رات بھر ایلس فیض حیران پریشان پھرتیں کہ فلاں نے گلاس بغیر میٹ کے رکھ دیا ہے۔ میز پر نشانات پڑ جائیں گے۔ پھر چاہے رات کو تین بجے دعوت ختم ہو، صبح تک ایلس کو گھر کو دوبارہ سلیقے میں لانا ہے۔ پھر آرام کرنا ہے۔

بیروت سے واپس آنے کے بعد، انہوں نے ایک اور گھر ماڈل ٹاؤن میں لیا جو منیزہ کے نام سے تھا۔ اس میں رہنے کو اپنے لیے ٹاؤن ہاؤس بنایا اور یہ پارٹیز ہم لوگ اُسی گھر میں کیا کرتے تھے۔ اب تو وہ گھر بھی نہیں رہا۔ ان کی بیٹی نے ابا کی یہ نشانی بھی ختم کردی ہے۔

اس زمانے میں مَیں تیسری مرتبہ پھر نیشنل سنٹر کی ڈائریکٹر بنی۔ اس کی بڑی خوبصورت لائبریری تھی۔ یہاں ایک کونے میں م۔ش آکر بیٹھتے اور کالم لکھتے اور سامنے نوائے وقت کے دفتر دے کر چلے جاتے، کبھی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کوئی فنکشن ہوتا تو گھنٹہ پہلے آجاتے اور کتابیں پڑھتے۔ فیض صاحب کا فون آتا "بھئی ہمیں بلالو"۔ میرے دفتر کی گاڑی جا کر لے آتی۔ جہاں جہاں یہ لوگ پڑھنے کو بیٹھتے، وہیں چپڑاسی کو ہدایت تھی کہ ہر گھنٹے بعد چائے دے دی جائے۔ فیض صاحب چند گھنٹے بعد، میرے دفتر میں آجاتے اور پھر ان کو گھر چھوڑ دیا جاتا۔

وہ مجھ سے کہتے "تم عورت بن کر کیوں شاعری کرتی ہو"۔ میں کہتی "فیض صاحب میں عورت ہوں۔ پر وہ عورت نہیں جو آپ کی شاعری کی محبوبہ ہے"۔ وہ کہتے "بھئی ہم نے تو اس کے علاوہ عورت کے بارے میں سوچا ہی نہیں"۔

جب منیزہ ان کے گھر کے بیک یارڈ میں اپنا گھر بنا رہی تھی تو مجھے بار بار فیض صاحب کا وہ درختوں کا دکھانا اور بڑے دھیان سے کہیں امرود، کہیں انار اور کہیں مالٹوں کے درخت لگواتے ہوئے کرسی پہ بیٹھے بیٹھے خوش ہونا، مسلسل یاد آرہا تھا۔

ایک زمانے میں فیض صاحب بیمار ہوئے، میو ہسپتال میں داخل تھے۔ سلیمہ کا فون آیا "تمہیں بلا رہے ہیں"۔ خاص اجازت ملی اندر جانے کی، کان ان کے ہونٹوں کے قریب

لے کر گئی" وہ ساری نئی شاعری کی کتابیں لاؤ، جو تم ہمیں سمجھاتی رہتی ہو"۔ میں بہت خوش ہوئی۔ زاہد ڈار، عباس اطہر، انیس ناگی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کی نثری نظم کی کتابیں لے گئی۔ دس دن گزر گئے۔ خیر سے فیض صاحب گھر لوٹ آئے، سالگرہ کا دن بھی آ گیا۔ جموں یونیورسٹی کے پروفیسر مظہر امام صاحب نے ضد کی کہ میں انہیں فیض صاحب کے گھر لے چلوں۔ میں نے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ غزل آزاد کہتے ہیں"۔ فیض صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا "لاحول ولاقوۃ"۔ پھر میں نے پوچھا "آپ کو جدید شاعری کی کتابیں کیسی لگیں"۔ بولے "بھئی ہم ایسی شاعری نہیں کر سکتے"۔

یوسف کی موت پر وہ صبح سلیمہ کے ساتھ آتے تو شام کو شعیب کے ساتھ مگر چین نہیں پڑتا تھا۔ ضد کر کے آتے، چند لمحے ٹہلتے یا میرے پاس بیٹھتے اور پھر چل پڑتے۔

صوفی صاحب کی موت کا بھی انہیں بہت غم تھا۔ اُسی زمانے میں سارتر کا انتقال ہوا تھا۔ کسی نے فیض صاحب سے افسوس کرتے ہوئے کہا "سارتر مر گیا"۔ فیض صاحب نے بے ساختہ کہا "اور صوفی صاحب بھی تو چلے گئے"۔

دو مرتبہ ایسے ہوا کہ فیض صاحب کی سالگرہ، کسی دوست کے گھر میں منائی گئی۔ ایک محفل میں میڈم نور جہاں بھی تھیں۔ وہ ساری شام فیض صاحب کا کلام بغیر سازوں کے سناتی رہیں۔ ایک اور شام میں فریدہ خانم موجود تھیں اور انہوں نے تمام شام فیض صاحب کی پسندیدہ غزلوں کو اُسی وقت دھن میں سمویا اور گایا۔ یہ شام اس لیے نہیں بھولتی کہ فیض صاحب کی ایک محبوب شخصیت کی وفات چند روز پہلے ہوئی تھی۔ یہ کراچی کا واقعہ ہے۔

یہ غزل برنگ نوحہ تھی جس کو فریدہ خانم سے سُن کر، کبھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔ آخری سالوں میں فیض صاحب نے دو تین جام کے بعد، بولنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی وہ اپنے بچپن کا احوال سناتے، کبھی امرتسر کالج کا، کبھی فوج میں شامل ہونے کا اور کبھی اپنے گاؤں کا۔

کوئی ایسا موقع تھا کہ منٹو صاحب کے لیے جلسہ تھا، اس کے بعد ہم نے فیض صاحب سے پوچھا، آپ منٹو صاحب کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ بولے "بھئی وہ امرتسر میں ہمارا شاگرد تھا۔ کلاس میں مگر کبھی کبھی آتا تھا۔ ایک دن ہم نے بلایا، پوچھا "بھئی کلاس میں نہیں آتے، کیا کرتے رہتے ہو"۔ بولا "پڑھتا رہتا ہوں"۔ "کسے پڑھتے ہو"۔ "چیخوف، ٹالسٹائی کو"۔ "تو پھر یہ کہانی ذرا ترجمہ کر کے لاؤ"۔ فیض صاحب نے جب وہ ترجمہ دیکھا تو کہا "ٹھیک ہے تمہیں کلاس میں آنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ پڑھو اور ترجمہ کرو۔

ایک دفعہ میں نے کہا "فیض صاحب آج کل آپ نرودا سے بہت متاثر نظر آ رہے ہیں۔ یہ "سمندر آنکھیں" جیسی ترکیبیں تو نرودا کی ہیں"۔ بولے "بھئی اتنے بڑے شاعر کا اثر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے"۔

ٹیلی ویژن کے شروع کا زمانہ تھا۔ مجھے اور افتخار جالب کو انٹرویو لینے کے لیے کہا گیا۔ ہم دونوں نے بڑی تیاری کی۔ بڑے سوالات کیے۔ وہ سیدھے سبھاؤ اتنی آسانی سے جواب دیتے گئے کہ ہماری تیزی دھری کی دھری رہ گئی۔ آخری سوال بڑا توپ بجھ کر ہم نے کیا "آخر آپ حبیب جالب کی طرح شعر کیوں نہیں کہتے ہیں؟" مسکرا کر بولے "ہمیں یہ انداز نہیں آتا۔ ہاں حبیب جالب بڑے شاعر ہیں"۔

۱۹۷۳ء میں افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں مجھے بھی الماتا بھیجا گیا۔ یہاں فیض صاحب نے مریم سالگانیک، رسول حمزہ، زلفیہ خانم، چنگیز اتماتوف اور روز نے سینگی سے ملاقات کروائی۔ لدمیلا تو اُسی زمانے سے دوست بنی۔ فیض صاحب نے حوصلہ دیا کہ ساری کانفرنس کے سامنے بولو۔ فیض صاحب نے ہر شام دوستوں کی محفلوں میں مجھے شعر سنانے کو کہا۔ میرے اندر کی مٹی یوں سونا بنتی گئی۔

ایک دفعہ ہندوستان جانا تھا مگر ان پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ ملاقات کے لیے ضیاء الحق سے وقت مانگا۔ اس نے تو فوراً بیتاب ہو کر وقت دیا۔ ہم سب مرجھا گئے۔ خفگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا "دیکھیے میرے بھی تو آگے پیچھے پولیس لگی

ہوتی ہے"۔ کہنے لگے "ہم یہ زمانے جوانی میں دیکھ چکے، اب ہماری عمر جیل جانے کی رہی نہیں"۔

ایک دفعہ کسی ملک کے سفر سے پاکستان آئے، کراچی اُترے، انہیں بتا دیا گیا "آپ یہاں نہیں رہ سکتے ہیں"۔ "بولے بھئی رات ہے صبح جو جہاز ملے گا چلے جائیں گے"۔ آمنہ آپا کے یہاں ٹھہرے وہیں سے نظم "مرے دل مرے مسافر" بھجوائی، جو تمام تر پابندیوں کے باوجود، میں نے ماہِ نو میں شائع کی۔

وفات سے کوئی آٹھ دن پہلے، مجھے اور حمید اختر کو بلا کر کہنے لگے "بھئی ہمارا ایلس سے جھگڑا ہوتا ہے۔ ہم دوپہر کو ڈبل روٹی نہیں کھا سکتے ہیں۔ یہ ابھی تک انگریز ہیں۔ بتاؤ اس مسئلے کا حل کیا ہے"۔ ہم دونوں نے کہا "نئے نئے انگریزی پرچے نکل رہے ہیں۔ آپ اپنی یادداشتیں لکھیں۔ اتنے پیسے ملیں گے کہ آپ خانساماں رکھیں، خود بھی کھائیں اور ہمیں بھی کھلائیں"۔

وہ مہلت ہی نہیں ملی۔ یہ وہ دن بھی تھے جب سگریٹ چھڑائی جا چکی تھی، صرف ریڈوائن کبھی کبھی ایلس سے چھپ کر پی لیتے تھے۔ کرکٹ بہت شوق سے دیکھتے تھے اور کتابیں پڑھتے تھے۔

راشد صاحب اور کبھی حفیظ صاحب، ان پر چوٹ کرتے تھے۔ وہ کبھی تلخ نہیں ہوتے تھے۔ بس درگزر کرتے تھے۔

الماتا میں کانفرنس ڈیکلیریشن میں کشمیر کے بارے میں صائب ذکر نہ ہونے پر فیض صاحب نے اتنی لڑائی کی تھی کہ ڈیکلیریشن نہ صرف بدلا گیا بلکہ اگلے دن تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

چند دن بعد ہمارے سب کے خلاف لکھنے والے اخبار نے متروک ڈیکلیریشن شائع کیا اور خوب نمک مرچ لگا کر فیض صاحب کا اور میرا نام لکھا۔ میں نے طیش میں آ کر فیض صاحب کو فون کیا کہ آپ تردید کریں بولے "تمہارا نام بھی تو ہے۔ تم کرو۔ بھئی ہم اس اخبار کی کسی بات پر تبصرہ نہیں کرتے ہیں"۔

منور حفیظ اور حفیظ الرحمٰن، کی طرح عابد شاہ اور نازی نے بھی ان کی اس قدر خدمت کی کہ بھلائے نہیں بھولتی ہے۔

ہم نے ایک زمانے میں پوئٹری فورم شروع کیا۔ مقصد تھا کہ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر لاہور کے نئے شاعروں اور لاہور میں مہمان آنے والے شاعروں کا کلام سنا جائے۔ منتخبہ نظمیں، تین اہم لوگوں کو دے دی جاتیں تا کہ وہ ان نظموں پر تبصرہ کریں۔ اس سلسلے میں توفیق رفعت، استاد دامن اور فیض صاحب جیسی شخصیات کے علاوہ پہلی دفعہ لاہور کے لوگوں نے عشرت آفریں اور تنویر انجم کو بھی سنا۔

فیض صاحب نے کبھی بھی کہیں جانے پہ نخرا نہیں دکھایا۔ ہم لوگ ان کی اتنی سادگی پر برہم بھی ہوتے۔ کہتے یہ کیا ہے آپ اس صنعت کار، اس دکاندار، اس سیاست دان کے گھر چلے گئے تھے، ایسا کیوں کیا، کیوں گئے۔ کوئی وضاحت نہیں کرتے، جواب بھی بہت کم دیتے۔ بس سگریٹ پیتے ہوئے مسکراتے رہتے اور میں جب بہت بولتی تو کہتے "اچھا اب چپ کرو"۔

فیض صاحب روس گئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں انہیں بھٹو صاحب نے اپنا ایڈوائزر اور پی۔ این۔ سی۔ اے کا چیف ایگزیکٹو لگایا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں آج کل بہت وضاحتیں کرنے والے حفیظ پیرزادہ صاحب اور خالد سعید بٹ نے، وہ جو کہتے ہیں تختہ اُلٹ دیا۔ فیض صاحب واپس آئے تو گھر بیٹھ گئے۔ بھٹو صاحب کو جب خبر ہوئی تو وہ خاص طور سے لاہور آئے فیض صاحب سے ملنے۔ ضد کی کہ جاؤ اور جس طرح کا دفتر چاہیں آپ بنالیں مگر آپ کام میرے ساتھ کریں گے۔ مجھے یاد ہے چھوٹی گلبرگ مارکیٹ سے پہلے ایک گھر کرائے پر لے کر انہوں نے دفتر بنایا۔ شیخ صاحب جو ریلوے سے ریٹائر ہوئے تھے اور موسیقی کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ انہیں اپنے ساتھ ملایا، برصغیر کی موسیقی کے ذخیرے اکٹھے کرنے شروع کیے۔ بھٹو صاحب کے جاتے ہی یہ دفتر بھی گول کر دیا گیا۔ البتہ موسیقی کے ذخائر معہ شیخ صاحب، ریڈیو پاکستان لاہور کی بیسمنٹ میں منتقل کر دیئے گئے۔

اب زمانہ آیا تاریکیوں کا، کوڑوں کا، سنسر شپ کا، فیض صاحب کو یاسر عرفات نے

’’لوٹس‘‘ کا ایڈیٹر لگا کر بیروت بھیج دیا۔ جب تک بیروت نہیں اجڑا حتیٰ کہ وہ مکان جہاں فیض صاحب رہتے تھے، بمباری سے تباہ نہیں ہوگیا فیض صاحب بیروت ہی میں رہے۔ پھر پاکستان آکر کہا ’’اب کہیں نہیں جاؤں گا‘‘۔ مگر اولاد کے لیے فیض صاحب کو بھی اپنے اوپر جبر کر کے پاکستان کے فرینکو سے ملنا پڑا۔ جب سی آئی ڈی لگی تو باہر جانے کی اجازت لینے کے لیے بھی اس فرینکو سے ملے۔ ہم نے بہت بُرا مانا۔ احمد فراز نے تو کئی دفعہ جھگڑا بھی کیا۔ مگر کیا کرتے بیٹی بضد تھی کہ اس کا ٹرانسفر رکوایا جائے۔ فیض صاحب سے بھٹو صاحب کے زمانے میں سرکاری افسر پوچھتے یہ کام کس سے کروائیں تو وہ آرام سے کہہ دیتے ’’بھئی سلیمہ اور شعیب سے مشورہ کرلیں‘‘۔ یہ سچ ہے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بہت سچا اور بے لوث پیار دیا۔ ایسے لمحے بھی آئے کہ انہوں نے اپنی عزت کی پاسداری کو ترک کیا۔ بیٹیوں کو سکھ پہنچایا۔ البتہ ایک بات تھی۔ ہر چند ہر سال وہ اور ایلس علاج اور چیک اپ کے لیے سوویت یونین جاتے تھے مگر کبھی انہوں نے سوویت روس کی مدح میں نظم نہیں لکھی۔

اپنے شہر سے نکلتے تو ان کے کچھ گھر متعین تھے جہاں وہ بلا تکلف جا کر ٹھہرا کرتے تھے۔ آمنہ مجید ملک کا گھر کراچی میں، سرفراز اقبال کا گھر اسلام آباد میں، ملتان میں عفت ذکی کا گھر تھا۔ لاہور میں ندرت الطاف کے دفتر میں جا کر بیٹھنا ان کو اچھا لگتا تھا۔ لندن میں زہرہ نگاہ کے گھر رہا کرتے تھے۔

لوگوں نے بہت کوشش کی فیض صاحب اور راشد صاحب کو لڑوانے کی۔ راشد صاحب برہم بھی ہوتے تھے اور اس بات سے چڑ بھی جاتے تھے کہ لوگ فیض صاحب کو ان کے مقابلے میں بڑا شاعر کیوں کہتے ہیں مگر فیض صاحب سے جب بھی ذکر ہوا وہ ہمیشہ راشد صاحب کی تعریف بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ اس طرح دو ایک دفعہ ہمارے ساتھ چل کر قاسمی صاحب کے پاس بھی گئے۔ یہی ان کی بڑائی تھی۔

میجر اسحٰق، مرزا ابراہیم، عبداللہ ملک، حمید اختر اور آئی۔ اے رحمٰن، ان سب سے ملاقاتیں، فیض صاحب کے توسط سے ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں بعد ازاں، الگ الگ دوستی کی شکل اختیار کر گئیں۔

بڑے بڑے مشکل لوگ یعنی مظہر علی خاں اور طاہرہ سے ملاقاتیں یا پھر الف رسل، آغا حمید، مجید ملک، سبط حسن اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی۔ یہ سارے لوگ میری زندگی کی رحل پہ رکھے صحیفے ہیں۔ وہ مظہر علی خاں جو ہر کام وقت پر کرتے تھے، فیض صاحب کے سامنے بولتے بھی نہ تھے۔ شاکر علی واحد شخص تھے جو بالکل ہی نہیں بولتے تھے۔ فیض صاحب ان کو چپ دیکھ کر خود بولنا شروع ہوجاتے تھے۔

فیض کے تراجم کے سلسلے میں پہلا ترجمہ وکٹر کیرنین نے کیا تھا۔ ہم لوگوں کو پسند نہیں آیا، یہ تو بعد میں اندازہ ہوا کہ بعد ازاں جس قدر تراجم ہوئے وہ اس قدر خراب تھے کہ آخر وکٹر کے تراجم ہی بہتر لگنے لگے۔

جب میں ۱۹۷۳ء میں الماتا پہنچی تو ایئرپورٹ پر خبر ملی کہ رات دو بجے کے قریب فیض صاحب اور سجاد ظہیر صاحب بے ہوش ہوگئے تھے۔ ہسپتال میں ہیں۔ میں چونکہ صبح چار بجے پہنچی تھی۔ اس لیے ہوٹل جاتے ہی سوگئی۔ صبح ناشتے کے لیے نیچے اُتری تو فیض صاحب کو منتظر پایا۔ کہنے لگے ’’تم پہلی دفعہ روس آئی ہو۔ تمہارا استقبال کرنا تھا۔ اب تم پاکستان کی نمائندگی کرو گی‘‘۔ میں سارا دن تقریریں کرتی اور جگہ جگہ انٹرویو دیتی جب واپس آتی تو فیض صاحب مریم سالگانیک، ڈاکٹر ستاچوف لدمیلا اور بے شمار دوستوں میں گھرے، کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا اور گفتگو قہقہوں سے لبریز چھلک رہی ہوتی تھی۔ میں کہتی ’’آپ بھی باہر نکل کر گھوم آئیں نا۔ دیکھیں میں نے وہاں وہاں کی سیر کی‘‘۔ کہتے ’’ہم تو ہر روز آتے ہیں۔ ہم تھک چکے ہیں سب کچھ دیکھ کر‘‘۔

میں نے زندگی میں بہت کم مشاعرے پڑھے ہیں۔ دو چار مشاعرے فیض صاحب کے ساتھ بھی پڑھے۔ سب چھوٹے بڑے شاعروں کے ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ نہ کبھی میں نے ان کو لفافے میں سے پیسے نکال کر گنتے
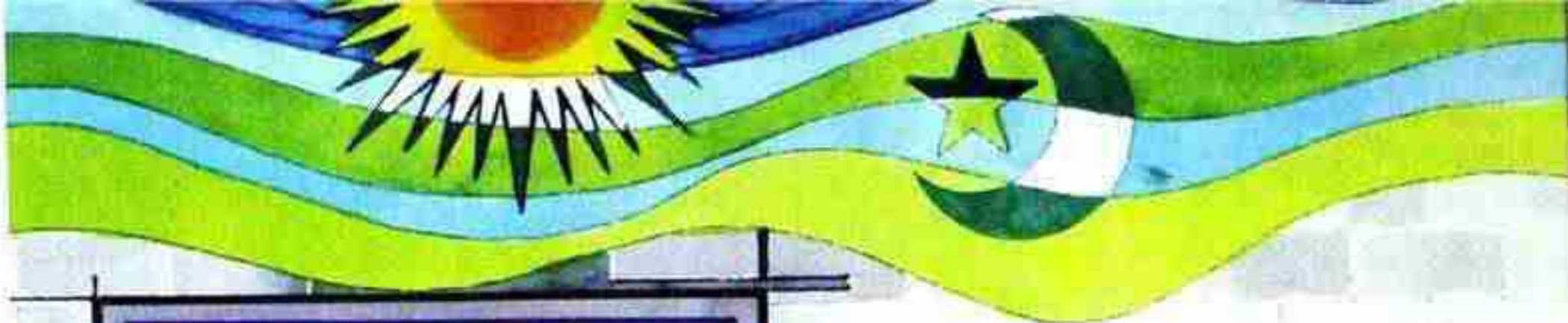
میرے ملنے والے
عمل: اسلم کمال

یاد
دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
عکس: اسلم کمال

دیکھا اور نہ کبھی یہ دیکھا کہ جب وہ پڑھ رہے ہوں تو کہیں سے کوئی آواز آ رہی ہو۔ نوجوان شاعروں کو نہ صرف دھیان سے سنتے بلکہ جس کا شعر پسند آتا، وہ دوسروں کو بھی سنواتے۔ سلیم شاہد کا یہ شعر کہ

باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
بیٹھا ہوں میں گھر میں در و دیوار پہن کر

اس قدر اور اتنی مرتبہ دہرایا، لوگوں کو سنایا اور پھر مجھے فخر ہے کہ میرا ایک شعر۔

کچھ اس قدر تھی گرمئی بازار آرزو
دل جو خریدتا تھا اُسے دیکھتا نہ تھا

انہوں نے شوکت ہارون کا نوحہ لکھا اور ''ہم آگئے تو گرمئی بازار دیکھنا'' اس میں لکھا تو مجھے بڑی خفت ہوتی تھی جب وہ کہتے کہ بھئی اس مصرعے کے لیے تو ہم کشور کے شکر گزار ہیں۔ اس طرح محمد خالد اختر کے ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' کی ہر جگہ تعریف کرتے تھے حالانکہ ان کی ملاقات محمد خالد اختر سے بالکل نہیں تھی۔

جب لوگ ان کو سویت روس سے وابستگی کے باعث، دہریہ کہتے تو تکلیف ہوتی مگر پھر بھی وہ نہیں بولتے تھے۔ ہم لوگ بتاتے تھے کہ فیض صاحب نے تو عربی میں ماسٹر کیا ہوا ہے۔ ابن انشاء کے لندن میں انتقال اور کراچی میں تدفین کے باعث، لاہور کے ادیبوں نے اشفاق احمد کے دفتر کے لان میں فاتحہ خوانی کا اہتمام کیا۔ فیض صاحب بیٹھے سیپارہ پڑھ رہے تھے۔ کچھ ضیاء الحق کے چہیتے ادیب آئے اور بے ساختہ بولے ''ارے فیض صاحب کو عربی آتی ہے''۔ یہ سن کر بہت سے لوگ ہنس پڑے کہ تم لوگ اتنے جاہل ہو۔ وہ لوگ کھسیانے ہو کر کونے میں بیٹھ گئے۔

فیض صاحب کی نظم ''آج بازار میں پا بجولاں چلو'' فارسی میں ترجمہ کر کے، ان کی سترویں سالگرہ پر بی بی سی سے نشر کی گئی۔

نعمان الحق نے لندن میں جب فیض صاحب کو یہ بتایا تو فیض صاحب نے بڑی طمانیت کے ساتھ کہا ''بھئی ہمارے عقیدت مند اپنی محبتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں''۔

قزلباش حویلی سے دسویں کی شب، شب عاشور کی مجلس سننے کے لیے ہم لوگ بھی شاکر علی اور فیض صاحب کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ ذوالجناح کے نکلنے تک وہاں ٹھہرتے، ہماری تواضع بہت ہوتی اس لیے کہ ہم فیض صاحب کے ساتھ ہوتے تھے۔ باقر خانیاں، کشمیری چائے، حلیم، کیا کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا۔

فیض صاحب جب تک زندہ رہے، کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ فیض صاحب کے یہاں سب لوگ جمع ہوں۔ البتہ ان کی سالگرہ پہ، سارا انتظام باہر سے مگر ان کے گھر پہ پارٹی ہوتی تھی۔ ایلس واقعی انگریز تھی۔ یہ گھر کا ڈسپلن تھا، جس نے فیض صاحب کو بھی مجتمع شخصیت کے طور پر منظم رکھا۔

ایلس نے بھی رنڈاپے کے ۱۷ سال گزارے۔ کئی دفعہ بیمار ہوئی مگر انسانی حقوق کی تنظیم کی دو منزلہ سیڑھیاں چڑھ کر ہفتے میں دو دفعہ کام کرنے ضرور جاتی تھیں۔ نواسے، نواسیوں سے بہت پیار تھا، شروع میں تو پالا ہی انہوں نے اور ان کی زندگی کے وہ آخری سال جب وہ چلنے سے بھی معذور ہو چکی تھیں، سلیمہ ان کو اپنے گھر لے آئی تھیں۔ اب تو سنائی بھی کم دیتا تھا۔ بستر پر لیٹی کتاب پڑھتی رہتی تھیں۔

فیض صاحب نے کبھی لمبی بیماری نہیں کاٹی۔ نظمیں بھی انہوں نے بہت لمبی نہیں لکھیں۔ رشتے جہاں جہاں قائم ہوئے، ان کو خلوص سے زندہ رکھا۔

فیض صاحب کی مقبولیت کے صحیفے کس کس انداز سے لکھوں۔ کبھی ہم لاہور کوسموپولیٹن کلب جاتے یا پھر پنڈی کلب، منظر ایک جیسا ہی ملتا۔ ہم لوگ ابھی ایک ایک پیگ کا آرڈر دیتے کہ دس منٹ کے اندر کیا دیکھتے کہ کبھی اس میز سے کبھی اس میز سے فیض صاحب کے لیے جام لیے، ایک بیرا ہماری میز کی سمت بڑھ رہا ہوتا۔ بتاتا کہ پیگ فیض کے لیے فلاں میز سے بھیجا گیا ہے۔ یہ سلسلہ متواتر چلتا اور ہر روز چلتا۔ لوگوں کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ خود اُٹھ کر ہماری ٹیبل تک آ جائیں۔ تہذیب کا زمانہ تھا۔ کم علم لوگ اپنی عقیدت کا اظہار کیا کرتے تھے اور اس طرح فاصلے پہ رہتے تھے۔

کالج کا طالب علم ہوں اور فیض صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی سوالوں کی بوچھاڑ ہوگئی۔ اور میں ہر سوال کا جواب اطمینان سے دیتا گیا۔ شاید اس لیے کہ ان سوالوں کی اہمیت کا احساس ہی نہیں تھا۔ سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو ان صاحب نے فیض صاحب کی تعریفیں شروع کر دیں اور یہاں تک کہا کہ وہ اکثر ان کے پاس چلے جاتے ہیں اور ان کی باتوں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر واقعہ جیلر صاحب نے بیان کیا وہ یہ کہ فیض صاحب اور جیلر صاحب دونوں آج کل فرانسیسی پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں اورینٹل کالج میں شام کے وقت فرانسیسی زبان کا ڈپلومہ کر رہا ہوں اور یہ میرا آخری سال ہے تو وہ حضرت فوراً ہی فرانسیسی کی کتاب نکال لائے اور میرے ساتھ گرائمر سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب میں نے اپنا سوال پھر دہرایا کہ جیلر صاحب مجھے فیض سے ملنے تو دیں۔ جیلر صاحب کا جواب تھا کہ یہ ان کے بس میں نہیں۔ لیکن اگر تین دن میں برابر آتا رہا تو شاید ان کے لیے ایسا ممکن ہو۔ چونکہ میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا اس لیے ان سے اجازت لے کر فیض صاحب کو ملے بغیر میں واپس لاہور آ گیا۔

یہ واقعہ اس لیے بیان کیا کہ ایلس کے وہ الفاظ "Why not, If you have the guts" ساری زندگی میری راہنمائی کرتے رہے۔ فیض سے منٹگمری جیل میں ملنے میں ناکام رہا یا زندگی کے دوسرے معاملات میں کامیاب۔ ایلس کے ان الفاظ کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

۱۹۵۹ء میں ایم اے (انگریزی) کرنے کے بعد بلکہ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی مجھے حکومت فرانس کی طرف سے ایک سال کا وظیفہ ملا۔ فرانسیسی زبان سیکھنے کے لیے۔ ظاہر ہے اتنی ہمت نہیں تھی کہ اتنی خوبصورت آفر کو ٹھکرا سکوں۔ فوراً مان لیا۔ خیال یہ تھا کہ ایک سال فرانس میں گذارنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی سے (B.C.L) قانون کی ڈگری حاصل کریں گے۔ مگر ہائے رے قسمت اسے تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک سال پیرس میں گذارنے کے بعد اسے چھوڑنے کو طبیعت ہی نہیں چاہی۔ فرانسیسی حکومت بھی ساتھ دیتی رہی ایک سال کا وظیفہ مزید چار سال میں منتقل ہوگیا۔ دو سال فرانسیسی زبان اور فرانسیسی ادب کے دو ڈپلوموں کے بعد ComparativeStudies میں ڈاکٹریٹ کا ارادہ کیا اور یوں تقریباً ساڑھے سات برس تک پیرس میں قیام کیا۔ ۱۹۶۶ء میں جبکہ میں اپنی Thesis یونیورسٹی میں داخل کر چکا تھا، مجھے جناب انور بیگ صاحب کی وساطت سے یونیسکو میں چھ مہینے کا کنٹریکٹ مل گیا اور یہیں پر میری ملاقات جناب قدرت اللہ شہاب سے ہوئی جو ان دنوں پاکستان میں شعبہ تعلیمات کے مرکزی سیکرٹری تھے۔ باتوں باتوں میں شہاب صاحب نے مجھ سے تعلیم ختم کرنے کے بعد آئندہ پروگرام کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت میرے یونیورسٹی کے ڈائریکٹر نے میرا نام کینیڈا کی ایک یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر بھجوا دیا تھا اور قوی امکان تھا کہ مجھے وہاں نوکری مل جائے گی۔ ویسے بھی مجھے پڑھانے کا بہت شوق تھا کیونکہ اس کے ساتھ میں اپنی Research کا دائرہ بھی وسیع کر سکتا تھا۔ جب شہاب صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ ان کی دلیل تھی کہ اتنا پڑھ لکھ لینے کے بعد میں اپنے ملک واپس کیوں نہیں جاتا۔ جبکہ وہاں بھی سراج صاحب کے زیرِ انتظام پنجاب یونیورسٹی میں Comparative Studies کا شعبہ کھولنے کا انتظام ہے اور جب تک وہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچے، میں بڑی آسانی سے یونیورسٹی میں Reader in French کی پوسٹ سنبھال سکتا ہوں، جذباتی تو میں ہوں ہی، ان کی جذباتی باتوں میں آ کر فوراً پاکستان کا رُخ کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ ہی یونیورسٹی میں ComparativeStudies کا شعبہ کھلا اور نہ ہی Reader in French کی نوکری مجھے ملی۔

انہیں دنوں سٹیج پر کام کرنے کا موقع ملا اور یہیں سے فنکاروں کی سیاست میں حصہ لینے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ آرٹس کونسل لاہور کی اس وقت کی انتظامیہ کے فنکاروں کے ساتھ ناروا سلوک اور فنکاروں کی بے چارگی نے توجہ ان کے حقوق کی طرف دلائی اور انہی حقوق کی پاسداری کے لیے میں نے Artists Equity کا قانونی مسودہ تیار کیا اور ایک باقاعدہ جماعت بنا ڈالی۔ انہیں دنوں آرٹ اور کلچر پر بنائی گئی جناب ایوب خان کی ایک کمیٹی کا بہت چرچا تھا۔ اس کمیٹی کے سربراہ فیض صاحب تھے۔ اور ان کی ایک رپورٹ بھی منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ اس رپورٹ پر ہم لوگوں نے بھی نظر ڈالی اور اس رپورٹ کے خلاف اپنے تحفظات حکومت پاکستان کو بھجوا دیئے۔ اسی ضمن میں دو تین ملاقاتیں جناب قدرت اللہ شہاب سے بھی ہوئیں۔ ہم لوگوں کی تنقید کی اتنی پذیرائی ہوئی کہ اسے ''فیض رپورٹ'' کا حصہ بنا دیا گیا۔

اسی دوران مجھے کراچی میں انشورنس ایسوسی ایشن میں پبلک ریلیشن منیجر کی نوکری مل گئی۔ یہاں میں تقریباً دو سال رہا اور شاید میری زندگی کے سب سے آرام دہ یہی دو سال تھے۔

پھر 1971ء کی جنگ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو صاحب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے روپ میں پاکستان کے حکمران بن کر آئے۔ جس طرح انہوں نے ایک ہاری ہوئی قوم کے مزاج کو تھوڑے ہی عرصہ میں نا امیدی کی گہرائیوں سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں منصوبہ بندی شروع ہو گئی اور چُن چُن کر قابل اور مستحق لوگوں کو قابلیت کے مطابق کام کرنے کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔

اس دور کی ابتداء میں ہی، غالباً فروری ۱۹۷۲ء کو جناب جے اے رحیم صاحب کی زیرِ صدارت ایک بہت بڑی کانفرنس بلائی گئی جس میں اس وقت کی ثقافت اور فنون سے تعلق رکھنے والی تمام برگزیدہ شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ کوئی چالیس کے لگ بھگ لوگ تھے۔ تعجب اس بات پر ہوا کہ نوجوان طبقوں کی نمائندگی میرے ذمہ لگی۔ یعنی کہ مجھے بھی بلایا گیا۔ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ میں بتانے سے قاصر ہوں اس لیے کہ مجھے خود نہیں پتا۔ شاید اس کی وجہ وہ تمام اعتراضات تھے جو ''فیض رپورٹ'' پر میں نے حکومت کو ارسال کئے تھے یا شاید لاہور اور اس کے بعد پھر کراچی میں آرٹسٹ ایکویٹی کے بانی کی حیثیت سے مجھے اس قابل سمجھا گیا۔ یا پھر اس زمانہ کا ایک کامیاب ڈرامہ آرٹسٹ ہونا اس اعزاز کا باعث بنا۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس امر پر اس وقت زیادہ توجہ بھی نہیں دی۔

پاکستان واپسی کے بعد پہلی دفعہ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں بہت ہی آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا اور میری نوکری کسی حکومتی ادارے کی نوکری بھی نہیں تھی جو کہ اکثر لوگوں کو بزدل بنا دیتی ہے۔ میٹنگ شروع ہوئی۔ پہلے جے اے رحیم صاحب نے گل افشانی کی پھر فیض صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ باری باری سب سے رائے پوچھی گئی۔ میری باری آئی تو سب سے پہلے میں نے ''فیض رپورٹ'' کے خلاف اپنی سوچ کا اظہار کیا۔ انداز بیان میں تختی بھی تھی اور منطق بھی۔ جن باتوں کی مخالفت اس وقت کی تھی آج بھی ان پر قائم ہوں تاہم مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر ان دلیلوں کو پیش نہیں کر رہا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ میری تمام باتیں بالکل خاموشی میں سنی گئیں اور کسی نے مجھے بیچ میں نہ ٹوکا نہ روکا۔ کھانے کے وقفہ پر اس وقت کے جوائنٹ سیکرٹری نے مجھے اتنا ضرور کہا کہ میں نے فیض صاحب کی رپورٹ کے خلاف بہت سخت باتیں کیں جو مجھے زیب نہیں دیتیں۔

اس میٹنگ کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ''فیض رپورٹ'' پس منظر میں چلی گئی اور فیصلہ یہ کیا گیا کہ ایک نیشنل کونسل بنائی جائے گی جو ثقافتی پالیسی بنائے گی اور فنون کی ترویج و ترقی کے لیے لائحہ عمل بھی طے کرے گی۔

ہم بڑے اطمینان سے واپس کراچی آ گئے اور چند ہی روز میں اپنی گوناگوں مصروفیت کی بنا پر اس واقعہ کو مکمل طور پر بھول گئے۔

مارچ 1972ء کے پہلے ہفتہ ہی ایک ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے فون کیا اور

دریافت کیا کہ کیا میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کی نوکری پسند کرونگا۔ میں نے ذرا خفگی سے کہا کہ جی نہیں میں یہاں بہت خوش ہوں اور دوسرے یہ کہ میں سرکاری نوکری کرنا نہیں چاہتا۔ بات ختم ہوگئی۔ کوئی ایک ہفتہ کے بعد فون آیا کہ ''بھئی میں فیض بول رہا ہوں۔ آپ سے ملاقات ہوسکے گی؟'' زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں فیض صاحب سے ہم کلام تھا۔ سکتہ سا طاری ہوگیا۔ دوبارہ آواز آئی ''بھئی میں فیض بول رہا ہوں، بٹ صاحب سے بات ہو سکے گی؟''۔ بہت ہمت کی ضرورت تھی اس کیفیت سے باہر نکلنے کی۔ جواب دیا کہ ''جی میں ہی بول رہا ہوں''۔ اس پر فیض صاحب نے کہا کہ ''بھئی ہم کل کراچی پہنچ رہے ہیں دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ ہی کھائیں گے''۔ بات ختم ہوگئی مگر کیفیت برقرار رہی اور وہ تمام احساسات اور جذبات وہ تمام واقعات جو فیض صاحب کے حوالے سے رونپذیر ہوئے ایک فلم کی صورت ذہن سے گزرتے گئے۔ محترمہ ایلس فیض سے گورنمنٹ کالج بس سٹاپ پر ملنا۔ منٹگمری جانا۔ جیلر سے بات چیت، ''فیض رپورٹ'' کے حوالے سے تحفظات۔ رپورٹ کے خلاف محاذ آرائی۔ اسلام آباد میٹنگ کا نقشہ یہ تمام پل بھر میں ذہن میں اُبھر آیا۔ سائرہ نے یہ حالت دیکھی، (سائرہ میری بیوی کا نام ہے) تو ٹیلی فون کے بارے میں پوچھا۔ اسی سکتہ کی حالت میں جواب دیا کہ فیض صاحب کا فون تھا کل دوپہر کھانے کے لئے آرہے ہیں۔ سائرہ نے بیساختگی میں پوچھا کہ کیا ایلس بھی آئیں گی۔ میں نے کہا کہ پتہ نہیں۔ ایلس کا ذکر اس لئے ہوا کہ متعدد بار سائرہ کو ان کے بارے میں بتا چکا تھا۔ خاص طور پر غیر ملکی خواتین سے شادی کے حوالے سے۔ میرے مشاہدے اور حلقہ احباب میں جتنی شادیاں غیر ملکی خواتین سے ہوئیں ان سب میں سے کامیاب ترین بیوی ایلس ثابت ہوئیں۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے یہاں کی زبان سیکھی، یہاں کی ثقافت کو اپنایا، یہاں کے مسائل پر تنقید بھی کی تو اپنا سمجھ کر بلکہ ملک اور معاشرے کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بہت تکلیفیں بھی برداشت کیں۔ کبھی اس ملک کو چھوڑنے کا خیال ذہن میں نہ لائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی دونوں بیٹیوں کا پورا پورا خیال رکھا ان کو پڑھایا، لکھایا اور انہیں مفید شہری بنایا۔

فیض صاحب تو بقول ان کے تمام عمر ہی ''کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے''۔ انہیں گردشِ ایام نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ ان باتوں کا خیال رکھیں۔ خاندان کو اکٹھا رکھنا اور اس کے ہر نشیب و فراز کا خیال رکھنا ایلس ہی کی ذمہ داری رہی۔ اس لحاظ سے مجھ سے زیادہ سائرہ ایلس کی پرستار تھیں۔ ایلس ان کے لئے آئیڈیل خاتون، آئیڈیل بیوی اور آئیڈیل ماں تھیں۔ اسی لئے شاید وہ فیض صاحب سے زیادہ ایلس فیض سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔

سکتہ کہیں، نشہ کہیں یا مختلف جذبات و احساسات کا تصادم جس نے سوچنے اور عمل کرنے کی صلاحیت کو مکمل طور پر ماؤف کردیا تھا۔ گو یہ کیفیت چند لمحوں کے لئے تھی مگر یوں محسوس ہوا کہ زندگی کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ہوش آیا تو گھبراہٹ اور بے چینی شروع ہوگئی۔ کھانے پر فیض صاحب آرہے ہیں۔ ان کی پسند، ناپسند کا بالکل کوئی اندازہ نہ تھا۔ سائرہ کے چہرے پر بھی اسی قسم کے سوالیہ نشان نظر آئے۔ پھر خیال آیا کہ فیض صاحب نے کراچی کافی عرصہ گذارا ہے ان کے کافی دوست، احباب ہونگے ان سے معلوم کیا جائے کہ فیض صاحب دوپہر کے کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں! فوراً خیال عطا صاحب کا آیا جو کہ فیض صاحب کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے اور اس وقت کراچی میں کتابوں کی ایک دکان چلا رہے تھے۔ قصہ مختصر شام کو تمام معلومات اور ضروریات اکٹھا کرکے سائرہ کے حوالے کردیں۔

رات صحیح طرح سو بھی نہ سکا۔ ذہن میں عجیب قسم کا انتشار، جذبات کا نہ سمجھ میں آنے والا کوک ٹیل ۔۔۔۔ دورِ حاضر کی عظیم شخصیت میرے گھر آنے والی ہے۔ وہ شخصیت جسے Idealise بھی کیا، جس پر تنقید بھی بھرپور کی۔ ان کے آنے پر ان کی پذیرائی کروں یا ان کی سوچ پر تنقید پر پشیمانی کا اقرار! اسی کشمکش میں

دوپہر بھی آ گئی اور فیض صاحب بھی، کھانے سے پہلے اور کھانے کے دوران بے شمار مسائل پر باتیں ہوئیں۔ اسی دوران اپنی خود اعتمادی آہستہ آہستہ واپس آنے لگی۔ کھانا ختم ہوتے ہی فیض صاحب نے کہا کہ "خالد تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں آجاتے"۔ جواب میں میں نے مؤدبانہ گزارش کی کہ "جہاں تک ثقافت اور فنون کا تعلق ہے میرے اور آپ کے خیالات اور سوچ میں بہت فرق ہے اور پھر میں نے اس مسئلہ پر ہر جگہ آپ کی سوچ کی بھرپور مخالفت کی ہے جس پر میں شرمندہ ضرور ہوں مگر میری سوچ ابھی بھی وہی ہے"۔ اس پر ان کا جواب تھا کہ "بھئی ہم تو برائے نام ہیں، کام تو آپ ہی کو کرنا ہے اور پھر اس سوچ کے اختلاف پر ہی ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں"۔ خود اعتمادی کی فضا جو بمشکل بنائی تھی ایک دفعہ پھر ایک ہی جھٹکے میں نیست و نابود ہوگئی۔ پھر وہی کشش و پیچ کی کیفیت۔ اتنی عظیم شخصیت میرے گھر آئی۔ باوجود میری گستاخیوں اور اختلافات کے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس شخصیت کی عظمت کو سلام کروں، یا اپنی جائز و ناجائز تنقید پر پشیمانی کا اقرار۔۔۔ فیض صاحب نے شاید میری پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور سائرہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اس کو سمجھاؤ انشورنس چھوڑے اور ملک و قوم کے لئے کچھ کرے"۔ فیض صاحب تو چلے گئے۔ لیکن مجھے اپنی نظروں میں اتنا چھوٹا کر گئے کہ اک مدت درکار تھی خود کو تلاش کرنے کے لئے۔ دوستوں کے حلقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ خالد سعید بٹ کو پیشکش ہوئی اور اس نے انکار کردیا۔ کراچی کے فنکار دوست آئے اور ہر ایک کا اصرار تھا کہ میں نیشنل کونسل کو ضرور اپنا لوں۔ ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ لاہور سے فنکاروں کا وفد کراچی پہنچ گیا جس میں میرے قریبی دوست ڈاکٹر انور سجاد، ایم شریف اور خالد عباس ڈار شامل تھے۔ ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ میں اسلام آباد ضرور جاؤں۔ صرف میرے پیرو مرشد اور گرو جناب صفدر میر صاحب تھے جنہوں نے مجھے اسلام آباد نہ جانے کی صلاح دی۔ ان کے خیال میں مَیں حکومت سے الگ رہ کر فن کی بہتر خدمت کرسکتا تھا۔ ان تمام لوگوں کو ان اثرات کا اندازہ نہ تھا جو کہ فیض صاحب کے ساتھ ایک ملاقات نے میرے سوچ کے دھاروں پر مرتب کردیئے تھے۔۔۔ "جاؤں یا نہ جاؤں" یہ تکرار ضرور تھی مگر نہ جانے کا خیال صرف اور صرف اس لیے تھا کہ کیا میں اس عظیم شخصیت کے معیار پر پورا اُتر سکوں گا۔

بہت اُتار چڑھاؤ بہت سے نشیب و فراز کا سامنا تھا۔ تان یہاں ٹوٹی کہ دو مئی 1972ء کو میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس میں بطور سیکریٹری داخل ہوگیا۔ اُس وقت کونسل کا بجٹ ڈیڑھ لاکھ روپے تھا اور ہم کل سات لوگ تھے۔ فیض صاحب اور ان کا PA، میں اور میرا پی اے، ایک ایڈمن آفیسر ایک اکاؤنٹ آفیسر اور ایک ڈرائیور۔ اللہ تعالیٰ کا بہت کرم رہا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں فیض صاحب کی سربراہی میں یہ مختصر سا یونٹ ایک کامیاب ادارے کے طور پر اُبھرا۔

یوں تو فیض صاحب کے ساتھ کام کرنے کی طویل داستاں ہے جو کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں مگر چند واقعات ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں۔

میرا فلسفہ تھا کہ جو کام ملا ہے یا جس کا ارادہ کیا ہے اُسے بہر حال پورا ضرور کرنا ہے۔ اس کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرنی۔ شائد اسی وجہ سے بہت سے دشمن بنالئے تھے۔ ان دشمنوں سے میں فیض صاحب کے دستِ شفقت کی وجہ سے ہی محفوظ رہا۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ لیاقت ہال میں ایک ڈرامہ پیش کیا۔ اس ڈرامے میں سعدیہ پیرزادہ صاحبہ مہمانِ خصوصی کے طور پر تشریف لانے والی تھیں۔ گرمی بھی اپنے جوبن پر تھی۔ سات بجے ڈرامہ شروع ہونا تھا اور پانچ بجے لیاقت ہال سے فون آیا کہ بجلی کی وولٹیج کم ہے اس لئے ایئر کنڈیشنر چل نہیں سکے گا۔ راولپنڈی الیکٹرک سپلائی کمپنی کو بہت ٹیلی فون کئے گئے مگر ان کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں آرہا تھا اس زمانے میں کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی کی

طرح راولپنڈی الیکٹرک سپلائی کمپنی بھی ہوا کرتی تھی۔ میں فوراً لیاقت ہال پہنچا۔ اس وقت کمپنی کے کوئی اہلکار موٹر سائیکل سمیت تشریف لائے۔ میں نے عرض کی کہ سات بجے ڈرامہ شروع ہوگا۔ اتنی سخت گرمی میں فنکار لوگ کام نہیں کر پائیں گے اور پھر مہمانِ خصوصی بھی تشریف لانے والی ہیں۔ برائے کرم ہم پر نوازش کرتے ہوئے جلد ہی کوئی انتظام کر دیجئے کیوں کہ کم از کم ایک گھنٹہ ائیر کنڈیشنر یونٹ چلے گا تو کہیں جا کے ہال ٹھنڈا ہوگا۔ اس پر اُن اہلکار صاحب نے ہماری شرافت کو کمزوری سمجھتے ہوئے فرمایا کہ حضور سعدیہ پیرزادہ صاحبہ آ رہی ہیں تو بھٹو صاحب سے ہی کہیں بجلی ٹھیک کر دیں گے۔ اب بھٹو صاحب سے ہمارا جذباتی لگاؤ ایک مدت سے رہا تھا۔ اس اہلکار کی بات پر اتنا غصہ آیا کہ ایک زور دار تھپڑ اسے رسید کیا، وہ بیچارہ موٹر سائیکل پر جا گرا جس سے اُس کا چشمہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں نے غصہ کی حالت میں کہا کہ پندرہ منٹ کے اندر اندر بجلی آ جانی چاہیے ورنہ۔۔۔(ورنہ ہم کیا کر سکتے تھے!) وہ صاحب موٹر سائیکل لے کر فوراً غائب ہو گئے۔ پندرہ منٹ میں بجلی ضرور بحال ہوگئی اور ڈرامہ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ دوسرے دن تک ہم اس بات کو بھول بھی چکے تھے۔ دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ فیض صاحب صبح ہی دفتر آ چکے ہیں اور کافی لوگ ان کے پاس تشریف فرما ہیں۔ ہم اپنے کام میں مگن ہو گئے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ فیض صاحب یاد کر رہے ہیں۔ ہم گئے، اس وقت وہاں کوئی نو دس دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ فیض صاحب نے پوچھا کہ کل کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں تھا۔ میں نے جواب نفی میں دیا۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ کیا کسی بجلی والے سے جھگڑا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا اور میں نے پورا واقعہ دہرا دیا۔ اس وقت پتہ چلا کہ چیئرمین راولپنڈی الیکٹرک کمپنی نے میرے خلاف رپورٹ درج کروانے سے پہلے فیض صاحب سے بات کی اور فیض صاحب نے فوراً چند بارُسوخ شخصیات کو اکٹھا کر کے چیئرمین کے پاس بھیجا اور انکا غصہ ٹھنڈا کیا۔

ہمارا ایک اور کارنامہ۔ ثقافت کا شعبہ اس وقت وزارتِ تعلیم کے ماتحت تھا اور ہمارے وزیر بھٹو صاحب کے سوتیلے منڈے جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب تھے۔ پیرزادہ صاحب نے شمالی کوریا کا دورہ کیا۔ وہاں بہت چیزیں پسند آئی ہونگی۔ ایک چیز جس کا ہمیں بھی پتہ چلا وہ کوریا کا نیشنل سونگ اینڈ ڈانس طائفہ تھا۔ پیرزادہ صاحب جوش میں آ کر ان لوگوں کو پاکستان آنے کی دعوت دے آئے۔ دعوت فوراً قبول کر لی گئی اور اطلاع ملی کہ ایک سو بیس فنکاروں پر مشتمل گروپ آ رہا ہے جو کہ تقریباً تین ہفتہ پاکستان قیام کرے گا۔ پیرزادہ صاحب نے یہ معاملہ فیض صاحب کے سپرد کر دیا اور ظاہر ہے فیض صاحب نے یہ پرابلم ہماری جھولی میں ڈال دی۔ پاکستان میں سوائے لیاقت ہال کے اور کوئی بھی جگہ موجود نہ تھی جہاں ایک سو بیس فنکار اپنے فن کے جلوے دکھا سکیں۔ اس ضمن میں کیا کیا تکلیفیں سامنے آئیں۔ ان کی تفصیل بیان کرنا بے محل ہوگا لیکن سب سے بڑا مسئلہ تھا ان کی رہائش اور ان کی نقل و حرکت، شہر کے اندر ہی نہیں بلکہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک۔ تجویز یہ پیش کی کہ ایک سپیشل ٹرین تیار کروائی جائے جس میں سب کے سب ڈبے ایئر کنڈیشنڈ ہوں جہاں طائفے کے سونے کا انتظام بھی ہو اور کھانے پینے کا بھی۔ کوریَن طائفہ کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچنا تھا۔ یہاں سے انہیں ٹرین میں بٹھا کر حیدرآباد، سکھر، کوئٹہ، ملتان، لاہور، راولپنڈی اور پشاور تک لے کر جانا تھا۔ کراچی میں فنی مظاہرے کے بعد وہ لوگ ٹرین پر سوار ہوگئے۔ سپیشل ٹرین کراچی سے ہی چلنا تھی۔ تمام لوگ گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ گاڑی کی روانگی میں دس منٹ باقی تھے کہ ریلوے کے دو اہلکار آئے اور مجھے یہ کہا کہ سٹیشن ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ سٹیشن ماسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ اور افسران بھی موجود تھے۔ سٹیشن ماسٹر صاحب نے کہا کہ ہمارا یعنی کہ ریلوے کا اُصول ہے کہ ٹکٹ پہلے خریدی جاتی ہے اور سفر بعد میں ہوتا ہے۔ ٹرین تیار ہے ہمیں پورا کرایہ دے دیجئے پھر ٹرین چلے

گی۔ میں پہلے ہی بے شمار پرابلمز کا سامنا کرتا چلا آرہا تھا کہ یہ ایک اور بم پھٹا۔ مگر اس دفعہ بہت بڑا بم تھا۔ ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ لوگ حکومت پاکستان کے مہمان ہیں، ریلوے بھی حکومت پاکستان کا حصہ ہے یہ آپس کا لین دین ہوتا رہے گا۔ مگر وہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ جتنی بھی دلیلیں دیں رائیگاں ہی گئیں۔ اب ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی ہے ایک سوبیس فنکار بشمول شمالی کوریا کے ڈپٹی وزیر برائے ثقافت ٹرین میں سوار ہیں اور لاکھوں روپے کا معاملہ ہے دلیلیں کامیاب نہ ہوئیں تو دھمکیاں بھی دیں مگر ان لوگوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک دھمکی یہ دی کہ وزیراعظم کو ٹیلی فون ملاؤ۔ سٹیشن ماسٹر صاحب نے ٹیلی فون میرے سامنے رکھ دیا۔ وزیراعظم کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس نہ تھا ہوتا بھی تو بات کہاں ہو سکتی تھی۔ میں نے فیض صاحب کو اسلام آباد فون کیا اور ان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد سٹیشن ماسٹر صاحب کے لئے ٹیلی فون آیا۔ جس پر سٹیشن ماسٹر صاحب نے پھر اصرار کیا کہ کرایہ لئے بغیر میں ٹرین کیسے جانے دوں۔ جب یہ بات نہیں مانی گئی تو نزلہ مجھ پر گرا اور انہوں نے ٹیلی فون پر ہی کہا کہ کوئی صاحب خالد سعید بٹ نام کے ہیں جنہوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے اور ہماری بے عزتی کی ہے۔ وہاں سے شائد جواب آیا کہ ٹرین کو جانے دو اور ان حضرت کو روک لو۔ سٹیشن ماسٹر صاحب نے ٹیلی فون بند کیا اور پولیس اہلکار جو موجود تھے ان کو حکم دیا کہ مجھے اپنی تحویل میں لے لیں اور ٹرین کو جانے دیں۔ کراچی آرٹس کونسل کے کچھ حضرات بھی ہمیں الوداع کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے اسلام آباد اطلاع کر دی۔ سنا ہے کہ فیض صاحب نے اپنی طبیعت کے بالکل برعکس ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں بات چیت ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریلوے کے چند اعلیٰ افسران تشریف لائے مجھ سے معذرت کی اور گاڑی پر سوار کر دیا۔۔۔ اگر فیض صاحب ہماری مدد کو نہ پہنچتے تو ہم چند دن کے لئے ریلوے پولیس کے مہمان ضرور ہو گئے ہوتے۔

اسی شمالی کورین طائفہ کی آمد کے دوران راولپنڈی لیاقت ہال میں بھی طائفہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ایک شام وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے نام تھی۔ شام آئی ہم لوگ شو شروع ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ بلاوا آیا۔ فیض صاحب بلا رہے ہیں۔ جھنجلاہٹ سی ہوئی کہ یہاں شو شروع ہونے کا وقت ہے وزیراعظم صاحب آچکے ہیں یہ فیض صاحب کو ہماری کیا ضرورت محسوس ہوگی۔ بہرحال گئے تو دیکھا فیض صاحب بھٹو صاحب اور پیرزادہ صاحب VIP روم میں بیٹھے ہیں۔ میرے داخل ہوتے ہی فیض صاحب نے میرا تعارف بھٹو صاحب سے کروایا اور کہا کہ اس طائفہ کا سارا انتظام تو بٹ صاحب نے کیا ہے ہم تو محض تماشائی ہیں۔ ان کے جملے اب بھی جب یاد آتے ہیں تو ایک عجیب قسم کی مسرت سی محسوس ہوتی ہے۔ میرے تعارف کی یا ان جملوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی صرف فیض صاحب جیسے انسان کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی۔ وگرنہ بہت سے ایسے لوگوں سے واسطہ رہا جو ہر کامیابی کا سہرا اپنے ہی سر رکھتے ہیں اور اصل حقداروں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

ایک دن فیض صاحب نے بلایا اور کہا کہ Academic Francain یعنی کہ فرنچ اکیڈمی اور برٹش کونسل کے منشور کو غور سے پڑھو اور پاکستان اکادمی ادبیات کا ایک منشور بنا کر مجھے لا کر دو۔ چار پانچ دن لگا کر ایک خاکہ سا تیار کیا اور فیض صاحب کے حوالے کر دیا اس واقعہ کے تقریباً دو ہفتے بعد انہوں نے مجھے بلا کر پاکستان اکادمی ادبیات کا سرکاری نوٹیفکیشن میرے حوالے کیا۔ اگرچہ اس نوٹیفکیشن کا متن میرے بنائے ہوئے منشور سے مختلف تھا لیکن دلچسپی کی باتیں دو تھیں۔ پہلے یہ کہ اکادمی ادبیات پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ایک ضمنی ادارہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ فی الحال اس میں دو ایڈوائیزر ہونگے جن کو کہ ماہانہ تنخواہ یا وظیفہ دیا جائے گا اور وہ دو ایڈوائیزر تھے جناب جوش ملیح آبادی اور جناب حفیظ جالندھری صاحب۔ بظاہر تو یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں لیکن

اس واقعہ سے کچھ ہی عرصہ قبل پاکستان کے ایک اخبار میں جناب حفیظ جالندھری صاحب نے فیض صاحب کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ اس پر میں نے باقاعدہ ایک شام فیض صاحب کے ساتھ گزاری اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ آپ حفیظ صاحب کی باتوں کا جواب دیں۔ فیض صاحب کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ اگر یہ سب لکھ کر حفیظ جالندھری صاحب کو خوشی ہوئی ہے تو اس میں کیا مضائقہ!

یہ واقعہ میرے نزدیک فیض صاحب کی شخصیت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے ثقافت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا "ہم تو فنکار ہیں، محبت کرنا اور دل جلانا ہی جانتے ہیں" اس لحاظ سے وہ عظیم انسان تھے۔ ہمارے صوفیاء کرام کی آگ میں ڈھلے ہوئے کندن۔ ایک عظیم انسان، ایک عظیم شاعر۔

"فیض عصر حاضر کا ایسا سقراط ہے جس کا یچ طالع آزما قوتوں کے لئے قابل برداشت نہیں۔ اس لئے اسے ہر روز زہر بھرے الزامات کے پیالے پلائے جاتے ہیں اور وہ منافقین کے سامنے الزامات کی صفائی پیش کرنے کی بجائے اپنے ارد گرد بیٹھے ہوئے مخلص ساتھیوں کو سچائی کا اپدیش دیتا ہے، انسانیت کے لئے آدرش دیتا ہے اور دلوں پر لگنے والے شکوک کے جالے صاف کرتا ہے۔"

(منصور قیصر)

"کون کہتا ہے کہ وہ بار بار کرۂ ارض پر بنائی گئی جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔ وہ تو شروع ہی سے قیدی ہے۔۔۔ انسان دوستی کا، ضمیر کا، انصاف کا، راست گوئی کا، بے باکی کا، حب الوطنی کا، سوجھ بوجھ کا، عقل و دانش کا۔"

(نعیم حیدر سید)

فیض احمد فیضؔ......شاعرِ عصر

ڈاکٹر ثمینہ محبوب

تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعرِ عصر تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز
(فارغ بخاری)

شاعر جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ وہ شاعر پر اثر انداز ہوتا ہے شاعر اسی معاشرے کا انسان ہے اور ظاہر ہے اس کے موضوعات بھی اسی معاشرے سے متعلق ہوں گے۔ ماحول اگر سازگار نہیں ہوگا تو اس کا لازمی اثر شاعر کی شاعری پر ہوگا۔ شاعری میں شاعر کی ذات گردو پیش کے ماحول کے علاوہ اس وقت کا شاعرانہ ماحول اور عمومی رجحانات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ قدیم اور معاصر شعراء کے ہاں پائے جاتے والے موضوعات اور عنوانات نئے اُبھرنے والے شاعروں کو متاثر کرتے ہیں۔

1936ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ تو وہ اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدو جہد میں تحریک آزادی کا ساتھ دیا۔ آزادی حاصل ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ آزادی کے باوجود عام آدمی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ چنانچہ انہوں نے غریب عوام کی بیداری کو اپنا فرض جانا۔ عوام کے مسائل پیش کئے۔ ان کی بدحالی سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

فیض انقلابی تھے، وہ انقلابی تحریک کا نتہائے کمال ہے۔ وہ تحریک جس کی آبیاری نصف صدی تک ہوئی۔ آج ایک عالم اس انقلابی تحریک کے سائے میں زندگی گزار رہا ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے مصروف پیکار ہے۔

ترقی پسند شعراء کی شاعری انقلابی عناصر کی حامل ہے اور دنیا کو تبدیل کر دینے کے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ حقیقت سے گریز نہیں کرتی بلکہ حقیقت کی بدصورتی اور حُسن کو نمایاں کرتی ہے۔ بدصورتی سے نفرت اور حُسن سے محبت پیدا کرتی ہے۔ دنیا کی بدصورتی میں سب سے زیادہ بھیانک مفلسی اور بے حسی کے نظارے ہیں جن کی بڑی دلدوز تصویریں ترقی پسند شعراء نے کھینچی ہیں۔

فیض احمد فیض کا دل صرف اس مفلسی اور غلامی پر ہی نہیں کڑھتا بلکہ یہ خیال بھی ستاتا ہے کہ نئی پود بڑی ہو کر غلام ہو جائے گی۔ یہ مایوسی کی ترغیب نہیں بلکہ انسانی ضمیر کو تازیانہ لگانے کا ایک طریقہ ہے۔

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

خلیل الرحمن اعظمی کے رائے ہے کہ:

''کسی فرد یا شاعر کا شعور مخصوص مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردعمل سے تشکیل پاتا ہے۔ یوں تو انسان کے شعور پر نہ جانے کتنی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ہر منزل اس کے شعور کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتی ہے اور اس پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن اصل چیز معاشی زندگی کے حالات ہیں جو سماجی اور معاشرتی احساس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

فیض احمد فیض ''نقشِ فریادی'' کے دوسرے حصے میں ''دلے بعزو ختم جانے خریدم'' کا اعلان کرتے ہوئے رومان سے حقیقت کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ یہاں ان کی شاعری ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہے، لکھتے ہیں

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کردیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اس دور میں فیض کی نظم سماجی حقیقت نگاری کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ وہ آمرانہ اور سامراجی ذہنیت پر گہری چوٹ کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عالمی کساد بازاری کے باعث ادباء، شعراء سماج کو بدل دینے کا عزم صمیم کیے ہوئے تھے۔

ادب کو زندگی کے قریب لانے کی کوشش نے وہ بہت سے موضوعات دیے جو اب تک اُردو شاعری میں نامانوس تھے اور ان کے سہارے عوام کی زندگی کے کئی پیچیدہ مرحلوں سے روشناس کرایا۔ نئے موضوعات سخن کے ساتھ نئے اسالیب کی تلاش ہوئی۔ مختلف دائرے سمٹ کر ایک ہی شاعر کے دامن میں آگئے اور اُردو شاعری کا یہ مرجھایا ہوا پودا دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن گیا۔

پروفیسر سلامت اللہ خان فیض کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فیض کی شاعری میں جو چیز ابتداء سے کھٹکتی ہے وہ ان کی رُوح کی تنہائی ہے۔ خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ لیکن پڑھتے ہوئے قاری ان کی رُوح کی تنہائی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ بہت کچھ شیلے کی طرح ان کی اکتائی، اکتائی سی نظریں اپنے گردوپیش پر پڑتی ہیں۔ اپنے دور کی زوال پذیر نظروں سے مایوس ہوتی ہیں اور پھر اس نئے دور کی منتظر رہتی ہیں۔(۱)

فیض کی ابتدائی شاعری کا مرکزی محرک تنہائی اور انتظار ہے۔ ایک خیال سے دوسرے خیال تک، ایک شعر سے دوسرے شعر تک ایک نظم سے دوسری نظم تک یہی دھاگا پرویا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ نظم انفرادی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر وہ سب ایک ہی مالا ہیں۔ فیض کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف شکلوں میں اُجاگر ہوتے ہیں۔

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرت دیدنا تمام رہے؟
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسمان پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آکہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

.....☆☆.....

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

نظم انتظار میں شاعر کے اظہار کا انداز سیدھا اور سپاٹ ہے۔ لیکن نظم تنہائی معنوی اور فنی اعتبار سے شاعری کی معراج ہے۔ تنہائی بظاہر واردات قلبی کی داستان ہے۔ لیکن بے حد معنی خیز ہے۔

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فیض کی اس نظم کو محض داخلی اور انفرادی واردات قلب سمجھا جائے پھر بھی اس نظم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن حقیقتاً یہ نظم محض انفرادی نہیں، تنہائی اور انتظار کا اظہار اس فنکارانہ انداز سے کیا گیا ہے وہ صرف شاعر کا نہیں پوری قوم کا ہے۔

نظم "میرے ندیم" میں محبت اور رومان کے دروازے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ محبت اور رعنائیاں جس میں شاعر اُلجھا تھا۔ اب اسے پہلی بار ان میں شاعرانہ وجدان کے ختم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

"میرے ندیم" پوری نظم سوالیہ نشان ہے۔ شاعر خود حیران ہے کہ وہ احساسات، وہ آرزوئیں کہاں ہیں جن سے شعر کی دنیا میں جان تھی۔ جس سے فضائے فکر وعمل رنگین تھی۔ یہی نظم وہ حد ہے، جہاں شاعر شاعر محبت سے شاعر انسان بن جاتا ہے۔

جمیل جالبی اپنے مضمون ''نیا شاعر فیض احمد فیض'' میں لکھتے ہیں :

''میرے ندیم'' رومانی دور کی آخری نظم میں فیض کے تیور بدلے جا رہے ہیں اور اس کے خیالات نئے سانچوں میں ڈھلتے اور نئے انداز میں بدلتے معلوم ہوتے ہیں۔ جو دوسرے دور کی شاعری میں نمایاں ہو گئے ہیں''۔

''چند روز اور میری جان فقط چند روز'' ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس میں انہیں اس ظلم و ستم کا شعور ہے۔ جو ہندوستان کی سیاسی تحریکوں پر روا رکھا گیا۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اب ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

فیض نے اپنی نظم ''کتے'' میں عوام کی خفیہ قوتوں کا اظہار کیا ہے ان ممکنات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ عوام متحد ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو مضبوط سے مضبوط حکومت ہلا سکتے ہیں۔

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

فیض نے اپنی شاعری میں غم انگیز مسائل کا بیان صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں کیا ہے۔

''دست صبا'' سے فیض کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ''زنداں نامہ'' کی بیشتر منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں یعنی جولائی 1953ء سے مارچ 1955ء تک۔

فیض ایک طبقے ایک گروہ کی آواز ہیں۔ وہ گروہ جسے کچلا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں ''ہم'' کی ضمیر اس اجتماعی شعور کا پتہ دیتی ہے۔

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترک روایت نہ کریں گے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے

فیض کا دور ایسا دور ہے جب ناانصافی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ معاشی بدحالی عام تھی، قتل و غارت کا بازار گرم، یاس و غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے لمحات کے بیان میں فیض کا لہجہ غمگین ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ غم صرف ان کی اپنی ذات کا نہیں۔ بلکہ بیسویں صدی کے ہر باشعور انسان کا غم ہے۔ جو گرد و پیش سے باخبر ہے۔

''یہ سیاسی غم ہو یا عشقیہ غم فیض کے یہاں ہر چیز غم بن جاتی ہے۔ یہ غم تاریخی مطالعہ کا نتیجہ ہو یا معاشرتی نا انصافی کا نتیجہ، یا مابعد الطبعیاتی طور پر پرتو تقدیر آدم بن کر آیا ہو۔ ان کی شاعری میں نیند بن کر سرایت کر گیا ہے اور فیض نے اسے اپنے لہجے کی استقامت سے خوشگوار بنایا''۔

''اُردو ادب کو اب تک صرف تین ایسے شاعر میسر آئے ہیں۔ (غالب، اقبال، فیض) جو لوگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہتے ہیں۔ ہمیں پڑھو، ہمیں سوچو، ہمارے لفظوں پر غور کرو............ مرزا غالب، ڈاکٹر محمد اقبال اور فیض احمد فیض اپنے فن کے اندر وہ وسیع سمندر ہیں۔ جن می غوطہ خور صدیوں معانی تلاش کرتا ہے۔ بڑے فنکار کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکان اور پست و بلند سے بے نیاز ہو کر انسانیت کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھتا ہے''۔ (۳)

''نقش فریادی'' کی نظم سوچ میں فیض کہتے ہیں :

ایسی فضائیں میرا دل کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ جہاں نہ لوگ محنت کرتے ہوں، نہ مزدوری دیتے ہوں۔ صرف مزدوروں کا لہو چوستے ہوں۔

بے فکر لے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سُکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

فیض کی شاعری کا تعلق زندگی کے ان نا ساعد حالات سے ہے۔ جن سے آج بھی ہماری جنگ جاری ہے ''اقتصادی جنگ'' کبھی نہ ختم ہونے والا چیلنج وہ غربت پر روا رکھے جانے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ غریب کے سینے میں دبے سچ کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں دنیا میں آنے والے

تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی امیر غریب نہیں اور یہی سچ تیرے سینے میں پوشیدہ ہے۔ مگر تو زبان نہیں کھولتا۔ ان ظالموں نے تجھ سے قوت گویائی چھین لی ہے۔

''سر وادی سینا'' میں لفظ ''انتساب'' کو بڑے وسیع معنوں میں لیا ہے۔

''میری یہ جو شاعری میری اولاد کی مانند ہے۔ میں اسے اپنے غم کے نام کرتا ہوں۔ یہ آج کا غم پورے زمانے سے خفا خفا لگتا ہے اور یہ زرد پتوں کا جنگل جو میرا دیس ہے۔ میں نے انہیں زرد پتوں کو اپنا وطن بنالیا ہے'' (۴)

ہر کوئی مرد خواں رس بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیز حلقہ بگوش
جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفل غم ہے کہ بزم جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشان ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

فیض کے کلام میں فلسطین میں ہونے والے مظالم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اپنی نظم ''فلسطینی بچے کی لوری'' میں انہوں نے غم سے نڈھال اس بچے کو دکھایا ہے۔ جس کے ماں باپ، بہن بھائی سب فلسطین میں ہونے والی قتل وغارت کی نذر ہو چکے ہیں۔

مت رو بچے
امی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

مقصدی ادب تخلیق کرنے کا رجحان نیا نہیں ہے۔ اس سے پہلے سرسید اور ان کے رفقاء اس میں نمایاں کام کر چکے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا مقصدی ادب سماج اور معاشرے کے حوالے سے تھا۔ سامراج دشمنی معاشرتی ناہمواری، دولت کی غیر مساوی تقسیم، طبقاتی درجہ بندی، ان سب کے خلاف ترقی پسند تحریک نے نفرت کا اظہار کیا۔ فیض اس تحریک کے صف اول کے دانشوروں میں شامل تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ان تمام موضوعات کو اپنایا۔

فیض کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو اپناتے ہوئے کہیں بھی کلاسیکی روایت کا دامن ہاتھ سے انہیں چھوڑا، بلکہ انہوں نے ترقی پسندانہ موضوعات کو روایتی شاعرانہ عنصر کے آمیزے میں جذب کر کے ایک تازہ مرکب تیار کیا۔ جس میں روایتی لذت بھی تھی اور جدید ذائقہ بھی۔

فیض کی نظموں میں سامراجی تسلط کے خلاف اظہار خیال ملتا ہے۔ انہوں نے بڑی جرأت مندی سے آزادی کے نعرے لگائے۔

لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

فیض کی شاعری میں غلامی سے نجات اور آزادی کا نعرہ گونجتا رہا۔ کبھی یہ نعرہ سامراجیت کے خلاف تھا اور کبھی یہ نعرہ وطن عزیز میں پائی جانے والی ناگفتہ بہ سیاسی صورتحال کے خلاف تھا۔

فیض احمد فیض نے 1947ء کی جنگ آزادی سے پہلے انگریز سامراج کے خلاف آواز بلند کی۔ 1947ء کے بعد ملک میں پائی جانے والی سیاسی صورتحال، مارشل لاء اور سامراجی طور طریقوں کے خلاف اظہار خیال کرتے رہے۔

فیض کی شاعری داخلی احساسات ان کے جذبات ان کی آرزوؤں کی تمناؤں کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسیری کے زمانے کی پیداوار ہے۔ نقادوں کے نزدیک فیض کی بہترین ان کی اسیری کے زمانے کی شاعری ہے۔

''فیض کے جیل کے ساتھیوں کے بیان کے مطابق ان کے چہرے پر کبھی پریشانی اور سراسیمگی کے آثار نہیں دیکھے گئے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ سکون، شگفتگی اور دلکش مسکراہٹ رہی۔ فیض کی شاعری کا خاصہ بڑا حصہ اسی زمانے کا ہے''۔ (۵)

فیض کے مجموعے ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ'' میں خاص طور پر اسیری کے دنوں کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیض انسانی عظمت کے قائل تھے۔
اس انسانیت کے جو ظلم کے ہاتھوں مجبور تھی۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع حب الوطنی بھی ہے۔ 1947ء سے پہلے یہ جذبہ سامراجیت کے خلاف نعرہ بن کر اُبھرا

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

1947ء کے بعد یہ جذبۂ حب الوطنی پاکستان کے لئے وقف ہو گیا۔ انہوں نے وطن کو بالکل محبوب کی طرح چاہا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں :

"وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے کہ اب اس کی دوسری محبتوں سے علیحدہ کر کے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے"۔(۶)

وطن سے محبت کی شاہکار نظم "نثار میں تیری گلیوں میں" ہے۔

نثار میں تیری گلیوں میں اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہو اور سگ آزاد

اور پھر آزادی کے بعد حالات کے تبدیل نہ ہونے کا شکوہ اس طرح موجود ہے۔

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

اپنی نظم "ربا سچیا" میں اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ربا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نائب تے عالیجاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی اُو ربّ سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈّاں اچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی اچ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای ربّ سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

فیض کا اصل موضوع اوّل تا آخر انسان کا دُکھ رہا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا انداز یہ ہے کہ زخم ایک ہی ہے۔ دہانِ زخم جدا جدا ہیں۔ اشفاق حسین لکھتے ہیں۔

"پہلے وہ سمجھتا تھا کہ غم جاناں کی موجودگی میں غم دوراں کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ اسے دنیا میں اپنے محبوب کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر اب اسے ان گنت صدیوں کے تاریک اور بہیمانہ طلسم کا مکروہ چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ اب اس کی نظریں خاک و خون میں تھڑے ہوئے جسموں کو سربازار نیلام ہوتے ہوئے بھی دیکھتی ہیں"۔(۷)

الیگزانڈر سرکوف لکھتے ہیں :

"فیض اپنی شاعری، اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پُر خلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوت صداقت اور توانائی الفاظ سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ عذاب تنہائی اور جبری بے کاری کا شکار بنانے کے لئے انہوں نے منٹگمری اور حیدر آباد کی جیلوں میں فیض پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کر دی تھی۔ لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زنداں کی تاریک رات غالب نہ آسکی اور نہ ایّام اسیری کی بے حس اور جامد خامشی ان کے نغموں پر کوئی مہر سکوت ثبت کر سکی"۔(۸)

حواشی

۱۔ سلامت اللہ، پروفیسر۔ شاعر محبت، شاعر انسانیت۔ افکار فیض نمبر، ص ۳۳۹۔
۲۔ کچھ فیض کے بارے میں اور کچھ اپنے بارے میں۔ روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۴ء۔
۳۔ ع، ادیب۔ "فیض ہر عہد کے شاعر" روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۴ء۔
۴۔ فیض احمد فیض "سرِ وادیٔ سینا" مکتبہ دانیال، کراچی، ص ۲۳۔
۵۔ تنقیدی جائزہ، انجمن ترقی اُردو، ہند، دہلی، ص ۴۹۔
۶۔ سجاد ظہیر۔ زنداں نامہ، لاہور۔ مکتبہ کارواں، ص ۵۴
"۷۔ فیض ایک جائزہ۔ کراچی، ادارہ یادگار غالب، ۱۹۷۷ء، ص ۳۸۔
۸۔ الیگزانڈر سرکوف، ایک حوصلہ مند دل کی آواز، سرِ وادیٔ سینا، مکتبہ دانیال، کراچی۔ ص ۱۹۔

فیض احمد فیضؔ، ایک محبِ وطن نظریاتی شاعر

ڈاکٹر آغا سلمان باقر

گذشتہ صدی کا وسطی عہد جدید اُردو شاعری کے ارتقاء میں قابلِ قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اُس عہد کے دوران تخلیق ہونے والی اُردو شاعری اِس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ نہ صرف سیاسی، معاشرتی اور سماجی تہذیب و اقدار پر براہِ راست اثر انداز ہو رہی تھی بلکہ اُس شاعری میں موجود بنیادی تصورات، نظریاتی اقدار اور خیالات کا بیان ہندوستانی معاشرے کی سیاسی اور تہذیبی سوچ کے اثرات کے خارجی اور داخلی پرتو کا نظریاتی انعکاس بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس عہد کے شعراء اور اُن کے خیالات، شعری افکار میں محرومیوں سے فکری قوت و توانائی کشید کر کے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

اُسی درخشاں شعری عہد نے نئے سماجی اور دوقومی نظریاتی افکار کی ملی سطح پر سیاسی شعور کی بالیدگی میں اپنا مضبوط ترین کردار ادا کیا۔ اقبالؔ نے اپنے حرکی فلسفۂ حیات سے برصغیر میں موجود قومی جمود پر ایسی ضرب لگائی جس سے دوقومی نظریہ کا انقلاب آفریں پیغام بہت دُور دُور تک پہنچا اور عوامی سطح پر قبول کیا گیا۔ اُن کے شعری نغموں نے برصغیر کے مسلمانوں کی رگوں میں نہ صرف خون کی گردش کو تیز کیا بلکہ اُن کی فکری سطح میں فکر و بالیدگی کے شعور کو حیاتِ نو عطا کرنا بھی شروع کر دی پھر اُسی دور میں مولانا ظفر علی خان کی شعلۂ نوائی، آتش بیانی اور صحافت کی سرگرمیوں نے قومی سطح پر نہ صرف برصغیر کے مسلمان حلقوں بلکہ دیگر حلقوں میں بھی فکر کی نئی راہوں کے تعین میں نئی جہتوں سے روشنی بخشی اُسی زمانے میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی نے آتے ہی اپنے انقلابی ترانوں اور روشن خیالی سے برصغیر کی معاشرتی سوچ و فکر کو نہ صرف توانائی بخشی بلکہ حرکت و عمل کی شعری قوت سے بیداری کا پیغام بھی دیا ایسے ہی حالات و واقعات میں ایک اور شاعر اپنی رومانوی مگر انقلاب آفریں استعاراتی شاعری کا علم اُٹھائے اِس بیداری کے قافلے میں ظاہر ہوا۔ جس کا نام فیض احمد فیضؔ ہے۔ فیضؔ نے احساسات اور تاثرات میں گندھی اپنی شاعری سے حرکت و عمل کے عوامی شعور میں ایک نئے انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فیضؔ جیسے حساس اور فکری و عملی شاعر نے ہندوستانی معاشرے کے لوگوں کے دلوں میں بہت تیزی سے اپنی شعری جہات میں پوشیدہ مگر اثر رکھنے والی رومانویت سے جگہ بنانا شروع کر دی۔

فیضؔ نے لوگوں کے جذبوں میں حرکت و عمل کا چراغ روشن کیا۔ جو اُن حالات میں بد دل اور بے یقین ہو چکے تھے۔ فیضؔ کی جانب سے یہ وہ رُوح پھونکنے کی کوشش تھی جو اِس انداز سے اس سے قبل وقوع پذیر نہ ہو سکی تھی۔ فیضؔ کی شاعری نے جذبوں کی خوابیدہ سوچ و فکر کو اپنی خاموش اور مدھر رومانیت سے بیدار کیا اور ایک عام ہندوستانی مسلمان کو روحانی طور پر قوت و توانائی عطا کی۔ اُن کے جذبوں میں حرکت و عمل پیدا کرنے کے اسباب پیدا کئے جو عرصہ دراز سے دلوں اور دماغوں میں تڑپ رہے تھے اور اُبلنے اور اظہار کرنے کو بے چین و بے قرار تھے۔ اس لیے کہ عوامی سطح پر شعوری سوچ تو موجود تھی مگر اُن کے سمجھنے اور بیان کرنے کے دریچے، بے بسی کی حد تک بند

کیا کریں
مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں
جو میرے تیرے شہر کی
ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقش پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بُنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا،
بتا، بتا،
عمل: اسلم کمال

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے
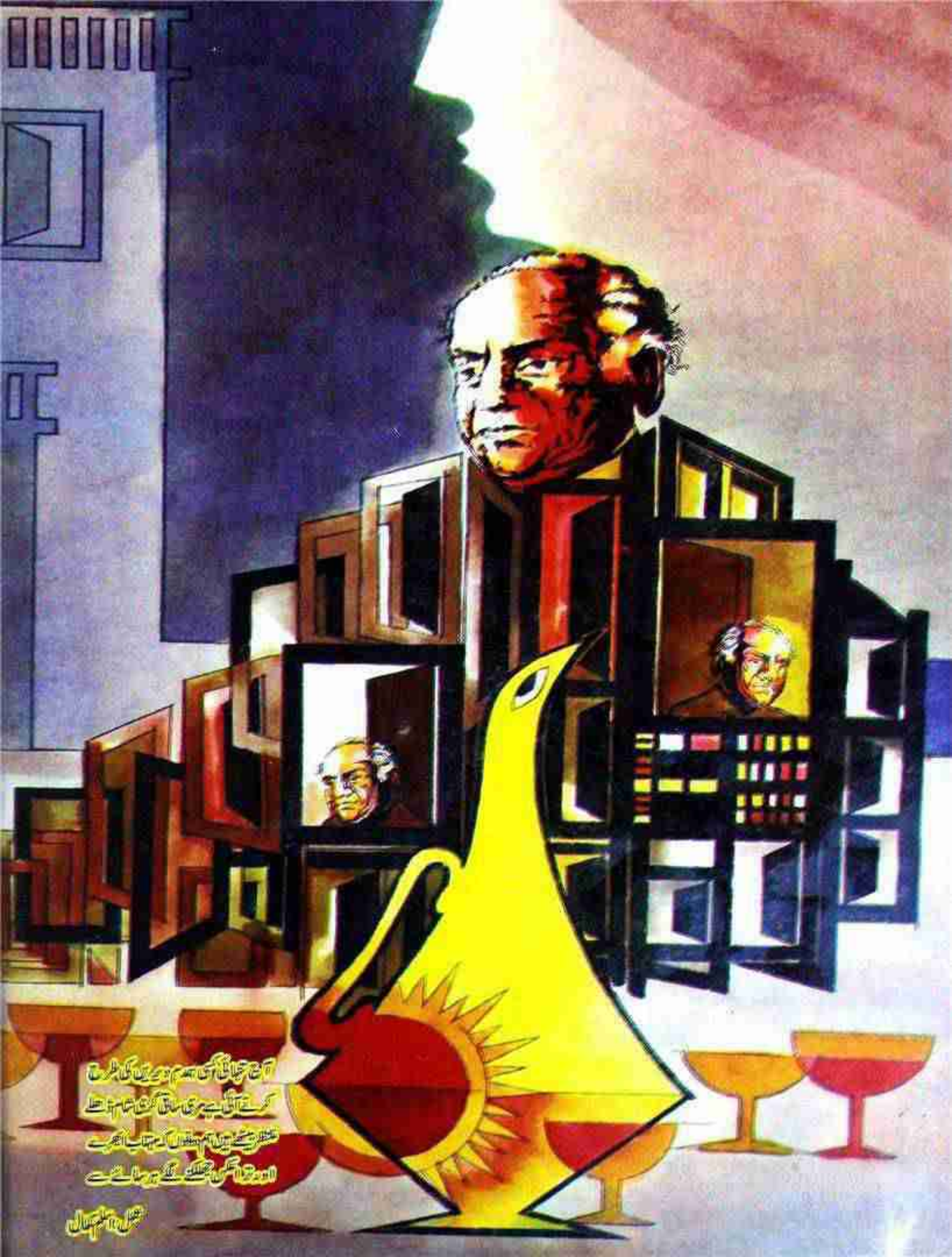
تھے۔ ایسے میں فیض احمد فیض نے اپنی رُومانوی شاعری کے نازک پردے اور دبیز آہنگ سے جذبوں کو متاثر کرنا شروع کیا۔ گویا فیض کی شاعری اُس وقت سماجی سطح پر پہنچی جب جذبوں سے متاثر ہونے کے راستے اور اُن کو سمجھنے کے انداز مثبت نہ تھے بلکہ خوف اور گومگو کے عالم میں پڑے، ہر صاحب دل انسان میں مجبوری اور بے کسی کی غیر طبعی نیند سوتے تھے۔ فیض کی شاعری کی ابتداء اور عروج کو اسی نظریہ اور حالات کے سبب انقلابی اقدار کے دروازے پر عوامی دستک کا نام دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا!

فیض احمد فیض اپنے پہلے شعری مجموعہ ''نقش فریادی'' کا عنوان بھی غالباً اسی نظریاتی ماحول اور تناظر میں طے کرتے ہیں تاکہ اُن کی سوچ وفکر کو اسی عنوان کے بلاواسطہ منظر نامے میں دیکھا جائے۔ گویا وہ ابتداء میں شعری جارحیت کے قائل تھے اور اپنی سوچ میں وہ اُس دور کے معاشرے میں انقلابی اقدامات کا تصور پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔

''نقش فریادی'' کی شاعری کو اگر مذکورہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی ناہمواری کے تناظر میں پرکھا جائے تو فیض کے کلام میں اُن کے اُس دور کے عالمی نظریات کے حوالے سے غیر طبقاتی سماج کے نظریاتی نظام کی خواہش کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ بورژوائی نہیں تھے۔ اُن کی شاعری میں ایک ہموار معاشرہ، اپنے برصغیر کے مروجہ حالات میں تشکیل پا جانے کا آرزومند دکھائی دیتا ہے اور فیض اسی کے لئے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں وہ بارہا اس بات سے بھی اپنی شاعری میں در پردہ اور کبھی واضح اعلان کرتے تھے کہ ہمارے ہندوستان کے مسلمان معاشرے کے لوگوں کا گزارہ فقط غیر طبقاتی معاشرے کے نظام حیات اور نظام حکومت سے ہی ہوسکے گا۔ غالباً اُن کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور دیگر ہم خیال لوگوں کو حکومتی اور انتظامی نظام جلد از جلد تبدیل کر دینا چاہیے اور نظریاتی نظام اقبال کے افکار جیسا تشکیل دے دیا جائے تو نئے پاکستانی معاشرے اور نظام کو مزید خوبصورت، طاقتور اور لوگوں کے لئے ہر شعبۂ زندگی میں آسانی سے قابلِ قبول اور حقیقی انصاف پر مبنی بنایا جا سکتا ہے۔ دنیا کا دانشور اور باشعور عوامی طبقہ جانتا ہے کہ جس معاشرے میں انصاف کے حقیقی اور شفاف حصول کی آواز بلند کرنا ناممکن ہو جائے وہ معاشرہ اور اُس کے محروم لوگ انصاف کے حقیقی تقاضوں کی طلب کا اظہار مختلف طریقوں سے کرنے لگتے ہیں۔ اُس دور میں معاشرہ ایسے ہی حالات سے گزر رہا تھا اور فیض نے انصاف کے حقیقی حصول اور معاشرے میں موجود ناہمواریوں کے خلاف اپنی شاعری میں صورت حال کو باآواز بلند بیان کرنا شروع کر دیا تھا جو اُس وقت کے حکمرانوں کے لئے ہزیمت اور پریشانی کا سبب بننا شروع ہوگئی تھی۔ فیض کی کتاب ''زنداں نامہ'' حکومتِ وقت کے ردعمل کا شعری اور فلسفیانہ جواب تھا۔ جس کو بعض حلقوں نے سراسر بغاوت قرار دیا تھا اور فیض کو اُن کے نظریاتی افکار شعری کی قیمت، مقدمۂ بغاوت کی فرد جرم اور قید و بند کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ اُس قید اور الزام بغاوت کے تکلیف دہ دور میں بھی فیض حالتِ قید کے بعد میں آنے والے دنوں کے بارے میں بہت پُر اُمید تھے۔ ''نقشِ فریادی'' کی ایک نظم ''بول کہ'' حالات اور اُمید و بیم کی خوبصورت اور حقیقی عکاس ہے۔

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اَب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اَب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اِک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اَب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

حق اور حق گوئی سے محرومی کے معکوس اثرات نے فیض احمد فیض جیسے لوگوں کو پیدا کیا۔ اُن کی شاعری جو موقع بہ موقع بدلتے سیاسی اور سماجی پس منظر میں لفظوں، استعاروں اور خیال کی قوت سے مزیّن اور توانا تھی، اہلِ فکر کے دلوں کو

خواہشوں نے آہ و دل پسند بن کر چھونے لگی۔

محرومیِ حق نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دوسری جانب فیضؔ کے معاشرے کے لوگوں نے پس پردہ الفاظ شعری کو اپنے اپنے دل جلے انداز میں شعلہ نگار جامے پہنانے شروع کر دیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا حق سے محرومی اور فرائض سے کوتاہی اس فکری انقلاب کو ہوا دے رہی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اقبالؒ ہو یا فیضؔ سب کو غالباً یہ توقع تھی کہ جدید پاکستان میں حق و انصاف کی جنت نظیر فراوانی ہوگی۔ سچ کا بول بالا ہوگا۔ قربانیوں کے ثمرات پاکستان کے نئے معاشرے کی تشکیل میں مثالی کردار ادا کریں گے اور خوشحالی کے لئے نئے پاکستان میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر افہام و تفہیم کا مثال آفریں سماج جنم لے گا...... یہ خواب تیزی سے چکنا چور ہونے لگا اور حساس دل رکھنے والے شعراء اور معاشرتی ناقدین نے سچ کہنا اور سچ لکھنا اپنے اپنے انداز میں بے اختیار شروع کر دیا۔ نتیجہ فوراً سامنے آیا اور حق کا گلا گھونٹنے کے عمل میں ہر سطح پر تیزی کا رجحان پیدا کر دیا گیا۔ یہی وہ وجہ بنی کہ نئے پاکستانی معاشرے کے لوگ جنت گم گشتہ سے گھبرا کر جلد ہی باہر نکلنا شروع ہو گئے اور دانشوروں سمیت تقریباً سب ہی کو محسوس ہونے لگا کہ معاشرے میں فساد ایک انوکھے انداز سے پنپنے لگا ہے اور حق سے محرومی کا عمل، زبان سے لے کر عمل تک پرورش پانے لگا ہے۔ اور جب سب نے نئے معاشرتی رجحان کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ یہ اُن کا فطری اور قدرتی حق تھا۔ جس کی اُمر بیل فیضؔ جیسے شعراء کی شاعری کے تن آور درخت کے سائے میں تیزی سے پروان چڑھنے لگی۔ ایسے میں فیضؔ کچھ اس طرح سوچنے لگے۔

چند روز اَور میری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
(چند روز اور مری جان)

مندرجہ بالا سیاسی معاشرتی اور سماجی تحیر کی فضا میں، جہاں نظریات کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، فیضؔ کو محسوس ہوا کہ حضرت علامہ اقبالؒ بھی اسی تحریک کا ایک مثبت حصہ ہیں جس کے لئے خود فیضؔ کوشاں ہیں۔ یہ خوش آئند صورت حال تھی جس میں اُس دور کا شاعر اپنا اپنا کردار اپنی قوت کے مطابق صرف کر رہا تھا۔ فیضؔ نے اقبالؒ کی اس عوامی نظریاتی میدان میں موجودگی کو محبت کی نظر سے دیکھا اور پرکھا۔ اُن کی رائے تھی کہ علامہ اقبالؒ کی نظریاتی سمت دُرست سمت میں سفر کر رہی ہے اور موجودہ معاشرتی رجحانات اور حالات میں اس دیس کا نصیبہ سنور سکتا ہے۔ اقبالؒ کی شاعری اور اس کی بے پناہ مقبولیت، اس نظریاتی میدان کے لئے راستہ تیزی سے ہموار کر رہی ہے، جس کی کسی محب وطن فرد کو ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کا اظہار فیضؔ نے اپنی پہلی شعری کتاب ''نقش فریادی'' میں ایک نظم ''اقبال'' لکھ کر کیا ہے اور علامہ اقبالؒ کی موجودگی میں مجموعی قومی مفادات کی ہم آہنگی اور توانائی کو شدت سے محسوس کر کے خوش آئند قرار دیا ہے۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اُس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم، صبح کی آمد سے بے خبر

فلسفۂ حیات، طرزِ زندگی اور نظام معاشرت پر فیضؔ کی عاقلانہ نظر ابتداء سے تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ کام، مسلسل کاوش اور جدوجہد کے باہمی ارتباط سے زندگی کے جمود کو شکست اور نظریات کو سربلندی عطا کی جاسکتی ہے۔ ''دستِ

صبا" کے دیباچے میں فیضؔ نے اپنے نظریات کی تشریح جیل میں پابندِ سلاسل ہونے کے باوجود کی ہے۔ جو ان کی، ان معروضی حالات میں خیالات کی جوانمردی کی دلیل ہے۔ فیضؔ لکھتے ہیں:

"......نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دُور دراز، اوجھل، دشوار گزار پہاڑوں میں برفیں پگھلتی ہیں۔ چشمے اُبلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر، آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کتنا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں یم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے، اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نگاہ اُن گزشتہ اور حالیہ مقامات تک بھی پہنچ گئی لیکن اُن کی منظر کشی میں نطق ولب نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے جسم و جاں جہد و طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے......"

(فیضؔ، سینٹرل جیل، حیدرآباد 1952ء۔ ابتدائیہ "دستِ صبا")

فیضؔ اسی صورتِ حال کو اپنی شاعری میں جابجا، کبھی خوبصورت رومانوی لفظوں کا جامہ پہنا کر، کبھی موسیقی بھرے خیال کو فضا میں دلیری سے اُچھال کر اور کبھی دُکھ اور اُمید کے پیرہن میں سمیٹ کر بیان کرتے ہیں۔ "اے دلِ بیتاب ٹھہر" اُس شاعرانہ ترقی پسند عمل کی بہترین مثال ہے جس میں لفظ رومانوی، خیال دلفریب، اُمید لازوال، جہد و جہد بے مثال اور قوتِ شاعر پُر ہمت ہے۔

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے، اے دلِ بیتاب ٹھہر
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانباری آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

اگر کوئی یہ کہے کہ فیضؔ کی فکر اور شاعری میں باغیانہ عناصر پائے جاتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ اُس نے فیضؔ کی شاعری کو باقی موجودہ افکار و خیالات، سماجی عناصر، معاشرتی حالات اور عوامی ضرورت کی تڑپ سے قطعی طور پر علیحدہ کر کے پیمانہ بنایا ہے، جو درست نہ ہوگا۔ فیضؔ کی شعری جہات اور ان میں موجود انسان سے محبت کی تڑپ کا احساس، انہیں اجتماعی بغاوت پر اُکساتا ہے۔ گویا وہ پودے میں موجود چند کانٹوں کو پودے کی جڑ سے لے کر پھننگ تک ساتھ لے کر چلنے کے عادی ہیں۔ یاد رہے کہ پودا اصل میں جڑ، تنے، پتوں، پھولوں، پھلوں اور کانٹوں کی اجتماعی اکائی کا نام ہے۔ اگر کوئی اس مجموعی اکائی کو فراموش کردے اور فقط کانٹے کو کسی پودے کی صفاتی اکائی قرار دے دے تو وژن کا تناظر محدود ہو کر کسی اور داستانِ دروغ گوئی کی نشاندہی کا اشارہ دیتا ہے جو قطعی طور پر درست نہیں ہے۔

فیض احمد فیضؔ کے یہاں زندگی اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کی موجودگی میں ایک سرمستی ہنگام کا نام ہے، مگر وہ اس میں سے فقط عطرِ محبت کے کشید کرنے کو حاصلِ زندگی قرار دیتے ہیں۔ ان کی فکر قومی اُمنگوں کی ترجمان ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے زندگی کو خود بہت غور سے، بہت قریب سے بلکہ ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ وہ ایک ایسے سربلند شاعر ہیں کہ بطور شاعر انہوں نے موت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھ کر کئی سال تک اس زندہ رومانوی فلسفہ کو جانچا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ بغاوت کے مقدمے کا آخری نتیجہ کرب ناک موت ہوتا ہے اور فیضؔ نے موت کی کوٹھری کی سلاخوں کے پس منظر سے کئی قیدیوں کو صبح صبح اپنی کوٹھری سے موت کے گھاٹ جاتے دیکھا ہوگا۔ یہ منظر بہت کم شاعروں کو دیکھنے کو ملا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کی شاعری کا تیسرا دور پہلے دور کا بالکل عکاس ہے۔
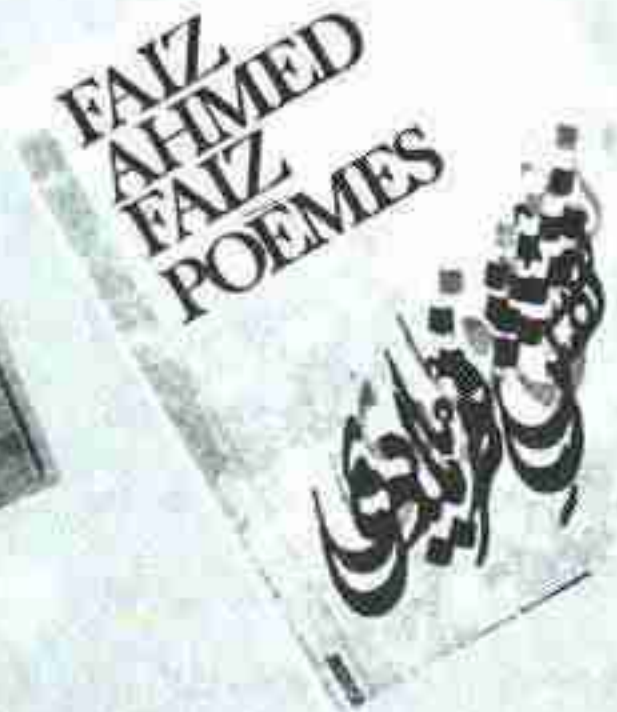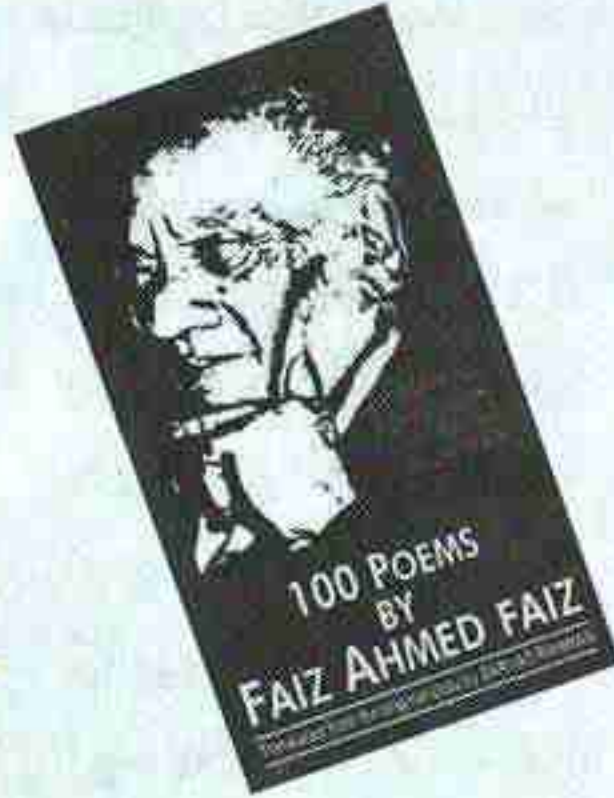
فیض کے مجموعہ ہائے کلام کے دیگر زبانوں میں تراجم

فیض احمد فیض اور تحریکِ آزادیٔ فلسطین

افتخار شفیع

آزادی کی تحریکیں، ادب کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں اور حساس شاعر اور صاحب دل ادیب ایک تخلیقی ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے، آزادی کی تحریکوں کو معنویت عطا کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادب تخلیق کرتے ہیں بلکہ تاریخ نگاری کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ شعراء اور ادباء، آزادی کی کسی بھی تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ خود تحریکِ پاکستان میں موجود تحرک ایک شاعر کے تصورات اور نظریات کا ثمر تھا۔

فیض احمد فیض، انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعے اُردو ادب میں وارد ہوئے، انہوں نے انسان دوستی کے جذبات کے ساتھ آزادی کی عالمی تحریکوں تک رسائی حاصل کی۔ فیض کا شعری کینوس، چونکہ خاصا وسیع تھا اس لیے انہوں نے اپنی شاعری میں ذات کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی حالات کو بھی موضوع سخن بنایا۔ تحریک آزادی فلسطین کے ساتھ فیض کی دل بستگی اس لیے بھی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اپنی جلاوطنی کا زمانہ بیروت میں گزارا۔ اس دوران ''لوٹس'' کی ادارت کے ساتھ ساتھ فلسطین کی کئی ممتاز شخصیات سے ان کے قریبی مراسم رہے۔ فلسطینی تحریکِ آزادی سے وابستگی کے دنوں میں فیض کے معین بسیسو، فدوی طوقان، توفیق زیاد اور ولید خازندار جیسے ممتاز شعراء سے دوستانہ تعلقات تھے، فیض، فلسطینی شعراء کے شعری مزاج سے خاصے متاثر تھے اور ان کی فکری بالغ نظری کے قائل بھی۔ فلسطینی شعراء کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ:

''فلسطینی شعراء نے آئیڈیل ازم اور حقائق کے درمیان خوبصورت توازن پیدا کیا ہے۔ ایک طرف اگر انہوں نے اپنے دور کے دکھوں، اپنی مشکلات سے بھری زندگی، اپنی قربانیوں اور شدت جذبات کا انکشاف کیا ہے تو دوسری جانب وہ لوگوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے وقار، عزت اور آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔'' (۱)

فیض کے لیے ''لوٹس (۲)'' کی ادارت کی پیش کش انگولا میں منعقدہ افریقی و ایشیائی ادیبوں کے اجتماع میں یاسر عرفات کے مشیر ثقافت اور معروف شاعر معین بسیسو اپنے ساتھ لائے تھے لیکن فیض نے اسے تب قبول کیا جب انہیں یاسر عرفات کی طرف سے باقاعدہ دعوت نامہ ملا۔

فیض کی یاسر عرفات سے بیروت میں پہلی ملاقات خاصے سوگوار ماحول میں ہوئی۔ فرانس میں کینز کے مقام پر تنظیم آزادیٔ فلسطین کے عسکری مشیر ظہیر محسن کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا تھا۔ تین روز بعد، جب ماتمی رسومات ختم ہوئیں تو فیض، معین بسیسو کے ہمراہ اس وقت، عرفات کی سکونت پر پہنچے جب ان کی سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ فیض کو یاسر عرفات کی مہمان نوازی، والہانہ پن اور سادگی اچھی لگی، اپنے ایک مختصر سفرنامے میں لکھتے ہیں:

''ابو عمار (یاسر عرفات) کچھ اس انداز سے ملے جیسے ہمیشہ سے آشنا، میانہ قد اکہرا بدن، گندمی رنگ، خشخشی ڈاڑھی، اُڑتے ہوئے بال، ملائم خدوخال مدہم آواز، شکل وصورت سے ایک بڑے انقلابی رہنما اور جری بطلِ حریت کے بجائے ایک شفیق سکول ماسٹر معلوم ہوتے تھے'' (۳)

بیروت میں فیضؔ کا قیام بھرپور رہا۔ اس زمانے کی شاعری عمدہ اور شیریں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں مقامی اثرات نمایاں ہیں۔'' انہوں نے یہ کاوش اس لیے کی تھی کہ ان کے کلام کا عربی میں ترجمہ آسانی سے ہو جائے۔ ان نظموں میں کچھ وہاں کے شعرأ کی طرز کا پاس بھی ہوگا'' (۴)

''سرِ وادیٔ سینا'' میں اسرائیلی جارحیت فیضؔ کو وادیٔ سینا پر آتش و آہن کی بارش کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس نظم میں فیضؔ اپنے مخصوص مترنم لہجے میں ''مفتیٔ دیں'' کی اس مصلحت پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں، جس کے ذریعے وہ صدیوں سے ظلم وستم کے لیے تائیدی رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ فیضؔ اس نظم میں ''مفتیٔ دیں'' کے اس اقرار کو انکار میں بدلنے کے لیے باغیانہ جذبہ اُبھارتے ہیں۔

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

(۵)

فلسطین کے حوالے سے فیضؔ کے احساسات اور جذبات ''قوالی'' کی صورت میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ یہ قوالی 1979ء میں بیروت میں لکھی گئی، اس میں اسرائیلی ظلم وستم کے ردعمل میں اُبھرتا ہوا پورا منظرنامہ دکھائی دیتا ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں کہ ''ہمارا زمانہ قدیم وحشی زمانوں سے جا ملا ہے۔ جہاں انسان اور انسانیت کے مقام سے کوئی آگاہ نہیں، تازیانوں کی طرح بجلیاں کڑک رہی ہیں'' ''قلم کے پاسبان خوار ہیں اور افراد کے اذہان اور زبانیں نیلام ہو رہی ہیں۔ اس قوالی میں تشبیہی انداز سے رچاؤ کی کیفیت پیدا کی گئی ہے، مثلاً صبر کو خرمن اور آہ وزاری کو دھوئیں سے تشبیہ دی ہے۔ ذرا تیور ملاحظہ ہوں۔

یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں خداوندا
بنا پھرتا ہے ہر اک مدعی پیغام بر تیرا
ہر اک بُت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خدائی کا
خدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

(۶)

فیضؔ کے ساتویں شعری مجموعے ''مرے دل مرے مسافر'' کا انتساب مع الاحترامات یاسر عرفات کے نام ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں مسئلہ فلسطین کے حوالے سے موجود نظموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ نظم ''گاؤں کی سڑک'' بیروت میں تخلیق ہوئی۔ اس میں فلسطین کے مسلمان باشندوں کی تعریف کی گئی ہے، جن کی شکلیں افلاس اور ناداری کے باوجود روشن اور تاباں ہیں۔ اس علاقے کو پاک لوگوں کا مدفن قرار دیا جاتا ہے۔ فیضؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ اداسی میں بھی روشنی کا ایک در وا رکھتے ہیں۔

یہ نائبانِ خداوندِ ارض کا مسکن
یہ نیک پاک بزرگوں کی رُوح کا مدفن

(۷)

اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی دستِ غیبی اور معجزۂ قدرت کی مدد کی نویدیں ملتی ہیں۔

خوشا کہ آج بفضلِ خدا وہ دن آیا
کہ دستِ غیب نے اس گھر کی درکشائی کی
چنے گئے ہیں سبھی خار اس کی راہوں کے
سنی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی

(۸)

فلسطین میں ہونے والے ظلم وستم کے حوالے سے فیضؔ کی نظم ''کیا کریں'' کا سالِ تخلیق 1980ء ہے، شاعر فلسطین اور فلسطینیوں کے غم میں نہ صرف خود غم زدہ نظر آتا ہے بلکہ اس کے غم سے مظاہرِ فطرت بھی لہولہو ہیں۔ نظم کے آخر میں شاعر کی بے بسی نقطۂ عروج کو چھولیتی ہے۔

کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا بُنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا،
بتا، بتا،

نظم ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' میں شاعر دیارِ غیر میں بھی اپنے ساتھ پُرعزم مجاہدین کی موجودگی محسوس کرتا ہے اس نظم کے آخر میں بھی فیضؔ کا رجائی انداز نمایاں ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ براہ راست سرزمین فلسطین سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ انہوں نے تو صرف ایک فلسطین برباد کیا ہے مگر میرے دل پر جتنے زخم لگے ہیں وہ قلم کی نوک سے لہو بن کر ٹپک رہے ہیں اور ان قطروں سے کئی فلسطین جنم لیں گے۔

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعداء نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

(۱۰)

فیض کی نظم ''فلسطینی بچے کے لیے لوری'' فلسطین میں ہونے والی تباہ کاری کی آئینہ دار ہے اس تباہی میں نہ صرف دودھ پیتے بچے شہید ہوئے بلکہ ان کے خواب بھی ٹوٹتے بکھرتے رہے، رقصِ ابلیس جاری رہا۔ ایک فلسطینی بچے کے دُکھ کو سمجھنے کا نہایت خوبصورت، نفسیاتی انداز اس نظم میں اسلوب کی جدت کی غمازی کرتا ہے، تنہا بچہ آہ وزاری کر رہا ہے، اس کا باپ مر چکا ہے اور ماں اس کی لاش پر بین کرتے کرتے سو گئی ہے۔ اس کا بھائی پردیس میں ہے، فیضؔ اس روتے ہوئے بچے کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

مت رو بچے!
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امی، ابا، باجی، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے

(۱۱)

اس نظم کے آخر میں فیضؔ نے رنگین اور پُرامید خوابوں کو دلکش تتلی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بچہ اچھے دنوں کی بانہوں میں ضرور کھیلے گا!

نظم ''عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا'' میں شاعر کی ایک مخفی خواہش بیان کی گئی ہے جو بالآخر بغاوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، وہ دُکھ اور کرب جو انسان ہمیشہ سینے میں چھپائے رکھتا ہے آخر کار ایک آتش فشاں بن کر پھٹ جاتا ہے۔ شاعر اس نظم میں آزادی کے متوالوں سے اظہار یک جہتی کرتے ہوئے ان کی قربانیوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ فیضؔ کے نزدیک ان لوگوں کے پاؤں کی بیڑیوں کی جھنکار کسی خوش نما نغمے سے کم نہیں۔

پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے

(۱۲)

''ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' (۱۳) میں فیضؔ عدو کی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہونے والے غازیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، نظم میں اس وقت جذبات کی شدت پیدا ہو جاتی ہے جب اردگرد کے ماحول سے بے خبر، اپنی محویت کے عالم میں مجاہدینِ فلسطین کو فتح کی نوید سنائی جاتی ہے۔

فرمودۂ ربِ اکبر ہے
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایۂ رحمت سر پر ہے
پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

(۱۴)

فلسطین کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں ایک اہم نظم ''ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے'' کے عنوان سے فیضؔ کے آٹھویں شعری مجموعے'' غبارِ ایام'' میں شامل ہے۔

فیضؔ کے خیال میں فلسطین کے جلے ہوئے آشیانے کسی محل سے کم تر معلوم نہیں ہوتے۔ سرزمین فلسطین رشکِ ارم ہے اور

شہداء کے چہرے خونِ شہادت میں ڈھلنے کی وجہ سے پہلے سے ہزار گنا روشن ہو گئے ہیں اور ان چہروں کے رنگین عکس سے لبنان، جو فلسطینیوں کی پناہ گاہ ہے، کی گلیاں جگمگا اٹھی ہیں۔

جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پرنور ہوئے
اب ان کے رنگیں پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اور تاباں ہے ارضِ لبنان
بیروت نگار بزم جہاں

(۱۵)

آخر میں شہر بیروت کے لیے دعائیہ انداز جنم لیتا ہے شاعر کے دل کی تمنا بھی یہی ہے

یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے
بیروت نگار بزم جہاں
بیروت بدیل باغ جناں

(۱۶)

یوں تو فیضؔ، دنیا میں آزادی کے حصول کے لیے برپا ہونے والی تمام تحریکوں سے قلبی ربط رکھتے تھے لیکن انھیں فلسطینی تحریکِ آزادی سے فطری لگاؤ تھا، جس میں قیام بیروت کی معروضی صورت حال نے اہم کردار ادا کیا۔ فیضؔ اُردو شاعری کی تاریخ میں اس لیے بھی زندہ جاوید ہیں کہ ان کا پیغام آفاقی ہے، جو جغرافیائی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ امن اور انصاف کی عظیم بنیادوں پر مشتمل عالمی معاشرے کے قیام کا تمنائی ہے۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ فیض احمد فیضؔ ''فلسطینی ادب'' دنیازاد، جلد دوم، شمارہ ۵، کراچی شہرزاد، ۲۰۰۲ء، ص ۶۵۔

۲۔ ''لوٹس'' (Lotus) کا اجرا، ۱۹۶۸ء میں قاہرہ (مصر) سے ہوا۔ معروف ادیب یوسف السباعی اس کے پہلے مدیر تھے۔ یوسف السباعی بعد میں صدر انور سادات کے وزیرِ ثقافت بنے۔ انور سادات کی اسرائیل کے ساتھ رسم و راہ بڑھی، تو اس کے ردعمل میں یوسف السباعی کو قتل کر دیا گیا۔ تب سے ''لوٹس'' تو شائع ہو رہا تھا لیکن اس کے مدیر اعلیٰ کی نشست خالی تھی۔

۳۔ فیض احمد فیضؔ ''ظہیر محسن کا ماتم اور یاسر عرفات کی سالگرہ''، فلسطین، اُردو ادب میں، لاہور، سنگِ میل ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۲، کراچی۔

۴۔ عزیز حامد مدنی، آج بازار میں پابجولاں چلو، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳۔

۵۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲۲۔

۶۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۲۔

۷۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۴۴۔

۸۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۴۵۔

۹۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۴۔

۱۰۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۶۔

۱۱۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۳۸۔

۱۲۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۷۶۔

۱۳۔ یہ نظم ''دنیازاد'' کے شمارہ ۵ میں اضافی بند کے ساتھ موجود ہے۔ وہاں اس کا عنوان بھی کلیات سے مختلف ہے اور نظم کا نام ''ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' کی بجائے ''لاخوف علیہم'' ہے۔

۱۴۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۸۳۔

۱۵۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۸۰۔

۱۶۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، ص ۶۸۱۔

☆..........☆☆☆..........☆

فیض اور اس کی یاد

شاہدہ دلاور شاہ

انقلابی شاعر فیض احمد فیض کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے 24 سال کا عرصہ بیت چکا ہے مگر ان کی "یاد" ہمارے دلوں میں روزِ روشن کی طرح موجود ہے۔ 20 ویں صدی میں جہاں مختلف حوالوں سے تاریخ پلٹا کھا رہی تھی وہاں فیض کی انقلابی شاعری انڈیا اور پاکستان میں سامراجیت کے خلاف بھرپور احتجاج کر رہی تھی۔ ان کی شاعری میں روایت اور بغاوت کا امتزاج، کلاسیکی رنگ و رس اور وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے۔ انہوں نے ترقی پسندی اور رومان پسندی کو یکجا کر کے فنِ غزل کو ایک نئے مزے سے آشنا کیا ہے۔

آیئے! فیض کو یاد کرتے ہوئے ان کی "یاد" کی بات کرتے ہیں۔

"یاد" وہ سات رنگی قوس ہے جس میں ماضی ایک خوش نما شکل بن کر چند لمحوں کے لیے حال سے دور ایک گوشۂ عافیت میں انسان کو لے جاتی ہے۔ جب ایک تخلیق کار یاد کے دریچے کھولتا ہے تو پھر ماضی کی رنگینی، غزل یا نظم کی صورت ایسے جہاں میں لے جاتی ہے جو آپ کی تمناؤں کا تخلیق کردہ ہے۔ یاد بڑی عجیب شے ہے۔ یہ کبھی درد تو کبھی درماں بنتی ہے کبھی زخم تو کبھی مرہم میں ڈھل جاتی ہے، اگر ایک شاعر یہ کہتا ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

تو اسی کے پہلو بہ پہلو فیض کے اولین شعری مجموعے "نقشِ فریادی" کا پہلا نقش یاد سے یوں روشن ہوتا ہے۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یاد کی بوقلمونی اور رنگا رنگی یہ کہنے کے باوجود کہ:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض کے یہاں دل فریبیِ روزگار کے سائے دھندلائے نہیں۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

زیرِ مطالعہ نظم "یاد" ایک کیفیت کا خوبصورت تجسیمی اور حسی تلازموں پر مشتمل اظہاریہ ہے۔ یہ نظم "دستِ صبا" میں شامل ہے۔ اسی مجموعے کے دیباچے میں فیض نے لکھا تھا کہ تخلیق کار پر مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی فرض ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعوری کوششوں کے باوجود بھی فیض رومان کی اس کشش سے جو ماضی کی ویران سراؤں یا بھری بہاروں میں لے جاتی ہے، چھٹکارہ نہیں پا سکے۔ انہیں غمِ عشق بھی غمِ روزگار لگتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف تاریک راستوں میں مارے جانے والوں اور حسین کھیتوں میں اُگنے والی بھوک کے دکھ بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ، غازے کی تحریروں اور ٹمٹماتے ہوئے آویزوں کی یاد کو بھی بے اختیار موضوعِ سخن بنا لیتے ہیں۔ یہ نظم اس لمحے کی یاد ہے جب غمِ یار کی پرچھائیاں نظم کی صورت خود گنگنانے لگتی ہیں۔

خارجی اور اندرونی شہادتیں بتاتی ہیں کہ نظم زنداں میں ہی لکھی گئی ہے۔ پہلے حصے میں ایک مجبور کردار ہے۔ محبت کے خاص دُکھ

اٹھانے والا کردار جس کے پاس دل کو بہلانے کے لیے صرف یاد کا سہارا ہے۔ ہجر کے اس عالم میں تخیل کی قوت شاعر کو ماضی میں لے جاتی ہے جہاں وہ خوبصورت چہرہ، اس کی خوبصورتی اور خوبصورتی کے دیگر حوالے اگر میسر نہ بھی تھے تو کم از کم نظروں کے سامنے ضرور تھے۔ دشتِ تنہائی کی ترکیب لاکر شاعر تنہائی کی وسعت میں اضافہ کرتا ہے۔ تنہائی کے صحرا میں شاعر محبوب کی آواز کے سائے سنتا ہے اور ہونٹوں کے سرابوں کا شکار ہوتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جو بقول عابد علی عابد اختلالِ حواس کا عالم ہے۔ یہاں تمام حسیات وحدت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ محویت کا خاص عالم ہے جو صرف عشق ہی عطا کرسکتا ہے۔ تنہائی بذاتِ خود ایک بہت بڑا وشت ہے اور رومانی مزاج کا شخص اس وشت سے ماضی کی پرچھائیاں تلاش کرنے ضرور نکلتا ہے کوئی بھی رومانوی شخص ماضی کی کشش اور ماضی میں لوٹ جانے اور یادِ ماضی سے ایک خاص طرح کی لذت پانے سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس حصے میں ماضی کی قوسِ وقزح اس شخص کو آواز کے سایوں اور ہونٹوں کے سرابوں کا قیدی بنالیتی ہے۔ آواز کا دشت، جو محبوب سے بھی بہت دور ہے لیکن محبوب کے پہلو سے کھلنے والے گلاب اور سمن اب بھی نظروں کے سامنے ہیں۔ سراب کی صورت ہی سہی یادِ محبوب نے ایک گلزارِ ارم کھلا دیا ہے۔

دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

نظم کا دوسرا حصہ یاد کا ایک نیا دریچہ وا کرتا ہے۔ تخیل کی وہی قوت ہے لیکن اب لوحِ یاد پر جو نقش اُبھرا ہے وہ پاس بیٹھے ہوئے محبوب کی سانسوں کی آمد و رفت ہے۔ مدہم اور معطر سانس، یہ وہ زمانہ ہے جب قربت نصیب ہوئی ہے اور مہکتی سانسیں خود شاعر کی اپنی سانسوں کو بے ترتیب بلکہ اتھل پتھل کردیتی ہیں۔ رومانی افتادِ طبع نے اس لمحے کو تخیلی سطح پر ہی سہی لیکن دوبارہ گرفت میں لیا ہے۔ یہ لمحہ گویا ٹھہر سا گیا ہے۔ اب نظر کو وہ قوت حاصل ہوگئی ہے جو دور اُفق پار مناظر تک چلی گئی ہے جہاں محبوب کی نظروں کی شبنم گر رہی ہے۔

فیض کے مزاج آشنا جانتے ہیں کہ وہ عشق میں کچھ طلب نہیں کرتا یہ درست ہے کہ وہ زندگی میں کئی غزل اور غزال چہروں اور ستارہ آنکھوں کا عاشق رہا یعنی ایک سے زائد محبتیں عشق کے جذبۂ لامحدود کو متاثر نہیں کرتیں لیکن یہ ایک الگ کہانی ہے۔ فیض کی شاعری میں عشق اور محبوبیت کے درمیان ایک واضح فاصلہ موجود ہے۔ اثر لکھنوی کو ''دلدار نظر'' میں جو غرابت نظر آتی ہے وہ کج فہمی اور مخصوص طرح کے تعصبات کا نتیجہ ہے۔ وہ ''دلدار نظر'' کی بجائے ''غم دیدہ مژہ'' کی جو ترکیب تجویز کرتا ہے وہ پوری نظم کو گرہن لگا دیتی ہے۔

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

نظم کے آخری حصے میں شاعر ایک بار پھر اُمید پرستی کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں ہجر و وصال کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ شاعر کا دل یاد کی مٹھی میں یوں بند ہو جاتا ہے کہ ساری کی ساری کیفیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ صبحِ فراق میں ہجر کا دن یوں ڈھلتا ہے کہ یکا یک شامِ وصال ہو جاتی ہے۔

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

اثر لکھنوی نے ''دل کے رخسار'' کی ترکیب پر بھی ناواجب اعتراضات کیے ہیں تاہم فیض کے یہاں یاد، فرار کا لمحہ نہیں بلکہ ماضی اور حال کی خوشیوں کو ملانے والا خواب ہے۔ احساسات داخلی ہیں لیکن یہ خارج کی طرف سفر کرتے ہیں پابند ہیئت میں تین بندوں پر مشتمل یہ نظم تین مختلف احساسات کو جوڑتی نظر آتی ہے۔ نظم خوبصورت امیجری پر مشتمل ہے۔ یہ تصویریں ان احساسات کا خوبصورت اظہاریہ ہیں۔

۱۔ تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
۲۔ کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

۳۔اُبھر رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
۴۔گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
۵۔دل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات

ڈاکٹر وزیر آغا اور انیس ناگی نے موضوع کی مطابقت سے جس نئی شعری لسانیات
فیض کی شعری لسانیات کے ٹھہراؤ اور اُلجھاؤ کی کو گرفت میں لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔
بات کی ہے لیکن یہ نظم بتاتی ہے کہ فیض نے اپنے

☆..........☆☆☆..........☆

''مجھے ابا سے ایک شکایت ہے۔ میری منگنی حمیر کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ہم دونوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے حمیر سے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ میرے ابا ماڈرن خیالات کے ہیں وہ ہمیں فلم دیکھنے کی اجازت فوراً دے دیں گے۔ لہٰذا میں نے اعتماد کے ساتھ ابو سے فلم دیکھنے کی اجازت چاہی۔ ابا بولے اکیلے نہیں جانا۔ میں نے خوش ہو کر بتایا حمیر کے ساتھ جا رہی ہوں۔ بولے ابھی شادی تو نہیں ہوئی نا۔ اجازت نہیں ملی۔ حمیر کہنے لگا کوئی حرج نہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ شادی فوراً ہونی چاہیے۔

مجھے Cockroaches سے وحشت ہوتی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی میرے پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور میں یخ ٹھنڈی ہو جاتی ہوں۔ حد یہ ہے کہ میری آواز تک نہیں نکلتی۔ ایک مرتبہ میرے غسل خانے میں کاکروچ نکل آیا۔ میں اُمید سے تھی۔ بستر پر لیٹے ہوئے میں نے کاکروچ صاحب کو دیکھا تو اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے...... ساتھ والے کمرے میں ابا تھے۔ انہیں آہستہ سے آواز دی۔ آئے اور بولے کیا بات ہے؟ پھر اچانک ان کی نظر کاکروچ پر پڑی۔ وہ میری کمزوری سے واقف ہیں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ابا کا رنگ فق ہے۔ ایک قدم کاکروچ کی طرف بڑھاتے ہیں تو دو قدم پیچھے لوٹ آتے ہیں۔ اسی تگ و دو میں مصروف تھے کہ کاکروچ نہ جانے کیسے سوراخ میں جا گھسا۔ ابا نے کمال چابکدستی سے سوراخ پر ڈھکنا رکھ دیا۔ کہنے لگے اچھا ہوا خود ہی چلا گیا۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے وہ میرے کمرے سے چلے گئے۔ لوگ کہتے ہیں یہ انقلابی ہیں اور ان کا انقلاب خونیں ہے۔ میں اُس روز سے سوچ میں ہوں کہ ان سے کاکروچ کا قتل تو ہو نہیں سکتا یہ خونیں انقلاب کیسے لا سکتے ہیں۔''

(منیزہ ہاشمی)

فیضؔ اور شو بزنس

زاہد عکاسی

فلم ایک مؤثر ذریعہ ابلاغ ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے کی نہ صرف برائیوں کو بیان کیا جاسکتا ہے ان کا انجام دکھایا جاسکتا ہے بلکہ انسان کا ذہن بھی بدلا جاسکتا ہے اس کی سوچ کو مہمیز بھی دی جاسکتی ہے۔ انسان میں پیار بھی بانٹا جاسکتا ہے اور وائلنس والی فلمیں بنا کر انسان کو جرائم پیشہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جرائم پیشہ فلموں کا آغاز ہالی وڈ سے ہوا تھا جب کاؤبوائے فلمیں منظر عام پر آئی تھیں جبکہ برصغیر میں پیار محبت کی فلمیں بنائی جاتی تھیں کیونکہ یہاں کی فضا ہی رومان پرور نظاروں سے بھری پڑی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد 1947ء کے فسادات سے متاثر ہو کر جو فلمیں پیش کی گئیں انہوں نے تماشائیوں کو خون کے آنسو رلایا۔ اس زمانے میں جو لٹریچر سامنے آیا اس میں تو شاعروں اور ادیبوں نے انسانوں کے قتل عام پر احتجاج کیا ہی فلمیں بھی اس میں پیچھے نہیں رہیں۔ پاکستان میں ''کرتار سنگھ'' اور بھارت میں ''بٹوارہ''، ''گرم ہوا'' اور ''ٹرین ٹو پاکستان'' جیسی فلموں نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔

کرتار سنگھ میں امرتا پریتم کی اس نظم کو جس درد ناک طریقہ سے پیش کیا گیا وہ لوگوں کے ذہن میں ثبت ہو کر رہ گئی۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتے قبراں وچوں بول
تے اپنی کتاب عشق دا اج اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ درد منداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں اج لہو دی بھری چناب
اج سارے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لیائیے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

اس زمانے میں نہ صرف قتل و غارت سے متاثر ہو کر فلمسازوں نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا تھا بلکہ جب بھوک نے ڈیرے ڈالے تھے تو اس پر بھی ظہیر کاشمیری جیسے شاعروں نے فلموں کے مکالمے لکھے تو انہوں نے دیکھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بابا ظہیر کاشمیری نے ''آس پاس'' میں لکھا تھا ''یا تو مجھے ایسی جگہ بھیج دو جہاں بھوک نہیں لگتی' جہاں اناج نہیں اُگتا یا میرے ساتھ بھوک کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دو تا کہ آنے والی نسلیں صرف پیٹ کی خاطر جرائم نہ کر سکیں۔ جج صاحب آپ کا قانون ایک بیگناہ کو پھانسی تو دے سکتا ہے روٹی نہیں دے سکتا۔'' جبکہ ضیا سرحدی نے بمبئی میں تیار کی جانے والی اپنی فلم ''ہم لوگ'' میں ایسے ہی مکالمے لکھے تھے'' جس دیئے میں تیل نہ ہو اسے جلنے کا کیا ادھیکار اور جب تیل ختم ہو جاتا ہے تو دیا بجھ جاتا ہے اور صبح ہو جاتی ہے نہیں اندھیرا چھا جاتا ہے''

جہاں تک فیض احمد فیضؔ کا تعلق ہے رنگا رنگ نگار خانے میں ان کی وہ نظمیں بطور خاص مقبول ہوئیں جن میں آغاز شباب کا البڑپن اور مناظر کا حسن تو چھلکتا ہی ہے لیکن ساتھ ہی معاشرے کے تضادات کا بھی ذکر ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں فیضؔ کی طرح ہی دھیما پن ہے لیکن ایک بات اس میں ضرور ہے کہ فیضؔ کی شاعری اوپر سے تو اخترؔ شیرانی کی طرح شبنمی ہے لیکن اس میں جوشؔ ملیح آبادی کی طرح اندر سے شعلوں کی لپک بھی دکھائی دیتی

ہے۔ ان کے دل میں ایک چنگاری تھی جو بنی نوع انسان کی محکومیت اور مظلومیت کو دیکھ دیکھ کر سلگتی اور بھڑکتی تھی اور پھر شعروں کے قالب میں ڈھل جاتی تھی ان کے اشعار قاری کا خون گرماتے بھی ہیں اور سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف غزل کی روایت کو بدلا بلکہ ان کے الفاظ کے معانی بھی بدل ڈالے وہ اپنے زمانے کے سارے دکھ پی گئے۔ ساری دنیا کے مظلوم انسانوں اور ان کے معاشروں کے سارے دکھوں کو اپنا دکھ بنالیا اور یوں فیض کی شاعری میں ہر دکھی انسان اپنے دل کی دھڑکن محسوس کرتا نظر آتا ہے۔

فیض کا فلم سے براہ راست تعلق شروع میں بالکل نہیں تھا ان کی جو غزلیں اور نظمیں مشہور ہو چکی تھیں ان کو بعض فلمسازوں نے اپنی فلموں میں ضرور لیا البتہ بعد ازاں بھٹو دور میں وہ براہ راست فلموں میں ملوث بھی ہوئے۔ 1947ء میں نرگس آرٹ پروڈکشن کے تحت بمبئی میں فلم ''رومیو جولیٹ'' بنی تو اس میں فیض صاحب کی غزل ۔

''دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے''

شامل کی گئی۔ اس کی موسیقی حسن لال بھگت رام نے ترتیب دی تھی جبکہ آواز زہرہ بائی انبالہ والی کی تھی۔ اس کے فنکاروں میں نرگس، سپرو، انور حسین، نثار، جان کاوس، نذیر کاشمیری وغیرہ شامل تھے۔ مکمل غزل یوں تھی البتہ ایک مصرع میں ایک لفظ تبدیل کر دیا گیا تھا مثلاً

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

لیکن فلم میں گناہ کو نگاہ کر دیا گیا تھا اور شعر کچھ یوں ہو گیا تھا

اک فرصت نگاہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

بھارت میں دوسری تیار ہونے والی فلم ''مزدور'' تھی اس میں دلیپ کمار ہیرو تھے اس میں فیض احمد فیض کی نظم کو گیت کی شکل میں پیش کیا گیا جس کے بول ہیں ۔

''ہم محنت کش مزدور جب اپنا حصہ مانگیں گے''

اسی طرح موسیقار شنکر جے کشن نے شمی کپور کی فلم ''جانور'' میں ان کا ایک قطعہ دیا جو رفیع اور آشا بھونسلے کی آوازوں میں تھا۔

رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

ممتاز ترقی پسند ادیب اور صحافی حمید اختر کا کہنا ہے کہ فیض کو فلم سے خاصا لگاؤ تھا۔ وہ اس میڈیا کو سب سے اہم سمجھتے تھے۔ ان کا دوستانہ مشہور ہدایت کار اے جے کاردار کے ساتھ تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نیف ڈیک کے تعاون سے خود بھی جو فلمیں بنائیں ان کے ہدایت کار اے جے کاردار ہی تھے جبکہ اے جے کاردار ہوشیار اور چالاک آدمی تھا، فیض صاحب جب بھٹو دور میں بھٹو صاحب کے مشیر مقرر ہوئے تو انہوں نے فیض صاحب کے ذریعے فوائد حاصل کرنے کی خاصی کوشش کی ان ہی کاوشوں کے نتیجہ میں فلم ''پریت کی ریت'' کا منصوبہ بنا تھا جس کی ہیروئن حمیرا چودھری اور ہیرو سلیم ناصر تھے۔ اسکی شوٹنگ گڈانی اور ہالہ جھیل پر ہوئی تھی جہاں سارا یونٹ کئی روز تک مقیم رہا تھا۔ یہ فلم مارشل لاء کے نافذ ہونے کی وجہ سے نامکمل ہی رہی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فیض صاحب کو فلم سے بڑی دلچسپی تھی لہٰذا فیض صاحب نے 1958ء میں پنڈی سازش کیس سے فارغ ہونے کے بعد فلمساز نعمان تاثیر سے ایک فلم کی کہانی لکھنے کی حامی بھری۔ فلم کا نام ''جاگو ہوا سویرا'' رکھا گیا جس کے ہدایت کار اے جے کاردار مقرر ہوئے۔ فیض صاحب ان دنوں ''پاکستان ٹائمز'' کی چیف ایڈیٹری چھوڑ چکے تھے کیونکہ جنرل ایوب خان نے ملک میں

صدر سکندر مرزا کی حکومت برطرف کر کے مارشل لاء لگا دیا تھا۔

جنرل ایوب کی کوشش تھی کہ پی پی ایل کے مدیران ان کی مرضی کے مطابق اداریے اور مضامین لکھیں اس سلسلہ میں جنرل ایوب کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے بھی انہیں راضی کرنے کی کوشش کی لیکن فیض احمد فیض مظہر علی خان اور احمد ندیم قاسمی نے ادارتی عہدوں سے استعفیٰ دے دیا ان کے ہمراہ سید سبط حسن بھی تھے جو ان دنوں ہفتہ وار ''لیل ونہار'' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ ادارہ اس قدر طاقت ور تھا کہ حکومت کو اس پر قبضہ کرنا پڑ گیا اور یوں میاں افتخار الدین کے پی پی ایل کا زوال شروع ہوا جو آخر کار نوے کی دہائی میں بند ہو گیا۔

''جاگو ہوا سویرا'' کی کہانی مچھیروں کی زندگی پر تھی جس میں بتایا گیا تھا کس طرح ایک مچھیرا عمر بھر کی کمائی سے بچت کر کے ایک کشتی بنانا چاہتا ہے تا کہ وہ خود اپنی کشتی پر مچھلیاں پکڑ سکے لیکن کشتی جب تیار ہو جاتی ہے تو اسے طوفان نگل لیتا ہے۔ اس فلم میں جن اداکاروں نے کام کیا ان میں ترپتی مترا، انیس زورین اور رخشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ فلم 25 مئی 1959ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ موسیقی تمرن برنی کی تھی لیکن یہ فلم باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس فلم میں کہانی کے علاوہ منظر نامہ، کردار اور مکالمے بھی فیض صاحب نے لکھے تھے۔ اس فلم کے گیت بھی فیض صاحب نے لکھے تھے۔ ایک گیت کے بول کچھ یوں تھے۔

موتی ہو کہ شیشہ جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا

اس گیت کو محبوبہ اور حسنات نے گایا تھا جبکہ دوسرا گیت:

شام ڈھلی بجھ گیا دل

الطاف محمود کی آواز میں تھا۔

تیسرے گیت کیلئے آواز راحت غزنوی کی تھی جس کے بول ہیں:

بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو، چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو، چھوڑو غم کی بات
کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات

یہ فلم اردو اور انگریزی دونوں ورژن میں بنائی گئی تھی۔ یوں تو فیض صاحب کے کلام سے مختلف فلمساز مستفید ہوتے رہتے تھے جن کی فلموں میں ''شہید''، ''فرنگی''، ''قیدی''، ''چاند سورج''، ''سکھ کا سپنا''، بھارتی فلم ''انجمن'' اور ''قسم اس وقت کی'' قابل ذکر فلمیں ہیں۔

بھارتی اور پاکستانی ملا کر کل 12 فلمیں ہیں جن میں یا تو فیض صاحب کی غزلیں یا گیت آئے یا پھر انہوں نے کہانیاں، مکالمے یا منظر نامہ لکھنے کے علاوہ فلمسازی بھی کی۔

بھارت کے ہدایت کار مظفر علی نے جب ''امراؤ جان ادا'' کے بعد فلم ''انجمن'' بنائی تو اس میں فیض صاحب کی غزل تھی۔

''کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں''

اس غزل کو جگجیت سنگھ نے گایا اور موسیقی خیام نے دی تھی۔

پاکستانی فلم ''شہید'' میں فیض صاحب کا ایک گیت شامل تھا۔ اس کی موسیقی رشید عطرے کی تھی اور ہدایت کار خلیل قیصر تھے، اداکاروں میں مسرت نذیر، علاؤ الدین اور طالش تھے یہ فلم 5 جنوری 1962ء کو ریلیز کی گئی تھی گیت کے بول تھے۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم وجاں بچا کے چلے

جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

پنجند پکچرز کے بینر تلے حمید اختر نے اپنی فلم ''سکھ کا سپنا'' 19 جنوری 1962ء کو ریلیز کی۔ فلم کے ہدایت کار مسعود پرویز جبکہ موسیقی منظور اشرف کی تھی فلم کے ستاروں میں لیلیٰ، یوسف خان، ترانہ، یاسمین اور طالش تھے۔

اس کہانی کا مرکزی خیال ایک آسٹریلین کہانی سے لیا گیا تھا جو کسی کیمونسٹ ورکر پر لکھی گئی تھی جو کہ انگریزی زبان میں تھی۔ کہانی کے مطابق ایک بوڑھا آدمی جوئے کا رسیا ہے اسی سے اسے پیسے کی طاقت کا احساس ہوتا ہے وہ اس طرح کہ جب پولیس چھاپہ مارنے آتی ہے تو جوئے کے اڈے سے پیسے لے کر چلی جاتی ہے۔ ہوٹل والا باقاعدہ رشوت دے کر ناجائز کام کراتا ہے۔ اس فلم کا یہ گیت کافی مشہور ہوا تھا جس پر زریں سلیمان نے رقص کیا تھا۔

''میری بوتل گھومے سنبھل سنبھل کے''

یہ گیت نسیم بیگم کی آواز میں تھا دوسرا گیت یہ تھا جو نور جہاں کی آواز میں صدا بند ہوا

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
سب چاہتیں بھلا کر
کتنے اداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
کیا کیا نہ دل دکھا ہے
کیا کیا بہیں ہیں اکھیاں
کیا کیا نہ ہم پہ بیتی
کیا کیا نہ ہوئے پریشاں
ہم تجھ سے دل لگا کر
تجھ سے نظر ملا کر
کتنے فریب کھائے
اپنا تجھے بنا کر
تھی آس آج ہم پر
کچھ ہو گی مہربانی
ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
ہلکا کریں گے جی کو، سب حال دل زبانی
تجھ کو سنا سنا کر آنسو بہا بہا کر،
کتنے اداس آئے ہم تیرے پاس جا کر

ایک گیت نور جہاں نے ''شام ہوئی گھر آ'' اور نسیم بیگم نے ''لاؤ اپنے حسن کی ناؤ'' گایا تھا۔

عام طور پر باتوں ہی باتوں میں لوگ فیض صاحب سے پوچھا کرتے تھے کہ پاکستان میں بھی اچھی فلمیں بنیں گی ان کا برجستہ جواب تھا کہ پاکستان میں اس وقت اچھی فلمیں بن سکتی ہیں جب فلمیں شوٹ کرنے کے بجائے موجودہ فلمسازوں کو شوٹ کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں جو فلم حقیقت کے قریب ہو یا جس میں تفریح کا عنصر کم ہو یا جس چیز کو فلم والے تفریح سمجھتے ہیں وہ اگر نہ ہو تو فلم کامیاب نہیں ہوتی۔ یہ تصور اور یہ تاثر سرے سے غلط ہے۔

ان کا یہ جملہ اب تک فلم انڈسٹری پر صادق آتا ہے یہ فلمیں غیر معیاری ہونے کا نتیجہ تھا کہ انڈسٹری زوال پذیر ہوتی ہوئی آخر کار دم توڑ گئی۔

فیض صاحب نے ''جاگو ہوا سویرا'' کے بعد اے جے کاردار کیلئے اگلی فلم ''دور ہے سکھ کا گاؤں'' لکھی تھی یہ فلم نامکمل ہی رہی۔ اس دوران فلم ''فرنگی'' ریلیز ہوئی جو 18 دسمبر 1964ء کو نمائش کیلئے پیش کی گئی اس کی مہدی حسن کی آواز میں صدا بند کی ہوئی یہ غزل بہت مقبول ہوئی:

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اس فلم کے ہدایت کار خلیل قیصر تھے جبکہ موسیقی رشید عطرے کی تھی فنکاروں میں شمیم آراء، سدھیر، طالش اور بہار قابل ذکر تھے، اسی طرح فیض صاحب کی نظم، ''اے روشنیوں کے

شہر'' بھی کافی مشہور ہوئی تھی جہاں تک ''گلوں میں رنگ بھرے'' کا تعلق ہے یہ مہدی حسن نے سب سے پہلے اس جمہوری ٹرین میں گائی تھی جو جنرل ایوب خاں کے دور میں ہر شہر میں جاتی تھی۔

فیض صاحب کی ایک نظم ''قیدی'' فلم میں بھی لی گئی تھی جو نور جہاں کی آواز میں تھی دراصل نور جہاں نے یہ نظم ریڈیو کیلئے گائی تھی اور تمام ملک میں اس نے مقبولیت کی سند حاصل کرلی تھی جسے بعدازاں ہدایت کار نجم نقوی نے اپنی فلم ''قیدی'' میں لے لیا تھا اس فلم کے پروڈیوسر آغاجی اے گل اور موسیقار رشید عطرے تھے۔ اداکاروں میں شمیم آراء اور نذر تھے۔ یہ فلم 15 جون 1962ء کو ریلیز ہوئی تھی نظم یہ تھی۔

مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات

ہدایت کار شور لکھنوی کی فلم ''چاند سورج'' 25 دسمبر 1970ء کو ریلیز ہوئی تو اس میں بھی فیض صاحب کی غزل مہدی حسن کی آواز میں لی گئی اس فلم کے موسیقار نوشاد تھے جبکہ اداکاروں میں وحید مراد، ندیم، شبانہ اور روزی قابل ذکر ہیں۔ یہ غزل بھی ماضی میں گائی گئی غزلوں کی طرح مقبول ہوئی اس کے بول ہیں۔

''عشق کو حسن سے دوچار تو کر دیتا تھا''

جنرل ایوب خان 1965ء کی جنگ سے قبل ہی خود بخود فیلڈ مارشل بن گئے تھے یوں انہوں نے بغیر کسی جنگ کے ترقی کرلی تھی لیکن 1965ء کی جنگ کے بعد جب تاشقند میں معاہدہ ہوا تو اس وقت کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو ان سے علیحدہ ہو گئے 1967ء میں بھٹو نے پیپلز پارٹی قائم کی اور اس کے بعد ایوب خان کے خلاف تحریک شروع کردی پھر کیا تھا ایوب خان کا تختہ الٹ دیا گیا اور ایوب خان نے عنان اقتدار اس وقت کے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دی۔

اے جے کاردار کا تعلق اپر کلاس سے تھا لہٰذا ایوب حکومت کے دور میں اس نے ایئر فورس کے تعاون سے فلم ''قسم اس وقت کی'' کا آغاز کر دیا تھا اس فلم کا مقصد پاکستان ایئر فورس کی اس کارکردگی کو خراج تحسین پیش کرنا تھا جو انہوں نے 1965ء کی جنگ میں دکھائی تھی پھر اس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی یکجہتی پر بھی زور دیا گیا تھا جو 1971ء کو ٹوٹ گئی تھی۔ اے جے کاردار نے اس فلم کے گیت اور مکالمے فیض صاحب سے لکھوائے جبکہ ایئر فورس کی طرف سے اس کے نگران اشفاق نقوی تھے۔ اشفاق نقوی نے بھی اس فلم کے بارے میں اپنی کتاب میں خاصا ذکر کیا ہے فلم کی موسیقی سہیل رعنا نے ترتیب دی تھی جبکہ فنکاروں میں شبنم، طارق عزیز، روزی اور روزینہ قابل ذکر ہیں۔ گیت مہدی حسن اور مجیب عالم نے گائے تھے اس فلم کا یہ گیت کچھ مشہور ہوا تھا ورنہ فلم مجموعی طور پر خشک ہونے کی وجہ سے بری طرح فلاپ ہوئی تھی اس گیت کیلئے آواز مہدی حسن کی تھی۔

''منزلیں منزلیں شوق دیدار کی منزلیں''

اس فلم کے پروڈکشن کنٹرولر اشفاق نقوی تھے جو ان دنوں ایئر فورس میں تھے۔ ان کی ڈیوٹی ایئر مارشل نور خاں نے خاص طور پر اس مقصد کیلئے لگائی تھی کیونکہ یہ قبل ازیں فلائیٹ سیفٹی کیلئے مختصر دورانیہ کی فلمیں بنا چکے تھے ان کا کہنا ہے کہ مجھے حکم ملا تھا فلم بنواؤ اور فلم کے ڈائریکٹر کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاؤ۔

بقول نقوی صاحب فلم میں ہیرو کا کردار نیلام گھر والا طارق عزیز کر رہا تھا شبنم ہیروئن تھی جو ایک فوجی نرس کے کردار میں تھی اس کے ساتھ روزینہ وصاعقہ تھیں اور روزی بھی تھی رقص کیلئے شہزادی کا انتخاب کیا گیا تھا جبکہ گانے کیلئے فریدہ خانم کو لیا گیا تھا۔ اس کہانی کا کوئی سکرپٹ نہیں تھا جو کچھ کاردار کے ذہن میں ہوتا اس کو فلم بند کرلیا جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلا فلم کا تسلسل برقرار نہ رہا ایک سین میں کپڑے کچھ ہوتے تو دوسرے میں کچھ ہو جاتے، کاردار سے کہا جاتا تو وہ کہتے یہ کون دیکھتا ہے اس فلم میں ڈائیلاگ بھی کم تھے ایک موقع پر سورن لتا نے کہا تھا کہ یہ سائلنٹ (خاموش) فلم بن رہی ہے اس

فلم کے کیمرہ مین ماروین مارشل تھے۔

اس فلم کے افتتاح کے موقع پر خاص طور پر اس وقت کے صدر مملکت یحییٰ خان کو بلایا گیا تھا اس نے فلم دیکھ کر بہت برا منایا تھا اور کہا تھا کہ آپ لوگوں نے میری شام خراب کر دی ہے۔

فلم کے علاوہ بعد ازاں مشہور گلوکارہ ٹینا ثانی نے فیضؔ صاحب کی نظمیں ٹی وی کے لئے بھی صدا بند کرائیں مثلاً

''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''

اس کے علاوہ ایک بھارتی سیریل ''ہم لوگ'' کا ٹائٹیل سانگ بھی فیضؔ صاحب کے اشعار پر تھا

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں

اس کے علاوہ ضیاء محی الدین نے ٹی وی کے لئے فیضؔ صاحب کا کلام تحت اللفظ میں بھی پیش کیا۔

''بھئی ہم مولانا چراغ حسن حسرت کے بہت قائل ہیں۔ امروز کو جس ٹھاٹھ سے انہوں نے نکالا اور سنبھالا وہ ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اُردو صحافت میں صرف مولانا ظفر علی خاں ان سے ذرا آگے تھے ورنہ آج تک میدان میں ان کا ہم پلہ برصغیر میں پیدا نہیں ہوا۔۔۔

''پاکستان ٹائمز'' نکل چکا تھا۔ ہم اس کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے اور پھر ہم مولانا کو ''امروز'' کے لئے لے آئے۔۔۔

مولانا کی حفیظ جالندھری صاحب سے نوک جھونک رہتی تھی۔ صوفی تبسم کا گھر تو سب کے لئے صلائے عام تھا۔ بھی شام کو وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ حسرت صاحب بھی، حفیظ جالندھری بھی، بلق لق بھی، تاثیر بھی۔ ہم بھی چلے جایا کرتے تھے۔ صوفی تبسم کا گھر تو لنگر تھا۔ سب وہاں آتے تھے اور باہر سے جو آیا وہ ہوٹل تھوڑا ہی جاتا تھا۔ سٹیشن سے نکلے تانگہ پکڑا اور صوفی صاحب کے۔ بس سے اُترے تانگہ پکڑا اور صوفی صاحب کے۔ گھر سے پیدل نکلے اور صوفی صاحب کے۔ تاثیر بہت تیز آدمی تھے۔ وہ دوسروں کو لڑانے میں مہارت رکھتے تھے۔ بس کان میں کہہ دیا حسرت صاحب حفیظ کا یہ شعر پھس پھسا ہے۔ مولانا اُچھل پڑے۔ حفیظ کہاں کا شاعر ہے اور حفیظ کہاں چوکتے وہ حسرت کو شاعر نہیں مانتے تھے۔ الغرض اُن میں نوک جھونک شروع۔ تاثیر الگ خاموش بیٹھے ہیں۔ سب لطف اندوز ہو رہے ہیں اور پھر تاثیر کچھ دیر کے بعد بیچ بچاؤ والے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ واہ کیا پُر لطف اور سحر انگیز شامیں تھیں وہ۔۔۔

(فیض احمد فیضؔ)

MEMORIAL TO A.S. BOKHARI 'PATRAS' IN TUNIS: This is Faiz Ahmed Faiz, photographed in Tunis recently with a sign that bears a familiar name. Faiz has returned to Pakistan after a six-month sojourn in different countries. This is how he explained this photograph in Karachi on Monday: "In an affluent locality of Tunis, Muttelle-Ville, there is a large tree-lined avenue named after A. S. Bokhari. This was first mentioned to me by our Charge d'Affaires in Tunis Ashraf Qureshi who happens to be an old Ravian and hence had heard of our illustrious teacher. I was later told by the Minister of Culture of Tunisia that A.S.B. – as he wished to be called – was regarded as a great benefactor of Tunisia because of his eloquent advocacy for the independence of Tunisia during his tenure as Pakistan's representative in the United Nations. My happiness at this discovery was tinged with some sadness as we have hardly paid any befitting tribute to his memory."

چند ملاقاتیں۔ چند باتیں

لبنیٰ اشرف

گھر میں داخل ہوئے تو ہمارے ڈرائیور باغ حسین نے بتایا کوئی فیضی صاحب ملنے آئے تھے اپنا نمبر چھوڑ گئے ہیں۔ اشرف نے فون کیا تو پتہ چلا فیضی صاحب نہیں فیض احمد فیض ہیں۔ اشرف نے فوراً کہا کہ اگر آپ فارغ ہیں تو ہم حاضر ہو جاتے ہیں آپ گھر تشریف لائیے۔ فیض صاحب مان گئے اور یوں فیض صاحب سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔

اشرف نے باغ حسین کو بتایا یہ فیضی نہیں، فیض صاحب ہیں، شاعر ہیں تو باغ حسین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ بولا ''او فیض صاحب جنہاں لکھیا اے ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ جو آدمی اُردو بولنا نہیں جانتا وہ فیض احمد فیض کے کلام کو جانتا ہے۔ فیض صاحب نے باغ حسین کو گلے لگایا اور باغ حسین بہت دیر تک دھیرے دھیرے سینے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ شائد یقین کرنا چاہتا ہو کہ وہ فیض سے ملا ہے۔

ذکر کر رہی ہوں تیونس کا، سال تھا 1983ء۔ اشرف کی پہلی پوسٹنگ تھی۔ فیض ان دنوں Lotus میگزین کے چیف ایڈیٹر تھے۔ یہ رسالہ ایفرو ایشین رائیٹرز ایسوی ایشن کے زیرِ اہتمام عربی انگلش اور فرنچ میں شائع ہوتا۔ فیض بیروت میں اس کے ساتھ منسلک تھے۔ ان دنوں PLO کا ہیڈ کوارٹر بیروت سے تیونس منتقل ہو چکا تھا۔ یاسر عرفات بھی تیونس میں مقیم تھے۔ فیض کی محمود درویش سے بھی راہ و رسم تھی اور معین بسیسو سے بہت دوستی تھی اور یاسر عرفات سے بھی بہت ملتے تھے۔ اکثر ذکر کرتے کہ بیروت میں کئی بار انہوں نے رات یاسر عرفات کے ساتھ گاڑی میں سو کر گزاری۔ فیض کے تیونس آنے کا سبب یہی لوگ تھے۔

فیض آئے تو فان کلر کا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ زیرِ لب مسکراتے بہت Composed، پُر سکون اور مطمئن۔ ان کے اضطرار کا اندازہ صرف اُن کے سگریٹ پینے کے انداز سے ہوتا۔ مسلسل سگریٹ کے دھوئیں سے نقش و نگار بناتے۔ نپے تلے مختصر فقرے، ادائیگی کا ایک مخصوص انداز، فقروں کے ابتدائی لفظ یا چند الفاظ کو بہت لمبا کھینچتے۔ فیض کی پُر سکون آنکھیں جو انسان کو ان کے سحر میں جکڑ لیتیں ان کی حساسیت کی غماز بھی تھیں۔ دیکھتے تو یوں محسوس ہوتا وہ بغیر پوچھے بغیر سنے، جانتے ہیں دوسرا کیا کہنا چاہتا ہے۔

فیض کے ساتھ تیونس میں ملاقات کی خوشی کیا ہوگی اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک ایسی جگہ جہاں زیادہ تر لوگ عربی اور فرنچ بولتے ہوں اُردو تو دور کی بات ہے انگریزی بولنے والے بھی کم ملتے ہوں، وہاں فیض کی صحبت کیا بتاؤں کہ کتنی بڑی نعمت تھی بس یوں سمجھئے کہ ''جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے''۔

اکثر اِدھر اُدھر گھومنے نکلتے مختلف موضوعات ادب، سیاست، کلچر پر بات کرتے کبھی کبھی ذاتی زندگی کے گزرے لمحوں کا ذکر بھی، بات خواہ کچھ بھی ہو فیض کسی نہ کسی طور سلیمہ ہاشمی اور شعیب ہاشمی کا ذکر کھینچ لاتے شاید اُن کو بہت مس کرتے تھے۔ مزے لے کر بات سناتے اور پھر دل کھول کر ہنستے۔ ایک دفعہ کہنے

گئے کہ وہ (فیض) پاکستان میں نہیں تھے شعیب نے سوچا کہ فیض کی سالگرہ منائی جائے۔ تقریب کا اہتمام کیا پر ظاہر ہے عین موقع پر پولیس آگئی شعیب کو بھی تھانے لے گئی۔ شعیب سے تھانے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ ہاں بھئی تم کس پارٹی سے ہو، تو شعیب نے جواب دیا۔ جناب میرا تعلق تو برتھ ڈے پارٹی سے ہے مجھے پتہ نہیں کیوں لے آئے ہیں۔ فیض بہت دیر تک ہنستے رہے پھر سنجیدگی سے بولے پاکستان میں لوگوں میں اب ہمت اور سکت نہیں رہی۔ شاعروں اور ادیبوں کے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ مل بیٹھیں۔ پاک ٹی ہاؤس کا ذکر بھی کرتے وہاں حلقہ ارباب ذوق کے لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں آٹھ دس اوپر کی منزل میں، آٹھ دس نیچے کی منزل میں پر وہ پہلے جیسی بات نہیں۔ پھر انہوں نے ''دائرہ'' کا ذکر کیا کہ اسلام آباد میں ایک سرکاری انجمن ''دائرہ'' کے نام سے بنی اور جب فیض پاکستان گئے تو منتظمین ''دائرہ'' نے فیض کے اعزاز میں تقریب منعقد کرنا چاہی فیض مان گئے۔ غالباً 84ء کی بات ہے پھر اسلام آباد کی ایڈمنسٹریشن سے پیغام ملا کہ جلسے کی اجازت مارشل لا ایڈمنسٹریشن سے لی جائے۔ اس سے کچھ عرصہ قبل جنرل کے ایم عارف کی کتاب ''گرد سفر'' کی رونمائی کی تقریب کا اہتمام ''دائرہ'' نے کیا تھا۔ سو شائقین جنرل کے ایم عارف کے پاس پہنچ گئے انہوں نے فوراً فون کیا اور فوراً ہی دعوت نامے تقسیم ہو گئے۔

ہالیڈے ان (Holiday inn) میں فیض کے اعزاز میں تقریب منعقد ہوئی، دو تین سو لوگوں کی جگہ تھی پر بہت زیادہ لوگ آئے۔ سرکاری بھی، عوام بھی، بلکہ تقریب کے آغاز میں محبوب الحق نے جو وزیر خزانہ رہے فیض کے کلام کا انگریزی ترجمہ سنانا چاہا جو انہوں نے کیا تھا پر لوگ فیض کو سننے کے لیے بیتاب تھے۔ فیض کا کہنا تھا اگلے چند روز اخباروں میں اس تقریب کا تذکرہ ہوتا رہا لوگ حیران تھے کہ اس تقریب کا مقصد کیا تھا۔ دو طرح کے مضامین چھپے، ایک یہ کہ شاید ہم افغانستان یا ہندوستان سے حکومت کے کچھ معاملات طے کروا دیں گے۔ دوسرا کہ ہم کچھ لکھیں تو ہمیں تھانے بلوا لیا جائے۔ پھر دو چار روز میں جب فیض اسلام آباد سے لاہور آئے تو ''نوائے وقت'' کے لوگوں نے ان کا انٹرویو کرنے کی خواہش کی بقول فیض ''میں نے کہا 30 سال سے تم مجھے گالی دے رہے ہو اب انٹرویو کرنا چاہتے ہو پھر میں مان گیا''۔ چھ سات لوگ آئے اور چار صفحے کا انٹرویو چھپا۔

اگلے دن یار دوست کہنے لگے یہ چکر کیا ہے اسلام آباد میں سرکاری ''دائرہ'' یہاں جماعت اسلامی کا اخبار۔ فیض بولے ہمارا مقصد تو اپنی بات اپنی سوچ لوگوں تک پہنچانا ہے جیسے بھی ہو۔

فیض، ایوب خان اور ضیاء الحق کے ادوار کا موازنہ بھی کرتے۔ ایک بار کہنے لگے ''میں پاکستان ٹائمز کے ساتھ وابستہ تھا۔ گرفتار ہوا، دفتر پہ تالا لگا، واپس آیا تو ISI کے ایک ڈی جی جو ہمارے دوست تھے انہوں نے کہا آپ دوبارہ اخبار شروع کریں۔ میں نے انکار کیا۔ پھر ہمارے دوست گورمانی صاحب پنجاب کے گورنر ہو گئے انہوں نے پوچھا کیا کرنا چاہو گے تو ہم نے کہا آرٹس کونسل جو ہم نے شروع کی تھی وہاں کام کرنا چاہتا ہوں۔ سو آرٹس کونسل میں آگئے۔ خوب رونق ہوتی شام کو سارا لاہور جمع ہوتا۔ مختلف محفلیں راگ رنگ کی ہوتیں مگر گورمانی صاحب گئے تو نواب آف کالاباغ آگئے۔ انہوں نے آکر کہا یہ سب کیا بکواس اور بیہودگی ہے! بند کرواؤ اس کے بعد ہم لندن چلے گئے۔

ایک مرتبہ فیض آئے تو ہمارے ایک عزیز خالد وائیں اور سیماں بھی آئے ہوئے تھے۔ فیض سے تعارف ہوا تو فیض نے فوراً کہا ہم تو دو وائیں صاحب کو جانتے ہیں ایک سیالکوٹ میں ڈاکٹر وائیں اور دوسرے منٹگمری میں ہمارے جیلر حمید وائیں، خالد نے بتایا کہ وہ انہیں کا بیٹا ہے۔ فیض نے لاہور قلعے میں گزارے ہوئے وقت کا ذکر بھی کیا کہ بھئی جب وہاں پہنچے تو اندر سماں ہی کچھ اور تھا، بڑی آؤ بھگت ہوئی پہلوان صاحب ملے تو انہوں نے کہا ''فیض صاحب شام دی روٹی ساڈے ول'' فیض حیران تھے کہ جب دال روٹی ہی ملنی ہے تو شام کی روٹی کا کیا مطلب مگر پھر پتہ چلا

کہ بارسوخ قیدیوں کا اپنا انتظام ہے۔ فیض لاہور قلعہ میں گزرے وقت کو "شاف کالج کورس" کہتے تھے۔

فیض ایک مرتبہ ایلس کے ہمراہ بھی تیونس آئے دونوں ساتھ گھومنے گئے تو فیض کا اصرار تھا کہ چٹائی خریدیں گے۔ ایلس کا کہنا تھا "مگر اس کا کیا کرو گے؟" فیض کا جواب تھا "اور کچھ نہیں تو اس پر بیٹھ کر سلیمہ کے بچے قرآن پڑھا کریں گے"۔ میرے ذہن میں ان پر لگے لادینیت کے سارے الزام گھوم گئے۔

ایک مرتبہ فیض تیونس سے تاشقند جانے لگے تو بولے کچھ تحفے خریدنا ہیں۔ بڑی محنت اور شوق سے ہم نے کچھ چیزیں خریدیں۔ یہ چیزیں خریدتے وقت میرے دل میں یہ بات ضرور آئی کہ یہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جن کے لیے فیض اتنے شوق سے تحفے خرید رہے ہیں۔ فیض نے شاید میری نظروں میں یہ بات پڑھ لی۔ جب اگلی بار تیونس آئے تو ایک خوبصورت Box لائے اور بولے "میں نے تم لوگوں کے لیے تاشقند سے لیا تھا"۔

اشرف نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ تیونس میں ایک خوبصورت شاہراہ کا نام پطرس بخاری کے نام پر ہے فیض بہت خوش ہوئے اسی وقت دیکھنے کے لئے گئے اور پھر بہت شوق سے تصویر بنوائی۔

1984ء میں جب فیض آخری بار تیونس گئے تو ان کی صحت کافی خراب تھی بات کرتے تو سانس اکھڑ جاتی اور سانس کی آواز بہت محسوس ہوتی۔ لہجے میں تھکن ہوتی۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے وقت یکلخت خاموش ہوجاتے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے فیض اس کرب، اس اذیت، اس تکلیف کو از سر نو محسوس کر رہے ہیں جو ان کی سوچ کی پاداش میں انہیں اور ان کے پیاروں کو ملی، ایک دفعہ میں نے پوچھا زندگی کا سب سے مشکل وقت کونسا تھا، تو بولے "نہ پوچھو قید تنہائی"۔ آنکھیں بند کرکے سر کو جھٹک کر بولے "بہت بُری چیز ہوتی ہے، بہت بُری" مجھے لگا جیسے وہ ہر اس یاد کو جھٹکنا چاہتے ہیں جو اُس وقت سے وابستہ ہے پھر بولے "صرف ایک آدمی کی شکل دیکھنے کو ملتی تھی جو مجھے کھانا دیتا تھا۔ جب میں جیل سے چھٹا تو اسے بہت ڈھونڈا وہ نہیں ملا"۔

پھر نصیحت کرنے لگے تم اپنا کوئی گھر بناؤ۔ ابھی نہیں بناؤ گے تو پھر سرکاری ملازمت میں کبھی نہیں بنے گا۔ اپنا بتایا ہمیں وقت پر ماڈل ٹاؤن میں زمین مل گئی تو ہم نے گھر بنا لیا۔ نہیں تو بہت خوار ہوتے یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ فیض جب ایسی باتیں کرتے مجھے لگتا کہ تو جوانی میں لاابالی پن میں جو کام وہ نہ کر پائے فیض کو شاید ان کا احساس تھا اور انہیں بُرا لگتا تھا کہ اس کی سزا ان کے پیاروں کو ملی۔

ایک مرتبہ فیض گھر آئے تو میں نے جھنجھلا کر بتایا اتنی محنت سے کشمیری چائے بنائی تھی پر یہ گلابی تو بنتی نہیں، فیض نے رسان سے سمجھایا بھئی چائے کے رس کو دو برتنوں میں چھینٹئے، ٹھنڈا ہوتا ہے تو پھر رنگ نکلتا ہے۔ چھوڑو ان چیزوں کو تم لکھا کرو، میں نے کہا کیا لکھوں اُردو بولنا پڑھنا بھولتا جارہا ہے ویسے بھی زندگی میں اتنا امن سکون ہے کہ Inspiration نہیں ہوتی، فیض کا جواب تھا "ہوگی ہوگی پاکستان جاؤ گی تو ہونے لگ جائے گی اور اچھی اُردو جاننے کے لئے عربی اور فارسی کا جاننا ضروری ہے یہاں عربی سیکھو"۔

فیض سے ایک مرتبہ ان کا پنجابی کلام سنا اور استفسار پر کہ پنجابی میں اتنا کم کیوں لکھا فیض نے اُستاد دامن کی تعریف کی "بھئی سمجھ میں یہ آیا ہے کہ استاد کے ہوتے ہوئے ہم نہیں لکھ سکتے"۔ فیض کو اپنا کلام نور جہاں کی آواز میں گایا ہوا بہت پسند تھا۔ فیض سے کبھی ان کے اشعار سننے کی درخواست کرتے تو وہ ساتھ میں ایک شفیق استاد کی طرح ایک آدھ فقرہ ایسا بھی کہتے جس سے اشعار کا مفہوم واضح ہونے لگتا۔ ایک مرتبہ کہا:

پاکستان میں آج کل اسلام کا بڑا چرچا ہے۔ اس پر یہ اشعار سنائے۔

ستم سکھلائیں گے رسم وفا ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہ خدا ایسے نہیں ہوتا
گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
میرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

پھر بولے پاکستان میں ہر بات پر

کوڑے لگ رہے ہیں پر بات یہ ہے۔

جہاں دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمان تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ان سے ان کا تازہ کلام سننے کی درخواست کی تو یہ اشعار سنائے جو مکمل شائع نہیں ہوئے ہیں۔

پھر غم یاد یاراں کے دن آگئے
ماتم دل فگاراں کے دن آگئے
کسمسائی فضا، رُت بدلنے لگی
اہتمام بہاراں کے دن آگئے
آتش مئے سے چہرے فروزاں کرو
میکدے کو سجانے کے دن آگئے
فرق عشق و ہوس پھر نمایاں کرو
جان و دل آزمانے کے دن آگئے

(انہوں نے کہا کہ ابھی یہاں تک لکھی ہے)

پھول مسلے گئے فرشِ گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختۂ دار پر
بزم برپا کرے جس کو منظور ہو
دعوت رقص تلوار کی دھار پر
دعوت بیعتِ شاہ پہ ملزم بنا
کوئی اقرار پہ کوئی انکار پہ

فیض نے اس کی وضاحت کی جو مجلس شوریٰ میں گیا اس کو بھی گالی پڑی جو نہیں گیا اس کو بھی پڑی۔

فیض نے جو وقت وطن سے دور گزارا اس کا ذکر کرتے وقت آنکھوں میں دُکھ کی پرچھائیاں ضرور جھلکتیں۔ ایک مرتبہ اپنا کلام سنایا۔

اگر انتظار کٹھن ہے تو جب تک اے دل
کسی کے وعدہ فردا کی گفتگو ہی سہی
دیار غیر میں محرم اگر نہیں ملتا
تو فیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

اور بتایا کہ یہ اشعار انہوں نے بیروت میں کہے تھے۔

ہماری خوش قسمتی کہ فیض کی آخری عید تیونس میں ہمارے ساتھ گزری، فیض نے کہا کہ وہ صبح صبح آئیں گے۔ کچھ لوگوں کو دوپہر میں بلایا ہوا تھا اور میں انتظام کرنے کی کوشش کر رہی تھی فیض نے بہت پیار سے کہا کہ بھئی عید کا دن ہے تم ابھی تیار کیوں نہیں ہوئیں، تیار ہوتے ہیں۔

ایک شام فیض کا فون آیا چلو کھانا کھانے چلیں۔ میں نے کہا آپ گھر آجائیں فیض بولے نہیں باہر جائیں گے پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے بھئی سمجھا کرو پیسے ملے ہیں اب پینا چھوڑ دیا ہے اس لئے پیسے بچ جاتے ہیں کہیں تو خرچ کرنے ہیں چلو چلتے ہیں۔

جس روز فیض کو تیونس سے جانا تھا اس روز شام میں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور انہوں نے دوائی لانے کو کہا۔ اس روز ہمیں ان کی بہت فکر ہوئی۔ انہوں نے تسلی دینے کو کہا وہ نومبر میں دوبارہ تیونس آئیں گے۔ میں نے کہا مگر شاید ہماری پوسٹنگ ہوجائے اس لئے اب آپ سے ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔ فوراً بولے بھئی کیسے نہیں ہوگی یہاں نہیں ہوگی تو لاہور میں ہوگی۔

ان کی واپسی کا انتظار تھا کہ اچانک خبر ملی کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

نہ وہ جانتے تھے نہ ہم کہ ان سے واقعی دوبارہ کبھی ملاقات نہ ہوگی۔

☆.........☆☆☆.........☆

......شوق کا مضمون لکھوں

محمد حنیف

جب فیض صاحب جلاوطنی ختم کر کے وطن لوٹے تو میں نے بہت محترم اور مرد آہن دوست پروفیسر امین مغل صاحب سے عرض کی آپ فیض صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ فیض صاحب آپ کی بات سنتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔ آپ فیض صاحب کو میرے گھر تشریف لانے کی دعوت دیں اور ساتھ دوستوں کو بھی...... اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر فیض صاحب کے اعزاز میں کسی دوست کے ہاں نشست ہو تو مجھے ساتھ لے کر چلیں۔ فیض صاحب کو قریب بیٹھ کر سننے کا مجھے بے حد اشتیاق ہے۔

پروفیسر امین مغل صاحب نے میری بات کو سُنا اور اپنے مخصوص سنجیدہ لہجہ میں فرمایا۔ ''اچھا آپ کے لئے کچھ کرتے ہیں''۔ اگرچہ فیض صاحب سے ملنے اور اُن کو سننے کا مجھے تین بار اتفاق ہوا تھا۔ پہلی دفعہ گورنمنٹ کالج میں جہاں فیض صاحب کے اعزاز میں مشاعرہ تھا دوسری بار باہمت انسان اور دوست قمر یورش صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی میں جو پاک ٹی ہاؤس میں فیض صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔ اس تقریب میں فیض صاحب نے قمر یورش کو ''قلم کا مزدور'' کا خطاب دیا تھا۔ قمر یورش مرحوم نے اپنے مضمون میں اور طرح سے بات کی ہے مگر مجھے یہ بتایا تھا کہ پروگرام کو ترتیب دینے میں اور فیض صاحب کو تقریب میں لانے میں سب کردار پروفیسر امین مغل صاحب کا تھا۔ تیسری ملاقات فلیٹیز ہوٹل میں اُن کے اعزاز میں تقریب میں ہوئی تھی اُس وقت فیض صاحب بہت بیمار تھے اور کمزور بھی کافی ہو گئے تھے۔ اس موقع پر اُن کی خدمت میں ہندوستان میں شائع ہونے والے رسالہ ''فن و شخصیت'' کے ''فیض نمبر'' پر آٹوگراف دیتے ہوئے فیض صاحب نے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا ہندوستان سے کتابیں اور رسائل منگوانے پر پابندی ہے آپ نے کیسے منگوالیا؟ میں نے اُن کو بتایا ایک دوست حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے عرس پر گئے تھے انہوں نے لا کر دیا تھا۔ فیض صاحب کے ساتھ کشور ناہید صاحبہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اُس ''فیض نمبر'' پر لکھ کر کیا۔

پروفیسر امین مغل صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیے چند روز ہی ہوئے تھے کہ پروفیسر زکی درانی صاحب تشریف لائے انہوں نے کہا امین مغل صاحب کا پیغام ہے کہ فیض صاحب کے ساتھ ایک نشست نصیر اے شیخ صاحب کے گھر کینٹ میں ہے، تم نے بھی وہاں آنا ہے۔ درانی صاحب نے ہاتھ سے لکھا ایک کارڈ دیا جس پر نصیر اے شیخ صاحب کے گھر کا پتہ تاریخ اور وقت درج تھا اس پر میں نے پروفیسر امین مغل صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ مگر وہ دوستوں سے شکریہ وصول کرنے کے قائل نہ تھے۔

مقررہ تاریخ پر میں اپنے دوست اقبال احمد خان کے ساتھ نصیر اے شیخ صاحب کی کوٹھی واقع کینٹ پہنچا۔ وہاں شفیق شخصیات اور دانشور نثار عثمانی صاحب، آئی اے رحمٰن صاحب، حسین نقی صاحب، ممتاز دولتانہ صاحب، احمد سعید کرمانی صاحب، اعتزاز احسن صاحب، احمد بشیر صاحب، عابد حسن منٹو صاحب، حمید اختر صاحب اور دیگر احباب فیض موجود تھے۔

ماحول انتہائی پُر وقار تھا۔ گفتگو فیض صاحب کے بارے میں اور سیاسی قسم کی ہو رہی

تھی۔ تھوڑی دیر بعد فیضؔ صاحب بھی تشریف لے آئے سب نے کھڑے ہو کر اُن کا استقبال کیا۔ خوشی اور محبت کا تاثر سب کے چہروں سے جھلک رہا تھا۔ کچھ نے ہاتھ ملایا۔ حال واحوال پوچھا اور پھر فیضؔ صاحب سے کلام سنانے کی درخواست ہوئی۔

فیضؔ صاحب نے مختصر تمہید میں فرمایا۔ ''سفر کے دوران ایک نظم ہوئی ہے آپ کو پہلے وہ سناتے ہیں'' نظم تھی

......دل من مسافر من
میرے دل میرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشنایاں......
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کہیں شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

آمریت نے جو ملک کی صورت بگاڑی تھی، حریت پسند دوستوں سے جو سلوک ہو رہا تھا بھوک کی پھانسی، قید اور جلاوطنی، اس پس منظر میں نظم نے جو کیفیت پیدا کی اُس کا اندازہ احساس کی آنکھ سے آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نظم کے ایک ایک مصرعہ پر واہ واہ ہو رہی تھی، فیضؔ صاحب نے اُس کے بعد اپنا اور کلام بھی سنایا۔ شعر وشاعری کی یہ محفل ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ اُس کے بعد چائے کا دور تھا جہاں ہر شخص فیضؔ صاحب سے مصافحہ کرنے کا مشتاق تھا۔ شام گئے جب یہ محفل ختم ہوئی تو واپسی پر یوں لگ رہا تھا کہ بغیر پیئے ذہن و وجود میں نشہ سرایت کر رہا ہے۔

یہ نشست میرے لئے آج بھی ایک یادگار اور خاص تقریب ہے اور یہ بات میرے لیے قابلِ فخر ہے کہ میں فیضؔ صاحب سے ملا۔ اُن کو دیکھا، اُن سے باتیں کیں، اُن کا کلام اُن کی زبانی سُنا۔

فیضؔ صاحب کی شاعری کرۂ ارض کے سب انسانوں کے لیے آفاقی شاعری ہے وہ دنیا کو ایک خوبصورت اور امن و شانتی کی جگہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں ہر آدمی کو انصاف مساوات، حقوق، وقار اور عزت نفس ملے۔ اُن کی نظموں اور غزلوں میں جہاں انسانی جذبوں کی کیفیت کے رنگ ہیں وہاں تاریخ کے عمل کا تناظر بھی ملتا ہے اُن کی شاعری نے حق پرستوں کو جدوجہد، حوصلہ، تقویت اور باطل کے سامنے ڈٹ جانے کی تحریک دی ہے عظمتِ انسان ان کا مقصد تھا۔ ناقدینِ ادب کی رائے ہے کہ شاعری میں علامہ اقبال کے بعد جو عہد ہے وہ فیض احمد فیضؔ صاحب کا عہد ہے۔

کیا پوسٹ مین، کیا لیڈر، کیا سیاستدان، کیا وکیل، نوجوان، وطن پرست، عشاق، مولوی وغیرہ اپنی گفتگو اور تقاریر میں جوش وحسن اور بلاغت پیدا کرنے کے لئے کلام فیض کا سہارا لیتے ہیں۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

بقول سجاد ظہیر......فیضؔ کے کلام میں گرمی بھی ہے حرکت بھی اور توانائی بھی۔

☆.........☆☆☆.........☆

فیضؔ اور پرورشِ لوح و قلم

مظہر عباس چودھری

اردو شاعری کے منظرنامے پر غالبؔ و اقبالؔ کے بعد فیضؔ ایک منفرد اور معتبر شاعر کے طور جلوہ فگن ہوئے۔ آج کل اردو تنقید میں غالبیات اور اقبالیات کی طرح فیضیات کی اصطلاح کا اضافہ فیضؔ پر تیز رفتاری سے کئے جانے والے تحقیقی کام اور تنقیدی مقالات کی اشاعت کا آئینہ دار ہے۔ ناقدین نے غالبؔ اور فیضؔ کی شاعری کو poetry of dissent قرار دیا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ غالبؔ و فیضؔ نے شاعری کے مروجہ طریقوں سے ہٹ کر اپنا راستہ خود بنایا اور یوں انفرادیت، جدت اور ندرت ایسے اوصاف سے اپنی شاعری کو مزین کیا۔ یہ بھی کہ وہ پہلے سے موجود کسی فلسفہ و فکر کے قائل نہ تھے اور اپنا فلسفۂ شاعری خود تراشنے والے فنکار تھے۔ فیضؔ بیسویں صدی کے عہد ساز اردو شاعر تھے۔ انہوں نے کم لکھا مگر بہت خوب لکھا۔ ان کی شاعری چونکہ محبت اور سیاست کا امتزاج ہے لہٰذا وطن عزیز کے بدلتے سیاسی حالات کے مطابق ان کی شخصیت سے وابستہ نزاعی باتوں کی شدت میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ البتہ ان سے فیضؔ کی تخلیقی شخصیت کبھی متاثر نہ ہو سکی صد شکر کہ قوم کو فیضؔ کی سچی قدر نہ کرنے کا احساس ہو چکا ہے اور اس اعتراف جرم اور پشیمانی کے سبب سے آج فیضؔ کو مرکزِ توجہ بنایا جا رہا ہے۔ جس طرح خوشبو کو مقید نہیں کیا جا سکتا اور جذبات پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے اسی طرح اخلاقی اقدار اور سچ کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا اور سچی شاعری اپنی عظمت و آفاقیت کا اعتراف کروا کر ہی رہتی ہے فیضؔ نے کیا خوب کہا تھا:

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

فیضؔ زندگی کے عکاس، زندہ شاعر تھے، انہوں نے ادب برائے زندگی تخلیق کیا۔ وہ عام انسان کی پستیوں اور محرومیوں کا ازالہ چاہتے تھے اور پستے ہوئے لوگوں کو مصائب و آلام کی چکی سے نکالنا ان کا مطمع نظر تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک شاعری خیالی باتوں کے بجائے حقیقت پسندی کا نام ہے۔ فیضؔ کا فلسفہ زندگی اور سوچ کسی تحریک کے تابع نہ تھی۔ البتہ ان کی فکری مماثلت و مطابقت انہیں ترقی پسند تحریک اور سوشلزم کے قریب لے آئی۔ سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اقبالؔ بھی ترقی پسندی اور سوشلزم کے خلاف ہرگز نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد قوم و ملت اور رسم و آئین کی حد بندیوں کو ہٹا کر زندگی میں یگانگت اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنانا اور اخوت و مساوات کا علم بلند کرنا ہے لہٰذا اس تحریک کے تحت ادب کا منصب و معیار یہ ٹھہرایا گیا کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقہ سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ ترقی پسند مصنفین کے تخلیقی مقاصد کے سلسلہ میں فیض احمد فیضؔ نے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اپنے مقالہ ''شاعر کی قدریں'' کے آخر میں بہت خوب لکھا ہے کہ شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی

افادیت دونوں شامل ہیں۔ اس لئے مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار پر ہی نہیں زندگی کے معیار پر بھی پورا اترے۔ فیض نے زندگی کو موضوع بنا کر جس رعنائی خیال کا اظہار کیا ہے وہ اس کی پہلی نمائندہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' ہے جس میں زندگی محبوب کا حسن دیکھنے کے بجائے زمانے کے حقائق اور تلخیوں کو دیکھنے کا نام ہے۔ دراصل فیض کے نقطہ نظر سے آزادی ملنے سے منزل سر نہیں ہوئی بلکہ اس آزادی سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور تعمیر و ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے سے منزل سر ہوگی۔ ان کے مطابق اس ملک میں ظلم و استحصال، معاشی ناہمواری اور سماجی لوٹ کھسوٹ کے ذمہ دار پاکستان بننے سے پہلے انگریز اور اب خود ہم ہیں۔ اس لئے فیض نے غیر جمہوری آمرانہ حکومت (ایوب کے مارشل لاء) کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور آج بھی ہر جمہوری فلاحی اور تعمیری تحریک میں ان کے آوازۂ حق کی بازگشت گونجتی سنائی دیتی ہے۔

فیض کی استاد دامن سے دوستی اور خود چل کر ان کے گھر جانا بھی اسی سلسلے میں تھا۔ وہ نہ صرف زندگی کی حقیقت کی بات کرتے تھے بلکہ ایسا کرنے والے دوسرے لوگوں سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ فیض پہلے سے موجود کسی فلسفہ کے پیرو نہ تھے بلکہ انہوں نے غالب کی طرح اپنا فلسفہ خود ایجاد کیا۔ فیض ایسے شاعر ہیں جنہوں نے جوش وخروش اور گھن گرج سے بچ کر دھیمے انداز میں لکھا۔ ترقی پسندوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ مواد پر اسلوب کو قربان کر دیتے ہیں لیکن فیض کی شاعری اس بات کی نفی کرتی ہے۔ انہوں نے تو بعض اوقات اچھی خاصی مقرر شاعری کی اور ان کے ہاں انقلاب (تبدیلی) کے عملی پہلو سے کم اور اس کے تصور سے زیادہ دلچسپی ملتی ہے۔ گویا فیض کا انقلاب ایک نفاست پسند انسان کا انقلاب ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی کم فکری کے سبب فیض کے یہاں انتہا پسندی کا شائبہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ انتہا پسندی ہرگز نہیں بلکہ ہماری بے سمت اور بے معنی گردش کے المیہ پر نوحہ خوانی ہے۔ شاعر اور ادیب سے کمٹمنٹ کی توقع معاشرے کا استحصال کرنے والوں، عوام پر جبر کرنے والوں اور فکر و عمل پر پابندی عائد کرنے والوں کے خلاف قلم کو بطور ہتھیار استعمال کرنا ہے جسے فیض نے بدرجہ اتم نبھایا ہے۔ نظم ''لہو کا سراغ'' میں ان کا طرز اظہار جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے:۔

نہ مدعی، نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

جب ملک میں جمہوریت ناپید ہوگئی تو انہوں نے وطن سے محبت کے جذبے اور یقین و غنایت کے لہجے میں ''نثار میں تیری گلیوں کے'' تخلیق کی اور نظم، بست وکشاد یہ بتایا کہ سنگ ہا را ببستند وسگاں را کشادند (سعدی)

فیض نے ظلم سے ٹکرانے، ناانصافی کا نشانہ بننے، زنجیر و سلاسل پہننے، آگ میں پھول کھلانے کے تاریخی استعاراتی اور تلمیحاتی انداز میں یوں درس استقلال دیا:۔

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

انہوں نے ایوب خاں کو انتخابی نشان پھول ملنے پر اس سرخ پھول کو سرخ خون بہائے جانے کی علامت جانا اور اس دور کے دُہرے معاشرتی معیار کا مذاق یوں اڑایا:۔

دامن دامن رت پھولوں کی آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم شہر بہ شہر

فیض کا فلسفہ زندگی اور انداز تفکر ہمیں بتاتا ہے کہ فیض کمیونسٹ نہیں فقر و فکرِ ابوذر کے امین تھے۔ روس میں فیض کے کلام کا ترجمہ کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فیض کی شاعری میں پائی جانے والی عالمگیر محبت، امن دوستی اور مساوات پسندی روسی شاعروں اور ادیبوں کو اپنے دل کی آواز لگی۔ فیض نے اپنے اوپر اچھالے جانے والے کیچڑ اور تہمتوں کے طومار کو تخلیقی محرک جانا اور اپنے فکر و فن کو اس سے مزید نکھارا۔ فیض نے درس وتدریس کی، فوج میں رہے۔ صحافت کاری کی، ٹریڈ یونینوں میں رہے، جیل خانوں میں گئے اور ان مختلف حالات میں ''دست تہ سنگ''، ''سر وادیٔ سینا''، ''دست صبا''، ''زنداں نامہ'' وغیرہ اور مجموعہ ''نسخہ ہائے وفا'' چھوڑا۔ ہر نئے

مجموعہ کلام میں ان کا رنگ سخن نکھرتا گیا اور جوں جوں وہ فرد کی ذات کو باہر کی دنیا سے ہم آہنگ کر کے دیکھتے گئے۔ غم جاناں اور غم دوراں کی آمیزش سے ان کا فن کمال تک پہنچتا گیا۔ اقبال کے بعد جس شاعر نے اپنے زمانے کو متاثر کیا وہ فیض ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ایسے معاشرے کی آرزو ہے جو مساوات پر مبنی ہو، جس میں برابری کا احساس ہو، انسان کی عزت نفس محفوظ ہو اور اخلاق اقدار کا بول بالا ہو۔ اگر یہ سب کچھ نہیں تو بشر کی زندگی موت سے بدتر ہے۔

فیض کے فکر و احساس نے انہیں حوصلۂ اظہار بخشا اور انہی مقاصد کیلئے وہ عمر بھر پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے۔

هم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

''دوسرے دن ہمیں شہیدوں کے مزار پر پھول چڑھانے جانا تھا۔ اب اطلاع ملی کہ وہاں جانا خطرناک ہے۔ ڈھاکہ میں مخالف مظاہرہ ہوگا۔ عجیب مصر تھا کہ یہ رسم ضروری ہے۔ سردار شوکت حیات، مصطفےٰ کھر اور آغا شاہی سوچتے تھے کہ نہ جایا جائے مگر بھٹو صاحب نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بہر حال ہم لوگ تو گاڑیوں میں مزار تک پہنچے۔ بھٹو صاحب ہیلی کاپٹر میں آئے۔ دور ایک مختصر سا مخالف مظاہرہ نظر آیا۔''

(فیض احمد فیض)

''جب ہم ہوٹل پہنچے تو ہم نے فرمائش کی ہم بنگلہ اسکول آف فائن آرٹس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگلے دن قمرالحسن وغیرہ کی جانب سے ہمیں دعوت ملی کہ آ کر بنگال اکیڈمی میں ایڈریس کریں۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ ہم صوفیہ کمال، قمرالحسن، کبریا اور امین السلام وغیرہ سے ملنا چاہتے تھے۔ صبح اپنے لوگوں سے کہا بھئی ہمیں تقریر کرنے جانا ہے۔ انہوں نے کہا ضرور کریں۔ ہم نے اکیڈمی والوں سے کہا آ کر لے جاؤ۔ نو بج گئے۔ دس بج گئے پھر کوئی ساڑھے دس بجے ان کا فون آیا Very Sorry ہمیں آپ کو بلانے کی اجازت نہیں ملی۔ It is cancelled۔ ہم ہوٹل کے ریستوران میں چلے گئے۔ اکیڈمی والے سب لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ظہور حسین چوہدری بھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے خاصے دوست مارے گئے ہیں۔ آپ نے کیا کیا؟ ہم نے کہا ہم تو شعر ہی لکھ سکتے تھے سو لکھے ہیں۔ پھر انہیں اشعار ''ہے تو کیسے ہے قتل عام کا میلہ'' وغیرہ سنائے۔''

(فیض احمد فیض)

فیضؔ صاحب کے تین قطعات

شریف فاروق

1950ء کی دہائی کے ابتدائی سال پاکستان کی تاریخ کا انتہائی حساس زمانہ تھا محلاتی سازشوں کا آغاز ہو چکا تھا جس کی تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں۔ مسئلہ کشمیر کو اُلجھانے اور کشمیریوں کو استصواب رائے سے محروم کرنے کیلئے جہاں انگریز کمانڈر انچیف نے اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا وہیں حکمرانوں نے بھی اپنی بزدلی اور کم ہمتی سے کام لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قائداعظم اس صورتحال سے قطعی طور پر خوش نہیں تھے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے دانشور سیاسی رہنما اور بعض فوجی افسر بھی مسئلہ کشمیر کو کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق حل کرنے کیلئے بے حد مضطرب تھے لیکن ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ حکمرانوں کی Passive Policy تبدیل کر سکیں۔ فضا پُر سکون نہیں تھی عوام کے تمام طبقات میں اس صورتحال کے خلاف احساسات کا لاوا دلوں میں بھڑک رہا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جذبہ حریت سے بے قرار ہو کر یکا یک حکومت کے خلاف فوجی سازش کا دھماکہ ہوا۔ جنرل ایوب خان کمانڈر انچیف اور شہید ملت لیاقت علی خان وزیراعظم تھے۔ 9 مارچ 1951ء کو انہوں نے انتخابی مہم کے سلسلے میں سرگودھا سے آتے ہوئے راولپنڈی میں ''فوجی سازش'' کا لرزہ خیز انکشاف کیا۔ اس دھماکہ کے نتیجے میں فیض احمد فیض، سید سجاد ظہیر، میجر جنرل اکبر خان، بیگم نسیم اکبر خان، میجر اسحاق محمد، کرنل ارباب نیاز، کیپٹن ظفراللہ پوشنی وغیرہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے ملک میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اسے فوجی سازش قرار دیتے ہوئے ان سب حضرات کو پابند سلاسل کر دیا اور پوری قوم کی نظریں اس بات پر مرکوز ہو گئیں کہ دیکھتے ہیں اس ''فوجی سازش'' جس میں فیض احمد فیض جیسے نابغۂ روزگار شاعر اور زیرِ زمین Under Ground Communist Party کے سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر جیسے نستعلیق ادیب جو اپنے بے تکلف احباب میں بنے ''میاں کے لقب'' سے جانے جاتے تھے، پر کیا گزرتی ہے۔

راقم ان دنوں روزنامہ ''احسان'' لاہور کے ساتھ وابستہ تھا۔ روزنامہ ''زمیندار'' اور روزنامہ ''انقلاب'' کی طرح روزنامہ ''احسان'' کا بھی اپنا ایک قومی پس منظر تھا۔ روزنامہ ''انقلاب'' تو 50-1949ء میں اپنی اشاعت مستقل طور پر معطل کر چکا تھا روزنامہ ''زمیندار'' بھی مالی مشکلات کا شکار تھا۔

روزنامہ ''احسان'' کے مالک نور الٰہی مرحوم کراچی میں روزنامہ ''احسان'' کے ایڈیشن کی ناکامی کے بعد مالی دباؤ کی وجہ سے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ روزنامہ ''احسان'' کو بھی مستقلاً بند کر کے قالینوں کا کاروبار شروع کر دیا جائے جبکہ ان کے صاحبزادے بیرسٹر مقبول الٰہی ملک جوان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے نہیں چاہتے تھے کہ ''احسان'' کو بند کر دیا جائے۔ مقبول الٰہی ملک کے ساتھ میرے تعلقات دوستانہ نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ مجھ سے انہوں نے ایک روز جب میں صبح صبح دفتر ''احسان'' پہنچا تو بڑی پریشانی کے عالم میں اپنے والد کے عزائم کا اظہار کیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ چاہتے ہیں کہ ''احسان'' کی اشاعت

جاری رہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا میں نے انہیں یقین دلایا کہ انشاء اللہ "احسان" کی اشاعت جاری رہے گی۔ چنانچہ میں نے ایک منصوبہ بنایا جس کے مطابق نہ صرف "احسان" کے عملہ ادارت میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں بلکہ "بے باک طناز" قسم کے کالم نگاروں کا انتخاب کیا گیا جن میں سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ظہور الحسن ڈار، مرزا محمد حسین، راجہ مہدی علی خان اور شوکت تھانوی وغیرہ شامل تھے۔ احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد بھی شاعری اور اپنی تحریروں سے سرفراز فرمانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب میاں ممتاز دولتانہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے ان کے مراسم ملک نور الٰہی مرحوم کے ساتھ بہت قریبی تھے اور وہ بھی چاہتے تھے کہ روزنامہ "احسان" کو موثر بنایا جائے۔ میں روزنامہ "احسان" کی حیات نو کو تابدار بنانے کیلئے اپنی تمام تر تابندگی کے باوجود سرگرم عمل تھا۔ انہی دنوں راولپنڈی سازش کیس کا واقعہ پیش آ گیا جیسا کہ عرض کیا ہے بہت سی گرفتاریاں ہوئیں ان گرفتار شدگان میں فیض صاحب کی شخصیت مسلمات کا درجہ رکھتی تھی اتفاق سے امرتسر کے زمانے میں جب فیض صاحب اور ڈاکٹر تاثیر کالج میں لیکچرار تھے ان کے دوستوں میں مجلس احرار کے لیڈر شیخ حسام الدین بھی شامل تھے، وہ فیض صاحب کے بہت بڑے مداح تھے ان کے علاوہ بھی شیخ صاحب مرحوم سیاست کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ادباء اور شعراء سے دوستانہ رابطہ رکھتے تھے۔ ان کے ہاں مجالس شعروادب منعقد ہوتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے گھر واقع گوالمنڈی میں بھی مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جس میں سیف الدین سیفؔ اور حبیب جالبؔ مرحوم شرکت کرتے تھے میری ملاقات شیخ صاحب مرحوم سے ہوئی انہیں علم تھا کہ میں روزنامہ "احسان" کیلئے سرگرداں ہوں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ فیض احمد فیضؔ نے کچھ قطعات اور اشعار جیل سے کسی نہ کسی طرح مجھے بھجوائے ہیں اگر یہ شائع کرسکو تو تمہیں اس کی اجازت ہے۔ شیخ صاحب مرحوم نے سفید باریک یعنی رائس پیپر پر ہاتھ سے لکھے ہوئے فیض صاحب کے تین قطعات مجھے دیئے جوان کے دلی جذبات کے عکاس تھے۔ اس پُر آشوب دور میں فوجی سازش کا ہوا بڑا ہولناک تھا اور فیض احمد فیضؔ صاحب کے پائے کے "انقلابی باغی" کا کلام شائع کرنا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ میں نے ان قطعات کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے پہلے تو اس کاغذ کو چھپا کر سینے سے لگالیا اور فیصلہ کیا کہ ہر چہ باداباد یہ قطعات ضرور شائع ہوں گے۔ اگلے ہی روز "احسان" کے صفحہ اول پر شوخ سرخ رنگ میں یہ تین قطعات شائع ہو گئے۔ روزنامہ "احسان" جو اس زمانے میں "سرکاری درباری" اخبار سمجھا جاتا تھا۔ سرخ رنگ میں اس کے صفحہ اول پر نہایت جلی الفاظ میں ان تینوں قطعات کا چھپنا قیامت سے کم نہیں تھا۔ دُنیا ان کی اشاعت پر حیرت زدہ رہ گئی۔

پہلا قطعہ حسب ذیل ہے:-

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

"زنداں نامہ" کے دیباچے میں "روداد قفس" کے زیر عنوان میجر اسحاق مرحوم نے اس قطعہ کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالی ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:-

"میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چار رنگ ہیں (یا موڈ کہہ لیجئے) پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں ان کی تین مہینوں کی قید تنہائی کا ہے وہ بہت مشکل دن تھے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار اور خطوط سب چیزیں ممنوع تھیں"۔ چنانچہ لوح و قلم کے چھن جانے کا حوالہ نہایت موزوں ہے۔ یہ طویل بحث ہے اسے چھوڑتے ہیں البتہ کیپٹن ظفر اللہ پوشنی نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "زندگی زنداں دلی کا نام ہے" میں انتہائی دلچسپ انداز میں پاکستان کی پہلی فوجی سازش کے حوالے سے جو نقش آرائی کی ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا شاہکار ہے اس کی اپنی ہی ادبی انفرادیت ہے۔

انہوں نے فیض صاحب کی شخصیت اور دوسرے گرفتارانِ ابتلاو آزمائش کے اسارتی شب و روز پر دلچسپ پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ فیض صاحب کے متذکرہ قطعہ کے علاوہ مجھے ان کا دوسرا قطعہ جو شائع کیا گیا یاد رہ گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

اب جب کہ ان قطعات کی اشاعت کو 56/57 سال کا عرصہ بیت چکا ہے تیسرا قطعہ یاد نہیں آ رہا۔ اس خلا کو پورا کرنے کیلئے فیض صاحب کا ایک قطعہ جو مجھے بہت پسند ہے اسے ہی قبول فرمالیجئے۔

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منت این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

اس میں جو بے باکانہ شوخی ہے وہ ریاض خیرآبادی، جگر مراد آبادی اور اختر شیرانی کے زہد شکن کلام میں بھی شاید آپ کو نہ ملے۔

فیض صاحب انقلابی فکر و نظر سے قطع نظر مجھے تو ہمیشہ صوفی باصفا لگتے تھے۔ پاکستان کا کونسا شخص ہے جو ان سے متاثر اور ان کے کلام کا اسیر نہ ہوا ہو۔ عجیب درویش شخصیت تھے ہمارے سامنے وہ سائیکل پر اپنے گھر سے ''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر متصل میو ہسپتال تشریف لایا کرتے تھے۔ فیض ان دنوں ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر تھے آزادیٔ صحافت کیلئے بھی ان کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا تھا لیکن ذاتی مراسم نہیں تھے۔ ہم لوگ اس زمانے میں ''بچونگڑے'' شمار ہوتے تھے ایسی قدآور شخصیات کے سامنے آنے کی جرات نہ کرسکتے تھے تاہم فیض صاحب کو بعض مجالس میں بھی دیکھا۔ 1961ء میں میں نے لندن رضا کارانہ جلاوطنی اختیار کی اور ''نوائے وقت'' سے وابستہ رہتے ہوئے کارِ صحافت جاری رکھا۔

فیض صاحب غالباً 1962ء میں لندن تشریف لائے۔ ان سے ملاقات کی بڑی خواہش تھی۔ ان کی اقامت گاہ کے قریب ہی غالباً حسین شہید سہروردی مرحوم قیام پذیر تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شہید ملت خان لیاقت علی خان جو سہروردی صاحب کے خلاف غیر پارلیمانی زبان تک استعمال کیا کرتے تھے اور ان کے پاکستانی سیاسیات میں آنے کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں صاحبزادے اسی مکان کی نچلی منزل میں مقیم تھے اور سہروردی صاحب ان کے سرپرست اور رہنما تھے۔ اب ایسی شخصیات کہاں؟ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔۔۔ہاں تو فیض صاحب سے ملاقات ہوئی ملکی اور عالمی حالات پر باتیں ہوئیں۔ وہی دھیما، محبت بھرا درویشوں، صوفیوں والا لہجہ اور انداز گفتگو اس کیلئے ایک الگ مجلس کی ضرورت ہوگی۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کے

''اب بانگلہ دیش ایک دوسرا ملک ہے اور وہاں کے شہری ایک دوسرے ملک کے شہری ہیں اور پھر ہمارے ان کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی تو نہ تھے اور ہمارے پہنچنے پر جو شاندار استقبال ڈھاکہ میں ہوا اس کی وجہ سے بھی ہمیں ہوٹل میں پابند کر دیا گیا۔ بھئی دلیل وہی تھی۔ سیکورٹی والی''

(فیض احمد فیض)

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم!

نصیب صحبت یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقص سایۂ سروچنار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک

عمل: طاہر رشید
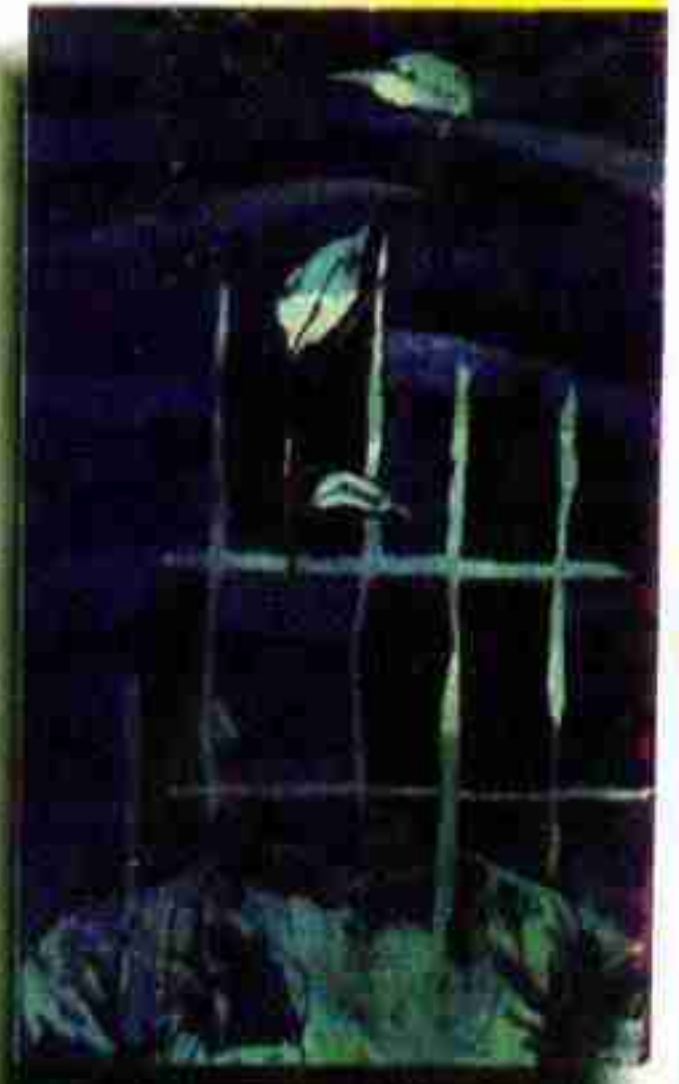
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

عمل = شاہد حسین

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھولے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی

ان دکھی ماؤں کے نام

رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں

دکھ بتاتے نہیں

منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام

جن کی آنکھوں کے گل

چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے

مرجھا گئے

اُن بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اُکتا گئے

بیواؤں کے نام

کٹڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند

راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لیے ہاتھ پھیلائے پہنچے

اور لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہ جو اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بجھ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے
اُن اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
قید خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے

منیر احمد منیر
(ناظم)

فیضؔ کی ایک یادگار تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انہوں نے ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن انعام کی پُرشکوہ تقریب کے موقع پر اُردو زبان میں کی۔

”محترم اراکین مجلس صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے، لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرت کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجز بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے بھی درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے ہیں جن میں اپنی عزت افزائی کے لئے لینن پرائز کمیٹی، سوویت یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کر سکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سب ہی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سب ہی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہیں یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لئے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ وہ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے۔ نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں ابن آدم

کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ان دو لفظوں پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے‘ انہیں پر انسانی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں‘ اس لئے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود تھا۔ لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل‘ سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سب ہی جھولیاں بھر سکتی ہیں‘ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر‘ پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس کے لئے نہیں بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنیادیں ہوس‘ استحصال اور اجارہ داری کی بجائے انصاف‘ برابری‘ آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں بلکہ عملی کام ہے۔ اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اس لئے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ‘ ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد‘ جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں کے تحفظ کے لئے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان عزیز ہے‘ جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کی بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرتے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق‘ ادب اور فن‘ روزمرہ زندگی‘ غرض کئی محاذوں پر کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب‘ انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لئے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراج اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید

ماسکو میں روسی ادیبوں کے ہمراہ فیض صاحب اور سلیمہ ہاشمی

اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں آزادی ملی۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازم ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے سوویت فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی کمینگیاں‘ خود غرضیاں‘ یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو‘ یہ بم اور راکٹ‘ توپیں‘ بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے‘ جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے‘ جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں مانی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

فیض احمد فیض

فیض کی کہانی...... فیض کی زبانی

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریٔ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے الٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پہ لطف و عنایت کی اس قدر بارش رہی ہے' اپنے دوستوں کی طرف سے' اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی داد و دہش کا مستحق ہونے کے لئے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے' اسکول میں پڑھتے تھے تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ خواہ مخواہ انہوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالانکہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں' یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رعب مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے' کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے مونہہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اُڑا رہا ہے' کوئی گولیاں کھیل رہا ہے۔ کوئی لٹو چلا رہا ہے' ہم بس کھیل کود دیکھتے رہتے تھے اکیلے بیٹھ کر۔ "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے" کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ اسے شریفانہ مشغلہ یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آج کل کی میں نہیں جانتا' ہمارے زمانے میں تو سکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے استاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ' فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا'

کان آہستہ سے کھینچا وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو استاد کہتے یہ کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں' ایک تو یہ کہ بچوں کی جو دلچسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دوستوں' ہم جماعتوں اور اپنے اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے بھی ملا اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اٹھ بیٹھے' ابا کے ساتھ مسجد گئے' نماز ادا کی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے' درسِ قرآن سنا' ابا کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی سیر کے لئے گئے' پھر سکول' رات کو ابا

بلا لیا کرتے تھے خط لکھنے کے لئے اس زمانے میں انہیں خط لکھنے میں کچھ وقت ہوتی تھی۔ ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انہیں اخبار بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اردو انگریزی کے اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی ایک دکان تھی' جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جنہیں سب ''بھائی صاحب'' کہتے تھے۔ بھائی صاحب کی دُکان میں اُردو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی' ساتویں جماعت کی طالب علمی میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آج کل قریب قریب مفقود ہو چکی ہیں جیسے ''طلسم ہوشربا''، ''فسانہ آزاد'' عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع کیا' داغ کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام پڑھا۔ غالب تو اس وقت بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا لیکن ان کا دل پر اثر کچھ عجب قسم کا ہوتا تھا' یوں شعر سے لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح کے منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا تو انہوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمہاری شکایت کریں گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ہی ڈر لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ کریں مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی۔ ابا نے ہمیں بلایا اور کہا میں نے سنا ہے تم ناول پڑھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے تو انگریزی ناول پڑھو اردو کے ناول اچھے نہیں ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے ناول لا کر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کئے۔ ڈکنس' ہارڈی اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلے نہ پڑتا تھا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔ دسویں جماعت میں پہنچنے تک محسوس ہوا کہ بعض استاد پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں۔ ہم ان کی انگریزی درست کرنے لگے اس پر ہماری پٹائی تو نہ ہوتی البتہ وہ استاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمہیں ہم سے اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے کیوں پڑھتے ہو۔ اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی' موسیقی سے لگاؤ تھا۔ شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم کی بیٹھک میں بڑے بڑے استادوں کا گانا سنتے۔ استاد توکل حسین خاں' استاد عبدالوحید خاں استاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔ ان استادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو خاک تھے بس رسمی طور پر کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔ غرض اس طرح ہمیں اس فن لطیف سے حظ اندوز ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتہ چلا کہ گھر میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک در بدر پھرے اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لطف آیا اس لئے کہ اس کی وجہ سے تماشائے اہل کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔ خاص طور سے اپنے دوستوں کا کالج میں ایک چھوٹا سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمید الدین بھی اس حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔ جوانی کے دنوں میں جو دوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ بھی ہوئے اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔ لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دوسرے لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے جہاں مناظر قدرت دیکھنے کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا۔ ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعہ حسن فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان کا بھی اپنا ایک حسن ہے جو دریا و صحرا' کوہسار یا سرو سمن سے کم نہیں البتہ اس کو دیکھنے کے لئے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہیے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی' چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا' چار طرف باغات تھے۔ ایک رات چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پر اسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب ہی قسم کا حسن پیدا ہو گیا تھا جسے میں نے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے۔ شہر کی گلیوں' محلوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت' کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا رُوپ آ جاتا ہے جیسے کوئی پرستان ہے۔ نیم شب' چاند' خود فراموشی' بام و در خامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

ایم۔اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی ضرورت ہوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دوسری کتابیں جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے' اس لئے امتحان میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اول دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں خواہ ہمارے نمبر ان سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے۔ جب کسی استاد کا جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر ہریش چندر کٹا پالیا تھے' لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے کہ ہمارے بجائے تم لیکچر دو' ایک ہی بات ہے البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمے انیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انہیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کر لو دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لیکچر تم لوگ بھی تیار کر دو۔ کتابوں کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو آ کے ہم سے پوچھ لینا۔ چنانچہ نیم استاد ہم اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی اگرچہ اس وقت کی تحریکوں مثلاً کانگریس تحریک خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی دہشت پسند تحریک کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے۔

شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیونکہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق تھا اور بہت کھیل چکے تھے پھر جی چاہا استاد بننا چاہئے' ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بن سکے نہ نقاد اور نہ ریسرچ کی۔ البتہ استاد ہو کر امرتسر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا شاید سب سے خوش گوار زمانہ امرتسر ہی کا تھا کئی اعتبار سے' ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا' اپنے طلبہ سے دوستی کا لطف' ان سے ملنے اور روزمرہ کی رسم وراہ کا لطف' ان سے کچھ سیکھنے اور انہیں پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرتسر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقاء کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود الظفر تھے' ڈاکٹر رشید جہاں تھیں' بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول لبرٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا۔ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور ان میں حصہ لیا۔ ادب لطیف کی ادارت کی پیشکش ہوئی تو دو تین برس اس کا کام کیا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے ایک ''ادب برائے ادب'' والے' دوسرے ترقی پسند تھے کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا۔ برصغیر میں ریڈیو شروع ہوا۔ ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک سید رشید احمد تھے جو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہوئے۔ دوسرے سوماناتھ چب تھے' جو آج کل ہندوستان میں شعبہ سیاحت کے سربراہ ہیں۔ دونوں باری باری لاہور کے سٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار اور ادیب ڈاکٹر تاثیر' حسرت' صوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ ریڈیو آنے جانے لگے۔ اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائریکٹر آف پروگرامز نہیں بناتا تھا بلکہ ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے' فیچر لکھے' دو چار کہانیاں لکھیں' یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھا۔ رشید جب دہلی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی ہوئی۔ مجاز' سردار جعفری' جاں نثار اختر' جذبی اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ پیدا ہوا جس سے دوستی کے علاوہ بصیرت اور سوجھ بوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔ وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شمیم جہاں

فیض احمد فیض۔ سوانحی خاکہ

نام: فیض احمد خاں، مشہور ہوئے: فیض احمد فیض کے نام سے۔

تاریخ ولادت: 13 فروری 1911ء یا 1912ء

جائے ولادت: قصبہ کالا قادر، ضلع سیالکوٹ۔

ابتدائی تعلیم: 1915ء میں چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ 1916ء میں میر حسن سیالکوٹی کے مکتب میں بٹھا دیا گیا جہاں سے انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کیا۔

1912ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ 1927ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ 1929ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ 1931ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے اور پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ اس کے بعد 1933ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور 1934ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز: 1934ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1935ء میں امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں فیض احمد فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرار ہوا۔ اس کے بعد 1940ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1942ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیر باد کہا اور فوجی خدمات انجام دینے لگے۔ فوج میں کیپٹن کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا اور لاہور سے دہلی آ گئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے تھا۔ 1943ء میں میجر اور 1944ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یکم جنوری 1947ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ 1959ء میں پاکستان آرٹ کونسل کے سیکریٹری مقرر کیے گئے۔ یہاں انہوں نے 22 جون تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد فیض صاحب لندن چلے گئے۔ 1962ء میں وہاں سے کراچی واپس آئے اور عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل و نگراں مقرر ہوئے۔

شادی: فیض احمد فیض نے 1941ء میں ایک انگریز خاتون مس ایلس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ شیخ عبداللہ (شیر کشمیر) نے ان کا نکاح پڑھایا۔ ایلس جارج ادبی دنیا میں ایلس فیض کے نام سے جانی جاتی ہیں لیکن فیض کی والدہ نے اپنی بہو کا نام کلثوم رکھا تھا۔

بچے: فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ 1942ء میں اور چھوٹی بیٹی منیزہ 1945ء میں پیدا ہوئی۔

والدہ کا نام: سلطانہ فاطمہ۔

والد کا نام: چودھری سلطان محمد خاں، فیض احمد فیض کے والد سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ علم و ادب سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاء الدین، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرکردہ رکن تھے۔ ان کی مشہور تصانیف میں افغانستان کے دستوری قوانین اور امیر عبدالرحمن کی سوانح عمری، جو انگریزی میں ہے، شامل ہیں۔

بھائی، بہن: فیض کی پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے دو بھائی اور تین بہنوں کا انتقال فیض کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

فیض کا زمانہ قید: فیض احمد فیض، قیام پاکستان کے تقریباً تین سال بعد ہی 1951ء میں لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش میں گرفتار کر لیے گئے تھے، ساتھ ہی دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار ہوئے۔ یہ کیس راولپنڈی سازش مقدمہ کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض نے چار سال ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں تقریباً تین مہینے انہیں قید تنہائی کی سزا ہوئی اور اس عرصے میں وہ باہر کی دنیا سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ تین ماہ انہیں سرگودھا اور لائل پور کی

جیلوں میں گزارنے پڑے۔ یہاں انہیں اپنے دوست احباب بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ وہ اپنا قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان کے زمانہ قید کی یادگار ہیں۔

کلام الملوک ملوک الکلام
تزک عبدالرحمانی

قاضی عارف حسین۔ صدر شعبہ تصنیف و تالیف سرسید کالج واہ کینٹ کے پاس فیض احمد فیض کے والد بزرگوار سلطان محمد خاں۔ بیرسٹر ایٹ لاء کی تالیف "تزک عبدالرحمانی" کا نسخہ جو ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا محفوظ تھا جسے انہوں نے اسلام آباد میں فیض صاحب کو نذر کیا۔ لیکن فیض صاحب نے یہ عبارت لکھ کر قاضی صاحب کو واپس کر دیا۔

"یہ کتاب پہلی مرتبہ نظر سے گزری۔ قاضی عارف حسین کے لیے۔ فیض احمد فیض"

قاضی عارف حسین سے فیض صاحب نے خواہش کی تھی کہ اس کتاب کی فوٹو اسٹیٹ مجھے لاہور بھجوا دینا لیکن اُن کی اچانک رحلت کے باعث قاضی صاحب اُن کی خواہش کو پورا نہ کر سکے۔

''زنداں نامہ'' کی بہت سی نظمیں انہوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ مارچ 1953ء سے مارچ 1955ء تک کی کہی ہوئی نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان کے یہ اشعار جن میں تلخی حیات اور تلخی کلام کا احساس ہوتا ہے اسی زمانے کی یادگار ہیں ۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

سازش کیس کے سلسلے میں قید سے فیض 20 اپریل 1955ء کو رہا ہوئے۔ دوسری بار 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل 1959ء میں رہائی ملی۔

فیض صحافت کے میدان میں: فیض کی شخصیت صحافت کے میدان میں خوب نکھری اور عروج پر پہنچی 39-1938ء تک انہوں نے ماہ نامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے' 55-1947ء تک اخبار و رسائل میں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ان میں چند ایک قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ پاکستان ٹائمز روزنامہ امروز ہفت روزہ

لیل ونہار۔اس کے علاوہ فیض صاحب بیروت میں افروایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے جریدہ "لوٹس" کے کافی عرصہ تک مدیراعلیٰ رہے۔

اعزازات: فیض کو فوجی ملازمت کے دوران 1946ء میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا۔ 1962 میں فیض احمد فیض کو لینن انعام سے سرفراز کیا گیا۔فیض پہلے ایشیائی شاعر تھے جنہیں یہ عزت بخشی گئی اور جس سے نہ صرف فیض کو بین الاقوامی عزت اور شہرت حاصل ہوئی بلکہ پاکستان' ایشیا اور اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا۔اس کے علاوہ نوبل انعام کے لئے بھی ان کا نام دیئے جانے کی تجویز تھی۔

سیر وسیاحت: فیض نے ایشیاء اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کئے 1948-49ء تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے۔ جولائی 1962ء سے جنوری 1964ء کے دوران 'انگلستان' روس' الجیریا' مصر لبنان اور ہنگری کے طویل سفر کئے۔

1958ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس' تاشقند میں ہوئی جس میں فیض صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

مطالعہ: فیض علم دوست انسان تھے۔مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا تھا۔زمانہ طالب علمی سے لے کر آخر وقت تک یہ شوق برقرار رہا۔ادب' سائنس' فلسفہ' نفسیات' سیاسیات' تاریخ اور مذہب' غرض' ہر موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔جن اہم شخصیتوں کو انہوں نے پڑھا' استفادہ کیا اور متاثر ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں۔

سرسید' حالی' گوئٹے' دانتے' ملٹن' ٹالسٹائے' برنارڈ شا' سقراط' افلاطون' ارسطو' ہیگل' مارکس اور نطشے۔

فیض بحیثیت ڈرامہ نگار: فیض نے 1938-39ء میں ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے جو لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے اور پسند کئے گئے۔ان کے کامیاب ڈرامے ہیں: پرائیویٹ سیکریٹری' سانپ کی چھتری' تماشا میرے آگے' ادب لطیف ماہنامے میں شائع ہو چکے ہیں۔

فیض کی فلموں سے وابستگی: فیض کا تعلق فلموں سے بھی رہا ہے۔انہوں نے دو فلموں کے لئے گانے اور مکالمے لکھے۔ایک فلم ہے" جاگو ہوا سویرا" جو 1959ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے' دوسری فلم ہے' دور ہے سکھ کا گاؤں۔"

سماجی خدمات: تعلیم ختم کرنے کے بعد جب فیض صاحب ملازمت کے سلسلے میں امرتسر آئے تو ان کی ملاقات پطرس بخاری' رشید جہاں' ہاجرہ بیگم' ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔اسی وقت سے وہ سوشلزم کی طرف مائل ہوئے۔فیض نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر' ریلوے' ڈاک وتار کے مزدوروں کو منظم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔قیام پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین کے ساتھ وابستہ ہوئے اور ایک عرصے تک ٹریڈ یونین کے صدر رہے۔سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں حصہ لیا۔فیض نے جینوا اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔ایل۔او کے اجلاس میں شرکت کی۔یہ فیض کا جذبہ خدمت ہی تھا جس نے انہیں اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطینی مہاجرین اور افریقی عوام کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔

فیض کی تخلیقات:

شعری مجموعے

1- نقش فریادی 1941ء میں پہلا مجموعہ کلام
2- دست صبا 1952ء
3- زنداں نامہ 1956ء
4- دست تہہ سنگ 1965ء
5- سروادیٔ سینا 1971ء
6- شام شہر یاراں 1978ء
7- میرے دل میرے مسافر 1981ء
8- کلام فیض 1982ء
9- کلام فیض 1982ء

نثری مجموعے

1- میزان (تنقیدی مضامین) فروری 1962ء
2- صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) 1971ء
3- متاع لوح وقلم 1973ء
4- ہماری قومی ثقافت 1976ء
5- مہ وسال آشنائی 1980ء
6- سفرنامہ کیوبا 1974ء

دست تہہ سنگ کے علاوہ فیض کے مجموعوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

کلیات: نسخہ ہائے وفا۔(پاکستانی ایڈیشن)
سارے سخن ہمارے (برطانوی ایڈیشن)

زیر ترتیب:

1-اردو شاعری کا انتخاب
2-پاکستانی کلچر (اردو اور انگریزی میں)
3-اقبال کی شاعری

وفات: فیض احمد فیض دمہ کے مرض میں مبتلا تھے جس نے ان کو کافی کمزور کر دیا تھا۔18 نومبر کی رات کو ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ان کو بچانے کی پوری کوشش کی گئی لیکن افسوس 20 نومبر 1984ء بروز منگل' دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ پر میو ہسپتال کے ایسٹ میڈیکل وارڈ میں فیض احمد فیض کی شمع حیات گل ہوگئی۔

عکس: سلیمہ ہاشمی

وہ باتیں جن کا فیض کو ساری عمر پچھتاوا رہا

افتخار عارف: فیض صاحب' اگر ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہیں' آپ کا انٹرویو لینا چاہیں تو ہمیں بتائیں کہ کون کون سی باتیں ہوں گی جنھیں آپ چاہیں گے کہ آپ سے پوچھی نہ جائیں۔

فیض: ایسی بہت سی باتیں ہیں' مثال کے طور پر ہمارے نامۂ اعمال میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں' وہ تو ہم نہیں بتائیں گے ...... اس کے علاوہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی باتیں ہیں جو آپ سے چھپانے کی ہیں۔ ہماری زندگی تو ایک کھلی کتاب کی سی ہے۔

افتخار عارف: عام طور سے آپ کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور زندگی گذاری ہے اور بڑی کامیاب زندگی گذاری ہے۔ کبھی کوئی پچھتاوا بھی آپ کو ہوا ہوگا۔؟

فیض: ایک پچھتاوا تو ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہماری Ambition یہ تھی کہ ہم ایک بڑے کرکٹر بنیں۔ ابھی تک کبھی کبھی ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ٹیسٹ کرکٹر ہیں اور کرکٹ میچ کھیل رہے ہیں ...... ایک تو وہ ہم نہیں بن سکے۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے۔

احمد فراز: فیض صاحب یہاں آپ سے تھوڑی سی عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر آپ کرکٹر بن بھی جاتے تو پانچ سات سال تک آپ کا جو خواب تھا وہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا۔ بعد میں کرکٹ سے ریٹائر ہو کر تو ادھر آنا ہی تھا آپ کو۔

فیض: یہ تو دوسری بات ہے نا۔

احمد فراز: میں سوچ رہا تھا لندن کے حوالے سے اور انگلستان کے حوالے سے کہ......

فیض: انگلستان کے حوالے سے یہ کہ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس سے چھ مہینے پہلے ہم نے کیمبرج میں داخلہ لیا تھا۔ جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں' بحری جہاز میں ہماری سیٹ بک تھی۔ ہم نے کچھ کپڑے بھی سلوا لئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم امرتسر کے کالج میں پڑھاتے تھے۔ کالج کرکٹ ٹیم کے صدر تھے۔ ایک سردار صاحب تھے جو ہماری کرکٹ ٹیم کو سامان مہیا کرتے تھے۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ وہاں کام کاج کر کے کام چلا لیں گے۔ سردار صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یوں کریں کہ آپ ہمارے ایجنٹ بن جائیں' ہم آپ کو مال کی فروخت پر معقول کمیشن دیں گے۔ مگر ایک شرط ہے کہ میں جوتشی سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ کو اس سے ملنا ہوگا۔ ہم اس جوتشی کے ہاں پہنچے۔ وہ کوئی پیشہ ور جوتشی نہیں تھے' ریلوے میں ملازم تھے۔ جوتشی صاحب نے ہمارا نام اور تاریخ پیدائش معلوم کی' کچھ یہ' کچھ وہ' پوچھا' ہاتھ دیکھا اور بولے آپ تو جا ہی نہیں رہے ہیں ہم نے پوچھا "کیا مطلب؟" تو بولے راستہ ہی بند ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا "راستہ بند سے کیا مطلب ہے۔ ہماری جیب میں ٹکٹ ہے' کیمبرج میں داخلہ مل چکا ہے' تمام تیاریاں مکمل ہیں۔"

وہ بولے' آپ مانیں یا نہ مانیں' آپ نہیں جا رہے ہیں۔ اور واقعی ہوا یہ کہ چند ہی ماہ بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہمارا اطالوی جہاز جو ہمیں لندن لے جانے والا تھا' بمبئی ہی نہیں آسکا۔ اس طرح واقعی ہمارا راستہ بند ہو گیا۔ جب سے آج تک کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ واقعی کچھ ہوگا اس علم میں بھی۔

احمد فراز: فیض صاحب آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ اپنے لٹریچر میں' اپنی گفتگو میں جو مقصد زندگی کا آپ نے بنایا ہے' جو کا ذکر کیا اس میں جیوتش یا ستاروں کی طاقت کی کوئی جگہ ہے۔ اُس چھوٹے سے واقعہ نے آپ کو کس حد تک متاثر کیا؟

فیض: متاثر صرف اس حد تک کیا کہ اس کی بات سچ ہو گئی۔ کبھی کبھی تکا بھی لگ جاتا ہے۔

افتخار عارف: آپ کا گھر سیالکوٹ میں تھا' وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی' اُس زمانے کے حوالے سے بچپن کی کچھ یادوں میں ہمیں بھی شریک کر لیں۔

فیض: بچپن کی یادیں یعنی کہ جب ہم نے ہوش سنبھالا' یعنی پانچ چھ یا سات سال کے ہوئے تو ابتداء ہم نے قرآن شریف حفظ کرنے سے کی۔ ایک حافظ صاحب مقرر کئے گئے کہ ہم کو حفظ کرائیں تو ہم نے تین سپارے حفظ کئے۔ اس کے بعد ہماری آنکھیں

زہرہ نگاہ، احمد فراز، فیض احمد فیض، گوپی چند نارنگ، عشرت آفرین، افتخار عارف، بلقیس دہلوی

دُکھنے آ گئیں۔ تو ایک پچھتاوا یہ بھی ہے۔ جو آپ ابھی پوچھ رہے تھے کہ اس کے بعد ہم آگے حفظ نہ کر سکے۔

ابتداء میں ماسٹر عطا محمد سے گھر پر اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ہم مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ہمارے ابا جو تھے وہ انجمن اسلامیہ کے صدر تھے۔ اس لئے پہلے ہمیں وہیں داخل کیا گیا۔ ہم جب پہلی مرتبہ مدرسہ بھیجے گئے تو بڑے اہتمام کئے گئے۔ ہمیں مخملی کپڑے پہنائے گئے' آنکھوں میں کاجل لگایا گیا' یہ اور وہ' نہ جانے کیا کیا اہتمام ہوئے۔ دو گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر مدرسہ بھیجا گیا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹاٹ بچھا ہوا ہے اور میلے کچیلے کپڑوں میں بے چارے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کون سا جانور آ گیا ہے۔

احمد فراز: (قطع کلام کرتے ہوئے) فیض صاحب کی زندگی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہے۔

فیض: بچوں نے ایسے ٹھٹھے لگائے ہم پر کہ بہت ندامت ہوئی اور فیصلہ کیا کہ آج کے بعد ہم یہ نہیں کریں گے کہ ہم اور یہ الگ الگ ہیں۔ خیر تھوڑے دن تک ہم اُس اسکول میں رہے مگر بچوں نے ہماری زندگی عذاب کر دی۔ ایک تو ہمارے ابا چونکہ اسکول کے صدر تھے اس لئے ہر ماسٹر ہمیں سلام کرتا تھا۔ امتحان وغیرہ تو ہوتے ہی نہیں تھے۔ ویسے بھی ہم اُردو' فارسی گھر پر اُس سے زیادہ پڑھ چکے تھے جو وہاں کے اُستادوں کو آتی تھی۔ آخر ایک دن ہم نے اپنے ابا سے کہا کہ ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے۔ وہاں سے ہم مشن اسکول چلے گئے۔

یہ بھی اُس زمانہ کی یاد ہے کہ جب کانگریس اور خلافت کی تحریک چلی تھی۔ امرتسر میں مارشل لاء لگا تھا۔ سارے شہر میں ایک طرح کا ہنگامہ تھا۔ سیاسی گہما گہمی تھی۔ باہر سے لیڈر آتے تھے اور اُن کے لئے شہر بھر میں پھولوں کے دروازے لگائے جاتے تھے۔ پھولوں سے سجی گاڑیاں تیار کی جاتی تھیں۔ جب ان کا جلوس نکلتا تو ہندو' مسلمان' سکھ سب ساتھ ہوتے تھے۔ نعرے لگتے تھے "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال" پھر نعرہ تکبیر "اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوتی۔ قومی نعرہ۔ "بندے ماترم" کی آواز لگتی تھی اور اُس کے بعد علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گایا جاتا تھا۔

یہ ہنگامے ہوتے ہی رہتے تھے۔ ہمارے ابا چونکہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے تو لوگ آتے تھے کہ آپ بھی تحریک میں حصہ لیجئے۔ وہ کہتے تھے جی تو بہت چاہتا ہے کہ میں بھی اس میدان میں کود پڑوں مگر مجھے اپنے بچوں کا خیال آتا ہے' یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اور چونکہ وہ اُس میدان میں نہیں کودے تو انگریز سے اُنہیں خان بہادر کا خطاب مل گیا۔

افتخار عارف: علامہ اقبال سے آپ کی ملاقاتیں کیسی تھیں؟

فیض: علامہ صاحب کو صرف ایک ہی بار دیکھا

ہے ذہن میں بہت دھندلا سا تصور ہے۔ یہ پوچھنے کہ پہلی بار ہم پبلک میں کب آئے...... انجمن اسلامیہ کا ہر سال ایک جلسہ ہوتا تھا۔ جس میں مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے۔ ہمارے ابا انجمن کے صدر تھے' ہماری عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ جب ہم نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع ہی کیا تھا۔ جلسہ میں ہمیں قرأت کرنے کے لئے کھڑا کر دیا گیا۔ ہم نے پلیٹ فارم پر پہنچ کر قرأت شروع کی تھی کہ انجمن کے سیکریٹری شیخ ظہور الٰہی مراد نے ہمیں اُٹھا کر منبر پر کھڑا کر دیا۔ وہاں ہم نے تھوڑی سی تلاوت کی۔ یہ تھی ہماری پہلی پبلک اپیرنس (Public Appearance)

ہمارے ابا چونکہ شہر کے رئیس تھے' ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین تھے' اور نہ جانے کیا کیا تھے وہ۔ ڈپٹی کمشنر' کمشنر' کمانڈر انچیف باہر سے آتے تو ہمارے ابا ہمارے بڑے بھائی طفیل اور چھوٹے بھائی عنایت کو چھوڑ کر ہمیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیونکہ ہم اچھی انگریزی بول لیتے تھے۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا مگر اس طرح پبلک لائف سے بچپن میں ہی روشناس ہو گئے۔ جب ہم ساتویں آٹھویں جماعت میں پہنچے تو بڑے بھائی کے ہم جماعت نذیر احمد محمود جو بعد میں جسٹس بنے کہنے لگے کہ تم شاعری کی کتابیں پڑھتے رہتے ہو کبھی شاعری بھی کی۔ ہم نے کہا شاعری تو کبھی نہیں کی۔ کہنے لگے ہماری کلاس میں ایک لڑکا ہے چھجو رام۔ اُس کی ہجو لکھو۔ جو کچھ میں آیا' ہم نے اُلٹی سیدھی ہجو لکھ دی کہ چھجو رام کا سر اس طرح کا ہے' پیٹ اس طرح کا ہے' ٹانگیں اس طرح کی ہیں...... انہوں نے ہجو پڑھی تو کہنے لگے تم تو شاعر ہو...... اگلے دن سارے اسکول میں ہجو مشہور کر دی۔ ہمیں بہت ندامت ہوئی کہ چھجو رام کو رنج ہوا ہوگا۔ ہم اُسے جانتے بھی نہیں تھے کہ کون ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اُس تک پہنچے' معافی مانگی تو کہنے لگا "معافی کیسی' میں تو شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے سارے اسکول میں مشہور کر دیا۔"

تو یہ تھی شاعری میں ہماری پہلی کوشش۔ پھر ہم جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہمارے ماسٹر بہاری لال نے ایک مصرع دے کر سب کو غزل کہنے کی دعوت دی۔ شمس العلماء سید میر حسن جج تھے۔ ہماری غزل کو پہلا انعام ملا۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے آدھے مصرعے وزن سے خارج تھے۔ شمس العلماء نے خوش ہو کر ہمیں ایک روپیہ انعام دیا۔ یہ پہلا انعام تھا جو ہمیں ملا تھا۔ آج تک یہ انعام یاد ہے۔

افتخار عارف: کچھ فوج کے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے گئے تھے؟

فیض: جب 1939ء میں لڑائی شروع ہوئی اُس وقت ہمارے جو سیاسی دوست تھے انہوں نے کہا یہ سامراجی جنگ ہے' ہمارا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلا رکھی تھی اور جتنے بائیں بازو کے لوگ تھے خاص طور سے کیمونسٹ اور سوشلسٹ ان سب کو انگریزوں نے دلائی کیمپ میں نظر بند کر دیا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ دوست مجید ملک فوج میں پبلک ریلیشنز افسر بن کر چلے گئے تو انہوں نے بہت چاہا کہ ہم فوج میں چلے جائیں مگر ہم نے انکار کر دیا کہ یہ امپیریلزم کی جنگ ہے ہم اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

اُس دوران میں بی بی سی نے اس سلسلہ کے کچھ پروگرام شروع کئے۔ افضل (مرحوم)' چچا سدید (مرحوم)' اعجاز بٹالوی' بی بی سی سے وابستہ ہو گئے۔ زیڈ اے بخاری انچارج تھے۔ اُن کا تار آیا کہ بی بی سی میں آجاؤ۔ ہمیں اُن دنوں امرتسر میں لیکچرار کے طور پر ایک سو بیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑا سا دل للچایا کہ اس بہانے سے لندن دیکھ لیں۔ ہم نے انگلستان نہیں دیکھا تھا حالانکہ انگریز خاتون سے شادی کر چکے تھے۔ انگریز خاتون سے شادی کرنے کے لیے انگلستان جانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی' وہ خود ہی آگئی تھی۔ دل کہتا تھا کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ ممکن ہوا تو کیمبرج میں داخلہ لے لیں گے' یا بیرسٹر بن جائیں گے لیکن بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے تار بھیج دیا کہ ہم اس جنگ میں امپیریلزم کا ساتھ نہیں دیں گے۔ پھر جرمنوں نے روس پر حملہ کر دیا' دوسری طرف جاپانی ہندوستان کی سرحدوں تک آگئے۔ ہمارے دوستوں نے کہا حضور یہ ملک کے تحفظ کا مسئلہ ہے' یہ عالمی جنگ ہے۔ یہ فاشزم کے خلاف جنگ تو لڑنا ہی چاہیے۔ فوج میں ہم اس طرح گئے کہ شام کو ہم ریڈیو پر تقریر کرنے کے لئے گئے تھے کہ وہاں دہلی سے مجید ملک کا فون آیا کہ کل دلی آجاؤ تم سے بات کرنا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو سب نے اجازت دے دی۔

دہلی میں انگریز بریگیڈیئر کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے کہا "تمہاری سی آئی ڈی کی فائل میرے سامنے میز پر رکھی ہے اُس پر لکھا ہوا ہے۔

"You are advanced communist"

(تم ایک زبردست کیمونسٹ ہو)

میں نے پوچھا:

"What is a retarded communist"?

(کمزور کیمونسٹ کیا ہوتا ہے؟)

کہنے لگے خیر مجھے اس رپورٹ کی پرواہ نہیں' تم کام کرو گے؟ میں نے کہا' ہاں کروں گا...... تب ہم اس طرح فوج میں آگئے۔

افتخار عارف: آپ نے مہاتما گاندھی کی آواز پر بھی تو کچھ ملکی نغمے لکھے تھے۔

فیض: ہاں۔ اُن دنوں ہم لیڈر تھے۔ بہت سے نغمے ہم نے لکھے جیسے "تجھ کو منظور......"

☆☆☆

''میں کرکٹر بننا چاہتا تھا''

کرشن گولڈ: فیض صاحب! ابھی حال ہی میں ایک انٹرویو میں آپ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ یہ بتائیے کہ ایسے کون سے سوال ہیں جو آپ سے نہ پوچھے جائیں لیکن میں اس کے بالکل برعکس کہنا چاہتا ہوں۔ آپ نے سینکڑوں ہزاروں انٹرویوز دیئے ہیں آپ ایسے سوال بتائیں جو آپ نے ہمیشہ سوچا ہو کہ کاش مجھ سے کوئی پوچھے اور میں اس کا یہ جواب دوں۔ ایسا کوئی سوال ہے؟

فیض: بھئی بات یہ ہے کہ ہم تو انٹرویو وغیرہ دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو صرف لکھنا ہے۔ ہم سے کوئی کیا سوال پوچھتا ہے' کیوں پوچھتا ہے ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ جو بھی کوئی سوال کرے ہم جواب دینے کو تیار ہیں۔ آپ پوچھ رہے ہیں کہ کوئی ایسا سوال جو ہم سے کرنا چاہئے تھا اور ہمیں اس کا جواب دینا چاہئے تھا۔ یہ ذرا سوچنے کا' مجھے موقع دیجئے۔ اگلا سوال کیجئے۔

کرشن: آپ نے ابھی کہا ہے کہ میرا کام لکھنا ہے اچھا تو پھر یہ بتا دیجئے' آپ نے شعر کہنا کب شروع کیا تھا؟

فیض: شعر تو...... شاید ہم نے بچپن ہی میں تک بندی شروع کر دی ہوگی۔ جس کا ہم نے کبھی کوئی ریکارڈ نہیں رکھا۔ لیکن سنجیدگی سے ہم نے اُس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ بات 1929ء کی ہے۔ ہم تھرڈ ائیر میں پڑھتے تھے جب پہلا مشاعرہ ہوا گورنمنٹ کالج لاہور میں۔ کالج کے اُس مشاعرے میں شہر کے نامور شعراء حضرات تشریف لائے تھے۔ آج کل جو فرشی مشاعرے کا رواج چل نکلا ہے' اُس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کالج میں ایسا ہوتا کہ جو بڑے بڑے شاعر ہوتے تھے' وہ اسٹیج پر کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور جو ہمارے جیسے ابھی شاعر بننے کی کوشش میں ہوتے تھے' وہ سامعین میں بیٹھتے تھے۔ اور باری باری ان کو پکارا جاتا تھا۔ تو ہم نے مشاعرہ میں پڑھنا تو گورنمنٹ کالج میں ہی شروع کیا تھا۔ پہلی بار جو ہم نے غزل پڑھی تو بہت داد ملی۔ اس مشاعرے کی صدارت پطرس بخاری صاحب کر رہے تھے۔ پہلے دور میں بہت داد ملی تو دوسرے دور کے لئے بھی ہمیں بلایا گیا۔ مگر ہمارے پاس تو صرف ایک ہی غزل تھی۔ ایک بار ہمارے ایک دوست برج موہن نے اپنے ایک دوست کے نام ایک منظوم خط ہم سے لکھوایا تھا جو کہ ہم نے نظم کر کے لکھ دیا تھا...... ہم نے مجبوراً دوسرے دور میں وہ منظوم خط پڑھ دیا۔ اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا تو چراغ حسن حسرت' صوفی تبسم اور عبدالمجید سالک جیسے بلند پایہ صاحب سخن اور اہل قلم ہمارے پاس آ گئے اور کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے دل کو بہت چوٹ لگی ہے۔ میں نے کہا ''جی ہاں لگی تو ہے۔'' کہنے لگے ''ہاں بھئی! رنگ بہت اچھا ہے شعر کہا کریں'' ہم نے سمجھا کہ ہم تو واقعی شاعر ہو گئے ہیں جو اس قسم کے چوٹی کے لوگ ہمیں سراہ رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارے شعری سفر کا آغاز۔

کرشن: ابھی آپ نے کہا کہ کسی زمانے میں آپ تک بندی کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں کبھی خیال آیا تھا کہ آپ شاعر بنیں گے؟

فیض: کبھی بھی نہیں۔ اُس وقت تو ہم کرکٹر بننا چاہتے تھے۔ اپنی خواہشات کا دائرہ یہاں تک ہی محدود تھا۔

کرشن: شاعری کے علاوہ آپ پروفیسر بھی رہے اور اخبار کے ایڈیٹر بھی۔ آپ فوج میں بھی رہے۔ ان سب کے باوجود آپ کا شاعری سے ناطہ برقرار رہا۔ یہ بتایئے متذکرہ ملازمتوں میں آپ کیسے چلے گئے۔ مثلاً فوج میں آپ کیوں اور کیسے گئے؟

فیض: جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا اور جاپانی ہندوستان تک پہنچ گئے تو ہم نے سوچا کہ اب تو فاشزم کا سوال ہے۔ یہ انگریزوں کی حمایت کا سوال نہیں ہے۔ وہ ایک عالمگیر تحریک تھی' فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں۔ تب ہم نے سوچا کہ ہمیں فوج میں شامل ہونا چاہیے اور جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے ہمیں بھی ہاتھ بٹانا چاہئے۔

کرشن: اس کے بعد پھر آپ نے سیاست میں بھی حصہ لیا؟

فیض: سیاست میں تو ہم نے فوج میں جانے سے پہلے ہی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم 1935 میں امرتسر میں پڑھاتے تھے تو

ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیق کار تھے رام پور سے صاحبزادہ محمود الظفر۔ ان کی بیگم تھیں ڈاکٹر رشید جہاں۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم کی جائے۔ کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا زمانہ تھا اور عاشقی وغیرہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ بیگم رشید جہاں نے کہا چھوڑو یہ عاشقی وغیرہ کے چکر، سب فضول بات ہے۔ دنیا کے دکھ جو ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمہارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے۔ انہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا غم جو ہے یہ تو بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اپنے لوگوں کے اپنی قوم کے اور اپنے ملک کے۔ ان کی بپتا کے بارے میں تمہیں سوچنا چاہیے۔ اگر اپنے لیے سوچتے رہو گے تو یہ خود غرضی کا عمل ہوگا۔ چنانچہ یہ شعر ہمارے اسی زمانے کی یادگار ہے۔

''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا''

کرشن: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ جیل میں تھے وہ زمانہ آپ کی شاعری کا سب سے زرخیز زمانہ تھا؟

فیض: یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ جیل خانے میں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی، کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہوتی تھی۔ جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسا پھر سے عشق کر لیا جائے۔ جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بنتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جذبات کی رو میں بہہ کر کہتا ہی چلا جاتا ہے۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے جیسا آپ نے دوبارہ عشق کر لیا ہو۔ جیل میں میرا یہ عشق شاعری سے تھا۔

کرشن: عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟

فیض: بھرپور تو ٹھیک ہے لیکن کامیاب ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ یا چھ سال کے بعد انسان کو اپنا کام بدل لینا چاہیے جیسے ہم نے پہلے پانچ سال پڑھایا پھر پانچ سال فوج کی نوکری کی۔ پھر اس کے بعد پانچ یا چھ سال صحافت کی نذر کر دیئے۔ اس کے بعد پانچ سال جیل خانے گئے۔ اس کے بعد ہم نے کلچرل کام کیا، چار سال باہر گزارے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آدمی کو کسی ایک رٹ میں نہیں لگا رہنا چاہیے۔

کرشن: کوئی ایسا کام جو آپ کرنا چاہتے تھے اور وہ نہیں ہوا؟

فیض: ایسے تو بہت سے کام ہیں جو ہم کرنا چاہتے تھے اور نہیں ہوئے اور ایسے بہت سے کام بھی ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ ہم نے کر دیئے۔ ہم سمجھتے ہیں جو کام ہمیں کرنا چاہیے تھے وہ ہم اس لئے نہیں کر پائے کہ ہمیں وہ کام کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ مثلاً ہم یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو چھوڑ کر ادب خاص طور پر اُردو شاعری کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی رشتوں کے بارے میں جم کے بیٹھ کر کچھ لکھیں کہ آخر غزل کیسے اور کیوں بدلتی رہی۔ مختلف زمانوں میں مثلاً ناول نے کیسے اور کیوں جنم لیا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد نقشہ کیسے بدلا وغیرہ۔ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو کافی لکھی گئی ہے لیکن وہ سب سطحی ہے۔ اس میں ادبی معاملات پر غور کیا گیا ہے اور ادب کے جو معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں ان پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ ہم چاہتے تھے کہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر اس خلا کو پُر کر لیا جائے۔ یہ کافی لمبا اور محنت طلب کام ہے جو ہم ابھی تک نہیں کر سکے۔

کرشن: نوجوان شاعروں کو آپ شاعری کے بارے میں کیا مشورہ دیں گے؟

فیض: شاعری کے بارے میں تین مشورے ہیں۔ پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ جو کچھ لکھو اپنے دل سے لکھو۔ کسی کے کہنے کی وجہ سے مت لکھو۔ دباؤ میں آ کر مت لکھو۔ ثواب کی خاطر مت لکھو۔ حتیٰ کہ سیاست کی خاطر بھی مت لکھو۔ جو دل سے بات نکلتی ہے وہی لکھو۔ اگر دل سے بات نہیں نکلتی تو مت لکھو۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات تو حقیر سی چیز ہے۔ اندر سے تم کیا نکال لو گے۔ اندر جو کچھ ہے وہ تو باہر ہی سے آتا ہے۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باہر کیا ہے۔ تو باہر کی بات کے تین حلقے ہیں ایک تو آپ کی اپنی ذات کا حلقہ ہے۔ خود آپ پر کیا گزری اور آپ پر جو گزری ہے اُس کا آپ کے لوگوں اور آپ کی قوم پر کیا اثر ہوا ہے۔ ان مناظر میں آپ حالات کا جائزہ لیں۔ یہ تو تین اہم سرکل ہیں جن پر انسان کی نظر ہونی چاہیے اور دوسرا آپ کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ یہ امر مدنظر رہنا چاہیے کہ ماضی سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ حال میں ہم کیا کر رہے ہیں اور مستقبل میں ہمیں کون سے راستے پر چلنا ہے؟ ان پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ پھر جا کر کہیں بڑی شاعری بنتی ہے جس سے معاشرے کی خدمت ممکن ہوتی ہے۔

کرشن: آخر میں، میں فیض صاحب! آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنا کوئی تازہ کلام سنایئے۔

فیض: ابھی ہم گھر گئے تھے، کوئی پانچ چھ مہینے ہوئے تو وہاں جو کچھ ہم نے دیکھا اور جو ہم پر گزری وہ ہم عرض کئے دیتے ہیں۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

☆☆☆

نصرت چودھری

فیضؔ سے ایک گفتگو

نصرت: اردو ادب میں آپ کا ایک منفرد مقام ہے۔ اور اس کے علاوہ عالمی ادب پر بھی آپ کی نظر ہے اور اب یہ کم و بیش تسلیم بھی کر لیا گیا ہے کہ روایت اچھے ادب کی اساس ہے' مگر ایک سوال یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا مشرق کی ادبی روایت مغرب کی روایت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔؟

فیضؔ: مقابلہ تو یقیناً کر سکتی ہے' اس لیے کہ ہر ملک کی روایت جو ہے وہ اس ملک کے مزاج کے مطابق' حالات کے مطابق' اس ملک کے مذہب اور کلچر کے مطابق اس کا ایکسپریشن ہوتا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس ملک کی روایت بڑھیا ہے اور اس ملک کی روایت گھٹیا ہے۔ ان میں بہتری یا کمتری کا مقابلہ نہیں ہو سکتا بلکہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کیا چیزیں مشترک ہیں اور کیا مختلف۔ اس بنیاد پر ان میں تقابل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارا تو زیادہ تعلق یا زیادہ مطالعہ انگریزی شاعری کا ہے۔ ہماری شاعری اور ان کی شاعری کا فرق' ہماری تاریخ اور ان کی تاریخ کا فرق ہے۔ ہمارے کلچر اور ان کے کلچر کا فرق ہے۔ ہمارے یہاں صدیوں تک ایک ہی نظام قائم رہا جس کو ہم نوابی' شاہی یا جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں اور اس وجہ سے ہمارے طرزِ زندگی میں بہت زیادہ داخلی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ مغلوں کے آنے سے پہلے یا یوں کہیے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے بادشاہتیں بنتی بگڑتی رہیں۔ لوگ آتے رہے اور اپنی اپنی تہذیب اپنے ساتھ لاتے رہے۔ ہر کسی کے آنے کے بعد زبان بدلی شاعری کے علاوہ مختلف علوم پر اثر پڑا' لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا' جب تک انگریز نہیں آئے۔ اس دوران ایک بڑا فرق یہ آیا یعنی سترھویں اٹھارھویں صدی کے بعد یا دوسرے الفاظ میں انگریزوں کے آنے کے بعد انحطاط شروع ہوا۔ ہماری تہذیب کا بھی اور ہمارے کلچر کا بھی۔ اردو شاعری اس عہد میں اپنے عروج کو پہنچی۔ عام طور سے ہوتا ہے کہ جب کسی تہذیب کا عروج ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف ادب بلکہ تمام فنون کا بھی عروج ہوتا ہے۔ اردو شاعری کی ایک نسبتاً مختلف حیثیت ہے کہ اس کا عروج اُس وقت ہوا جب ملک کی تہذیب کا' ملک کے کلچر کا' ملک کی ثقافت کا اور ملک کی سیاست کا انحطاط ہو رہا تھا' زوال ہو رہا تھا۔

نصرت: اس عہد کے جو شعرا تھے۔ آپ کے خیال میں ان کا کیا مقام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کیا ان کی اپنی کوئی روایت یا انفرادیت تھی۔؟

فیضؔ: اس زمانے میں' یہ دو تین سو سال کا قصہ ہے۔ اٹھارویں صدی سے لے کر بلکہ سترھویں صدی کے اخیر سے انیسویں صدی کے نصف تک جو شعرا ہیں وہی اردو کے روایتی شعرا ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے طریقے سے اس زمانے کا جو بھی معاشرہ تھا' اس زمانے کی جو بھی ثقافت تھی' اس زمانے کی جو بھی واردات تھی' اس کو اپنے اپنے انداز سے منعکس کرنے کی کوشش کی' لیکن چونکہ اس وقت کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا' اس لیے اس عہد کی شاعری میں ایک طرح کا تسلسل ہے۔ اس میں ایک بنیادی کیفیت ہے۔ حزن کی' غم کی اور دنیا کی بے ثباتی کی۔ یہ بات واضح طور پر ابھر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ کیفیت اس عہد کی روایت ہے۔ اب رہا سوال انفرادیت کا تو ہر اچھے شاعر کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔

نصرت: آپ اس عہد کے کس شاعر سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔؟

فیضؔ: ایک حد تک تو آدمی ہر ایک سے متاثر ہوتا ہے۔

نصرت: جسے ہم اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ آپ کے خیال میں کس شاعر سے شروع ہوئی۔؟

فیضؔ: جہاں تک اردو شاعری کی روایت کا تعلق ہے۔ روایت شروع ہوئی ولیؔ دکنی سے۔ اگرچہ ان سے پہلے بھی اردو شاعری موجود تھی' مگر جس کو ہم اردو کی کلاسیکی روایت کہتے ہیں وہ ان سے شروع ہوئی۔ ان کے بعد پہلے بڑے شاعر میرؔ پیدا ہوئے۔ میرؔ کی جو روایت تھی اس میں درد و غم اور دنیا سے بیزاری کا عالم تھا۔ ان کے مقابلے میں

سودا پیدا ہوئے جو کہ نسبتاً زیادہ حقیقت پسند' زیادہ جان دار شاعر تھے۔ ان دونوں کی الگ الگ روایتیں ہیں' زبان کے اعتبار سے بھی۔ اس لیے کہ میر کی زبان سادہ' شیریں' میٹھی اور ہندی نما تھی۔ اس کے برعکس سودا کی زبان زیادہ پرشکوہ۔ زیادہ زوردار اور فارسی نما تھی۔ خیالات اور مضامین کے اعتبار سے بھی دونوں مختلف تھے۔ سودا جو تھے وہ زیادہ خارجیت پسند تھے۔ جو لوگوں پر گزر رہی تھی' اس کی زیادہ عکاسی کرتے تھے۔ میر زیادہ داخلیت پسند تھے۔ یہ دونوں روایتیں ساتھ ساتھ چلیں۔ اس کے بعد یہ دور ختم ہوتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی بھی دور کے خاتمے پر یا اس کے آغاز میں بڑا شاعر پیدا ہوتا ہے۔ اس عہد کے خاتمے پر پیدا ہوئے غالب۔ انہوں نے سارے دور کا خلاصہ کر دیا۔ اس روایت کا جو تقریباً دو سو سال سے چل رہی تھی۔ ایک طرح سے غالب میں اس کا خلاصہ ملتا ہے۔ غالب کی شعری روایت کے تین پہلو ہیں ایک تو ماضی کے بارے میں' ماضی کتنا اچھا ہے' اس کا حسن اس کی خوبصورتی۔ وہ تہذیب جس سے وہ واقف تھے اور وہ ان کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی' ایک طریقے سے اس کا مرثیہ غالب نے لکھا۔ ان کی شاعری کا دوسرا پہلو ہے حال' اس میں تباہی' بے سروسامانی اور اُداسی کا مضمون ہے۔ تیسرا پہلو ہے مستقبل' اس میں امید بھی ہے اور خوف بھی۔ ایک کیفیت ہے کہ پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے؟

نصرت: زبان کے حوالے سے روایت کا تعین کس طرح ہوگا؟

فیض: جہاں تک زبان کا تعلق ہے کچھ تو غالب نے کوشش کی فارسی کے ساتھ جو ہمارا رشتہ تھا اس کو تازہ کرنے کی اور اس کی وجہ سے نئے استعارے نئی تشبیہیں' نیا طرز بیان غالب نے متعارف کروایا۔ اس کے بعد انگریزوں کا عہد ہے۔ انگریزوں نے باقاعدہ مدرسے بنائے' ایک کلکتے میں اور ایک دہلی میں اور ان کی مدد سے انہوں نے یہ کوشش کی کہ لوگ روایت سے ہٹ کر یعنی جو انگریزی شاعری ہے اس کی تقلید میں یا اس کے نمونوں پر شاعری کریں۔ چنانچہ حالی اور آزاد سے کہا گیا کہ وہ بجائے ان مضامین کے جو پچھلے شاعر لکھتے آئے ہیں یعنی کچھ دل کی باتیں' کچھ گردوپیش کی باتیں' ان سب کی بجائے روزمرہ کی باتیں لکھیں۔ نیچرل شاعری' سوشل شاعری مثلاً بیوہ کی فریاد' برسات کا موسم' سردیوں کا موسم وغیرہ۔ یہ بالکل سطحی سی بات تھی۔ یہ ایک ایسی شاعری تھی جو لوگوں کے دل کو نہیں لگتی تھی۔ واردات قلب سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انہیں نہ سردی سے دلچسپی تھی اور نہ برسات سے۔ نتیجے کے طور پر یہ شاعری جو کہ انگریزوں کی نقل میں شروع کی گئی تھی' تھوڑے دنوں میں ختم ہوگئی لیکن اس شاعری کا ایک پہلو اور تھا۔ ملک کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی جھلک بھی شاعری میں آنے لگی اور اسی سے نئی شاعری کا آغاز ہوا۔

نصرت: اس دور کا سب سے بڑا شاعر آپ کے خیال میں کون ہے اور نئی شاعری کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے؟

فیض: اس دور کے سب سے بڑے شاعر یقیناً اقبال ہیں جو اس دور کے آخر میں آتے ہیں۔ دیکھیں نا ہر دور میں شاعر جو ہے وہ نہ صرف حالات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ کسی حد تک ایک طبقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ طبقہ جو سب سے زیادہ بااثر ہوتا ہے۔ اس طبقے کے خیالات' اس کے مضامین' اس کی ذہنیت' شاعری میں داخل ہوتی ہے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے یہ طبقہ امرا' روسا اور نوابوں کا طبقہ تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی مڈل کلاس آگئی۔ اگلی شاعری جو ہے اقبال تک اسی متوسط طبقے کی شاعری ہے۔ ان میں ایک نیا سیاسی شعور پیدا ہوا۔ قومیت کا جذبہ' آزادی کا جذبہ۔ اور اس زمانے میں جو انگریزی شاعری کی تقلید ہوئی ہے وہ سطحی اس لیے بھی تھی کہ بیشتر شعراء انگریزی سے تقریباً ناواقف تھے' لیکن بعد میں لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی' مغرب سے پڑھ لکھ کر آئے' انہوں نے غور وفکر اور مطالعے کے بعد انگریزی کو اور انگریزوں کے شاعرانہ میتھڈز Methods کو اپنالیا اور پھر یہ نئی شاعری پیدا ہوئی۔

نصرت: اس عہد کو بجا طور پر تجربوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ذہنی اور فکری تجربوں کے علاوہ ہیئتی تجربے بھی ہوئے۔ حالی اور آزاد سے شروع ہو کر ان تجربوں کی وضاحت کس طرح ہو سکتی ہے۔؟

فیض: شروع شروع میں تو محض نقالی ہوئی۔ 1935ء کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں نے انگریزی شاعری کو سمجھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ان میں سے کون سے تجربات ایسے ہیں جو ہماری زبان کی روح میں ڈھل سکتے ہیں۔ انہیں ہم اپنی شاعری میں سمو کر بیان کر سکتے ہیں۔ اس ادراک کے بعد تخلیقی تجربات شروع ہوئے اس سے پہلے کے تجربات محض تقلیدی تھے۔ تخلیقی تجربے کرنے والوں میں ن۔م۔راشد اور میرا جی ہیں۔

نصرت: تقلیدی تجربہ کرنے والوں میں کچھ نام.....؟

فیض: حالی اور آزاد کے علاوہ ان میں شرر بھی ہیں' اسماعیل میرٹھی بھی اور ان کے علاوہ کئی اور.....

نصرت: آپ کے خیال میں شاعری میں نئے تجربے

ہونے چاہئیں یا اپنی صحت مند کلاسیکی روایت کی توسیع کرتے رہنا چاہیے؟

فیض: کوئی بھی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس میں روایت کا جوہر' اس کی روح' نہ ہو۔ یعنی تجربے کی مثال تو ایسی ہی ہے جیسے ایک ننھا سا بیج ایک قد آور درخت بنے اور اس کے لیے مناسب زمین اور موسم کے علاوہ اس کی جڑ کے پھیلنے اور پھولنے کی گنجائش ہو' مناسب مقدار میں پانی دستیاب ہو' کوئی تجربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک اس میں جان نہ ہو۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے' وہ اس وقت تک نہیں چلتی جب تک وہ بدلتے موسموں کا خیال نہ رکھے۔ نئے تقاضے' نئے تجربوں کی بنیاد بنتے ہیں' اگر یہ تقاضے پورے نہ ہوں تو پیڑ پھلتا پھولتا کہاں ہے' مرجھا جاتا ہے۔

نصرت: ایک ذاتی سوال۔ آپ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کن شاعروں کا اثر قبول کیا؟

فیض: جب شاعری شروع کی تو اس وقت کے جو بھی مشہور شاعر تھے ان کا اثر آیا۔ مثلاً: اختر شیرانی' حسرت موہانی۔

نصرت: جوش ملیح آبادی؟

فیض: جوش کا اتنا اثر ہم پر نہیں تھا۔

نصرت: علامہ اقبال کا؟

فیض: یوں تو اس عہد میں پورے علاقے پر اقبال کا اثر تھا' مگر جہاں تک براہ راست میرا تعلق ہے وہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا اور اس زمانے میں عام طور سے ہر شاعر رومانی شاعری کرتا رہا ہے' اس لیے اس زمانے کے جو رومانی شاعر تھے' اختر شیرانی' حسرت موہانی' حفیظ جالندھری ان کا اثر مقابلتاً زیادہ تھا اور ظاہر ہے کہ انگریزی کے ساتھ بھی لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں انگریزی کے بھی مشہور شاعر کیٹس اور شیلے تھے' انہیں کا رواج تھا' ان کا بھی اثر تھا۔ پھر کالج میں ہمارے سینئر راشد تھے اور راشد اس وقت شاید اختر شیرانی کے شاگرد تھے یا ان سے قریب تھے۔ ان کی دوستی کی وجہ سے ان کا بھی اثر تھا۔ گھر کے ماحول کے پیش نظر فارسی شاعری کا اثر بھی تھا۔ اسکول اور کالج میں عربی پڑھی اس لیے عربی شعراء سے بھی تھوڑی سی واقفیت تھی۔

نصرت: اور پنجابی؟ آپ نے پنجابی شاعری بھی تو کی ہے۔؟

فیض: یہ تو ابھی کی بات ہے۔ کسی نے چیلنج کر دیا تھا کہ پنجابی میں شاعری کر کے دکھائیں۔ ہم نے کہا کہ اچھا دکھا دیتے ہیں پنجابی میں بھی لکھ کے۔

نصرت: پنجابی کے حوالے سے آپ نے پنجابی زبان کو کیسا پایا؟

فیض: پنجابی کی خاص بات یہ ہے کہ بہت سے مضامین ایسے ہیں جو کہ صرف پنجابی میں لکھے جا سکتے ہیں۔ آپ انہیں اردو میں نہیں لکھ سکتے۔

نصرت: آپ کا اشارہ عوامی شاعری کی طرف ہے۔

فیض: جی ہاں۔ عوامی شاعری اردو میں ہو ہی نہیں سکتی۔

نصرت: آپ کے اس بیان پر کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ آپ نے ایسا کہہ کر اردو کو صدمہ پہنچایا ہے۔

فیض: میرا خیال ہے کہ اس میں صدمے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی برا پہلو نہیں ہے اس میں۔ ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اردو جو ہے وہ شہری زبان ہے' وہ گاؤں میں بولی ہی نہیں جاتی۔ کسی بھی علاقے کے دیہات میں اردو نہیں بولی جاتی۔ آپ دہلی سے چند میل باہر چلے جائیں' وہاں لوگ اردو نہیں بولتے۔ لکھنؤ سے تین چار میل باہر چلے جائیں وہاں بھی اردو نہیں بولی جاتی۔ وہاں کی زبان اگر ہے تو کہیں کھڑی بولی تو کہیں برج۔ آپ انہیں عوامی بولی کہہ سکتے ہیں' مگر اردو نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے کہ وہ اردو کی ادبی زبان نہیں ہے؟

فیض: جی ہاں۔ اس پس منظر میں میں کہتا ہوں کہ اردو خالص شہری زبان ہے۔ وہ دیہات میں کہیں بھی نہیں بولی جاتی۔

نصرت: آپ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ اگر آپ کوشش کریں تو غالب جیسا شعر کہہ سکتے ہیں مگر بلھے شاہ یا وارث شاہ جیسا نہیں۔

فیض: بالکل نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ بڑا شاعر غالب بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پنجابی محاوروں پر ہمیں اتنا عبور نہیں جتنا اردو محاورے کی کلاسیکی روایت پر ہے۔ ہمارے ذہن اور دماغ کی ساخت اب کچھ ایسی ہو چکی ہے جو صرف اردو شاعری کے لیے موزوں ہے۔

نصرت: تو پھر آپ نے پنجابی شاعری کی طرف کیوں رجوع کیا۔؟

فیض: جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ بعض مضامین ایسے ہیں جو صرف پنجابی میں لکھے جا سکتے ہیں' اگر آپ کسی کسان کے لیے شعر کہنا چاہیں تو وہ پنجابی میں کہا جا سکتا ہے' اردو میں نہیں۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے پنجاب کے کسان کیلئے؟

فیض: جی ہاں۔ پنجاب کے کسان کے لیے' لیکن یوپی کے کسان کے لیے بھی آپ اردو میں نہیں لکھ سکتے' وہ کھڑی بولی میں لکھنا پڑے گا۔

نصرت: آپ نے اپنی شاعری میں کس طرح کے تجربات کیے؟

فیض: بھئی وہ تجربہ تو شعر خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔

نصرت: آپ کی بیشتر شاعری نظریاتی شاعری ہے' کیا

آپ کے خیال میں "نظریہ" سامنے رکھ کر اچھا شعر کہا جاسکتا ہے؟

فیض: میرا ایک نظریہ ہے، مگر نظریے کو سامنے رکھ کر انسان شاعری نہیں کرتا۔ وہ نظریہ شاعری کا جزو بن جاتا ہے بلکہ آدمی کی اپنی ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ اسے سامنے رکھ کر لکھنے کا سوال نہیں اٹھتا۔ شاعری ایک مضمون سامنے رکھ کر نہیں کی جاتی بلکہ وہ مضمون جب شاعر کی واردات قلب، اس کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے، جبھی وہ شعر کے روپ میں ڈھلتا ہے۔

نصرت: اس سے یہ سمجھا جائے کہ کوئی ایسا شاعر نہیں ہے جو محض ایک مخصوص نظریے کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے؟

فیض: کیوں نہیں، ہیں ایسے بھی شاعر ہیں جو کہ نظریے کو شعر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نصرت: ایک عام خیال ہے کہ جو بھی ترقی پسند شعرا تھے وہ سب نظریاتی شاعری کرتے تھے۔

فیض: نظریاتی شاعری سارے ہی شعراء کرتے ہیں۔ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی نظریہ تو ہوتا ہی ہے۔ خالی الذہن تو کوئی نہیں ہوتا۔ نظریے کا مطلب یہی تو ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو کس زاویے سے دیکھتا ہے اور کیسا پاتا ہے!

نصرت: ترقی پسند تحریک اور غیر ترقی پسند تحریک کے شعرا میں آپ کے نزدیک بنیادی فرق کیا ہے؟

فیض: ترقی پسند تحریک کے شاعروں اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو، معاشرے کی تاریخ کو اور معاشرے کے مستقبل کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں، لیکن یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند شعرا کو عاشقانہ شعر لکھنے کی ممانعت ہے یا ان پر قید لگادی گئی ہے کہ وہ فلاں مضمون پر نہیں لکھ سکتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعر کوشش کرتا ہے کہ آج کی دنیا کی جو بھی حقیقت ہے اس کو دیانت داری سے پیش کرے۔ اس میں ہر طرح کے تجربے کی آزادی ہے، اس میں ذاتی عاشقی بھی شامل ہے، اس میں سیاسی مسلک بھی شامل ہے، سیاسی جدوجہد بھی شامل ہے، اس میں ڈھول، دھوپ، چاندنی، زمین، آسمان، بھوک، مفلسی غرض سب کچھ شامل ہے۔ شاعر سب چیزوں کا احاطہ کر کے شعر کہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ اس میں سے یہ نکال دو اور فلاں شامل کرلو۔ اس میں سے عاشقی نکال دو اور فلاں چیز شامل کرلو۔

نصرت: آپ نے "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" جیسی نظمیں لکھ کر عاشقی کو شاعری سے نکال نہیں دیا گیا؟

فیض: (ہلکی سی ہنسی) نہیں ہم نے بالکل نہیں نکالا۔ یہ کہنا بھی تو ایک طرح سے عاشقی کا اعتراف ہے۔ بات صرف اہمیت کی آجاتی ہے۔ کب، کس وقت، کون سے مسائل اہم ہیں اور کون سے غیر اہم، مگر شامل تو سبھی ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے اخبار کی مثال لے لیجئے۔ یوں تو دنیا بھر کی خبریں ہوتی ہیں، بیشتر اخباروں کے پاس ساری خبریں آبھی جاتی ہیں، مگر سب خبریں تو نہیں چھپتیں۔ پہلا انتخاب تو یہ ہوتا ہے کہ کون سی خبریں چھپیں گی اور کون سی نہیں، اس کے بعد پھر یہ تعین ہوتا ہے کہ کس خبر کے لیے کتنی بڑی سرخی ہو۔ ہم اس کو پہلے صفحے پر چھاپیں گے یا پانچویں صفحہ پر، یہی شاعری میں بھی ہوتا ہے۔ بعض چیزیں آپ کو اہم نظر آتی ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کو آپ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، لیکن جو بھی سچی چیز ہے، جو بھی سچا تجربہ ہے اس کو تو آپ بہر صورت بیان کریں گے خواہ وہ عاشقی ہے، خواہ وہ چاندنی رات ہے، خواہ وہ خوبصورت مکان ہے، خواہ وہ ایک خوبصورت شکل ہے۔ اگر آپ کا تجربہ سچا ہے تو آپ اسے بیان کریں گے، مگر ہاں اس کو اتنی اہمیت نہیں دیں گے کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے دنیا میں۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے، اس کی خوبصورتی اپنی جگہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ کون سی بڑی چیز ہے، کس کی اہمیت زیادہ ہے اور یہی احساس شاعری میں ترتیب اور اہمیت بن کر ابھرتا ہے۔

نصرت: جب کوئی مضمون آپ کے ذہن میں آتا ہے تو آپ کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تجربے کو، لسانیات کو یا آہنگ کو؟

فیض: بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی شعر کہتا ہے تو مختلف اوقات میں مختلف طریقے سے شعر وارد ہوتا ہے۔

نصرت: آپ کے ذہن میں پہلے کیا آتا ہے پہلے دھن یا امیج؟

فیض: میرے خیال میں پہلے ذہن میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے اور تب یہ سوچتے ہیں کہ اس خلش کو الفاظ کا جامہ کیسے پہنایا جائے۔ کبھی ایک دھن ذہن میں آجاتی ہے تو کبھی ایک امیج۔ الفاظ سے پہلے امیج آتا ہے جیسے ایک نظم کے بارے میں میں نے لکھا تھا۔ "زنداں کی ایک شام۔"

نصرت: جی ہاں۔ بہت خوبصورت نظم ہے۔

فیض: میں نے اس کا تجزیہ کیا تھا۔ لندن میں سب سے پہلے شام کو جب ستارے نکلتے ہیں تو ان کے گچھے نظر آتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس امیج کو لفظوں میں کیسے ڈھالا جائے۔ بہت سوچ کر خیال آیا کہ اس کو شام کے پیچ وخم سے تعبیر کیا جائے اور مصرع ہوگیا۔

زینہ زینہ اتر رہی ہے رات

اتنی بات ذہن میں آ گئی تو بحر بھی آ گئی' وزن بھی آ گیا۔ پھر کوشش کی کہ اس کو آگے بڑھایا جائے تو پھر قافیہ بھی ذہن میں آ گیا۔ رات کا قافیہ ہے پھر سوچا کہ اس کا پیٹرن کیا ہو۔ دو تین مصرعے ہو گئے تو پیٹرن بھی بن گیا۔

نصرت: کچھ الفاظ آپ کی شاعری میں بار بار آتے ہیں۔ مثلاً طوق و سلاسل' بہار' دار و رسن' زنداں' موسم اور بہت سے دوسرے الفاظ۔ کیا یہ الفاظ لاشعوری طور پر آپ کی شاعری کا نمایاں جزو بن جاتے ہیں یا پھر شعوری طور پر آپ انہیں استعمال کرتے ہیں؟

فیض: بالکل شعوری طور پر۔

نصرت: میرا مطلب تھا کہ جس طرح کچھ حرکات و سکنات لاشعوری طور پر ہماری شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں' کیا اسی طرح کچھ الفاظ بھی غیر محسوس طور پر ہمارے اظہار کا پیکر بن جاتے ہیں۔؟

فیض: شاعری میں عادتاً آدمی کچھ بھی نہیں کرتا۔ شاعری میں آپ سب کچھ شعوری طور پر کرتے ہیں۔ بار بار اگر کوئی لفظ آپ کی شاعری میں آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ تجربہ آپ کو بار بار ہوتا ہے۔ دار و رسن۔ ظاہر ہے کہ جب سے ہمارا ملک بنا ہے' دار و رسن کے علاوہ کچھ پیدا ہی نہیں ہوا ہے یہاں۔

نصرت: آپ ان کے علاوہ بھی تو کچھ متبادل الفاظ استعمال کر سکتے تھے؟

فیض: ٹھیک ہے۔ متبادل الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے' مگر ان کے معنی تو یہی ہوتے۔ قفس بھی استعمال ہوتا ہے' زنداں بھی استعمال ہوتا ہے' مقتل بھی استعمال ہوتا ہے' مگر تجربہ تو ایک ہی ہے نا۔ میرا خیال ہے زنداں اور قفس بھی تقریباً اتنی ہی بار آیا ہوگا جتنی بار دار و رسن۔ یہ تو سننے کی بات ہے۔ یہ تو ایک کیفیت ہے' یعنی دار و رسن کی' زنداں کی' قفس کی' مقتل اور دشت و صحرا کی۔ اس کے مقابلے میں بہار' چمن' گلستاں وغیرہ اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف وہ۔ ظاہر ہے دونوں تجربات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں' اس لیے یہ الفاظ بار بار آتے ہیں۔

نصرت: آپ کی شاعری کا مخصوص آہنگ ہے۔ یہ تکرار ایک طرح سے آپ کی پہچان بھی ہے اور اس کو ایک خوبی سے تعبیر کیا جاتا ہے' مگر جب یہی تکرار ہمیں مجاز میں نظر آتی ہے تو وہ عیب بن جاتی ہے۔ ایسا کیوں؟

فیض: مجاز کی شاعری تو بہت مختصر ہے۔ اس کو وقت ہی نہیں ملا۔ میں نہیں سمجھتا کہ الفاظ کی تکرار سے کوئی خامی نظر آتی ہے مجاز میں۔ بات یہ ہے کہ اس میں پھیلاؤ نہیں ہے کیونکہ ان کی شاعری کی عمر بہت کم رہی۔ انھوں نے جب شاعری شروع کی ان کا پہلا مجموعہ "آہنگ" شائع ہوا جو چار پانچ سال پر محیط ہے۔ اس کے بعد انہیں وقت نہیں ملا۔ کچھ ان کے ذاتی حالات اس قسم کے ہو گئے کہ وہ زیادہ نہیں لکھ پائے اور نتیجے کے طور پر ان کی شاعری اپنی پختگی کو پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی' لیکن جتنی بھی ہے ان کی شاعری وہ بہت خوبصورت ہے۔

نصرت: سردار جعفری کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ وہ صرف ایک انقلابی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ماحول کے خلاف ردِ عمل ہے۔ کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ نرے انقلابی شاعر ہیں یا ان کی شاعری میں اس کے علاوہ بھی کوئی جہت ہے؟

فیض: نہیں ایسا نہیں ہے۔ شروع شروع میں تو انہوں نے صرف انقلابی شاعری کی' بعد میں ان کی شاعری میں بہت تبدیلی آئی ہے۔

نصرت: ان کی آج کی شاعری پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کے رنگ میں شعر کہہ رہے ہیں۔

فیض: ہمارا رنگ تو اب ایک عام رنگ بن گیا ہے' محض ہمارا نہیں رہا۔ دوسرے کوئی بھی رنگ کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یوں ہے کہ وقت کے ساتھ ایک محاورہ' ایک خاص قسم کی نہج' ایک خاص قسم کا استعارہ مقبول ہو جاتا ہے' جس سے اس عہد کا مزاج بنتا ہے۔ کسی نے اس کو پہلے اختیار کر لیا اور بعد میں وہی رنگ عام ہو گیا۔

نصرت: مگر اب تو بہت سے لوگ آپ کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں۔ آپ کے انداز کو اپنا رہے ہیں۔

فیض: میں نے عرض کیا نا جب کسی عہد کو محاورہ یا استعارہ مل جاتا ہے اور لوگ شاعر کے محسوسات' اس کی ذہنی واردات' کسی محاورے یا آہنگ کو اپنی ضرورت کے مطابق پاتے ہیں تو اس کو زیادہ استعمال کرنے لگتے ہیں اور پھر ایک خاص انداز کی شاعری ہونے لگتی ہے۔

نصرت: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنے ایک مضمون میں فن کو شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ شخصیت سے گریز کا نام دیا ہے۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

فیض: نہیں۔ شخصیت کا فن سے فرار یا گریز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ غالباً ٹی۔ ایس ایلیٹ کے ذہن میں جو بات تھی وہ یہ تھی کہ اگر انسان صرف اپنے داخلی تجربات پر انحصار کرے تو وہ بات اتنی پرسنل' اتنی ذاتی ہو جائے گی کہ کسی دوسرے کو اس میں دلچسپی نہیں ہوگی۔ دوسرے لوگ کسی تجربے میں

دلچسپی اس وقت لے سکتے ہیں جب وہ خود اس میں شریک ہو سکیں۔ اس اعتبار سے آپ اپنی ذات کو الگ رکھ کر کوشش کریں گے کہ آپ کی ذات کا وہ حصہ جس میں دوسرے بھی شریک ہو سکیں اس کا اظہار کریں۔ اور وہ حصہ جو صرف آپ کی ذاتی بات ہے جس سے دوسروں کو کوئی علاقہ نہیں اس کو الگ رکھیں۔

نصرت: مگر آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ آج کے جدید شعرا تو صرف ذاتی شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا محور ان کے بڑے ذاتی قسم کے داخلی تجربات ہیں۔

فیض: دیکھیے نا انسان کی ذات اپنے ماحول' اپنے معاشرے سے الگ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہمارا جو معاشرہ ہے' جو اس کے مسائل ہیں ان سے کوئی بھی شخص اپنی ذات کو بالکل الگ تو نہیں کر سکتا۔ ایسا ناممکن ہے' اگر کوشش کر کے بالفرض آپ اپنی ذات کو دنیا اور معاشرے سے الگ کر بھی لیں تو پھر آپ کا وجود باقی دنیا والوں کے لیے مہمل ہو جائے گا۔ اگر آپ کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے اور آپ اس کا ذکر کریں تو دوسرا کسی حد تک اسے محسوس کر سکتا ہے کہ کانٹا چبھنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے' لیکن اگر آپ ساری تفصیل بیان کرنے بیٹھ جائیں کہ کانٹا کس طرح چبھا' کس زمین سے چبھا' کس وقت چبھا' تو اس سے دوسروں کا کیا واسطہ۔ شاعری اس حد تک تو انفرادی ہے کہ آپ اپنے پیر کے کانٹے کا ذکر کر رہے ہیں' لیکن اس تجربے میں اور لوگوں کا تجربہ بھی شامل ہونا چاہیے کہ وہ اس میں داخل ہو سکیں تو اس میں کوئی کنٹراڈکشن نہیں ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ہر آدمی کی ذات کے تین سرکل ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی ذات' ایک اس کا معاشرہ اور ایک ساری دنیا جو اس کی ہم عصر ہے۔ جتنا اس کی نظر کا دائرہ وسیع ہو گا' جتنی دور تک وہ دیکھ سکے' اتنی بڑی اس کی شاعری ہو گی۔ جتنا چھوٹا دائرہ ہو گا اتنی چھوٹی اس کی شاعری ہو گی۔ یہ تسلیم کہ سب کچھ اس کی نظر دیکھتی ہے۔ آدمی دیکھتا تو اپنی نظر سے ہی ہے' مگر اہم یہ ہے کہ اس کی نظر جاتی کہاں تک ہے۔ اگر کسی کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تو پھر نظر سے کیا ہو گا۔!

نصرت: کچھ لوگ اپنی ذات کے حوالے سے مذہب کو دیکھتے ہیں۔

فیض: بڑی خوشی سے دیکھیں مگر جب ان کو کچھ نظر آئے گا جبھی تو دیکھیں گے' اہم چیز دیکھنے والی نظر ہے' وہ کیا دیکھتا ہے بعد کی بات ہے۔

نصرت: نئی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: وہ سب ایک طرح کے تو ہیں نہیں' طرح طرح کے شاعر ہیں۔ ان میں سے کچھ اچھے شاعر ہیں اور کچھ برے شاعر ہیں۔ سب کو ایک لاٹھی سے تو نہیں ہانکا جا سکتا۔

نصرت: میرا اشارہ ہندوستان کے جدید شعرا کی طرف تھا۔ باقی' کمار پاشی' بلراج کومل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی' محمد علوی اور شہریار ہیں۔

فیض: (ہنس کر) بھائی میں کسی شاعر سے لڑائی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آج کے جتنے بھی شاعر ہیں' ان سب کو ایک خانے میں تو رکھا نہیں جا سکتا۔ نئی نسل میں جو بھی شاعری شروع کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آگے جائے گا اور دوسرا راستے میں رہ جائے گا۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں چکنے پات ہیں' اس میں امکان نظر آتا ہے' بعض میں امکان نظر نہیں آتا' لیکن کسی کے بارے میں یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بڑا شاعر بنے گا' یہ شاعر نہیں بنے گا۔ اس لیے نوجوان شاعروں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

نصرت: آزاد شاعری میں ایک اہم اور معتبر نام ن۔م راشد کا ہے' انہوں نے بہت خوبصورت نظمیں لکھی ہیں' ان کی شاعری کو آپ اردو کی ادبی روایت میں اضافے سے تعبیر کرتے ہیں یا محض ایک تجربے کا نام دیتے ہیں۔

فیض: راشد کی شاعری کے مختلف پہلو ہیں اور اس کے مختلف دور ہیں۔ ان کی شاعری یقیناً ایک اضافہ ہے۔ ان کی بہت سی شاعری تندرست شاعری ہے محض تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے اب وہ ہماری روایت میں شامل ہیں۔

نصرت: اگر ایسا ہے تو ان کی شاعری آپ کی شاعری کے مقابلے میں کم درجے کی کیوں تصور کی جاتی ہے اور اس کے علاوہ آپ کی تقلید زیادہ کیوں ہوتی ہے اور ان کی تقلید مقابلتاً کم کیوں؟

فیض: اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راشد یہاں آئے نہیں' زیادہ تر باہر رہے۔

نصرت: مگر ان کے شعری مجموعے تو آئے۔

فیض: ہاں لیکن زیادہ عرصہ انہوں نے پردیس میں گزارا' اس لیے ان کا رابطہ نہیں رہا' یہاں کے لوگوں کے مذاق کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو بعد کی شاعری ہے وہ عام پڑھنے والوں کے لیے اتنی مشکل ہے' اتنی مبہم ہے کہ وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ اس کو سمجھنے کے لیے' اس سے لطف اٹھانے کے لیے بہت سا مطالعہ کرنا چاہیے' بہت سی کتابیں پڑھنی چاہئیں' تھوڑی فارسی بھی آنی چاہیے' تھوڑی سی انگریزی بھی آنی چاہیے۔ اس طرح انہوں نے اپنے پڑھنے والوں سے فاصلہ بڑھا لیا۔ لوگ ان تک نہیں پہنچ

پائے اور نہ وہ ان تک۔

نصرت: ن۔م راشد کی شاعری کے بارے میں کچھ اور بتائیں۔

فیض: (کچھ سوچ کر) راشد بہت اچھے شاعر تھے' بہت تہہ دار شاعر تھے' اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بہت سے ہیئتی تجربے کیے' مگر اس زبان میں کیے جس سے بیشتر لوگ مانوس نہیں تھے۔ تجربے کی حد تک تو لوگوں نے انہیں مان لیا' لیکن زبان اور خیالات کے حوالے سے وہ لوگوں تک ٹھیک سے نہیں پہنچ سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ عرصے تک ملک سے باہر رہے۔

نصرت: اب میرا جی کے بارے میں۔ انہوں نے جو اردو میں گیت لکھے ہیں کیا وہ اردو گیت کی روایت میں ایک توسیع ہیں یا محض ایک تجربہ؟

فیض: تجربہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے' مگر گیت ہمارے یہاں کوئی نیا تجربہ تو نہیں تھے۔ یہ تو پہلے سے لکھے جا رہے تھے امیر خسرو سے لے کر آج تک۔ ہاں بیچ میں ایک ایسا دور آیا تھا جب لوگ گیت نہیں لکھتے تھے۔ گیت نظیر اکبر آبادی سے زیادہ کس نے لکھے ہیں۔

نصرت: عظمت اللہ خاں بھی ہیں۔

فیض: جی ہاں عظمت اللہ خاں نے بھی گیت لکھے ہیں' حفیظ جالندھری نے لکھے ہیں۔ گیت کا رواج میرا جی کی دین تو نہیں ہے۔ وہ تو حفیظ کے بعد آئے ہیں اس لیے گیت میرا جی کی ایجاد نہیں ہیں۔ اگر آج کے عہد میں کسی کو موجد مانیں تو وہ حفیظ جالندھری ہیں۔

نصرت: آزاد غزل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض: آزاد غزل کوئی چیز نہیں ہے۔

نصرت: آپ نے کوئی تجربہ کیا ہے اس ضمن میں؟

فیض: جب یہ کوئی چیز ہی نہیں ہے تو پھر تجربہ کہاں سے کرتا۔ آزاد غزل ایک مہمل چیز ہے۔ جس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ غزل ایک فارم کا نام ہے' اس میں آزادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر آپ اس میں آزادی برتیں گے تو یہ کوئی اور چیز ہو جائے گی غزل کہاں رہے گی۔

نصرت: آپ کا مطلب ہے کہ غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا؟

فیض: کیوں نہیں ہو سکتا۔ غزل میں تو بے شمار تجربے ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ غزل کے اندر رہ کر غالب نے تجربے کیے۔ استعارے کے' تشبیہوں کے' خیالات کے۔ سب سے بڑے تجربات اقبال نے کیے مگر غزل کی فارم میں رہ کر اس میں فلسفہ' حکمت اور باقی چیزیں لائے۔ غزل کی فارم سے الگ ہو کر غزل میں کوئی تجربہ نہیں ہو سکتا وہ تو کوئی اور چیز ہو جائے گی۔

نصرت: ترقی پسند شعرا کے فوراً بعد کچھ شاعروں نے میر کے رنگ کو اپنایا مثلاً ناصر کاظمی' مجید امجد' مختار صدیقی وغیرہ۔ کیا ان کی شاعری کا روایت میں کوئی مقام ہے؟

فیض: روایت میں ان کا مقام نہیں ہے۔ ان کا مقام جدید شاعری میں ہے۔ آج کے شاعر کا روایت میں کیا مقام ہے یہ آج کہنا مشکل ہے۔

نصرت: حالی اور آزاد کی روایت کے بارے میں کیا خیال ہے؟

فیض: اگر ان کی کوئی روایت تھی تو وہ انہیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس کو آج کوئی روایت نہیں مانتا وہ تو کوئی چیز نہیں تھی۔

نصرت: ایک نیا سٹائل تو ملا' نئے تجربے تو ہوئے۔

فیض: ان کی اہمیت ہے' مگر وہ اہمیت ان اصولوں کی ہے جو انہوں نے اپنی شاعری اور تنقید میں بیان کیے۔ شاعری محض الفاظ کی خانہ پری نہیں ہے۔ اس میں حقیقت کا اظہار ہونا چاہیے۔ ان کی شاعری جو انگریزی نمونوں پر تھی وہ زیادہ اہم نہیں ہے' مگر جو انہوں نے اصول بیان کیے' انہوں نے جو شاعری کا مذاق بنایا' وہ بعد میں یقیناً نئی روایت کی بنیاد بنا۔

نصرت: عام طور سے یہ خیال ہے کہ آپ کی وہ شاعری جو آپ نے درِ زنداں کے پیچھے کی ہے' وہ بہت خوب صورت ہے اگر آپ کو یہ تسلیم ہے تو اس کی کوئی بنیادی وجہ؟

فیض: زنداں میں ظاہر ہے فرصت زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی تراش خراش زیادہ کر سکتا ہے۔ عام دنوں میں دوسری مصروفیات کے باعث آدمی کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ شعر پر اتنی توجہ دے سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیل میں ایک خاص قسم کا بوجھ ہوتا ہے ذہن پر۔ ان دنوں ساری توجہ شعر پر مرکوز ہوتی ہے اور اس وقت آدمی جو شعر کہتا ہے تو یہ لگتا ہے جیسے نیا عشق کر لیا ہے کسی سے۔

نصرت: ایک بات اور۔ آپ نے اپنی بیشتر نظموں میں غزل کے آہنگ' غزل کے لب و لہجے کو اپنایا ہے حالانکہ نظم کا اپنا لب و لہجہ ہے' اپنا آہنگ ہے' اس کی کوئی خاص وجہ؟

فیض: اس لیے بھائی کہ ہم کو آتا یہی ہے۔ ہماری زبان کا مزاج بھی یہی ہے۔ شاعری کی لغت بدلنے کے لیے بہت بڑا شاعر چاہیے۔ نظیر اکبر آبادی نے کوشش کی تھی' اس کے بعد کسی نے آج تک کوشش نہیں کی۔

نصرت: نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟

فیض: بہت بڑی شاعری ہے۔ وہ اتنا بڑا شاعر تھا کہ اس نے شاعری کی زبان بدلنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔ بعد میں کئی بڑے شاعر ہوئے۔ مثلاً غالب' اقبال انہوں نے تکنیک بدلی' مضامین بدلے' خیالات بدلے مگر لغت نہیں بدلی۔ ہم نے بھی وہی لغت استعمال کی اس لیے کہ کچھ اور ہمارے ذہن میں آیا ہی نہیں۔

نصرت: مگر آپ کے عہد میں تو بہت سے نئے تجربے ہوئے اور خاص طور سے آپ کو تو انگریزی ادب پر بھی عبور ہے تو پھر آپ نے روایتی انداز کیوں اپنایا؟

فیض: (ہنسی) بس یوں سمجھ لو کہ ہم کو یہی اچھا لگا۔

نصرت: اگر آپ اجازت دیں تو ایک درخواست کی جسارت کروں۔ اپنے تازہ کلام میں سے کچھ سنائیں۔ آپ کے جو پرانے مجموعے ہیں۔ نقش فریادی' دست صبا' زنداں نامہ' دست تہہ سنگ۔ ان کے بارے میں تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے' مگر آپ کی جو تازہ کتابیں آئی ہیں۔ سر وادیٔ سینا' شام شہر یاراں' میرے دل میرے مسافر' ان کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ سنائیں یا ان کے بعد کی کوئی نظم سنائیں۔

فیض: ٹھیک ہے۔ ایک چھوٹی سی نظم سن لیں۔

نصرت: ارشاد:

فیض:

آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر تیرے خیال کے پھول
ترک الفت کے دشت سے چن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول
تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے
باندھ کر آرزو کے پلڑے میں
ہجر کی رات اور وصال کے پھول

نصرت: بہت خوب۔ بہت پیاری نظم ہے جی۔ اس سے پہلے کہ میں آپ سے اجازت لوں کچھ ہندوستانی شعرا کے بارے میں کہیں۔ آپ نے تو ان کو پڑھا ہی ہوگا۔

فیض: ہم تک کچھ زیادہ پہنچا نہیں۔

نصرت: دو سال پہلے تو آپ ہندوستان تشریف لے گئے تھے تب تو کچھ پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہو گا؟

فیض: عام طور سے مشاعروں میں سننے کا موقع ملتا ہے۔ مشاعرے میں جب آدمی شاعر کو سنے تو وہ اس وقت کا فیشن ہوتا ہے۔ جب تک اس کو پڑھے نہیں تو ٹھیک سے رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

نصرت: آپ کچھ شعری مجموعے تو ساتھ لائے ہوں گے' نئے لوگوں میں جیسے کمار پاشی ہیں اور.....

فیض: ہاں کمار پاشی اچھے ہیں' شہریار اچھے ہیں' پرانے لوگوں میں اختر الایمان ہیں' خلیل الرحمن اعظمی ہیں' وحید اختر ہیں سب اچھے ہیں۔

نصرت: اختر الایمان کی شاعری کے بارے میں کچھ فرمائیں۔

فیض: اختر الایمان بہت اچھا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جب کوئی نئی کتاب آتی ہے تو وہ یہاں ملتی نہیں۔ ان کے علاوہ علی سردار جعفری بھی اچھے ہیں۔ کیفی اعظمی بھی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہاں کے شعرا اور وہاں کے شعرا میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے۔

نصرت: میرے خیال میں تو فرق ہے۔ میں نے یہاں کی شاعری کو عوام کے زیادہ نزدیک پایا۔

فیض: (ہلکی سی ہنسی) ہاں تھوڑا سا فرق ہے مگر زیادہ نہیں ہے۔

نصرت: مگر یہ فرق کیوں ہے؟

فیض: اس لیے کہ ہم سب لوگ دیہات کے قریب ہیں۔ ہم تو دیہاتی لوگ ہیں۔ یہاں زیادہ بڑے شہر نہیں ہیں۔ بس تین چار ہیں۔ ہندوستان میں تو بڑے شہر بہت زیادہ ہیں۔ بمبئی ہے۔ دلی ہے۔ کلکتہ ہے۔ اس لیے وہاں کے شاعر زیادہ شہری ہیں۔

نصرت: فراق کے بارے میں کچھ بتائیں۔ انہوں نے اردو شاعری کو کیا دیا ہے؟

فیض: اتنے بڑے شاعر کے بارے میں کیا بات کریں۔

نصرت: اردو شاعری کی روایت میں فراق کا بھی تو ایک مقام ہے۔ اس پس منظر میں کچھ فرمائیں۔

فیض: اردو شاعری کی روایت کے دو بڑے ستون میر اور سودا ہیں۔ میر کی جو روایت تھی اس کے بڑے نمائندہ شاعر فراق تھے۔ اور سودا کی جو روایت تھی اس کے بڑے شاعر جوش تھے۔ یہ دونوں روایتیں اردو ادب میں ساتھ ساتھ چلی آئی ہیں۔

نصرت: میرے پاس وہ لفظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں آپ نے میرے بکھرے بکھرے سوالوں کا جواب اس قدر سکون سے دیا اور اتنا بہت سا وقت دیا۔

☆☆☆

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا

اپنی بہترویں سالگرہ پر فیضؔ کا انٹرویو

حسن رضوی: آج ہم نے روزنامہ جنگ لاہور کی جانب سے جناب فیض احمد فیض کو زحمت دی ہے۔ فیض صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ادبی اعتبار سے وہ منفرد شخصیت کے حامل ہیں اور پاکستان کی بین الاقوامی شناخت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ گفتگو فرمانے کے لیے ہم نے اردو ادب کی چند معتبر شخصیات کو بھی مدعو کیا ہے' میری مراد جناب صفدر میر' جناب اشفاق احمد' جناب قتیل شفائی' جناب فارغ بخاری' پروفیسر جیلانی کامران' سعادت سعید اور اجمل نیازی سے ہے۔ ہماری گفتگو کا موضوع ان کی شخصیت' فن اور نظریہ ہے۔ میں سب سے پہلے جناب صفدر میر صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

صفدر میر: فیض صاحب آپ اپنے حالیہ تجربات کے بارے میں کچھ بتائیں۔ لبنان پر اسرائیلی جارحیت کے دوران آپ بھی تو بیروت میں تھے۔

فیض احمد فیض: لبنان کے بیشتر واقعات اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے آپ تک پہنچ چکے ہیں میں ان میں زیادہ اضافہ نہیں کر سکتا۔ اسرائیلی جارحیت تو پہلے سے متوقع تھی۔ کس طریقے سے ہوگی' کب ہوگی؟ اس کے بارے میں کسی کو ٹھیک سے اطلاع نہیں تھی۔ میرا خیال یہی تھا کہ اسرائیلی اپنی لڑائی کو جنوبی لبنان تک محدود رکھیں گے۔ اس سے آگے نہیں آئیں گے۔ اس کی ایک وجہ تو عالمی رائے عامہ کا دباؤ تھا اور دوسری یہ کہ لبنان کی حکومت کے تعلقات فلسطینیوں کے ساتھ بھی ہیں اور مغربی طاقتوں کے ساتھ بھی' سو خیال تھا کہ اسرائیل ان امور کا لحاظ رکھے گا' پھر یہ خیال تھا کہ غالباً وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ اس قدر بے لحاظی سے نہیں کریں گے۔ ان کی کارروائی محدود ہوگی۔

صفدر میر: اس حملے کی کوئی فوری وجہ بھی تھی۔؟

فیض احمد فیض: جب پہلے دن بیروت پر ہوائی حملہ ہوا تھا چھ جون کو' جس میں ایک ہزار سے زیادہ جانیں ضائع ہوئی تھیں تو اس کا انہوں نے عذر یہ پیش کیا تھا کہ اسرائیل کے مقبوضہ علاقے میں ان کا اپنا آدمی بچھی ہوئی بارودی سرنگ سے مارا گیا تھا اور یہ کہ چونکہ ان کے ایک سفیر پر لندن میں گولی چلائی گئی تھی جس کا پتہ نہیں کس نے چلائی تھی۔ اس وجہ سے وہ انتقامی کارروائی کر رہے ہیں۔ اس ہوائی حملے سے پہلے بین الاقوامی سطح پر فائر بندی کا معاہدہ تو موجود تھا۔ اس حملے کے بعد اگلے دن چونکہ کوئی اور حملہ نہیں ہوا تو ہم یہ سمجھے کہ غالباً انتقامی کارروائی کے طور پر انہوں نے یہ حملہ کیا ہے۔ اس حملے کا نشانہ وہ علاقہ تھا جہاں پی ایل او کے دفاتر تھے۔ آٹھ تاریخ کو اسرائیل نے لبنان میں اپنی فوجیں اتار دیں اور اس کے بعد ہر روز مسلسل دو تین گھنٹے کے بعد کبھی صبح' کبھی شام اسرائیل کی طرف سے ہوائی حملے ہوتے رہے' بم باری ہوتی رہی اور شہر تباہ ہوتا رہا۔ وہ صرف پی ایل او کے دفاتر پر ہی حملے نہیں کرتے تھے ان کے علاوہ شہری آبادی پر بھی بم پھینکتے تھے۔ یہ ان کی دہشت اور ہراس پھیلانے کی حکمت عملی تھی۔ انکا یہ بھی مطالبہ تھا کہ پی ایل او ہتھیار ڈال دے تو ہم کارروائی بند کر دیں گے۔ پی ایل او کا جواب تھا ''ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے آخری دم تک لڑیں گے۔'' جنوبی لبنان میں جہاں فلسطینیوں کے کیمپ ہیں وہاں کچھ دیہات ہیں اسرائیلیوں کو ان دیہات میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے ان کیمپوں اور دیہات کا چاروں طرف سے محاصرہ کر کے ان پر مسلسل بم باری کی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں پر مقیم لوگ بھاگ جائیں یا مر جائیں یا بالکل وہاں پر کوئی نہ رہے اس وقت وہ وہاں داخل ہوں۔ یہی انہوں نے کیا۔ دو ہفتے تک فلسطینیوں کی طرف سے مقابلہ ہوتا رہا۔ شام نے تو تیسرے ہی دن فائر بندی کر لی تھی۔ فلسطینیوں کا حوصلہ اور جرأت قابل داد تھی۔ ایمبولینس' گاڑیاں' ہسپتال' سکول' مسلسل اسرائیلی بم باری کی زد میں رہے۔ فلسطینیوں کے ثقافتی اور فلاحی مراکز بھی اس

وحشیانہ بمباری سے متاثر ہوئے جہاں فلسطینی قیادت کے لوگ تھے خصوصاً یاسر عرفات ایک گلی سے دوسری گلی' ایک مکان سے دوسرے مکان تک اپنے ٹھکانے بدلتے رہے مگر بم باری ان کا تعاقب کرتی رہی۔

سعادت سعید: فیض صاحب! اس دوران میں فلسطینیوں کا مورال کیسا تھا۔

فیض احمد فیض: ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اس دوران میں کھانے پینے کی اشیا ملتی رہیں' ضروریات زندگی اور ادویات کی دکانیں کھلی رہیں۔ ان حالات میں جس قسم کا ہراس اور خوف ہوتا ہے وہاں اس کا شائبہ تک بھی نہیں تھا۔ دو ہفتے کے بعد فلپ حبیب اور دیگر تصفیہ کروانے والے وہاں پہنچے' انہوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا اور فلسطینیوں سے کہا کہ آپ شہر خالی کر دیں اور شرط یہ لگائی کہ پہلے ہتھیار ڈال دیں اور اس کے بعد انہیں وہاں سے باہر نکلنے کا پروانہ راہداری دے دیا جائے گا۔ یاسر عرفات نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ایک ہفتے تک یہ معاملہ چلتا رہا پھر مجھے کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا لیکن اس وقت تک یہ معاملہ شروع ہو چکا تھا۔

صفدر میر: آپ کے ٹھکانے پر بھی بم باری ہوئی؟

فیض احمد فیض: ہمارے دفتر کا تو تیسرے دن ہی قصہ تمام ہو گیا تھا لیکن میں ایک دن پہلے ہی وہاں سے کہیں اور منتقل ہو گیا تھا۔

حسن رضوی: فیض صاحب یہ فرمایئے اس سارے عرصے میں مسلم ممالک کا کیا رول رہا؟

فیض احمد فیض: ان کا کوئی کردار نہیں رہا۔ انہوں نے تو اس سارے عرصے میں قرارداد پیش کرنا تک گوارا نہیں کیا۔

اشفاق احمد: اسرائیل نے جن بستیوں کے گرد گھیرا ڈالا تھا وہاں ان کا بھی کوئی جانی نقصان ہوا تھا؟

فیض احمد فیض: جی ہاں انہیں شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ اسرائیلیوں کے ساتھ تیسرا یا چوتھا معرکہ تھا۔ پہلی لڑائی 1948ء میں ہوئی جب اسرائیل بنا اس وقت تین ممالک اردن' شام اور مصر کی فوجیں ان کے خلاف صف آرا تھیں مگر تین یا چار دن کے بعد ان ممالک کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ دوسری لڑائی 1967ء میں ہوئی وہ کوئی سات دن چلی پھر 1973ء میں لڑائی ہوئی یہ سب جنگیں فوجوں اور حکومتوں کے ساتھ تھیں۔ موجودہ لڑائی صرف فلسطینی رضاکاروں نے لڑی جن کے پاس نہ حکومت' نہ پیسہ' نہ جدید ترین اسلحہ لیکن اس کے باوجود گزشتہ تینوں جنگوں میں اسرائیلیوں کا اتنا جانی نقصان نہیں ہوا جتنا کہ موجودہ جنگ کے تین ہفتوں میں ہوا۔

فارغ بخاری: اس جنگ کے ضمن میں ہم آپ کے تاثرات بھی جاننا چاہیں گے۔

فیض احمد فیض: اس زمانے میں تین باتیں کھل کے سامنے آئیں ایک تو یہ کہ اسرائیلی جو اپنے آپ کو تعلیم یافتہ' مہذب اور نہایت عالم فاضل لوگ سمجھتے تھے ان کی بربریت نے نازیوں کو بھی مات کر دیا۔ دوسرا جو اس وقت دونوں میں تصفیہ کروانے والا فریق امریکہ تھا' اس کی دہری پالیسی بھی سامنے آئی۔ تیسری ہمارے بھائی بند اسلامی ممالک کی بے عملی اور بے حسی بھی سب پر عیاں ہوئی۔

قتیل شفائی: ایران کا اس سلسلے میں کیا کردار رہا؟

فیض احمد فیض: ایرانی تو براہ راست امداد اسی طرح سے کر سکتے تھے کہ وہ شام کے راستے سے لبنان پہنچیں لیکن ان کو وہاں پہنچنے ہی نہیں دیا گیا۔

عوامی سطح پر مختلف ممالک سے رضاکار وہاں پہنچے۔ پاکستان سے بھی گئے' بنگلہ دیش سے بھی گئے' کئی لوگ وہاں شہید بھی ہوئے۔

صفدر میر: لیکن حکومتوں کی طرف سے نہیں گئے؟

فیض احمد فیض: عوام کی طرف سے دنیا بھر میں مظاہرے بھی ہوئے اور لوگوں نے جو کچھ ان سے ہو سکتا تھا وہ کیا۔

حسن رضوی: ایران میں تو حکومتی سطح پر فلسطینیوں کی امداد کا اعلان کیا گیا تھا۔

فیض احمد فیض: جی ہاں وہ حکومت کی طرف سے تھا۔

جیلانی کامران: فلسطینیوں نے بڑی بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا ہے۔

فیض احمد فیض: چوتھی بات جو اس سلسلے میں واضح طور پر سامنے آئی وہ فلسطینیوں کا عزم' ان کی شجاعت اور ان کا نا قابل تسخیر ہونا۔

اجمل نیازی: جنگ تو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اب جو کچھ متوقع ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فیض احمد فیض: فلسطینی جھوٹی ضمانتوں پر یقین کر کے جب وہاں سے نکلے تو ان سے یہی کہا گیا کہ ان کی باقی رہ جانے والی آبادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن تحریری اور زبانی ضمانتوں پہ تکیہ کر کے وہ وہاں سے جلاوطن ہوئے تو اس کے بعد آپ نے اخبارات میں دیکھا ہوگا کہ جب یاسر عرفات کے ساتھ آخری طائفہ نکلا تو کسی امریکن نے یاسر عرفات سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے تو انہوں نے کہا۔ "ہم فلسطین جائیں گے۔" ایک بات میں کہنا بھول گیا تھا کہ اس سارے عرصے میں ایک دن بھی فلسطینیوں کا ریڈیو بند نہیں ہوا' ایک دن بھی اخبار بند نہیں ہوا۔ فلسطینیوں کے اہتمام اور

انتظام کی ہم داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جس گھر میں ہم تھے اس کے سامنے فلسطین کے مشہور شاعر معین بسیسو بھی رہتے تھے۔ میں دو تین ہفتے ان کے ساتھ رہا' ان کی چودہ پندرہ برس کی بچی اور ساتھ ہمسایوں کی تیرہ چودہ برس کی بچیاں سب نرسیں بن کر ہسپتال میں چلی گئی تھیں۔ جتنے چودہ پندرہ برس سے زیادہ عمر کے بچے تھے وہ سب محاذوں پر چلے گئے تھے' باہر سے بھی فلسطینی طالب علم جنگ میں حصہ لینے کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے اور ہمارے دن وہاں اس طرح گزرے کہ پیرس سے محمود درویش وہاں پہنچ گئے۔ وہ' معین بسیسو اور میں دو تین ہفتے اکٹھے رہے۔ ان کا رابطہ بدستور قائم تھا اس کے باوجود کہ رستے بھی بند تھے اور سڑکوں پہ بھی گولیاں چل رہی تھیں' بم بھی پھٹتے تھے۔ نہ تو فلسطینیوں کے انتظامی ڈھانچے میں کوئی فرق آیا نہ ان کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی میں کوئی رکاوٹ پیش آئی۔

صفدر میر: میری دانست میں لبنان کی یہ جنگ بین الاقوامی تعلقات کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس سے افریقی' ایشیائی ممالک اور ہماری اپنی زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جس قسم کی لڑائی وہاں ہوئی ہے ممکن ہے اسی قسم کی لڑائی بہت سے دیگر اسلامی' افریقی اور ایشیائی ممالک میں ہو۔ اس تناظر میں آپ اپنی پچھلی زندگی اور شاعری پر نظر دوڑا کر ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کیا سوچتے ہیں کہ افریقی اور ایشیائی ملکوں کے ادب میں اس وقت کس قسم کی تحریک کی ضرورت ہے کیونکہ 1937ء' 1938ء سے جب سے ہم آپ کی شاعری پڑھ رہے ہیں اس وقت بھی آپ کا ایک منفرد انداز موجود تھا جو آج تک قائم ہے۔ اس سے بہت سی نئی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں' اب جو زمانہ آگیا ہے اس میں آپ اردو ادب کے بارے میں اپنی رائے دیں کہ اس کو کون سی نئی جہت عطا کی جا سکتی ہے۔؟

فیض احمد فیض: اصل میں کسی کے کہنے سے ادب کو ڈائرکشن نہیں ملتی نہ ہی دی جا سکتی ہے۔ ڈائرکشن حالات سے اور حالات کو سمجھنے سے ملتی ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلتے ہیں اور لکھنے والوں میں ان کا شعور پیدا ہوتا ہے اور اس شعور سے جس قسم کا وہ سبق حاصل کرتے ہیں اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ان کے فن و ادب پر ہوتا ہے۔ افریقہ کو لے لیجیے ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ ہم سوائے انگریزی اور امریکی ادب کے دنیا کے دوسرے علاقوں کے ادب سے واقفیت ہی پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ افریقہ یا لاطینی امریکہ میں بڑے لکھنے والے ہیں۔ کینیا' نائیجیریا' جنوبی افریقہ' نمیبیا' انگولا' نکاراگوئے اور دوسرے ممالک کے ادب کو سامنے رکھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈائرکشن وہاں کے حالات نے پیدا کی ہے۔ یا فلسطینیوں ہی کے ادب کو لے لیجیے وہاں کے شاعر اور ادیب۔ مثلاً محمود درویش ہیں' جو حالات وہاں موجود تھے اور ان حالات کے جو محرکات تھے ان کو کس جذبے' دیانت اور فنی قدرت کے ساتھ انہوں نے پیش کیا ہے' وہی صورت دوسرے ممالک کے ادیبوں کے پیش نظر ہونی چاہیے۔ دونوں ہی باتیں ہوتی ہیں ادب ایک عیاشی کا طریقہ بھی ہے۔ اس کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے' وہ بھی ایک عنصر ہے اور دوسرا عنصر یہ ہے کہ محض عیاشی تو ادب کے ذریعے سے حاصل نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں اس میں ڈائرکشن ضروری ہے۔

سعادت سعید: ادب میں ڈائرکشن کی بات ہو رہی ہے 1936ء میں بھی تو یہ مسئلہ اٹھا تھا۔ ترقی پسندوں نے ان دنوں خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

فیض احمد فیض: ترقی پسندی کی اصطلاح کی بھی کئی تاویلیں ہیں۔ مختلف لوگوں کے ذہنوں میں اس کے مختلف معانی ہیں ہمارے ذہن میں ترقی پسندی کا تصور یہ ہے کہ اول جو زندگی کے حقائق ہیں اور جو گرد و پیش کے ماحول کے تقاضے ہیں ادیب اور شاعر کو ان کا تھوڑا بہت شعور اور ادراک ضرور ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بارے میں دو طرح کے فرار کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ ایک تو بے مقصد خواب سازی سے گریز کرنا چاہیے کہ حالات کو سمجھے بغیر ایسے خواب بیان کرنے شروع کر دیے جائیں کہ اب سحر ہونے والی ہے اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے جو مشکلات اور مسائل ہیں ان سے گریز کرنا بھی درست نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ چونکہ مشکلات ہیں' مسائل ہیں اس وجہ سے مفرور ہونا' بھاگ جانا یہ کہنا کہ اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا یہ بھی درست نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ دو دنیائیں ہیں ایک خارجی دنیا ہے جو آپ کا گرد و پیش ہے۔ ایک داخلی دنیا ہے جو آپ کا ذہن ہے۔ آپ دونوں دنیاؤں کے حسن اور بدصورتیوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں اچھی باتیں بھی ہیں اور وہ باتیں بھی ہیں جو آپ کو ناپسند ہیں۔ ان میں سے کسی سے گریز کرنا درست نہیں ہے۔ ترقی پسندی کے صحیح معانی تو یہ ہیں کہ جو بھی اس وقت آپ کے سامنے حقیقت ہے اس کی اس قسم کی تاویل نہ کیجیے کہ اس کی اچھی باتیں سامنے آئیں اور بری باتیں سامنے نہ آئیں۔ جو حسن ہے وہ بھی بیان کرنا چاہیے جو بدصورتی ہے اسے بھی

جانا، اظہار ملنا چاہیے۔ جو امید ہے وہ امید بھی رکھنی چاہیے' جو مایوسی ہے اس کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے' جو غم ہے اسے بھی بیان میں آنا چاہیے اور جو اداسی ہے اس کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ زندگی کی ادب میں اوور سمپلیفیکیشن درست نہیں ہے۔ یہ پیچیدہ چیز ہے۔

فارغ بخاری: فیض صاحب: فلسطینیوں کے ساتھ اردن کے ارباب بست وکشاد کا جو سلوک رہا ہے اس کے بارے میں بھی کچھ فرمایئے۔

فیض احمد فیض: ان میں لچک بہت ہے اور انہیں جیسی بھی صورت حال درپیش ہے وہ اس کے مطابق چل رہے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ان کے ساتھ ایک زمانے میں اردن نے بھی ظلم کیا' ان کے ساتھ شامیوں نے بھی ظلم کیا' ان کو اور لوگوں نے بھی دغا دی' انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے سٹرٹیجی اور دوسرا ہے ٹیکٹکس......

تو وہ بنیادی اصول ٹیکٹکس جو آپ کے سامنے ہے اس پر قائم رہنا چاہیے۔ جہاں تک منظر کا یا حکمت عملی کا تقاضا ہے اس میں جیسے بھی حالات ہوں اور صورت حال کا جیسا بھی تقاضا ہو اس کے مطابق آدمی کو عمل کرنا چاہیے۔ فلسطینی ایک بات پر تو قائم ہیں کہ انہیں فلسطین اپنا گھر ہر قیمت پر چاہیے۔ آخری دم تک جب تک ایک بھی فلسطینی باقی ہے اس وقت تک انہیں لڑتے رہنا ہے۔ اس لڑائی میں آج حریف کون ہے اور کل حلیف کون اس کے مطابق انہیں عمل کرنا ہے۔

جیلانی کامران: موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ فلسطینی لبنان سے چلے گئے ہیں اور ایک طرح بکھر گئے ہیں اور لبنان میں اسرائیلی فوجیں داخل ہو گئی ہیں اور وہاں ہیں۔ مسلمانوں کی جانب سے لبنان میں اسرائیلی داخلے پر کوئی مثبت احتجاج نہیں ہوا اور کسی مسلم ملک نے ان کو روکا نہیں۔ اس طرح ایک تکلیف دہ احساس یہ پیدا ہوا ہے کہ ایک بین الاقوامی اصول قائم ہو گیا ہے کہ کسی بھی ملک میں' کسی بھی وقت کسی دوسرے ملک کی فوجیں داخل ہو سکتی ہیں۔ ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں یہ پہلے ہی بہت پریشان کن حالات سے دوچار ہے اور جس طرح کے سیاسی منطقے یہاں قائم ہو چکے ہیں ان میں بہت گنجائش ہے کہ اس اصول کی روشنی میں کسی دوسری جگہ بھی ایسا تجربہ ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کمزور اور پس ماندہ اقوام اور عوام کے لیے آپ کیا تجویز کرتے ہیں کہ وہ کس قسم کی ذہنی تربیت حاصل کریں کہ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہو سکیں۔؟

فیض احمد فیض: اس کی مثال تو فلسطینیوں نے قائم کر دی ہے' فلسطینی جن کے پاس نہ کوئی گھر نہ حکومت ہے۔ تو باقی کمزور اور پس ماندہ ممالک بڑی طاقتوں کو روکنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ الجزائر نے فرانس کو ہرا دیا' ویت نام نے امریکہ کو لیکن خیر ان کا تو اپنا گھر تھا وہ لڑ رہے تھے۔ فلسطینیوں کے پاس ان کا گھر بھی نہیں ہے اور حکومت بھی نہیں' سبق تو انہوں نے دیا ہے۔

جیلانی کامران: فلسطینی غیر علاقوں میں رہ کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ فیصلہ تو بالکل کسی بڑی طاقت کے ہاتھ میں آ جاتا ہے جب تک بڑی طاقتوں کا دبدبہ موجود ہے نقشے تو ان کی مرضی سے بنیں گے اور یہ کمزور قومیں صرف اپنا خون ہی دے سکتی ہیں اور تاریخ میں کئی ایسے قبیلے ہوئے ہیں جو بالآخر ناپید ہو گئے ہیں۔

فیض احمد فیض: دیکھئے نا امریکہ سے بڑی سپر پاور تو اور کوئی نہیں ہے ویت نام سے اس کی فوجیں نکل گئی ہیں۔

اشفاق احمد: اس کے مماثل یہ بھی تو ہے کہ افغانستان سے بھی روس کی فوجیں نکل جائیں۔

فیض احمد فیض: ظاہر ہے۔ بات تو یہ ہے کہ لڑائی میں فریق اول لڑنے والا انسان ہے جیسے کہ فلسطینی کہتے ہیں۔

Palastine is no longer a state,

it is a state of mind.

جب تک ایک بھی فلسطینی باقی ہے فلسطین باقی ہے' یہ ٹھیک ہے کہ آزادی کی جنگ میں جانیں بھی قربان کرنی پڑتی ہیں۔ بعض اوقات قومیں مٹ بھی جاتی ہیں' ان کا نام رہ جاتا ہے اس نام کی وجہ سے اوروں کو سہارا ملتا ہے' اوروں کو اس سے تقویت ملتی ہے۔

اجمل نیازی: فیض صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ دنیا سے سپر پاورز کی عمل داری ختم ہو جائے اور تیسری دنیا کے غریب ممالک فتح یاب ہوں۔

فیض احمد فیض: جس کو ہم تیسری دنیا کہتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ سپر پاورز کی دست نگر ہو اور ان سے قرضے بھی مانگے اور ان سے ہتھیار طلب کرے انہیں چاہیے کہ غیر جانب دار ممالک کی تحریک میں شامل ہوں اور سپر پاورز پہ انحصار نہ کریں۔ داخلی طور پر ایسا نظام تشکیل دیں جس میں سپر پاورز کی مداخلت نہ ہو سکے۔ یہ جذبے تنظیم اور نظام کی وجہ سے ہو سکتا ہے ایسا جذبہ تنظیم اور نظام جو دوسروں کی محتاجی نہ سکھائے۔

حسن رضوی: فلسطین کی جدوجہد کے بارے میں پاکستانی ادیبوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایک طرف تو فلسطین کی صورت حال پر ادیبوں نے زور دیا ہے اور دوسری طرف گزشتہ کئی سال سے افغانستان کی صورت حال پر کچھ ادیب چپ

سادھے ہوئے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔؟

فیض احمد فیض: میں تو نہیں سمجھتا کہ چپ سادھے ہوئے ہیں۔ فلسطین اور افغانستان کی صورت حال بہت مختلف ہے۔ افغانستان میں ایک حکومت یا اس کا طبقہ ہے اور ایک ان کے مخالف۔ دونوں طبقوں کے حامی موجود ہیں' دونوں طبقوں نے اپنے اپنے حامیوں سے امداد طلب کی چنانچہ بے چارے عام افغانی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ اس مسئلے کا سیاسی تصفیہ ہوتا کہ کسی طریقے سے افغانستان کے عوام کو دونوں طرف سے جو کشت وخون ہو رہا ہے اس سے نجات دلائی جائے۔

اشفاق احمد: روس میں بھی کسی طبقے میں ایسا احساس موجود ہے کہ افغانستان کے مسئلے کا سیاسی تصفیہ ہونا چاہیے۔

فیض احمد فیض: سب یہی کہتے ہیں۔ روسی بھی یہی کہتے ہیں' ہم بھی یہی کہتے ہیں لیکن اب تصفیہ کیسے ہو؟

اجمل نیازی: پچھلے دنوں ہمارے ہاں افغانستان کی صورت حال پر نظمیں اور افسانے لکھے گئے ہیں کیا یہ ادب آپ کی نظر سے گزرا ہے۔؟

فیض احمد فیض: ضرور گزرا ہو گا۔ یقینی طور پر لوگوں نے اس مسئلے کو جس طریقے سے محسوس کیا ہو گا اس کا اظہار ہوا ہو گا۔ فلسطینی مسئلہ تو افغانستان سے مختلف ہے۔ افغانستان بطور ملک موجود ہے اور اس کے عوام بھی۔ فلسطینی بے گھر ہیں' بے یار و مددگار۔ ان کی صورت حال بہت مختلف ہے۔ ٹھیک ہے افغانستان میں روسی فوجیں موجود ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ جن کو مجاہدین کہتے ہیں وہ یہاں ہیں اور ایران میں ہیں۔ ان کے حامی بھی موجود ہیں۔ تصفیے کی کیا صورت ہو' یہ قصہ چل رہا ہے۔

جیلانی کامران: روس کی فوجوں کے افغانستان میں آ جانے سے روسی اثر گرم سمندروں کے قریب تر آ گیا ہے اور کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ روس اب نظریاتی ریاست نہیں رہا امپیریلسٹ ہو گیا ہے اور وہ اپنی سرحدوں کی توسیع چاہتا ہے کیا ہمیں یہ سوچنا چاہیے۔؟

فیض احمد فیض: اس میں مشکل یہ آ جاتی ہے کہ لوگ پہلے سے جس طرح سوچ رہے ہوتے ہیں اس کی تصدیق چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں وہ کسی قسم کی ترمیم کریں۔ امپیریلزم کا قصہ یہ ہے کہ امپیریلزم یہ نہیں ہوتا کہ محض کسی ملک کو فتح کیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک کے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ سامراجی ممالک نے نہ صرف دوسرے ممالک پر قبضہ کیا بلکہ ان ملکوں کی معیشت' ذرائع پیداوار اور دوسری چیزوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا' ان کا استحصال کیا۔ اب سوویت یونین کا جہاں جہاں بھی اثر ہے مثال کے طور پر یورپ ہے یا ویت نام اور انگولا ہے وہ بجائے اس کے کہ وہاں کے ذرائع کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرے اس نے انہیں امداد پہنچانے کی کوشش کی۔ کسی ملک میں اندرونی داخلی انقلاب کی وجہ سے اگر سوشلسٹ حکومت قائم ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہ ان ملکوں سے کچھ حاصل کرے انہیں کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس کو تو امپیریلزم نہیں کہتے۔ افغانستان کا مسئلہ ذرا مختلف ہے' وہ اس وجہ سے کہ وہ ان کا ہمسایہ ملک ہے اور جو بھی دنیا کی اس وقت صورت حال ہے کہ امریکہ نے اور ریگن نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ ہم سوشلزم کو ختم کر دیں گے۔

We will throw them into a dustbin of a street.

اس صورت حال میں کچھ مصلحتیں بھی ہوتی ہیں جو بعض اوقات اصول سے بالاتر ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ہر ملک کے لیے اپنے تحفظ کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی ملک یہ نہیں چاہتا کہ ان کے دروازے پہ ان کی مخالف کوئی اس قسم کی حکومت قائم ہو جائے جس سے انہیں خطرہ ہو۔ امریکہ نے پانچ ہزار میل جا کر کبھی ویت نام سے ٹکر لی کبھی کوریا سے۔ افغانستان تو روس کے دروازے پہ ہے۔ افغانستان سے ہمارے جذباتی رشتے بھی ہیں اور مذہبی رشتے بھی۔ ان کے معاملے میں ہمارا جذباتی ہونا صحیح بھی ہے اور قابل فہم بھی ہے۔ افغانی عوام کی دو طرفہ پٹائی ہو رہی ہے۔

اشفاق احمد: فیض صاحب آپ افغانستان کے عوام کی صورت حال کے حوالے سے ذاتی طور پر کیا محسوس کرتے ہیں۔؟

فیض احمد فیض: افغانستان سے میرے خاندانی رشتے بھی ہیں۔ صورت حال وہاں کی یہ ہے کہ وہ ایشیا کا سب سے پس ماندہ ملک ہے۔ جس میں بہت سی آبادی ایسی ہے۔ جس نے اپنی ساری زندگی میں نہ موٹر کار دیکھی ہے نہ ریل دیکھی ہے اور نہ انہوں نے زیادہ علم پڑھا ہے۔ ایک قبائلی اور شاہی نظام وہاں پہ ہمیشہ سے مسلط رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں سب سے زیادہ ناخواندہ' مفلس اور پس ماندہ ملک وہی ہے اور ان کی جس طریقے سے ذہنی تربیت کی گئی ہے کہ اپنے سردار کی فرماں برداری کرو' اپنے پیر اور اپنے ملا کے ہاتھ چومو' اس کی زیارت کرو' اب کچھ تو جوان کہتے ہیں کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے' یہ نظام بدلنا چاہیے' کچھ اور ہونا چاہیے۔ کچھ ان میں سے باہر سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں' کچھ ایسے ہیں جنہوں نے

عسکری تعلیم روس میں حاصل کی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ اس مسئلے کا تدارک ہونا چاہیے۔ وہ ایک دن سارے ملک پر قبضہ کر لیتے ہیں اور صدیوں سے اپنے نظام سے مشروط لوگ ان کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے۔ یہ پہلی بار نہیں ہے یہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ جب امان اللہ نے اپنی اصلاحات نافذ کرنا چاہیں اس وقت امان اللہ کی مدد کے لیے روسی فوج نہیں آسکتی تھی کیونکہ روس میں خود امن نہیں تھا۔ اگر اس وقت سوویت یونین میں دس سال پہلے انقلاب آیا ہوتا اور وہاں امن و امان درست ہوتا اور امان اللہ اس وقت روس کو اپنی امداد کے لیے بلاتا تو صورت حال مختلف ہوتی۔ امان اللہ کا تختہ کس نے الٹا؟ انگریزوں نے۔ یہاں اس وقت امان اللہ خاں کے حق میں تحریک چلی تھی۔ قندھار چلو' قندھار چلو کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

قتیل شفائی: اس وقت امان اللہ خاں کی حمایت کرنے کا مطلب تھا ملا شور بازار جیسے لوگوں کی نفی کرنا۔

اجمل نیازی: فیض صاحب اسلام کے فعالی کردار کے بارے میں بھی آپ کچھ کہنا پسند کریں گے۔ مذہب کے انقلابی رول پر اظہار خیال فرمائیں۔؟

فیض احمد فیض: ہم تو سمجھتے ہیں کہ دین دنیا میں عوامی فلاح و انقلاب ہی کے لیے آیا تھا۔ جیسا بڑا انقلاب اسلام نے پیدا کیا اس سے بڑا انقلاب بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ دین ایک چیز ہے اور دین کے جو اجارہ دار بن جاتے ہیں وہ دوسری۔ جس نظام میں مختلف قسم کے طبقات ہوتے ہیں اور ہر طبقے کا اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے اس میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ دین عوام کی بھلائی کے لیے اور خلق خدا کی بہبود کے لیے آیا ہے اس کی ترغیب دی جا رہی ہے یا نہیں۔ ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی حمایت کسی بھی دین میں جائز نہیں ہے۔ دین کے صحیح معانی یہی ہیں کہ وہ خلق خدا کی بہتری اور بہبود کے لیے ہے۔

اجمل نیازی: روس میں آپ کے بہت سے دوست ہیں ایک شاعر رسول حمزہ توؤف کے بارے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ آپ ان کی ماں کے لیے قرآن کا تحفہ لے کر گئے تھے۔

فیض احمد فیض: رسول حمزہ توؤف مسلمان تھے اور یہ تحفہ ان کی والدہ کے لیے تھا۔ روس اور مذہب کے تعلق کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ یہ درست ہے کہ انقلاب روس کے ابتدائی سالوں میں کلیسا' زار شاہی' زار پرستوں' نوابوں اور مقامی بادشاہتوں کے ساتھ عوام کی براہ راست جنگ تھی۔ اس وجہ سے شروع شروع میں اس مذہب اور دین کے خلاف جو زار شاہی کا حلیف بن گیا تھا تحریک چلی تھی لیکن اب چونکہ وہ دور گزر گیا ہے وہاں پوری پوری مذہبی آزادی ہے۔

قتیل شفائی: 1967ء میں جب مجھے سوویت یونین جانے کا اتفاق ہوا وہاں میں ایک کیتھیڈرل میں گیا وہاں عبادت ہو رہی تھی پھر جمعہ کا دن تھا جب میں لینن گراڈ پہنچا تو وہاں ایک مسجد میں بہت سے مسلمان جمعہ کی نماز ادا کر رہے تھے۔ ان سے میری گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ یہاں مذہب اور کلیسا کو سرکاری امداد نہیں ملتی۔ لیکن اگر ہم اپنے مذہبی فرائض ادا کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی روکتا نہیں۔

جیلانی کامران: انقلاب کے بعد جو انسان سامنے آیا فیض صاحب' یہ فرمایئے اس کی داخلی زندگی میں کوئی بحران ہے یا نہیں؟

فیض احمد فیض: اس انقلاب سے پہلے سوویت یونین کی ریاستوں میں روحانی' ذہنی اور تعلیمی صورتحال خاصی مخدوش تھی۔ اب ان ساری جمہوریتوں میں 90 سے لے کر 99 فیصد تک لوگ خواندہ ہیں۔ ان کی پہلی بار ذہنی اور داخلی زندگی کے خزائن تک رسائی ہوئی ہے۔ وہاں آپ کسی علاقے میں چلے جائیں مزدور' کسان' دست کار اور کاریگر کو پہلی بار یہ موقع ملا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیبی اور ثقافتی مسائل سے اپنے رابطے قائم کر سکیں۔ وہاں ہر ریاست میں تھیٹر ہیں' بیلے سرکس' پپٹ شو اور سائنسی ادارے ہیں۔ 1958ء میں جب ہم تاجکستان گئے۔ اس کے صدر مقام کو دوشنبے اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہاں دوشنبے کے دن منڈی لگتی تھی۔ وہاں ہمارے میزبان نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم یہاں گیدڑ کا شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ یہاں نہ کوئی مدرسہ تھا نہ کوئی ہسپتال، یہاں کے موچی یہاں کے دانتوں کے ڈاکٹر بھی تھے۔ وہ کیل گرم کر کے دانت نکالا کرتے تھے۔ اب وہاں زندگی کی ہر سہولت موجود ہے۔ طب کی بڑی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں تک داخلی زندگی کا تعلق ہے دیکھنا یہ ہے کہ کس طبقے کی داخلی زندگی سے پہلے اعلیٰ ذہنی تربیت خاص طبقے کے لیے وقف تھی۔

یہ ضرور ہے کہ اس خاص طبقے کو زک ضرور پہنچی کیونکہ ان کو وہ مراعات اب حاصل نہیں رہیں۔ پہلی دفعہ عوام الناس کی ذہنی اور داخلی زندگی کو نشوونما پانے کا موقع ملا ہے۔ اس میں کرائسس کا سوال ہی نہیں ہے۔ طبقہ خواص یا زود حس طبقے کو کبھی کبھار یہ ضرور محسوس ہوا ہے کہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنی زود حسیت کا اظہار کر سکیں۔ یعنی اجتماع سے الگ ہو کر اپنا آئیوری ٹاور بنانے پر قدغن ہے۔

اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کا تعلق حب وطن یا بغض وطن سے نہیں ہے' اس کا تعلق آپ کے نظریے سے ہے کہ آپ کے نزدیک حکومت کیسی ہونی چاہیے اور سیاست کیسی ہونی چاہیے۔ جو آپ سے متفق نہیں ہیں ان کو آپ غیر محب وطن کہہ دیتے ہیں۔ یہ تصور سوائے ہمارے ملک کے اور کہیں رائج نہیں ہے۔ انگلستان میں بہت سے مخالف گروپ ہیں لیکن وہ آپس میں ایک دوسرے کو غیر محب وطن نہیں کہتے۔

فارغ بخاری: آج کل ہر ادبی پرچے میں زیادہ تر مذہبی شاعری دیکھنے میں آرہی ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

فیض احمد فیض: ہر دور میں حکومت کے طریق کار اور حکمت عملی سے بھی لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ حمد اور نعت ہر دور میں کہی گئی ہے۔ ہر دیوان کا آغاز ان سے ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی ظفر علی خاں' علامہ اقبال اور دیگر بڑے شعرا نے مذہبی حوالوں سے شاعری کی ہے۔

اجمل نیازی: ''دست تہہ سنگ'' میں آپ کی ایک نظم حمد کے عنوان سے ہے جس میں زندگی کے متعلق باتیں کی گئی ہیں' کیا اس میں آپ نے زندگی کو خدا سے مربوط کر کے دیکھا ہے۔؟

فیض احمد فیض: زندگی خدا ہی نے پیدا کی ہے۔ ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہیں۔ ان کے حوالے سے نظم لکھنا بھی ایک نوع کی حمد ہے کہ ان کا تعلق خدا سے ہے۔

سعادت سعید: آپ کے تنقیدی مجموعہ ''میزان'' کے بعد بھی لوگ آپ کی تنقید کے منتظر ہیں آپ نے تنقید کے میدان سے کنارہ کشی کیوں کی؟

فیض احمد فیض: کنارہ کشی نہیں کی۔ ''میزان'' میں کچھ تو ریڈیائی تقریریں ہیں۔ اس زمانے میں ریڈیو کے پروگرام پروڈیوسر مرتب نہیں کرتے تھے دانشور ترتیب دیتے تھے۔ سالک' حسرت' ڈاکٹر تاثیر اور ہم بیٹھ کے پروگرام وضع کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کے لیے تقریر لکھنا آج کی طرح نہیں تھا کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی چیز گھسیٹ دی۔ محنت کرنی پڑتی تھی اور ریڈیو کا ادبی اور ذہنی معیار بہت اونچا تھا۔ میرے بیشتر تنقیدی مضامین اس زمانے کے ہیں' پھر دو تین برس ''ادب لطیف'' کی ادارت بھی کی اس کی وجہ سے تنقیدی مضامین لکھنے پڑے۔ اس کے بعد ریڈیو اور رسالے سے رشتہ ٹوٹ گیا اس لیے کہ فوج میں چلے گئے۔ وقت ہی نہیں ملا۔ لوٹ کر آئے تو پاکستان ٹائمز کی ادارت ہمارے حوالے کر دی گئی۔ اب تو وقت بالکل ہی نہیں تھا' پھر جیل خانہ آ گیا' جیل خانے میں تنقید کیا لکھتے، شاعری پر اکتفا کیا۔ بعد میں تنقید کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔

سعادت سعید: 1857ء سے 1936ء تک کے ادب میں اظہار پانے والے تصور انسان سے آپ کس حد تک متفق ہیں۔؟

فیض احمد فیض: وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ کسی طبقے کا فرد ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسانی اور طبقاتی صورت حال بدلتی ہے ویسے ویسے انسان کا تصور بھی بدلتا ہے۔ 1857ء سے قبل یا تو ہمارے ادب میں صوفیا کا تصور انسان تھا یا پھر اس میں جاگیردار' رئیس یا امیر کا تصور ابھرتا نظر آتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد آزادی کی تمناؤں سے معمور انسان کی تصویر بھی نظر آئی۔ 1936ء کی تحریک میں مزدور' کسان اور عام آدمی کے تصور کو ابھارا گیا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی ایک خاص قسم کے انسان کا تصور بھرپور انداز سے سامنے آیا۔

سعادت سعید: جدید شاعری کی تحریک' جیسا کہ کہا جاتا ہے' ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر ابھری۔ آپ راشد' میرا جی اور مختار صدیقی کی شاعری کے تصور انسان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔!

فیض احمد فیض: فرق تصور انسان کا نہیں ہے۔ ترقی پسندوں نے عوام کی بات کو ادب میں لانے پر زور دیا' داخلیت پسندوں نے ادب کو ذاتی مسائل' شعور اور لاشعور کے معاملات تک وقف رکھا اور کہا کہ ہمارے لیے یہی دنیا ہے باقی دنیا سے ہمارا کیا واسطہ۔ یہ فرق اس تصور کا ہے کہ آیا انسان کی اپنی انا اکائی ہے یا کہ معاشرہ ایک اکائی ہے۔ بہت سی باتیں دونوں میں مشترک بھی تھیں۔ راشد سیاسی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ میرا جی قلندر آدمی تھے انہوں نے داخلی مسائل پر توجہ دی۔ جماعتی اور معاشرتی مسائل ترقی پسندوں کے لیے اہم تھے۔

سعادت سعید: نئے شعراء نے راشد اور میرا جی کی جدید اردو نظم کی تحریک سے بھی اختلاف کیا۔ ہم آپ کی رائے نئے شاعروں کے بارے میں بھی جاننا چاہیں گے۔

فیض احمد فیض: ہر شاعری کا واسطہ انسان سے ہوتا ہے۔ شعر کی افادیت اس کے ابلاغ میں ہے۔ نئی شاعری کی تحریک بھی حالات ہی کی پیداوار ہے' ان کے حالات ایسے تھے کہ کوئی اور تجربہ ان کے ذہن سے نہیں گزرا۔ شاعری پر قاری حکم لگاتا ہے کہ اس تک بات پہنچی یا نہیں پہنچی' اگر پہنچی تو اس میں کوئی حسن اور تاثیر نظر آئی یا نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ٹیسٹ تو یہ ہے کہ اس شاعری کو کتنے لوگوں نے قبول کیا یا نہیں قبول کیا۔ اس وجہ سے

اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کا تعلق حب وطن یا بغض وطن سے نہیں ہے' اس کا تعلق آپ کے نظریے سے ہے کہ آپ کے نزدیک حکومت کیسی ہونی چاہیے اور سیاست کیسی ہونی چاہیے۔ جو آپ سے متفق نہیں ہیں ان کو آپ غیر محب وطن کہہ دیتے ہیں۔ یہ تصور سوائے ہمارے ملک کے اور کہیں رائج نہیں ہے۔ انگلستان میں بہت سے مخالف گروپ ہیں لیکن وہ آپس میں ایک دوسرے کو غیر محب وطن نہیں کہتے۔

فارغ بخاری: آج کل ہر ادبی پرچے میں زیادہ تر مذہبی شاعری دیکھنے میں آرہی ہے، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

فیض احمد فیض: ہر دور میں حکومت کے طریق کار اور حکمت عملی سے بھی لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ حمد اور نعت ہر دور میں کہی گئی ہے۔ ہر دیوان کا آغاز ان سے ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی ظفر علی خان' علامہ اقبال اور دیگر بڑے شعرا نے مذہبی حوالوں سے شاعری کی ہے۔

اجمل نیازی: ''دست تہہ سنگ'' میں آپ کی ایک نظم حمد کے عنوان سے ہے جس میں زندگی کے متعلق باتیں کی گئی ہیں' کیا اس میں آپ نے زندگی کو خدا سے مربوط کر کے دیکھا ہے؟

فیض احمد فیض: زندگی خدا ہی نے پیدا کی ہے۔ ساری موجودات خدا ہی کی تخلیق ہیں۔ ان کے حوالے سے نظم لکھنا بھی ایک نوع کی حمد ہے کہ ان کا تعلق خدا سے ہے۔

سعادت سعید: آپ کے تنقیدی مجموعہ ''میزان'' کے بعد بھی لوگ آپ کی تنقید کے منتظر ہیں آپ نے تنقید کے میدان سے کنارہ کشی کیوں کی؟

فیض احمد فیض: کنارہ کشی نہیں کی۔ ''میزان'' میں کچھ تو ریڈیائی تقریریں ہیں۔ اس زمانے میں ریڈیو کے پروگرام پروڈیوسر مرتب نہیں کرتے تھے دانشور ترتیب دیتے تھے۔ سالک' حسرت' ڈاکٹر تاثیر اور ہم بیٹھ کے پروگرام وضع کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کے لیے تقریر لکھنا آج کی طرح نہیں تھا کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی چیز گھسیٹ دی۔ محنت کرنی پڑتی تھی اور ریڈیو کا ادبی اور ذہنی معیار بہت اونچا تھا۔ میرے بیشتر تنقیدی مضامین اس زمانے کے ہیں' پھر دو تین برس ''ادب لطیف'' کی ادارت بھی کی اس کی وجہ سے تنقیدی مضامین لکھنے پڑے۔ اس کے بعد ریڈیو اور رسالے سے رشتہ ٹوٹ گیا اس لیے کہ فوج میں چلے گئے۔ وقت ہی نہیں ملا۔ لوٹ کر آئے تو پاکستان ٹائمز کی ادارت ہمارے حوالے کر دی گئی۔ اب تو وقت بالکل ہی نہیں تھا' پھر جیل خانہ آ گیا' جیل خانے میں تنقید کیا لکھتے، شاعری پر اکتفا کیا۔ بعد میں تنقید کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔

سعادت سعید: 1857ء سے 1936ء تک کے ادب میں اظہار پانے والے تصور انسان سے آپ کس حد تک متفق ہیں۔؟

فیض احمد فیض: وقت کے ساتھ ساتھ انسان کا تصور بھی بدلتا رہتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ کسی طبقے کا فرد ہوتا ہے۔ جیسے جیسے انسانی اور طبقاتی صورت حال بدلتی ہے ویسے ویسے انسان کا تصور بھی بدلتا ہے۔ 1857ء سے قبل یا تو ہمارے ادب میں صوفیا کا تصور انسان تھا یا پھر اس میں جاگیردار' رئیس یا امیر کا تصور ابھرتا نظر آتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد آزادی کی تمناؤں سے معمور انسان کی تصویر بھی نظر آئی۔ 1936ء کی تحریک میں مزدور' کسان اور عام آدمی کے تصور کو ابھارا گیا۔ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی ایک خاص قسم کے انسان کا تصور بھرپور انداز سے سامنے آیا۔

سعادت سعید: جدید شاعری کی تحریک' جیسا کہ کہا جاتا ہے' ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر ابھری۔ آپ راشد' میرا جی اور مختار صدیقی کی شاعری کے تصور انسان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔!

فیض احمد فیض: فرق تصور انسان کا نہیں ہے۔ ترقی پسندوں نے عوام کی بات کو ادب میں لانے پر زور دیا' داخلیت پسندوں نے ادب کو ذاتی مسائل' شعور اور لاشعور کے معاملات تک وقف رکھا اور کہا کہ ہمارے لیے یہی دنیا ہے باقی دنیا سے ہمارا کیا واسطہ۔ یہ فرق اس تصور کا ہے کہ آیا انسان کی اپنی انا اکائی ہے یا کہ معاشرہ ایک اکائی ہے۔ بہت سی باتیں دونوں میں مشترک بھی تھیں۔ راشد سیاسی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ میرا جی قلندر آدمی تھے انہوں نے داخلی مسائل پر توجہ دی۔ جماعتی اور معاشرتی مسائل ترقی پسندوں کے لیے اہم تھے۔

سعادت سعید: نئے شعراء نے راشد اور میرا جی کی جدید اردو نظم کی تحریک سے بھی اختلاف کیا۔ ہم آپ کی رائے نئے شاعروں کے بارے میں بھی جاننا چاہیں گے۔

فیض احمد فیض: ہر شاعری کا واسطہ انسان سے ہوتا ہے۔ شعر کی افادیت اس کے ابلاغ میں ہے۔ نئی شاعری کی تحریک بھی حالات ہی کی پیداوار ہے' ان کے حالات ایسے تھے کہ کوئی اور تجربہ ان کے ذہن سے نہیں گزرا۔ شاعری پر قاری حکم لگاتا ہے کہ اس تک بات پہنچی یا نہیں پہنچی' اگر پہنچی تو اس میں کوئی حسن اور تاثیر نظر آئی یا نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ٹیسٹ تو یہ ہے کہ اس شاعری کو کتنے لوگوں نے قبول کیا یا نہیں قبول کیا۔ اس وجہ سے

قبول نہیں کیا کہ قاری کند ذہن ہے یا اس وجہ سے کہ اس شاعری میں ہی کوئی جھول تھا۔ جب تک شعر میں زندگی کی طرح کوئی نئی کونپلیں نہ پھوٹیں تو بات ضائع ہو جاتی ہے۔ اگر شاعری میں جان ہے تو وہ اپنے آپ کو منوا لے گی۔ یہ خواہش پیدا ہوگی کہ اپنے لاشعور سے نکل کر باقی کائنات سے بھی رشتہ جوڑا جائے۔

اجمل نیازی: آپ سے ایک شکایت کی جاتی ہے کہ آپ نئے شاعروں کو نہیں پڑھتے وہ جو تجربے کر رہے ہیں وہ آپ تک نہیں پہنچتے کیا یہ شکایت بجا ہے۔؟

فیض احمد فیضؔ: بجا ہے' یہ شکایت مجھ سے نہیں کرنی چاہیے، پہنچانے والوں سے کرنی چاہیے۔

سعادت سعید: آپ کو اپنے معاصرین اور نئے ادیبوں کی تحریروں میں کسی نے متاثر کیا ہے۔ کیا آپ حوالہ دے سکتے ہیں۔؟

فیض احمد فیضؔ: مختار صدیقی کے ہم بہت معترف ہیں' ناصر کاظمی کے بھی۔ باقی اور بھی بہت سے نام ہیں۔

سعادت سعید: ہم جاننا چاہیں گے۔

فیض احمد فیضؔ: نام لینے سے میں گھبراتا ہوں کیونکہ جن کا نام رہ جائے گا ان کے ناراض ہونے کا اندیشہ ہے۔

فارغ بخاری: آپ لوگوں کو ناراض کیوں نہیں کرنا چاہتے۔؟

فیض احمد فیضؔ: بھئی اپنا اپنا مزاج ہے۔ اس کے باوجود بھی بہت سے لوگ ہم سے ناراض ہی رہتے ہیں۔

سعادت سعید: کوئی اردو ناول آپ کو پسند آیا ہو۔

فیض احمد فیضؔ: اس ضمن میں ہم ایک ناول کا بہت پراپیگنڈہ کرتے ہیں اور وہ ہے "چاکیواڑہ میں وصال" محمد خالد اختر کا لکھا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے جواب میں کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔ انتظار حسین کا "بستی" بھی بہت پسند ہے۔

سعادت سعید: افسانے کی دنیا میں۔؟

فیض احمد فیضؔ: بھئی اپنے اشفاق احمد ہیں اور بہت سے دوسرے ہیں۔ "اپنا اپنا جہنم" یہ بھی پسند آیا اور بانو قدسیہ کے افسانے بھی۔

حسن رضوی: آپ نے پنجابی شاعری بھی کی۔ پنجابی میں لکھنے کا خیال آپ کے دل میں کیسے پیدا ہوا؟

فیض احمد فیضؔ: میں نے پہلے بھی کہیں یہ کہا تھا کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جن کے اظہار کے لیے پنجابی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اردو میں لوک گیت نہیں لکھے جا سکتے کیونکہ یہ زبان شہری بھی ہے اور اس کا تعلق متوسط طبقے سے بھی ہے۔ اگر آپ عوامی اردو میں کچھ لکھنا چاہیں گے تو وہ اردو کی بجائے کسی علاقے کی مقامی بولی کا روپ اختیار کرلے گی یا وہ کھڑی بولی ہو جائے گی یا پوربی ہو جائے گی یا کسی اور علاقے کی زبان۔

حسن رضوی: آپ نے مرثیے بھی لکھے ہیں ان کی تحریک کا سبب کیا تھا۔؟

فیض احمد فیضؔ: ایک تو موضوع ہی ایسا ہے کہ اس سے ہمارا تعلق بنتا ہے۔ ویسے بھی زیڈ اے بخاری' ہمارے استاد' بھی مرثیے لکھتے تھے، فرمائش بھی ہوئی اور ہم نے مرثیہ لکھا۔ کراچی میں کچھ ماحول اور فضا بھی ایسی میسر آئی کہ مرثیہ لکھنے کی ترغیب پیدا ہوئی۔

سعادت سعید: ان دنوں نثری نظم کا بھی بڑا چرچا ہے آپ اس صنف کے بارے میں کچھ کہنا پسند فرمائیں گے۔

فیض احمد فیضؔ: ایک چیز ہے شاعری اور دوسری نثر۔ باقی رہی نثری نظم۔ یہ اصطلاح ہی ہماری فہم سے باہر ہے۔ نثر کے معانی بکھیرنے کے ہیں اور نظم کے معانی تنظیم کے ہیں' یکجا کرنے کے ہیں۔

اشفاق احمد: فیضؔ صاحب یہ اصطلاح ویسی ہی اصطلاح ہے جیسے عارضی مستقل الاٹمنٹ کی اصطلاح۔

فیض احمد فیضؔ: نثری نظم کوئی نئی چیز نہیں۔ 1920ء اور 1930ء کے درمیانی عرصے میں ٹیگور کے ترجمے ہوئے تھے۔ "گیتانجلی" وغیرہ کے' وہ شاعرانہ نثر میں تھے۔ اس قسم کی نثر کو کبھی ادب لطیف کبھی انشائے لطیف اور کبھی نثر لطیف کہا جاتا تھا۔ اس کی ابتدا نیاز فتح پوری کے "نگار" سے ہوئی۔ اختر شیرانی کے "رومان" میں بھی اس کی جھلکیاں تھیں حتیٰ کہ اپنے امتیاز علی تاج صاحب نے بھی اس نثر میں بہت کچھ لکھا ہے' یہ سلسلہ کافی دیر تک چلا پھر یہ بات ختم ہو کر رہ گئی۔

سعادت سعید: مغرب میں تو نثری نظم کو ایک باقاعدہ صنف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ بادلیر وغیرہ نے بھی اس قسم کی نظمیں لکھی ہیں۔

فیض احمد فیضؔ: مغرب میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے وہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔

اشفاق احمد: میں اسے نہیں مانتا کہ مرثیہ آپ نے فرمائشی لکھا تھا اس لیے کہ آپ اپنی سائیکی سے ابھی تک اپنے آپ کو علیحدہ نہیں کر سکے۔ میرا مطلب ہے کہ اگر اسی زمانے میں اسی مقام پر آپ سے کوئی تخولیہ شاعری کی فرمائش کرتا تو کیا آپ ایسی شاعری بھی کرتے۔؟

فیض احمد فیضؔ: فرمائش سے میری مراد وقتی تحریک سے تھی۔ واقعہ کربلا ہماری سائیکی کا حصہ ہے' اعلیٰ تحریک کے بغیر میں مرثیہ کیسے لکھ سکتا تھا۔ "تخولیہ شاعری" کے لیے میں داخلی طور پر تیار نہیں

ہوں۔

اجمل نیازی: آپ کے خیال میں پاکستانی ادب کیا ہے یہ کیا ہوسکتا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے؟

فیض احمد فیض: پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستان کی روایات، حالات، پس منظر اور پیش منظر سے مطابقت موجود ہے۔ ویسے بڑا ادب حدود کا پابند نہیں ہوتا۔ اس میں مقامیت کے ساتھ ساتھ عالمگیریت اور آفاقیت بھی موجود ہے۔ عالمگیر ادب کا لکھنے والا بھی ایک مقام، ماحول اور ایک طبقے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم، طبقے، جغرافیے، آب و ہوا، تاریخ اور ثقافت سے جس حد تک متاثر ہے اس کا اثر اس کے ادب میں آئے گا لیکن اس کے باوجود اگر وہ اعلیٰ شاعر یا ادیب ہے تو وہ آفاقیت کی جانب سفر کرے گا۔ شیکسپیئر، عمر خیام، حافظ، سعدی، مولانا روم، غالب کو ساری دنیا پڑھتی ہے۔ مقامیت کے باوجود ان کے ہاں آفاقیت کے عناصر ہیں۔ ایزرا پاؤنڈ کا کہنا ہے کہ بڑا ادب بھی ٹوپیکل نہیں ہوتا، عصری ہوتا ہے۔ یہ ہر زمانے کے قاری کو متاثر کرتا ہے۔ پاکستانی ادب وہی ہے جو پاکستان کے کلچر اس کی خو بو اور حالات کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اجمل نیازی: آپ کم گو بھی ہیں اور کئی ایسی صفات بھی رکھتے ہیں جو صوفیوں کی صفات ہیں۔ ہمارے بہت سے شاعر تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ کے باطن میں بھی روشنی ہے!

فیض احمد فیض: میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شاعرانہ طریقے سے دیکھا جائے تو ہمارا ذہنی رشتہ تو صوفیا ہی سے ہے۔ ہماری غزل میں اہل باطن اور اہل ظاہر کی کشمکش شروع ہی سے موجود ہے۔ طریقت اور شریعت کے رجحانات ہمارے ہاں موجود رہے ہیں۔ اہل طریقت انسان دوستی، محبت اور آشتی کا درس دیتے تھے، دنیاداری اور ظاہر پرستی، تعصب، نفرت اور تحکم کے خلاف تھے۔

اجمل نیازی: جن دنوں آپ نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد کے چیئرمین تھے میرے لیے ایک اعزاز ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ گوجر خاں تک سفر کیا تھا۔ وہاں آپ نے ایک مزار پر حاضری دی تھی۔ آپ کی دستار بندی بھی ہوئی تھی اور آپ نے روحانی پس منظر میں اپنی تقریر میں کچھ باتیں فرمائی تھیں۔ آپ مسلم پاکستان کے کلچر کے ساتھ اس صورت حال کو کیسے مربوط کرتے ہیں؟

فیض احمد فیض: یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ ہم تو دیہاتی آدمی ہیں۔ چھٹیاں میں دیہات میں گزارتا تھا۔ دیہاتوں میں اس زمانے میں رات کو لالٹین کی روشنی میں سیف الملوک اور یوسف زلیخا کے قصے پڑھے جاتے تھے اور دن میں گرد و نواح کے مزاروں پر بھی جاتے تھے اور دیہات کے دوسرے ماحول میں بھی بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔

قتیل شفائی: ایک دفعہ آپ نے فرمایا تھا کہ ہری پور سے تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے، سرائے صالح، آپ کا وہاں کوئی رشتہ دار تھا، اس کے بارے میں فرمائیے؟

فیض احمد فیض: سرائے صالح نہیں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا درویش وہاں پیر لعل بادشاہ تھے، ہمارے ابا ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ہم پیر لعل بادشاہ کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ یہ بات ہے ساتویں آٹھویں کی۔

اشفاق احمد: فیض صاحب نے کہا ہے کہ شاعری کے رشتے سے وہ صوفی ہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا دوسرا رشتہ یہ ہے کہ آپ کی دل بستگی انقلاب کے ساتھ ہے۔ یہ بھی ایک زاویے سے صوفیانہ سوچ ہی کا حصہ ہے کہ صوفی ہر کام کو ایک جماعت کی حیثیت میں کرنے پہ یقین رکھتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ صوفی یا تو ہمیشہ صاحب حال ہوتا ہے یا صاحب حال کی بات کرتا ہے۔ وہ حال کے حوالے سے ہر بات سوچتے ہیں۔ بلھے شاہ ''علموں بس کریں او یار'' اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کتاب کو ماضی سمجھتے ہیں اور حال کی بات کو پسند کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض: سات آٹھ برس کی عمر سے لے کر جب تک ہم کالج نہیں پہنچے تھے ہمارا روز کا معمول یہ تھا کہ اپنے ابا کے ساتھ مسجد میں باقاعدہ نماز پڑھنے کے لیے جاتے اور نماز کے بعد مولوی ابراہیم سیالکوٹی کا درس بھی سنتے تھے۔ ان ساری باتوں کا اثر انسان کی سائیکی پر لازمی ہے۔ ہم نے تو کوشش کی ہے کہ دین جو انسانیت سکھاتا ہے اور ایک حدیث بھی ہے کہ تخلقو با اخلاق اللہ اسے مدنظر رکھا ہے۔

فارغ بخاری: فیض صاحب آپ نے جامعہ اشرفیہ کے کورس کی بھی تو تکمیل کی ہے۔

فیض احمد فیض: جی ہاں جب ہم ایم۔اے کر رہے تھے ان دنوں نیلا گنبد میں مفتی محمد حسین کا درس ہوتا تھا وہ مکمل درس ہم نے لیا تھا یہ درس تقریباً ایک سال کا تھا۔

حسن رضوی: علمائے دین میں سے بھی کسی سے آپ متاثر ہوئے ہیں؟

فیض احمد فیض: جی ہاں سید سلیمان ندوی، عطاء اللہ شاہ بخاری سے، بہت سے علما اور شعرا سے صوفی تبسم کے گھر میں ملاقات رہی ہے کیونکہ شہر سے باہر کا

جو بھی کوئی عالم یا شاعر آتا تھا شام کو اس کی نشست صوفی تبسم کے گھر میں ہوا کرتی تھی۔ وہیں سید سلیمان ندوی سے ہماری ملاقات ہوئی۔ میرا جی نے میرے ایک مصرع ''خوابوں کی مقتل گاہیں'' پر ادبی دنیا میں اعتراض کیا تھا۔ میرا جی کو عربی نہیں آتی تھی' میں نے سید سلیمان ندوی کو نظم سنائی۔ انہوں نے بڑی داد دی اور کہا مقتل گاہیں میں کیا خرابی ہے بالکل درست استعمال ہے۔ انہوں نے سند کے طور پر حافظ کا مصرع پڑھا۔

کس نہ دانست کہ منزل گہ مقصود کجا است

اجمل نیازی: حسن عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فیض احمد فیض: حسن عسکری نقاد بہت اچھے تھے۔ کسی زمانے میں انہوں نے افسانے بھی بہت اچھے لکھے۔ آخری عمر میں انہوں نے یہ کام ہی چھوڑ دیا اور ایک کتاب ''جدیدیت'' لکھی جو مجھے افتخار عارف نے بھجوائی۔ میں حیران ہوا وہ نہایت نامعقول کتاب ہے' اس وجہ سے کہ اس میں مغرب کی گمراہیوں کو گنوانے سے پہلے وہ یہ کہتے ہیں کہ منطق اور استدلال جزوی عقل ہے۔ بھئی اگر یہ جزوی عقل ہے تو پھر آپ سے بحث کیسے ہو؟ بغیر ثبوت کے کوئی دوسرا آدمی بالکل اس سے الٹ خیالات پیش کر کے مشرقی گمراہیوں کا بھی تذکرہ کر سکتا ہے۔ ہمارے لیے تو نظریاتی بحث میں منطق اور استدلال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

حسن رضوی: مولانا مودودی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فیض احمد فیض: جیل خانے میں ان سے سرسری ملاقات رہی۔ جب میں امرتسر میں تھا تو انہیں اپنے کالج میں بھی بلایا تھا۔ نثر بہت اچھی لکھتے تھے اور اپنے نظریے کے حوالے سے عالم آدمی تھے۔

قتیل شفائی: اسلامی ادب کی تحریک کے سلسلے میں کچھ فرمائیے۔

فیض احمد فیض: ہمارے خیال میں مسلم ممالک میں مسلمان لکھنے والوں کی ادبی تحریک اسلام ہی کا حصہ ہے۔

اجمل نیازی: عربی ادب کے مطالعے نے آپ کی شاعری پر کیا اثرات ڈالے ہیں؟

فیض احمد فیض: ہم نے اسے جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔

سعادت سعید: جدید اردو نقادوں میں آپ کن نقادوں کو اہم جانتے ہیں؟

فیض احمد فیض: ڈاکٹر محمد حسن' قمر رئیس' گوپی چند نارنگ' ظ۔ انصاری' خالد احمد' غازی صلاح الدین' محمد علی صدیقی وغیرہ۔

حسن رضوی: آرٹس کونسلوں اور اکیڈمی آف لیٹرز کے کام سے آپ مطمئن ہیں۔

فیض احمد فیض: اول تو مجھے معلوم نہیں اکیڈمی آف لیٹرز کیا کرتی ہے۔ نیشنل کونسل آف آرٹس کا مصرف یہ ہے کہ اسے ایک واضح اور مرتب پروگرام اور لائحہ عمل بنا کے سارے ملک میں ہماری ثقافت اور تہذیب کی عملی اور نظریاتی صورتیں اجاگر کرنا ہے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کام صرف اتنا ہے کہ بیرونی ممالک کے طائفوں کا استقبال کریں اور اپنے طائفے باہر بھیجیں ان کی توجہ اور معاملات پر بھی ہونی چاہیے۔

حسن رضوی: ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کے بارے میں آپ کا خیال؟

فیض احمد فیض: میچ کی کمنٹری سنتے ہیں یا میچ دیکھتے ہیں اس سے زیادہ کوئی رائے نہیں ہے۔

قتیل شفائی: آپ فلم بھی تو بنا رہے تھے۔

فیض احمد فیض: فلم بنی پڑی ہے لندن میں۔

فارغ بخاری: ریلیز کیوں نہیں ہوئی؟

فیض احمد فیض: ڈائریکٹر اور محکمے کا جھگڑا ہو گیا تھا۔

جیلانی کامران: جھگڑا کوئی نظریاتی ہے؟

فارغ بخاری: فلم کا موضوع کیا تھا؟

فیض احمد فیض: تمثیلی فلم تھی۔

حسن رضوی: فیض صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے اپنے قیمتی وقت کا بہت سا حصہ ہمیں دیا۔ یقیناً آج کی یہ گفتگو کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کی حامل ہو گی، اس کے لیے میں ادارہ ''جنگ'' کی جانب سے آپ سب کا بے حد ممنون ہوں۔ بہت بہت شکریہ

☆☆☆

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

بیگم تاثیر

پاکستانی عورت کی حیثیت پر فیض کے خیالات

16 نومبر 1984ء کو میں نے اپنے بہنوئی فیض احمد فیض سے ماڈل ٹاؤن میں ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی' مقصد پاکستان میں عورتوں کی حیثیت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر معلوم کرنا تھا۔ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ عورتوں کو کمتر سمجھنے کے رویے کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے! بدقسمتی سے یہ ان کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ اس سے اگلے دن وہ اپنے آبائی گاؤں چلے گئے اور وہاں سے واپسی پر سخت بیمار پڑ گئے۔

فیض صاحب نے اس موضوع پر بہت یقین اور شدتِ احساس کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا ''عورتیں اپنے حقوق کو مردوں کے حقوق سے الگ کوئی چیز سمجھتی ہیں اور اس کے لئے علیحدہ جدوجہد کر رہی ہیں حالانکہ مردوں اور عورتوں کے مسائل کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورتِ حال کا انحصار تمام تر عورتوں پر ہے۔ قدیم اور پس ماندہ معاشروں میں جہاں مرد اور عورت کی محنت کی تقسیم میں کوئی فرق نہیں وہاں ان کے حالات بھی یکساں ہیں۔ عورتوں کی حالت اُس نظام کے مطابق بہتر یا بدتر ہوتی ہے جس کے تحت وہ زندگی گذارتی ہیں۔ جس سماجی نظام میں مرد کی ذات اہم کردار ادا کرتی ہے' وہاں عورت کی حالت اس معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ضرور مرد سے متاثر ہو گی۔ وہ مزید استبداد کا شکار ہو جائے گی۔ پاکستان کے جن علاقوں میں عورتوں کو نسبتاً بہتر حیثیت دی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے مرد بھی ترقی کر چکے ہیں۔ چنانچہ یہ سوچنا غلط ہے کہ عورتیں مردوں کے بغیر اپنے حقوق منوا سکتی ہیں۔ عورتیں اکیلی کچھ نہیں کر سکتیں۔ ظاہر ہے جب مرد تعلیمی' ذہنی اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہوں گے تو عورتوں کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''ہمارے بعض علاقوں میں تو صورتِ حال بہت ہی افسوسناک ہے مثلاً دیہات وغیرہ میں بالغ عورت کی شادی نوخیز بچوں سے کر دی جاتی ہے یا برادری میں رشتہ نہ ہونے کے باعث اس کی شادی ہی نہیں کی جاتی۔ اس کو جائداد کے حصے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ نواب پور کا المیہ (یہاں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا اور بید سے اُن کے جسم لہولہان کئے گئے) مردوں کی غیر مہذب ذہنیت ہی کا ثبوت ہے۔ جن علاقوں میں سماجی نظام استبداد پر مبنی ہو وہاں ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں۔ یہ دراصل معاشرے کے پورے ڈھانچے کا مسئلہ ہے۔ جہاں معاشرے کا یہ ڈھانچہ زیادہ روشن خیال ہے اور عورت اور مرد دونوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع مہیا کرتا ہے وہاں بھی کچھ نہ کچھ تفریق باقی رہتی ہے لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنی پس ماندہ معاشروں میں ہوتی ہے۔

عورتوں کو ذہنی اور سماجی طور پر مردوں کے برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی اور سماجی نظام میں انقلابی تبدیلی لائی جائے۔

عورتوں اور مردوں کو اکٹھے مل کر کام کرنا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عورتوں کے حقوق کی جدوجہد صرف ایک چھوٹے سے مراعات یافتہ طبقے تک محدود نہ ہو بلکہ پوری آبادی کی طرف سے ایک عوامی سیاسی جدوجہد کی صورت اختیار کر لے۔ گھروں میں بند رہنے والی عورتیں تبھی آزاد ہو سکتی ہیں جب وہ سیاسی تحریکوں میں حصہ لیں۔ سیاسی نظام ایک بہت بنیادی چیز ہے اور باقی ہر چیز اس سے وابستہ ہے۔ ایک پس ماندہ اور بے انصافی پر مبنی نظام کو بدلے بغیر آپ کچھ تبدیلی نہیں لا سکتے۔ سیاسی نظام ہی دراصل سماجی نظام ہے مثلاً ناخواندگی کو ہی لیجئے۔ دنیا بھر میں کسی جگہ بھی آج تک یہ نہیں ہوا کہ ایک وسیع ترین سیاسی تحریک کے بغیر ناخواندگی دور ہوئی ہو پھر سیاسی جدوجہد کے بغیر سیاسی تحریک نہیں چل سکتی۔ اسی تحریک سے خواندگی پروان چڑھے گی۔ سیاسی نظام کی خرابیوں کے اثرات سے معاشیات بھی محفوظ نہیں۔ وسائل سے بھرپور انداز میں فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتے ہوں۔ اس وقت ہمارے یہاں زیادہ تر وسائل چند لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اسی لئے عوام کی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی انقلاب بلاوجہ برپا نہیں ہوتا۔ یہ ناانصافی کے خلاف ایک ردِعمل کے طور پر ابھرتا ہے۔ کیوبا کی مثال لیں۔ وہاں 70 فیصد ناخواندگی تھی۔ کوئی صحت عامہ کا نظام نہیں تھا۔ وہاں کی نئی قیادت نے انقلاب کے بعد ہی ان سارے مسائل سے نبٹنا شروع کیا۔ سماجی نظام کو بدلنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی ایک مسئلے کو

علیحدہ سے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے مثلاً فیملی پلاننگ کو تعلیم اور ادویات کے بغیر رائج نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت میں لازمی فیملی پلاننگ ناکام ہو گئی بلکہ اندرا گاندھی کو اس سے انتخاب میں نقصان اٹھانا پڑا جبکہ چین میں فیملی پلاننگ کامیاب رہی۔ عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ ترقی کی جدوجہد میں حصہ لینا چاہیے خاص طور پر ملازمت پیشہ خواتین کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی کاوشوں سے ہی حالات کی بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ جب تک مردوں کو سماجی نظام میں انصاف نہیں ملے گا عورتیں بھی اس سے محروم رہیں گی۔"

☆☆☆

فیض کی نظم تشکیل کے دوران

(بشکریہ محسن بھوپالی)

ایلس فیض

ہم سفر اور شریکِ حیات

''کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟'' یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ہے اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوتِ متحرکہ ہوتی ہے مگر میں اس مضمون میں ان کی شخصیت کی صورت گری کی کوشش نہیں کروں گی، کیونکہ اس کے لئے ان اقلیموں کو طے کرنا پڑے گا جو ایک بیوی کے دائرہ عمل سے باہر ہیں، بلکہ میں ایک شاعر کے گھر کی زندگی کا خاکہ پیش کروں گی جہاں وہ اپنے اعزا اور احباب کے جمگھٹے میں ہوتا ہے، جس کے گوشۂ تنہائی میں وہ جسمانی اور ذہنی تکان دور کرتا ہے اور جہاں وہ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر شعر کی تخلیق کرتا ہے۔

میں نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص کا مزاج عجیب و غریب سہی، اس کے اطوار دنیا جہاں سے نرالے ہیں تو کیا ہوا، وہ بہرصورت ایک فن کار ہے۔ اس کی تلون مزاجی، اس کی بوقلمونیت اور اس کے لاابالی پن کو صرف اس لئے قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ فنکار ہے، اسے کسی حد تک خود فراموشی، تساہل، تن آسانی اور بعض دنیاوی فرائض سے گریز کرنے کی اجازت ہوتی ہے، بالخصوص وہ فرائض اگر ایسے ہوں جنہیں ادا کرنے کے لئے ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ضرورت ہو لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عام لوگوں کے مقابلے میں فنکار زیادہ خود فراموش کیوں ہوتا ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ بہرصورت یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فنکار کی بعض کوتاہیوں سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ایک حد تک قابلِ معافی بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ لوگوں سے ملنے کے وعدے کر کے بھول جاتا ہے۔ اپنی جیب و گریباں کا ہوش نہیں رہتا۔ کہیں جانا ہو تو ٹرین روانہ جانے کے بعد سٹیشن پہنچتا ہے۔ روپوں کا بٹوہ کہیں رکھ کر بھول جاتا ہے، اور اس کے لئے سارا گھر چھان مارتا ہے لیکن ممکن ہے وہ اس کی جیب میں ہی موجود ہو۔ اس کا فونٹین پن ہمیشہ چوری ہو جاتا ہے۔ اس کے اعزا و اقارب کو طوعاً و کرہاً یہ تمام باتیں برداشت کرنا ہوتی ہیں بلکہ دن بھر کی مسلسل الجھنوں کا نتیجہ کسی نظم، کسی شبیہہ یا تصویر یا کسی اور شاہکار کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو انہیں اپنی قسمت پر شاکر ہونا چاہیے۔

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری ۱۹۱۱ء درج ہے اور یکم جنوری ۱۹۱۲ء بھی درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔

۱۶/۴/۷۵ء فیض احمد فیض

کئی سال ادھر کی بات ہے کہ مجھے ایک کوٹ کی گم شدگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ہماری آمدنی بہت کم تھی۔ جنگ چھڑ چکی تھی اور قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی تھیں۔ میں ہندوستان میں تھی اور میرے والدین انگلستان میں۔ اس لئے ان سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی، پھر تنخواہ بھی اتنی نہیں تھی جتنی جنگ سے پہلے ملتی تھی۔ ہمیں شادی یا فنکار ان

فیض احمد فیضؔ، ایلس فیض، سلیمہ اور منیزہ

کمزوریوں کے لئے کوئی الاؤنس بھی نہیں ملتا تھا جنہیں وہ اپنا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہم نے ایک سوٹ بنوا ہی ڈالا۔ نیا سوٹ بنوانا اس زمانے میں ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیضؔ اسے لینے کے لئے امرتسر گئے اور رات گئے لاہور واپس آئے۔ ان دنوں ہم شہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت کوئی تانگے والا وہاں تک جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والا اس پر راضی ہو گیا کہ وہ انہیں کچھ دور تک پہنچا دے گا۔ تانگے والے نے فیضؔ کو جس جگہ اتار دیا وہاں سے ہمارا گھر تقریباً ایک میل دور تھا اور انہیں یہ مسافت پیدل طے کرنا پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کی بغل میں دبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر فیضؔ نے مجھے جگایا اور میں نے بنڈل ان سے لے لیا۔ لیکن اسے ہاتھ میں لیتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا' کیونکہ اس میں ایک گرم سوٹ ہونے کے باوجود بنڈل بہت ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارہ کھلا ہوا تھا اور کوٹ ندارد۔ فیضؔ نے کہا رات بہت ہو گئی ہے اب اسے صبح تلاش کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ جہاں تانگے والے نے مجھے اتارا تھا وہاں سے گھر تک آنے میں ہی کوٹ کہیں گر گیا ہے' لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد جو ایک حد تک یک طرفہ تھی، یہ طے پایا کہ وہ ٹارچ لے کر اسی وقت کوٹ تلاش کرنے چلے جائیں لیکن تلاش بسیار کے باوجود کوٹ نہ ملا۔ پتلون البتہ میرے پاس کئی سال تک جوں کی توں رکھی رہی۔ اسے کسی نے استعمال نہیں کیا اور ہماری ازدواجی زندگی کے پہلے اسراف کی یاد تازہ کرتی رہی لیکن 1950ء کے سیلاب کے بعد یہ نشانی میرے پاس باقی نہ رہی' اُسے ایک مستحق کو دے دیا گیا۔

چند مہینے بعد کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس گم ہو گیا تو میں نے کسی ناگواری کا اظہار تک نہیں کیا' لیکن 1949ء میں کراچی جاتے ہوئے فیضؔ

کا بستر ایک اور مسافر سے بدل گیا تو میری قوت برداشت قریب قریب جواب دے گئی۔ بستر کھولنے پر مجھے اس میں جو گدا ملا وہ اس گدے سے بہت اچھا تھا جو کہیں اور چلا گیا تھا لیکن مجھے اپنی جگہ پر کچھ ندامت اور کچھ پریشانی سی تھی کہ اس بستر کے مالک نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا۔

بعض اوقات میرا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ لا اُبالی پن ان کی طبعی فراخ دلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں' اور انہیں اس طرح سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو۔ لیکن کوئی شخص ان سے کوئی کتاب مانگتا ہے تو اُن سے انکار بھی نہیں کیا جاتا۔ جب میں ان سے پوچھتی ہوں "تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی۔ معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں" تو وہ بڑی متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا رہے گا اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

1947ء میں میرے تمام زیورات چوری ہو گئے۔ میری خوش دامن نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے لیکن پر تکلف زیور دیئے تھے۔ چند چیزیں میں نے خود بھی خریدی تھیں چور وہ سب اٹھا کر لے گئے۔ میرے اپنے گھر میں یہ پہلی چوری تھی۔ پولیس کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ہم یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ جانے والی چیز کا غم ہی کیا' میرے چہرے پر احساسِ محرومی کی جھلک دیکھ کر فیض کہنے لگے۔ تم نے شاعر کا یہ مصرع نہیں سنا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اور میں اچانک یہ محسوس کرنے لگی کہ میرے احساسِ محرومی میں ایک طرح کا احساس مخلصی بھی شامل ہو گیا ہے۔

میرا قیاس آہستہ آہستہ یقین کی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ ہماری بچی سلیمہ بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے اور ان سے کافی مماثل بھی ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ بڑی فراخ دلی سے اپنی اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو اٹھا کر دے دیتے ہیں یا کسی چیز کی گم شدگی پر ذرا بھی ملول نہیں ہوتے بلکہ جن کے لئے احساس محرومی بھی لذت بخش بن جاتا ہے' ان کی معیت انتہائی مسرت افزا' ان کی شخصیت انتہائی دلپذیر اور ان کی رفاقت ہمیشہ باعثِ تفننِ طبع ہوتی ہے۔

ان خامیوں یا خصوصیتوں کا توڑ کرنے کے لئے خوش قسمتی سے مجھ میں ایک طرح کی ملکیت پسندی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز بھی واپس لے لیتی ہوں جس کی واپسی کی کوئی امید باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمارے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہئے ورنہ ہم دوسروں کو دیں گے کیا؟ منیزہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ حقیقت پسند ہے اور ہر چیز کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن کتابیں پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کی حد سے زیادہ شوقین تھی۔ ایک دن اس نے اپنی باجی کی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "باجی۔! میں آپ کی کتاب دیکھ لوں؟" سلیمہ کو بھی اپنی کتابیں بہت عزیز تھیں۔ اس نے جواب دیا۔ "نہیں تم خود اپنی کیوں نہیں دیکھتیں۔" "باجی' میں اپنی کتاب بہت زیادہ دیکھوں گی تو وہ گھس جائے گی۔" منیزہ نے جواب دیا۔ فیض کو علم ہوا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولے "ہمارے گھر میں کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہئے۔"

ظاہر ہے کہ فیاض اور فراخ دل آدمی انسانوں کے ہجوم اور ان کی معیت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں' عید' ہولی' بسنت' اور دوسرے تہواروں میں سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر فیض خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ ان کا دور سے تماشہ نہیں دیکھتے بلکہ ان کی رنگ رلیوں میں خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خاموشی اور کم آمیزی کے باوجود..... اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ذہنی یک سوئی' ایک پُرسکون گھریلو زندگی اور عزلت گزینی کے متمنی رہے۔

ہمارے گھر کے معمولات بچوں کے نظام الاوقات کے تابع ہیں اور فیض نے اسے بے چون و چرا قبول کر لیا ہے تاکہ بچوں کی باقاعدہ زندگی میں کوئی خلل نہ پڑے یا انہیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔ ماما کا ہر قول بچوں کے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے' جس کے خلاف کسی اور عدالت میں اپیل ممکن نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر انہیں بہت چھوٹی سی کہانی سنائی جائے یا بچے کہتے رہ جائیں کہ ہم نے ابا جان کو دن بھر سے نہیں دیکھا انہیں آجانے دیجئے لیکن ماما اگر یہ کہہ دیں کہ نہیں اب سو جاؤ تو ان میں سرتابی کی مجال نہیں۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے معاملات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف خود فیض صاحب کو بھی ہے اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ کام میرے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

جون **1953**ء میں فیض جب حیدر آباد جیل میں تھے تو میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ان بچیوں کیلئے بیک وقت ماں اور باپ کے فرائض انجام دینا میرے لئے کتنا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھے یہ خط لکھا تھا کہ "میری بچیوں کو تم سے اچھی ماں نہیں مل سکتی' کتنی خوش نصیب ہیں وہ۔" ان کی تعلیم و تربیت سے فیض کی بے تعلقی کے باوجود بچیاں فیض سے بالکل نہیں ڈرتیں بلکہ باپ بیٹیوں نے ایک دوسرے کے عجیب و غریب اور دلچسپ نام رکھ چھوڑے ہیں۔ ان کے مقدمے کے دوران میں

ہمارے وکیل صاحبزادہ نوازش علی خان مرحوم نے ایک بار جیل جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے فیض کے نام عید کے تار میں جن کبوتروں کا ذکر کیا تھا وہ کون ہیں اور میں نے ان دونوں بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو میرے سامنے اسی وکٹوریا پر بیٹھی تھیں، کہا۔" وہ کیا بیٹھی ہوئی ہیں!"

منیزہ نو مہینے جدائی کے بعد جب اپنے والد سے پہلی بار جیل میں ملی اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے چار سال تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔ "ابا! آپ تو بالکل بوڑھے ہو گئے۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کی عمر بہت کم ہو گی اور آپ بڑے خوبصورت ہوں گے، ارے آپ کے بال بھی سفید ہو گئے۔" لیکن ان کی گود میں پہنچ کر وہ بالکل بدل گئی اور اس نے کہنا شروع کیا۔ "ابا! آپ گھر نہیں چلیں گے؟ امی مجھے مارتی ہیں۔" یہ سن کر میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رک گئی کیونکہ بچوں کو مارنا ہمارے خاندان میں قریب قریب بالکل منع ہے لیکن فوراً ہی میں نے محسوس کیا کہ یہ شکایت بڑی بامعنی ہے اور وہ دراصل یہ کہنا چاہتی ہے کہ گھر میں ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

منیزہ انہیں ہر خط میں یہ ضرور لکھتی ہے کہ "دیکھئے میرا خط کسی اور کو نہ دکھائیے گا۔" لیکن اسے کیا معلوم کہ ان کے نام جتنے خط جاتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ کو سینسر بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ پچھلے سال ایک بار منٹگمری جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر لودھی کی تو شامت ہی آ گئی۔ بے چارے نے کہیں اس سے یہ کہہ دیا کہ تم نے اپنے ابا جان کو جو خط لکھے ہیں وہ مجھے بہت پسند آئے، یہ سنتے ہی منیزہ غصے سے سرخ ہو گئی اور ان پر برس پڑی۔ چھوٹی لڑکی بڑی لڑاکا، چلبلی اور زود حس ہے۔ غصہ تو اس کی ناک پر رکھا رہتا ہے، لیکن وہ محبت کا ایک ننھا سا مجسمہ بھی ہے۔ اس میں صبر و تحمل کی ضرور کمی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی دلچسپ اور باغ و بہار ہے۔ ہم میں ہمت ہوتی تو غالباً ہم سب اسی طرح بن جانا چاہتے۔ اس میں اپنے والد کا بے پایاں صبر و تحمل نہیں، نہ وہ اپنی بڑی بہن کی طرح متین اور سلیم الطبع ہے بلکہ بعض رشتے دار عورتیں تو یہ کہتی ہیں کہ یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے، لیکن میری رائے میں اس کی تصدیق تو اس کی نانی کر سکتی ہیں۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ تو اردو بڑی اچھی بول لیتی ہیں۔ شاید یہ فیض کا اثر ہے۔ حقیقت اس کے برعکس نہ سہی مگر اس سے مختلف ضرور ہے۔ زبانیں، میں کچھ فطری طور پر آسانی سے سیکھ لیتی ہوں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں وہ ادبی اور بول چال کی زبان سیکھنے کے لئے انتہائی سازگار ہے۔ جہاں تک بچیوں کا تعلق ہے۔ فیض کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اردو ہی کو اپنائیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ بچیاں میری "خوشدامنی زبان" تو بہر صورت سیکھ لیں گی اور ان کی ماں اسے سکھانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اب اپنی زبان پر عبور حاصل کرنے کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ جس وقت تمام گھر والے بیٹھے ہوتے ہیں اور آپس میں باتیں ہوتی ہیں تو بچیاں کبھی ایک زبان بولتی ہیں کبھی دوسری۔ وہ مجھ سے انگریزی میں اور فیض سے اردو میں باتیں کرتی ہیں، اس لئے کوئی خاص کوشش کیے بغیر وہ دونوں زبانیں بولنے لگی ہیں۔

بعض دوست مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تم نے کبھی فیض کو غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے؟ فیض اپنی نرم مزاجی کے لئے مشہور ہیں اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ غصہ انہیں کبھی آتا ہی نہیں۔ میں اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ گھریلو زندگی میں بھی انہوں نے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میرا یہ جواب سن کر ایک دوست نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کہا تھا کہ جنگ کے بعد ملاپ میں جو مزہ ملتا ہے اس کی لذت سے تم محروم ہو۔ یہ درست ہے کہ اس لذت سے ہم محروم رہے ہیں جسے معلوم نہیں مسرت بھی کہا جا سکتا ہے یا نہیں لیکن اس کرب اور کوفت سے ہم یقیناً محفوظ رہے جو برافروختگی یا جلد بازی کے عالم میں کوئی بات کہہ جانے میں اور اس پر متاسف ہونے میں ہوتی ہے۔ ہم اپنے اختلاف پر باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن بات اس سے کبھی بڑھنے ہی نہیں پاتی اور آخر کار ہم اختلاف رائے پر ہی متفق ہو جاتے ہیں۔

ہماری خانگی زندگی کے ایک پہلو پر ایک بار جوش صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ 1946ء میں وہ دہلی آئے۔ اس سے پہلے ان سے سری نگر میں ہماری شادی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی لیکن عقد کے بعد ہی ایک مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں انہوں نے اور مجاز نے خوب اپنا کلام سنایا، اس لئے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اسے بعد کے لئے اٹھا رکھا گیا۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ "آپ میں اور فیض میں لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں؟" میرا جواب نفی میں سن کر انہوں نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے یہ؟" انہوں نے جملہ پھر دہرایا لیکن ان کی آنکھوں میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ "یہ بڑے افسوس کی بات ہے پھر آپ لوگوں میں محبت کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نہیں کہہ سکتی کہ جوش صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا۔ لیکن میں آج تک ان سے اتفاق رائے نہ کر سکی۔

ہماری ازدواجی زندگی کے دوران میں دکھ، درد اور رنج و ملال کے مواقع بھی آئے ہیں۔ میں نے فیض کو ایک پیاری بہن، ایک بھائی اور بہت سے عزیز اور محبوب دوستوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے، لیکن وہ جیسے ان غموں کو برداشت کرنے کے عادی ہو گئے

ہیں۔ ان کی جبیں کبھی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ان میں ایک ایسا تحمل اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہوگئی ہے جو محض موضوع ہی نہیں ہے بلکہ ان کا فلسفۂ حیات بھی اور ان کی امیدیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کی فطری شرافت پر ان کا عقیدہ بہت راسخ ہے یہ شرافت ناسازگار حالات میں مسخ ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کا وجود کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس کی خامیوں پر ہی کیوں انگشت نمائی کریں، ہم اس کی خوبیوں کی بات کیوں نہ کریں یا انہیں اپنا موضوعِ سخن کیوں نہ بنائیں۔

گذشتہ ساڑھے تین سال میں انہوں نے مجھے بار ہا لکھا ہے کہ بچوں کو خوش رکھو اور انہیں سکھ پہنچاؤ۔ انہیں رنج و غم سے روشناس کرانے کے لئے کافی وقت پڑا ہے، اور بچیاں بھی اپنی تمام پہیلیاں، لطیفے اور پُر مذاق کہانیاں اپنے والد سے ملاقات کے لئے اٹھا رکھتی ہیں ان کی باتیں سن کر اکثر سنگدل اور ترش رو وارڈن بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکے۔ فیض نے غم کا ایک روشن اور اثباتی پہلو بھی تلاش کرلیا ہے یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرت کے لئے مسلسل جدوجہد۔

ہمارے گھر میں اگر کسی کی سالگرہ ہو تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیئے جاتے ہیں۔ مجھے ننھی سلیمہ کی تقریب اچھے طریقے سے یاد ہے۔ فیض تہیہ کرچکے تھے کہ وہ اس کے لئے تحفے ضرور لائیں گے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اتنے چھوٹے بچے کے قابل تحفوں کے انتخاب کے لئے صرف پدری محبت کافی نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہم دہلی میں رہتے تھے۔ وہ اور مجید ملک خریداری کی مہم پر روانہ ہوئے اور کناٹ پیلس سے واپس ہوئے تو بنڈلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کی ایک چھوٹی سی گاڑی، تصویروں کی ایک کتاب اور ایک ٹی سیٹ لے کر آئے تھے لیکن ایک بنڈل ابھی کھلا نہ تھا اور ہر شخص یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ اس میں کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پارسل میں ایک ننھی منی خوبصورت سی گڑیا ہے جو گاڑی پر شان سے بیٹھ کر سیر کرے گی۔ لیکن ان دونوں نے اس کی خریداری کرنے سے پہلے گڑیا کے کپڑے اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کیونکہ جسے وہ گڑیا سمجھ رہے تھے وہ دراصل ٹی کوزی تھی جسے آخر کار آتش دان پر فروکش کردیا گیا اور گاڑی پر سواری کے لئے ایک اور گڑیا خرید لی گئی جو اتنی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن تھی گڑیا ہی۔

انگلستان کے ہر خاندان میں سالگرہ کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں لیکن پاکستان میں پیدائش کے اندراج اور ولادت کے سرٹیفکیٹ کے اندراج کا باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ سالگرہ کب منائی جائے۔ میں نے ایک بار اپنی خوش دامن سے فیض کی تاریخ ولادت معلوم کی کیونکہ میری رائے میں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سب کی تو سالگرہ منائی جائے لیکن صاحب خانہ ہی محروم رہے۔ ان کا جواب بہت مبہم تھا لیکن انتہائی دلچسپ۔ انہوں نے کہا کہ مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اُن کی ولادت کے وقت بارش ہو رہی تھی مگر یہ کسی کو یاد نہیں کہ بارش گرمیوں میں ہو رہی تھی یا سردیوں میں یا بادل محض اتفاق سے گھر کر برسنے لگے تھے۔ بعد میں فیض کے ایک ماموں نے ہماری مشکل حل کردی، انہیں صحیح تاریخ یاد تھی اور یہ وہی تاریخ تھی جو ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج تھی۔

میں 1938ء میں ہندوستان آنے کی تیاری کر رہی تھی کہ میری روانگی سے چند ہی روز قبل لندن میں مسز تاثیر کا خط ملا جس میں انہوں نے ایک انتہائی عزیز دوست کے لئے بعض چیزیں منگائی تھیں۔ اپنی مصروفیت کے باوجود میں ان فرمائشوں کی خریداری کے لئے آکسفورڈ سٹریٹ میں بھاگی پھری اور ان کے دوست کو برا بھلا کہتی رہی۔ نئی چیزوں کے لئے جگہ نکالنے کے لئے مجھے اپنا سامان کئی بار کھولنا، باندھنا پڑا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ کچھ دن بعد یہی چیزیں اپنی گرہستی بن جائیں گی لیکن اس کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے کہ اس کے انتہائی عزیز دوست نے عین وقت پر جن چیزوں کی فرمائش کی تھی ان پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اپنی شاعرانہ شہرت قائم رکھنے کے لئے ہر شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ برابر شعر کہتا رہے، لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ شادی کے بعد فیض نے شاعری کیوں ترک کردی۔ 1950ء تک وہ کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، اور اس دوران میں بھی انہوں نے بعض نظمیں اور غزلیں معرکتہ الآرا کہی ہیں لیکن یہ درست ہے کہ انہوں نے زیادہ نہیں لکھا۔ فیض اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ شاید اب میں بہت زیادہ آسودہ خاطر ہو گیا ہوں اور میری بہت زیادہ خبر گیری کی جاتی ہے لیکن اچھی شاعری کے لئے شاید تکلیف اور غم ضروری ہے۔ ''دست صبا'' کی نظموں اور غزلوں کا محرک بھی ان کا غم ہی ہے لیکن یہ محض ان کا ذاتی غم نہیں بلکہ ایک وسیع تر غم ہے۔ ''دست صبا'' کے متعلق انہوں نے جیل سے مجھے لکھا ''یہ مجموعہ تمہارا ہے۔''

جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور تیز ہوا چلنے لگتی ہے تو شاعر کی رگ احساس بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کی شاعری اس کے دل میں کروٹیں بدل کر بیدار ہوجاتی ہے اور وہ سوال کرتا ہے۔ ''کیا میں دن کا باقی حصہ باغ میں گزار سکتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں کوئی نظم کہنے میں کامیاب ہوجاؤں۔'' کئی گھنٹے کے بعد وہ واپس آتے ہیں تو میں ان کی آہٹ سن کر یہ اندازہ لگا لیتی ہوں کہ انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ ان کے برعکس تاثیر مرحوم آمد کے وقت اپنی کشمیری شال اوڑھ کر بیٹھ

جاتے، کبھی دبی زبان سے کراہتے، کبھی جھومنے لگتے اور پھر شعر ہو جاتا۔

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فنکار دنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں، لیکن وہ دوسروں سے اس لئے مختلف ہوتے ہیں کہ ان کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لئے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا، لیکن ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ہمارے معاشرے پر ہے جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوری سے لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن فنکار یا شاعر کی ذات سے نہیں۔ فنکار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے اس لئے وہ اس دنیا کی حدوں سے نکل جاتا ہے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اپنے گھر بار اور روزمرہ کی ضرورتوں کی پروا نہیں رہتی۔ اسے ایسے رفقاء کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کرسکیں۔ یہ ہفت خواں منازل اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصور یا مصنف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کار دنیا تمام ہو چکے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ ہوتے تو ان کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی اور مجھے یقین ہے کہ فیض نے "دست صبا" کا مسودہ بھیجتے وقت مجھے جب یہ لکھا تھا کہ "یہ تمہاری ہے" تو ان کا بھی یہی مطلب تھا۔

ٹیلیفون ۲۶۸۸۹۷

اے-۱۹۱ پی ای سی ایچ ایس
بلاک ۲ نمبر ۳
کراچی

کرمفرما، تسلیم

ہماری بھتیجی منیزہ گل اور عزیزی ممبر ہاشمی کی
تقریب خانہ آبادی ۱۹ نومبر ۶۳ء بروز اتوار
روز طے پائی ہے۔ اگر آپ اسی شام پانچ بجے
۱۸۹-اے سندھ مسلم کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی
تشریف لا کر ہمارے ساتھ شریک مسرت ہو سکیں
تو کرم ہوگا۔

منتظر جواب
فیض احمد فیض، ایلس فیض

ایک منیزہ ہماری بیٹی ہے، جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے،
ہم سب اسکو پیار کرتے ہیں، سب کے سب اسکو پیار کرتے ہیں
کیسے سب کو نہ آئے پیار اس پر ہے وہی تو ہماری ڈکٹیٹر
پیاری سے جو کچھ بھی چرائے گا، وہ ضرور اس سے مار کھائے گا،
خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے، ویسے سچ مچ بہت وہ اچھی ہے

"ایک منیزہ ہماری بیٹی ہے۔" کی رخصتی، شادی کارڈ اور فیض صاحب کا عکس تحریر

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

فیض سے میری پہلی ملاقات

1921 تھا اور اکتوبر کا مہینہ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی۔ نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ادب و شعر کا شوق پھر سے اُبھرا۔ چنانچہ ''بزم سخن'' کی وساطت سے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبا سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیاز مندان لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے خوش ذوقی اور حریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

روایتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبا سے شعر پڑھوانے کا اعلان کیا۔ دو ایک برخوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کر چلے گئے۔ اچانک ایک دبلا پتلا منحنی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت، چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس۔ ادھر اُدھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے میں اس نے کہا: ''عرض کیا ہے۔'' کلام میں ابتداء عشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی۔ سب نے داد دی۔ یہ حفیظ ہوشیار پوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے۔ گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں روانی، آنکھیں اور لب بیک وقت ایک نیم تبسم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے۔ اشارے ہوئے، پطرس نے کچھ

ظہیر کاشمیری۔ صوفی تبسم۔ فیض احمد فیض۔ سید وقار عظیم

معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں کیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا نیا کلام سنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی' انہیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا۔ بخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لئے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان ہی نہیں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا بھی امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے۔

ابھی پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہوا۔ جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرس' کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے ناتجربہ کاروں کو چھوٹے کمرے سپرد کئے گئے تھے۔ مجھے کالج کی دوسری منزل پر متعین کیا گیا۔ یہاں ایم۔ اے انگلش کے طلبا تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے۔

امتحان کا کمرہ مقام احترام ہوتا ہے۔ اُمیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کا امتحان بھی ہوتا ہے۔ سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے اپنی عادت کو دبانے کے لئے پان کا انتظام کر لیا تھا مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم متبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اٹھا کر سر کو کھجاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پڑوسیوں کی مزاج پرسی کرتے' کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ ایسے حرکت کرتا جیسے وہ کسی نامعلوم شئے کو ٹٹول رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ وہ اٹھے اور کہا کہ "ہمیں یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟" میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا معائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اُتر کر دروازے پر پہنچا' پوچھا: "سب کچھ ٹھیک ہے!"

میں نے کہا "جی!"

میں نے عرض کیا: "پروفیسر صاحب (میں انہیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا) بعض طلبا سگریٹ پینا چاہتے ہیں۔ اجازت ہے؟"

پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا:

"جب تک پروفیسر جودھ سنگھ اس کالج کے پرنسپل نہیں بنتے' اس وقت تک پی سکتے ہیں۔" اور پھر مسکرا کر چلے گئے۔

میں نے اندر آتے ہی فیض صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہوا جیسے قلم ہی سے ابھر آیا ہو۔

پھر قلم کے رش اور سگریٹ کے کش میں مقابلہ شروع ہوا اور اس کشمکش میں معطر دھوئیں کے غبارے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ میں معلم تھا' نظم و ضبط کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر اس خوشبو سے اپنے ذوق سگریٹ نوشی کی تسکین میں کھو گیا۔

کیا معلوم تھا کہ دھوئیں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے نکل کر دور دور تک فضا میں پھیل جائیں گے اور ان میں سگریٹ پینے والے کے معطر انفاس کی خوشبوئیں بھی لہرائیں گی اور ہنر فن اور ادب کی دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گے۔

☆☆☆

سجاد باقر رضوی۔ فیض احمد فیض۔ صوفی تبسم

فیض احمد فیضؔ اور ایلس فیض

فیض احمد فیضؔ، ان کے نواسے علی، یاسر اور نواسی میرا

فیض احمد فیضؔ اور اُستاد دامن

قدرت اللہ شہاب

بیادِ فیض

ثقافت، صحافت، شاعری اور ادب کے حوالے سے فیض احمد فیض کی یاد پر پھولوں کی چادر چڑھانا تو ان شعبوں کے ماہرین کا حق ہے، میرے پاس تو فقط ان کے ساتھ نیازمندی کی چند یادوں کا سرمایہ ہے۔ میری اس نیازمندی کو نہ تو کسی گہری دوستی کا درجہ حاصل تھا، نہ ہم جلیسی کا، نہ ہم خیالی کا۔ میرا ان کے ساتھ اتنا رشتہ تھا، کہ میں ان کی دل سے عزت کرتا تھا اور وہ میرے ساتھ مروت سے کام لیتے تھے۔ اس بے نام سے رشتہ کا آغاز اتفاقاً 1939ء میں ہوا تھا، جو پورے بیتالیس برس اس ہلکی سی برقی Current کی طرح قائم رہا جو بالوں میں کنگھی کرنے سے پیدا تو اکثر ہوتی ہے، لیکن اس سے جھٹکا کبھی نہیں لگتا۔

1939ء میں جب میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کا امتحان دے کر فارغ ہوا تو میرے استاد پروفیسر ڈکنسن نے کہا ''کینئرڈ کالج میں انگریزی کی ایک Leave Vacancy موجود ہے۔ میں نے پرنسپل سے بات کر لی ہے۔ تم فوراً جا کر ڈیوٹی join کر لو۔''

میں خوشی خوشی سر آنکھوں کے بل کینئرڈ کالج پہنچا، تو محاورے کے عین مطابق سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ایک کلاس روم میں داخل ہوتے ہی اس زمانے کی صاحبزادیوں نے ایسی نعرے بازی کی، اور چاک کے ٹکڑوں، مونگ پھلیوں، کھٹی میٹھی گولیوں اور کاغذی گولوں کی ایسی بوچھاڑ کی، کہ میں کلاس روم ہی نہیں بلکہ کالج چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

انہیں دنوں کسی نے بتایا، کہ امرتسر کے اسلامیہ کالج میں بھی leave vacancy کے طور پر کوئی جگہ خالی ہے۔ وہاں پہنچا، تو ایک نہایت خوش جمال، خوش لباس اور خوش گفتار نوجوان نے بتایا کہ جگہ پُر ہو چکی ہے۔ اس نوجوان کا نام فیض احمد فیض تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے غالباً یونہی رسماً پوچھا، کہ کسی اور جگہ پڑھانے کا تجربہ بھی ہے یا نہیں؟ میں نے فوراً کینئرڈ کالج کا ایک روزہ تجربہ بیان کر دیا۔ اسے سن کر فیض صاحب لڑکیوں کی طرح جھینپ جھینپ کر مسکراتے رہے اور باہر آ کر مجھے الگ سے سمجھایا، کہ آئندہ کسی انٹرویو میں اپنا یہ تجربہ ہرگز بیان نہ کرنا۔ اسی روز سے ہمارے درمیان وہ ہلکا سا رشتہ استوار ہو گیا۔ جس میں وقت کے ساتھ میری اور فیض کی دوستی بڑھتی گئی۔

جس زمانے میں فیض صاحب لاہور آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر تھے، جسٹس ایس۔اے رحمان مرحوم نے ایک روز مجھ سے فرمایا، کہ اگر صدر مملکت اس ادارے کو کسی وقت وزٹ کر لیں تو ممکن ہے کہ اس کے کام میں چند مقامی رکاوٹیں دور ہو جائیں۔ صدر تو بخوشی مان گئے لیکن گورنر کالا باغ نے خود آنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں منانے کی کوشش کرنے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کے پاس پنجاب پولیس کا ایک نامی گرامی افسر بیٹھا تھا نواب صاحب نے دوٹوک جواب دے دیا، کہ وہ ایسے ''کنجر خانوں'' میں جانا پسند نہیں فرماتے۔ صدر صاحب کو بھی وہاں مت لے جاؤ۔ فیض احمد فیض کے متعلق اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار فرمانے کے بعد انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے پولیس افسر کی طرف اشارہ کر کے کہا، ''فیض کے لیے میں نے یہ السیشین پال رکھا ہے۔ صدر کے دورے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا۔''

پولیس افسر نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنی دم ہلائی، اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی غیر مشروط وفاداری کا یقین دلایا۔

میں نے فیض صاحب کو یہ واقعہ سنایا، تو وہ اپنے دستور کے مطابق مسکرا کر چپ ہو رہے۔ البتہ تھوڑے سے عرصہ بعد وہ نہایت خاموشی سے آرٹس کونسل سے رخصت ہو گئے۔

ایک بار ایسے ہی شیخی میں آ کر میں نے وزارت اطلاعات ونشریات میں ایک کلب قائم کیا جس کا نام I do not agree club رکھا۔ اس کی پہلی تقریب میں جو حضرات شامل ہوئے ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، شورش کاشمیری صاحب، مجید نظامی صاحب، میر خلیل الرحمٰن صاحب، غلام احمد پرویز صاحب کے علاوہ پندرہ بیس دیگر مشاہیر بھی شامل تھے۔ سید مودودی صاحب کو یہ تقریب اس قدر بھائی کہ انہوں نے اردو میں اس ادارے کا نام ''میں نہ مانوں کلب'' بھی تجویز کر دیا۔ ایک اگلی میٹنگ کے

Rs.3 پاکستان
POETS OF PAKISTAN
FAIZ AHMED FAIZ
85TH BIRTH ANNIVERSARY

FAIZ AHMED FAIZ

فیض صاحب کے لئے پاکستان پوسٹ آفس کا خراج تحسین۔ یادگاری ڈاک لفافہ کا عکس

FIRST DAY OF ISSUE

یے میں فیض صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے شرکت کی حامی بھر لی' اور گفتگو کا موضوع Dissent in Art and Literatur مقرر کیا۔

ہم لوگ '' میں نہ مانوں کلب '' کی اس تقریب کے لیے مدعوئین کی فہرستیں تیار ہی کررہے تھے' کہ اوپر سے حکم نامہ آ گیا' کہ یہ خرافات بند کرو۔

اس تقریب میں بات چیت کے لیے فیض صاحب نے جو نوٹس تیار کر رکھے تھے' وہ انہوں نے میرے حوالے کر دیے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ دو اڑھائی صفحات چھ برس سے اوپر میرے پاس پڑے رہے۔ پھر 1968ء میں میں نے یہ کاغذات ان کو واپس لوٹا دیے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس برس مئی کے مہینے میں ہم لوگوں نے وزارت تعلیم میں ایک کانفرنس منعقد کی' جس میں اس وقت کے پاکستان کے دونوں حصوں سے میدان ثقافت کے نمائندوں' تنظیموں' اداروں اور آرٹ کونسلوں نے بھرپور شرکت کی تھی کانفرنس نے ایک standing Committee on Art and Culture قائم کی' جس کے چیئرمین فیض احمد فیض مقرر ہوئے۔

اسی روز شام کو فیض صاحب مجھے ملے' اور پوچھا کہ تم نے کمیٹی اور اس کے چیئرمین کے متعلق اوپر سے Clearance لے لی ہے یا نہیں؟

میں نے جواب دیا' کہ اگر میں پیشگی Clearance حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو غالباً نہ ملتی۔ اب کمیٹی قائم ہو گئی ہے' تو شاید چل نکلے۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ میری تھوڑی بہت جواب طلبی تو ضرور ہوئی' لیکن کمیٹی کو کسی نے نہ چھیڑا۔ فیض صاحب اس کمیٹی کو ساتھ لے کر پشاور سے چٹاگانگ تک بیسیوں جگہ گئے اور تین سو سے اوپر فنکاروں' ادیبوں' دانشوروں اور ماہرین ثقافت سے تبادلہ خیالات کیا' چھ سات ماہ بعد جب ان کی رپورٹ مرتب ہو کر وزارت تعلیم میں پہنچی' تو صدر ایوب کی حکومت کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کو اتنا ہوش نہ تھا' کہ وہ اس رپورٹ پر غور کر کے اسے منظور یا نامنظور کرتا۔ اس کے بعد پہلے ایک حکومت ٹوٹی۔ پھر مشرقی پاکستان ٹوٹا۔ پھر دوسری حکومت ٹوٹی۔ پھر تیسری حکومت ٹوٹی۔ اور اب معلوم نہیں کہ وہ رپورٹ اپنی اصلی صورت میں کہیں موجود بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ پس منظر تبدیل ہو چکا ہے' تاہم اس رپورٹ کے بعض حصے آج بھی غور طلب ہیں۔

1972ء میں جب Pakistan

National Council of the Arts کا قیام عمل میں آیا' تو فیض صاحب نے چیئرمین کے طور پر اس کی سربراہی قبول کرلی۔ دفتری سرخ فیتے کے Rules of Business کے مطابق بعض معاملات میں اس ادارے کی فائلیں منظوری حاصل کرنے کے لیے وزارت تعلیم میں آیا کرتی تھیں۔ ایک روز فیض صاحب نے مجھے فون کیا' کہ بہت ساری فائلیں جمع ہوگئی ہیں۔ میں انہیں لے کر تمہارے پاس کس وقت آجاؤں؟

فیض صاحب کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میرے جیسے دو دو ٹکے کے بیوروکریٹ تو ہر حکومت کو ہر زمانے میں تھوک کے بھاؤ ملتے ہی رہتے ہیں لیکن فیض تو نہ جانے کتنی صدیوں کے لیے فقط ایک ہی فیض ہے۔ چنانچہ میں نے کبھی انہیں فائلیں لے کر اپنے پاس آنے کا موقع نہ دیا۔ میں وقتاً فوقتاً خود ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور جس فائل پر وہ جو جو احکام صادر فرمانا چاہتے تھے ان پر بلاچون وچرا دستخط کرآتا تھا۔ میرے اس طریق کار کی وجہ سے یہ شکایت پیدا ہوئی' کہ منسٹری کا اس ادارے پر کوئی کنٹرول باقی نہ رہا۔ ایک دو تنک چڑھے وزیروں نے میرے اس عمل پر Inefficiency اور Negligence کی پھبتی بھی اڑائی' میں اس کو ہمیشہ خوش دلی سے قبول کرتا ہوں' اور اسے اپنے لیے ایک تمغۂ عقیدت سمجھتا ہوں۔

ایک بار مجھے فیض صاحب کے ساتھ ایک وفد میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے نیروبی جانے کا موقع نصیب ہوا۔ وہاں پر مہینہ بھر ہوٹل میں ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ ان دنوں وہ ''پیام مشرق'' کا منظوم اردو ترجمہ کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔ نیروبی میں پنجابی کے ایک شاعر سردار سوہن سنگھ بھی رہتے تھے۔ وہ فیض صاحب کے شیدائی تھے' اور ان کے ساتھ وقت گزارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ گنواتے تھے۔ ایک شام وہ فیض صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ خوب خاطر مدارت کی اور نذرانہ عقیدت کے طور پر انہیں ایک انگوٹھی کا تحفہ دیا' جس پر جلی حروف میں اللہ کا لفظ نقش تھا۔ واپس آکر فیض صاحب نے ہم سب کو بڑے شوق سے یہ انگوٹھی دکھائی کسی نے فقرہ چست کیا'' چلیے غنیمت ہے کہ نیروبی میں ایک سکھ نے آپ کو مسلمان تو سمجھا۔''

فیض صاحب مسکرا کر بولے۔ ''یہ بھی ضروری نہیں۔ کچھ لوگ تو یہی سوچیں گے کہ سکھوں سے ایک تازہ لطیفہ سرزد ہوگیا ہے!''

مذہب اور سیاست پر فیض صاحب کے ساتھ میری کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دراصل میں نے ان کے ساتھ کسی موضوع پر بھی کبھی کوئی طویل گفتگو ہی نہیں کی۔ ہالینڈ کے دارالخلافہ دی ہیگ' لندن اور نیروبی میں مجھے چند بار ان کی خدمت میں لگاتار کئی کئی گھنٹے اکیلے بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ ساحل پر بیٹھے ہوئے خاموش تماشائی کی طرح' جو اپنے سامنے پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھتا تو ضرور ہے' لیکن نہ اس کی وسعت سے واقفیت رکھتا ہے' اور نہ اس کی گہرائی میں جگمگاتے ہوئے موتی اور مونگوں کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فیض صاحب سمندر بھی ایسا تھے' جس میں کبھی جوار بھاٹا اٹھتا نظر نہیں آیا۔

فیض صاحب جیسے حساس' شریف النفس' سلیم الفطرت' حلیم الطبع اور انسان دوست افراد معاشروں کی تہذیب وتمدن کا جھومر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک یقینی پہچان یہ ہے' کہ موت کی تاریکی ان کی یاد کو دن بدن روشن سے روشن تر کرتی رہتی ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم میں سے اکثر نے فیض صاحب کو ان کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا' ان کے ساتھ ملے جلے' اور بات چیت کی۔

☆☆☆

فیض احمد فیض ایک غیر ملکی ثقافتی طائفے کا استقبال کر رہے ہیں

حمید اختر

فیض احمد فیض

گذشتہ ماہ جب فیض کی بڑی لڑکی سلیمہ نے سیالکوٹ سے لاہور تک کے سفر کے دوران میں سامان سمیت اپنا بھرا سوٹ کیس گم کر دیا تو بیگم فیض کو کپڑوں کی گمشدگی سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ سلیمہ بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر جا رہی ہے۔ دو روز بعد جب بیٹی نے باپ کے نقش قدم پر واقعی چلنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ بیٹی ابھی باپ سے بہت پیچھے ہے۔ ہوا یہ کہ فیض تانگے میں بیٹھے پولیس کے سپاہیوں کے ہمراہ جیل سے غالباً اسپتال جا رہے تھے۔ سلیمہ نے تانگے میں ابا کو دیکھا تو اچانک ملاقات کی خوشی میں اُس نے باپ کو زور سے پکارا۔ اتنے میں تانگہ کوئی بیس گز آگے نکل چکا تھا۔ سلیمہ نے اور پھر اس کے ساتھ اُس کی سہیلیوں نے مسلسل آوازیں دیں مگر فیض اپنے خیالات میں اتنے مگن تھے انہیں پتہ ہی نہیں چل سکا کہ انہیں بچیاں کتنے زور سے بلا رہی ہیں۔ شام کو جب بیٹی نے ابا کی بے خبری کا یہ واقعہ اماں کو سنایا تو اُس نے جھلا کر کہا "میں کیا کروں تم دونوں باپ بیٹی ایک سے ہو معلوم نہیں کہاں گم رہتے ہو۔ بھلا سوچو تو جس قیدی کو جیل سے باہر نکلنے کا موقع ملے اسے دنیا کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ گم سم رہنے اور اپنے ہی خیالات میں الجھنے کی؟"

بیگم فیض کی شکایت اس حد تک تو بجا ہے کہ انہیں اپنے شوہر کی غائب دماغی سے صبح، شام واسطہ پڑتا ہے مثلاً موٹر سٹارٹ کرنے کے لئے سیلف مارنے سے پہلے ان کو یا ان کی چھوٹی بچی منیزہ کو بہر حال یہ یاد کرانا ہوتا ہے کہ سوئچ لگائے بغیر موٹر سٹارٹ نہیں ہوتی۔ اگر وہ نہ بتائیں تو فیض کافی دیر تک سیلف مارتے رہیں گے، سگریٹ پیتے رہیں گے اور پریشانی میں پورا سگریٹ دروازے سے باہر بھی پھینک دیں گے۔

فیض کی موٹر ڈرائیوری کے سلسلے میں ان کے دوست انہیں اکثر پریشان کرتے رہتے ہیں مگر فیض کہتے ہیں کہ یہ اعتراضات غلط ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑے اچھے ڈرائیور ہیں مگر ان کے لئے یہ اندازہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ موٹر میں پٹرول کتنا ہے، کب ختم ہو گا یا گاڑی میں کیا خرابی ہے۔ ایک زمانے میں پٹرول کی مقدار ظاہر کرنے والی سوئی خراب ہو گئی اور اس زمانے میں اکثر لوگوں نے دیکھا کہ بیچ سڑک ان کی موٹر رک گئی ہے اور فیض خالی ٹینکی کو دیکھ رہے ہیں۔ بالآخر بیگم فیض نے مشورہ دیا کہ صبح گھر سے نکلتے وقت روزانہ دو گیلن پٹرول ڈلوا لیا کرو۔ یہ مشورہ انہیں بہت پسند آیا۔ لیکن آٹھ دس روز بعد وہ جب سویرے حسب معمول پٹرول پمپ پر پہنچے اور دو گیلن پٹرول کا آرڈر دیا تو معلوم ہوا کہ ٹینکی بھری ہوئی ہے، ہوا یوں کہ موصوف دو گیلن پٹرول روزانہ ڈالتے اور آدھا گیلن خرچ کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح پٹرول جمع ہوتا رہا۔ بیگم فیض کا کہنا ہے کہ انہیں پٹرول کے روزانہ خرچ کا اندازہ بھی ہونا چاہئے تھا اور یہ اندازہ نہیں رکھتے پھر انہیں شکوہ کرنے کا بھی حق حاصل ہے مگر ان کے سوا اور کسی کو شاید ہی فیض کی اس عادت پر کوئی اعتراض ہو۔

جیل سے نکل کر اسپتال کو جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بچی کو اور بقول بیگم فیض کے دنیا کو دیکھنے کی شاید کوشش نہ کی ہو مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ

وہ دنیا کو نہیں دیکھتے' فیض کے کردار کا یہ پہلو انتہائی دلچسپ ہے کہ وہ انتہائی سست اور انتہائی چست آدمی واقع ہوئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی سستی زیادہ تر جسمانی حد تک ہے اور چستی کا تعلق ان کی ذہنی کیفیت سے ہے۔ انہیں گم سم بیٹھنے اور گم ہونے کی اتنی عادت ہے کہ اگر وہ گم ہیں تو آپ ان کو مشکل ہی سے واپس لا سکیں۔ چند خاص دوستوں کو چھوڑ کر باقی رہی اجتماعات میں فیض کو دیکھ کر پتھر کے بت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ موڈ فیض پر اکثر غالب رہتا ہے۔ اور ایسے وقت میں کسی ناواقف آدمی کے لئے اس گہرائی کی تہہ تک پہنچنا ناممکن ہے جو فیض کے کردار کا خاص حصہ ہے۔ اس وقت اگر وہ اپنے مخصوص لباس کی بجائے تہمد باندھ کر کرتہ پہن لیں تو دیکھنے والا انہیں کا موکلی کا چودہری تو قرار دے سکتا ہے' شاعر یا دانشور ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔ ناواقف لوگوں کے لئے فیض پہلی نظر میں "ڈل" آدمی نظر آئیں گے لیکن جو لوگ ان سے واقف ہیں ان کے سامنے ایک بالکل متضاد تصویر ہوگی۔ اس جسمانی سست روی یا غفلت کوشی کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے "پاکستان ٹائمز" کی ادارت کے زمانے میں کبھی کوئی اداریہ دن میں نہیں لکھا بلکہ آخر وقت میں جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے تو انہیں بیٹھ کر لکھنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ دن بھر نہ لکھنے کے باوجود' اداریئے کے موضوع پر سوچتے رہتے اور گہری سوچ میں دن بھر اس قسم کی بدحواسیاں کرتے رہتے تھے جن کا ذکر بیگم فیض کرتی ہیں۔ فیض میں غور و فکر کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ وہ ہر ذہنی کام کو امکانی حد تک ٹالتے ہیں مگر جب یہ کام اور نہیں ٹل سکتا تو پھر وہ بیٹھ جائیں گے اور اسے مکمل کر کے دم لیں گے۔ "پاکستان ٹائمز" کے اداریئے وہ ہمیشہ آخر وقت لکھتے تھے مگر آج تک کبھی کسی شخص کو محسوس نہ ہوا ہوگا کہ یہ اداریہ یا اس کا کوئی حصہ جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اصل میں انہیں الفاظ کا مزاج سمجھنے میں بڑا کمال حاصل ہے اور ان کی یہ خصوصیت ان کے اشعار' اداریوں' حتیٰ کہ ریڈیو کی ان تقریروں میں بھی موجود ہے جن کا ابتدائی حصہ وہ مائیکروفون پر براڈ کاسٹ کرتے تھے اور آخری حصہ ساتھ ساتھ لکھتے بھی جاتے تھے۔

فیض کو دیکھ کر یا ان کے ساتھ بیٹھ کر مجھے ہمیشہ سمندر کے قرب کا احساس ہوتا ہے' یہ احساس مجھ پر اتنا حاوی ہے کہ گذشتہ دس برس میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی یہ احساس غالب رہا۔ اس کی کوئی وجہ شعوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آسکی لیکن اگر ان میں سمندر کی کوئی صفت موجود ہے تو وہ متلاطم اور امواج سمندر کی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا تعلق سمندر کے ٹھہراؤ اور سکون سے ہے۔ ایسا ظاہری سکون جس کے پیچھے قسم قسم کے اسرار چھپے ہوئے ہیں جن کی تہہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ سمندر میں لہریں اٹھتی ہیں' ساحلوں سے ٹکراتی ہیں' کف اڑاتی ہیں مگر اس سمندر کی سطح پر مجھے کبھی لہر اٹھتی نظر نہیں آئی۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایسا شخص جسے دکھ سہنے' اور درد کا بوجھ اٹھانے کا اس حد تک ملکہ حاصل ہے کہ اس کی پوری شاعری اسی کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے' بظاہر اس قدر پرسکون اور مطمئن نظر آتا ہے۔ فیض کو کسی سے جھگڑا کرتے کسی پر ناراض ہوتے' یا کسی کی مخالفت کرتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا! حتیٰ کہ کوئی آدمی کوئی کام لے کر ان کے پاس آ جائے تو وہ بحد امکان اس کی مدد کرنے میں ہر زحمت برداشت کرنے کو تیار نظر آئیں گے اور ان کی کوششوں سے کسی کا کام نہ بنے تو ان کی بے چینی میں اضافہ ہونا یقینی ہے۔ ایک دفعہ ایک صاحبزادے' بیکاری کی شکایت اور ملازمت کی تلاش میں آئے۔ فیض نے انہیں خط لکھ دیا' مہمان نے جیب خرچ بھی مانگا' وہ بھی دے دیا گیا مگر ملازمت نہ ملی' دوبارہ پیسوں کا تقاضا ہوا۔ پھر دے دیئے گئے۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا۔ آخر میں بعض دوستوں نے مہمان عزیز کی نیت پر شک و شبہ کا اظہار کیا تو آپ نے کہا۔ بالکل ٹھیک ہے اب اس کو پیسے نہیں دیئے جائیں گے۔ مگر اس دفعہ صاحبزادے صاحب تشریف لائے تو انہوں نے یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ وہ دنیا سے مایوس ہو کر خودکشی کرنے جا رہے ہیں اور آخری ملاقات کرنے آئے ہیں۔ ستم یہ ہوا کہ اس دن فیض کی جیب میں زیادہ پیسے نہیں تھے چنانچہ انہوں نے دفتر میں ادھر ادھر سے قرضہ حاصل کر کے اس لڑکے کو اچھی خاصی رقم دی اور اسے سمجھا بجھا کر رخصت کیا۔ میرا خیال ہے کہ خودکشی کرنے کا ارادہ اس کا بھی نہیں تھا مگر اس کمبخت نے شاعر کو یہ خبر سنا کر اتنا پریشان کیا کہ انہیں کئی روز اس کی خیریت کی پریشانی رہی۔ مجھے یاد ہے کہ اس پریشانی میں فیض نے کہا تھا بھئی تمہارے کمرے میں کوئی آدمی مرنے کے ارادے سے آ کر بیٹھا ہو اور تمہیں یہ معلوم ہو کہ ابھی یہ باہر جا کر زندگی کی آخری سانس لینے والا ہے تو سوچو تمہاری کیا حالت ہوگی۔ افوہ! ایسے لوگوں کا کیا علاج! بھئی مرنا اور پھر اس ارادے کا اظہار کرنا۔ کس قدر افسوسناک بات ہے۔

حساس آدمیوں کی خاموشی اور ظاہری سکون کو آسائش اور اطمینان کے احساس کا نام نہیں دیا جا سکتا' ہر بڑے فنکار کی طرح فیض میں بھی **conflict** موجود ہے لیکن عام زندگی میں فیض کا نقطہ نظر اتنا صحت مندانہ اور سائنٹفک ہوتا ہے کہ اس پر ہر آدمی کو حیرت ہوتی ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس دور میں مدہوش اور بیہوش شاعروں کا وجود باقی نہیں رہا لیکن اس کے باوجود فیض کی شاعری اور ان کی کام کرنے کی صلاحیت میں بڑا بعد معلوم ہوتا ہے۔ اپنے ہی دکھ درد میں ڈوبے رہنے کا دور ختم ہو گیا ہے۔ اس حقیقت سے

فیض بہت دیر سے آگاہ ہوئے ہیں اور انہوں نے اس آگاہی کو اپنی طبیعت کی افتاد کے برعکس اپنے مزاج کا حصہ بنالیا ہے۔ ان کے مزاج کے اس پہلو میں ان کی بیگم کا بڑا دخل ہے۔ مگر کتنے بگڑنے والوں کی بیگمیں دیکھتی ہی رہ گئیں اور بگڑنے والے نکمے ہو گئے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود فیض میں ذمے داری سے کام کرنے اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں آپ کو فیض کے چہرے پر جذبات کے آثار نظر نہیں آئیں گے۔ سوائے اس موڈ کے جسے "صمم بکم" کہہ لیجئے' یہی نہیں بلکہ وہ ہر بڑی سے بڑی بات پر "کوئی بات نہیں" کہہ کر یوں خاموش ہو جائیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ بیگم فیض اپنے شوہر کی اس عادت سے بجا طور پر نالاں ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ موٹر میں چار سواریاں بیٹھی ہیں۔ موٹر سٹارٹ ہونے کی بجائے پٹرول رکنے کی وجہ سے زمین سے چھ چھ انچ اونچی اچھل رہی ہے۔ مگر پوچھو کیا ہوا تو یہی کہیں گے "کوئی بات نہیں"۔ میرا خیال ہے کہ اس "کوئی بات نہیں" سے ان کی فرار کی ذہنیت یا پریشانیوں سے بچے رہنے کی خواہش کا بڑا تعلق ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہر وہ آدمی جو بنیادی طور پر نیک اور صلح کل قسم کا انسان ہے' ان پریشانیوں سے فرار ڈھونڈتا ہے۔ دکھوں اور مصیبتوں سے فرار۔ اپنے ہی نہیں' دنیا بھر کے' دوستوں اور اڑوسیوں پڑوسیوں کے دکھوں اور پریشانیوں کو محسوس کرنے کی ایک صورت' انہیں ٹالتے یا ان سے بچ نکلنے کی خواہش اس صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فیض ایسے معاملات میں اگرچہ حیرت انگیز حد تک متوازن دماغ آدمی ہیں۔ ان میں ضبط اور برداشت کی بے پناہ قوت موجود ہے تاہم درد کا احساس خواہ وہ کسی طرف سے ہو ان پر اپنا بوجھ چھوڑ جاتا ہے اور اس بوجھ سے نپٹنے کا طریقہ اس سے دور بھاگنے یا کم از کم دور رہنے کا اعلان کرنے ہی میں ہے۔

دوستی کے معاملے میں فیض بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں' یہاں تک کہ اگر ان کے دشمن بھی کہیں موجود ہیں تو ان کی صفیں بھی فیض کے دوستوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ غالباً ان کی صلح جوئی اور دوستی کے معاملے میں روایت پرستی ہے' ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کی دوستی کی عمریں زیادہ لمبی ہوں۔ فیض کے ابتدائی زمانے کے دوست اور ان کا ابتدائی حلقہ اب تک مثالی دوستوں کے گروپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فیض اپنے دوستوں کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے قائل ہیں۔ گذشتہ برس ان کے ایک دوست بے روزگار اور پریشان حال ہوئے تو انہوں نے کئی مہینے تک ان کے لئے کام مہیا کرنے کی کوششیں کیں۔ ایک آدھ دفعہ ان سے مشورے کی صورت میں کسی خاص کام کے بارے میں یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ یہ دوست یہ کام نہیں کر سکیں گے مگر فیض دوستوں کے کام آنے کے بارے میں کسی دلیل اور منطق کے قائل نہیں ہیں اور اس معاملے میں خالصتاً جذباتی آدمی ہیں چنانچہ انہوں نے صرف یہ کہا "نہیں کوئی بات نہیں" جب سر پر پڑے گا کر لیں گے۔ اصل میں دوست کی پریشانی دور کرنے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ اس میں ان کے لئے کچھ اور سوچنا ممکن نہ تھا اور بالآخر انہوں نے ان کے لئے کام مہیا کر کے ہی دم لیا۔ موجودہ زمانے کے نوجوان ادیبوں کو دیکھ کر مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ آج کے دور نے انسانوں کو اس قدر چھوٹا کیوں بنا دیا ہے۔ جس میں دوستی میں بھی ذاتی اغراض کا دخل زیادہ رہتا ہے۔ فیض اور اُن کا ابتدائی ادبی حلقہ چھ سات دوستوں پر مشتمل ہے۔ ان کی ملاقات دیکھئے' تو معلوم ہوگا جیسے نوجوان دوستوں کا ایک گروہ ہے جو باہمی محبت کے احساس تلے دبا جا رہا ہے۔ حسرت مرحوم کے انتقال پر میں نے فیض کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے بورڈ روم میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جذبات کی شدت میں ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے اور وہ ہر فقرے کے بعد اپنے آنسو پینے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ خالص سونا' یہ محبت' یہ وارفتگی آج کی دنیا میں مشکل ہی سے نظر آئے گی۔ یہ صرف اسی خمیر میں پائی جاتی ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نایاب ہو گیا ہے۔

فیض بہت بڑے شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک پوری نسل کے شعرا کو متاثر کیا ہے اور جدید اردو شاعری کو نیا اسلوب دیا ہے لیکن فیض بحیثیت انسان کے اس شاعر سے بھی بڑے ہیں۔ کوئی شاعر اچھا انسان ہوئے بغیر اچھا فنکار نہیں ہو سکتا اور فیض کو پرکھنے کے لئے یہی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ فیض کو اپنی والدہ' بیوی' بہنوں اور بچیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کے والد کے پاس بہت زمین تھی لیکن یہ شاہانہ مزاج جو فیض کا مزاج ہے ان کو اپنے والد ہی سے ملا ہے۔ ان کے والد کنبے کو' دوستوں کو' ملنے والوں کو پالتے رہے۔ کسی کو ولایت بھیج رہے ہیں' کسی کو تعلیم دلا رہے ہیں' کسی کی شادی کر رہے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا انتقال ہوا تو زمین کا بہت بڑا حصہ بیچ کر قرض اتارا گیا۔ جو زمین باقی تھی اس کا مقدمہ چلتا رہا اور عملاً انہیں اپنی اس وراثتی جاگیر سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا اور نہ کبھی انہوں نے اس کی کوشش ہی کی ہے۔ یہ فقر و استغنا ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد جب انہیں گھر سے ایم۔ اے کے داخلے کے لئے پیسے ملے تو انہوں نے لاہور پہنچ کر ساری رقم جشن اور ہاؤ ہو میں خرچ کر دی۔ جب داخلہ لینے لگے تو معلوم ہوا کہ رقم بہت کم ہے اور سو دو سو روپوں کی اور ضرورت ہے۔ البتہ عربی ایم۔ اے کلاس میں داخلہ صرف چند روپوں میں مل سکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے عربی ایم۔ اے میں داخلہ لیا اور ایم۔ اے ہو گئے اس کے بعد دوبارہ

انگریزی کے مضمون میں سند لی۔

دوستوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے میں فیض کا کوئی ثانی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ کوئی دوست اگر کہیں "نامناسب عشق" بھی کر رہا ہے تو وہ اُسے "بیک اپ" کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ اگر کوئی ان سے دھوکا بھی کر جائے تو وہ اُسے فوراً معاف کر دیں گے اور اصل میں اسی چیز کو میں زندگی کے بارے میں ان کا صحت مندانہ نقطۂ نظر قرار دیتا ہوں۔ یہ قابلِ رشک خوبی اگر چند دوسرے لوگوں میں پیدا ہو جائے تو دنیا کی بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں۔ آپ ان سے کسی کی شکایت کریں تو وہ کہیں گے "چلو چھوڑو پھر کیا ہوا"۔ اگر آپ جا کر ان سے عشق کے معاملے میں مدد طلب کریں تو وہ فوراً مدد کرنے کو تیار ہو جائیں گے اور لڑکی والوں کے گھر پیغام پہنچانے پر بھی راضی ہوں گے۔ کنوارے نوجوانوں کو ان کا مشورہ فی الفور شادی کرنے کا ہوتا ہے اور ایسے دوستوں کو جو ناکام عاشقوں کے زمرے میں آتے ہیں وہ ملامت بھی ضرور کریں گے۔ دراصل فیض لوگوں کو آسودہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اگر آپ ان کے دوست ہیں اور اپنی معشوقہ کے ہمراہ ان کے گھر جاتے ہیں تو آپ انہیں ہمہ تن دیدہ و دل فرشِ راہ پائیں گے' ان کے کان میں کہئے "صاحب لڑکی کے والدین شادی کے لئے نہیں" مانتے تو وہ فوراً جواب دیں گے "مان جائیں گے مجھے ساتھ لے چلو...."

فیض کو کوئی کام نہ ہو اور انہیں گھر پر ہی رہنا ہو تو وہ بڑے ٹھاٹھ سے دن گزاریں گے مثلاً دیر تک بستر میں بیٹھ کر چائے پیتے رہنا' اخبار پڑھتے رہنا اور مطالعہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ نہانے سے وہ حتی الامکان گریز کرتے ہیں اور اصرار کرنے پر وہ بیگم سے یہ ضرور پوچھیں گے۔ "نہانا ضروری ہے" جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے تو وہ مجبوراً نہائیں گے۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ جیل کی زندگی کے سوا فیض نے اپنے ناخن خود کبھی نہیں کاٹے' نہ ہی سر کے بال کبھی خود دھوئے ہیں بلکہ یہ فرائض بیگم فیض کو انجام دینے پڑتے ہیں۔ چنانچہ منیزہ نے گذشتہ برس جب فیض سوویت روس گئے ہوئے تھے انہیں ایک خط لکھا تھا۔ جس کا آخری فقرہ یہ تھا۔ کہ "وہاں پر آپ کے بال کون دھوتا ہے۔" کوئی کتاب وہ شروع کریں گے تو اُسے ختم کر کے دم لیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ شروع کرنے میں دیر کریں لیکن جب اس میں مشغول ہو جائیں گے تو پھر انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہے گا۔ شام کو ان کے لئے اکیلے رہنا یا گھر میں بیٹھنا بڑا مشکل ہے اور اُس وقت فیض کی خواہش مجلس برپا کرنے کی ہوتی ہے۔ دوستوں سے مل بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے لئے شام کو وہ ہر کام چھوڑنے پر راضی ہوں گے۔ یہ بات بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص مجلس میں بیٹھ کر بھی عام طور سے مجلس سے باہر نظر آتا ہو اُسے مجلسیں برپا کرنے کا اس قدر شوق کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن شام کو محفل برپا کرنے یا کوئی ثقافتی پروگرام دیکھنے' یا سننے اور ڈرامہ دیکھنے کے لئے وہ سب کام چھوڑ دیں گے۔ فیض کو اچھا کھانے اور "اچھی پینے" کا بے حد شوق ہے لیکن اس میں حد سے تجاوز کرتے انہیں شاید ہی کسی نے دیکھا ہو' دراصل اس کا تعلق بھی ان کی مجلسی زندگی سے ہے اور اس میں انہیں خوشی بھی ہوتی ہے۔ فیض اپنے وطن بلکہ شہر سے باہر نہیں رہ سکتے' حب وطن کی کئی اقسام ہیں۔ لوگ روایتی یا شعوری طور پر وطن سے محبت کرتے ہیں لیکن فیض کے حب وطن کو میں خمیری حب وطن کا نام دیتا ہوں۔ وطن کی محبت ان کے خمیر اور مزاج میں شامل ہے۔ آج بھی وہ طبعاً سیالکوٹ کے ایک جاٹ ہیں جن کا تعلق اپنے وطن کی سرزمین سے اتنا گہرا اور اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔ گذشتہ برس کے آخر میں انہیں برطانیہ میں بڑا اچھا کام مل رہا تھا مگر انہوں نے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ملک سے باہر نہیں رہ سکتے۔ لاہور اور امرتسر میں ان کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا ہے اور یہ دونوں شہر اپنی مخصوص تہذیبی روایات رکھتے ہیں۔ فیض پر ان دونوں شہروں کی تمام روایات کی گہری چھاپ ہے۔ اب بھی وہ رات بھر جاگنے' بحث کرنے' ہاؤ ہو کرنے اور آوارہ گردی کرنے پر تیار رہتے ہیں اور اگر انہیں بیوی کا خیال نہ ہو تو شاید وہ عام طور پر رات رات بھر گھومتے رہیں۔ محفل برپا کرنے اور رتجگے کی روایتیں امرتسر اور لاہور کے ادبی حلقوں میں بہت پرانی ہیں۔ ان پرانی مجلسوں کا ذکر کرنے پر فیض آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں بہت شدت سے یاد کرتے ہیں لیکن فیض پرانی یادوں کا ماتم نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو آس پاس بیٹھنے اور پڑھنے سننے والوں کبھی کو اس میں شریک کر لیتے ہیں' لیکن اپنے فن کے توسط سے فیض نے جب بھی ذاتی یا کائناتی دکھوں کا ماتم کیا ہے' تصویر کا روشن پہلو بھی سامنے رکھا ہے' یہ بات بڑی عجیب ہے کہ فیض میں محسوس کرنے اور درد سہنے کا بے پناہ جذبہ موجود ہونے کے باوجود ان کی شاعری اور عام زندگی کی بات چیت میں رجائیت کا اتنا گہرا دخل ہے۔ فیض اگر سو برس پہلے پیدا ہوتے تو شاید ان کی زندگی رونے پیٹنے اور فریاد کرنے میں گزرتی۔ دراصل یہ موجودہ دور اور فیض کے اپنے شعور کا نتیجہ ہے کہ جہاں انہوں نے روایتی خیالات اور ترقی پسند شاعری کا خوبصورت سنگم تعمیر کیا ہے وہاں وہ روحانی کرب Spiritual Suffering کی انتہا پر پہنچنے کے باوجود عملی آدمی ہیں اور زندگی اور مستقبل کی بہتری میں یقین رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆

مشتاق احمد یوسفی

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

(یہ مضمون فیض صاحب کی 90 ویں یومِ پیدائش کی تقریب میں آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں 25 مارچ 2001 کو پڑھا گیا۔ اس کا بیشتر حصہ اس مضمون پر مشتمل ہے جو 'فیض امن میلہ: نذرِ کمال' لاہور میں 12 فروری 1992 کو پڑھا گیا تھا۔ اس میں اس تعزیتی مضمون کے چند اقتباسات بھی شامل ہیں جو اردو مرکز لندن میں 23 نومبر 1984 کو پڑھا گیا تھا۔)

مرحوم اکابرین کی یاد میں تقاریب بطور خاص لائقِ ستائش و مبارکباد ہیں۔ اس لیے کہ وہ صحیح معنوں میں ارادت و عقیدت اور تحسینِ سخن شناساں کا سچا، بے غرض، خالص و پرخلوص اظہار ہوتی ہیں۔ ورنہ جہاں تک اللہ رکھے' زندوں کا تعلق ہے' کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا جب اُن کی نئی کتابوں کی رسمِ اجرائی کی تین چار تقریبیں نہ ہوتی ہوں۔ دو تین گھنٹے میں صاحبِ دیوان اور صاحبِ کتاب یعنی صاحبِ شام کی جتنی اور جیسی مبالغہ آمیز تعریف کی جاتی ہے' وہ اسے عمر بھر غلط فہمی میں رکھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ چھت بلاشبہ بے حد مضبوط اور پائیدار ہے۔ اس کے نیچے اتنا جھوٹ بولا گیا ہے کہ معمولی چھت تو کبھی کی ہم پر گر گئی ہوتی! ایسا لگتا ہے کہ اسی کے بے مثل آرکی ٹیکٹ نے ہماری عدالتوں، اسمبلیوں اور پلاننگ کمیشن کی عمارتیں ڈیزائن کی ہیں۔ اس لیے کہ سب سے زیادہ جھوٹ انہیں کی چھت تلے بولا جاتا ہے:

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ

یہ بات میں تعریف میں غلو کرنے والوں پر طنز و استہزا کی نیت سے نہیں کہہ رہا' اس لیے کہ اس طرح کی شاموں میں اس طرح تالیفِ قلوب کی خاطر جھوٹ بولنے والے غلو کاروں کی فہرست میں میرا نام بھی کہیں نہ کہیں ضرور آئے گا۔

ایک مختصر وقفے کے بعد شیما کرمانی فیض صاحب کی تین خوبصورت اور خیال انگیز نظموں پر مبنی اپنی کوریوگرافی کے مسحور کن کمالات کا مظاہرہ کریں گی۔ ایسے نگارخانۂ رواں اور رمی رقص میں وہی فرق ہے جو تنہا پورٹریٹ پینٹ کرنے اور میورل میں ہوتا ہے یا بدھ کی مورتی اور اجنتا، ایلورا اور کھجوراہو کے فریسکوز اور منظر تراشی میں پایا جاتا ہے۔ ایسے رقص سے پہلے تقریر کرنے میں قباحت یہ ہے کہ سامعین بار بار گھڑی دیکھتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ یہ شخص اسٹیج سے دفان ہو تو اصل پروگرام شروع ہو۔ رہا ڈانس کے بعد تقریر کرنا تو یہ ایسا ہی ہے جیسے نہایت لذیذ اور پُرتکلف ڈنر میں مہمانوں کو آئس کریم کھلانے کے بعد آپ مٹی کی پیالیوں میں ستو یہ کہہ کر پیش کریں کہ فقیر نے دانہ ہائے گندم و جو اپنے دستِ خاص سے بھونے اور پیسے ہیں!

ایسی صدارتی تقریر کو تھیٹر کی اصطلاح میں Curtain-raiser کہا جا سکتا ہے۔ کرٹن ریزر کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ جب تک اصل تے وڈا کھیل شروع نہ ہو' ناظرین کا جی کسی بالکل غیر متعلق ہلکے پھلکے آئیٹم سے بہلایا جائے۔ اس ترکیب سے گنجے ایکٹروں کو اطمینان سے وگ اور داڑھی مونچھ لگانے اور میک اَپ سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کرنے کی مہلت مل جاتی ہے۔ اسی طرح ایکٹریسوں کو اپنے فگر کے نشیب کو فراز اور فراز کو نشیب بنانے کے لیے مزید وقت مل جاتا ہے۔ اس بہانے کچھ اور ٹکٹ بھی بک جاتے ہیں۔

رقص، ہمارے ہاں' ہنوز ممنوع و مکروہ و معتوب فن ہے۔ ہماری conditioning کچھ ایسی ہوئی ہے کہ جس کام یا عمل میں ہمیں لطف و انبساط یا محض راحت ہی محسوس ہو' اُس میں ہمیں گناہ کی ملاوٹ نظر آتی ہے! خیر' مرد تو اپنی قلندری' رندی اور رسوائی پر ہر دور میں فخر کرتے رہے ہیں:

بصد سامانِ رسوائی سرِ بازار می رقصم

لیکن بیچاری رقاصہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی دعویٰ کر سکتی تھی کہ:

بصد سامانِ زیبائی، پسِ دیوار می رقصم

یادش بخیر' ہمارے ایامِ جوانی میں' شریف گھرانوں میں مور کے ناچ کے علاوہ کسی اور کا ناچ دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بیت الخلا میں ایک پیسے کی سگرٹ چھپ کر پینے کا شمار عیاشی بلکہ نری بدمعاشی میں ہوتا تھا! اس سے اُس زمانے میں سگرٹ کی خوردہ قیمت کے علاوہ معصوم بزرگوں کے معیارِ عیاشی اور

پیمانہ لہو و لعب کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تو میں عرض یہ کرنے چلا تھا کہ پہلے پہل جو زندہ ناچ اپنی زندگی میں دیکھا اُس کی دہشت عرصۂ دراز تک دل پر بیٹھی رہی۔ اس یادگار رقص کا اہتمام بچا جان نے ہماری سنتوں کی خوشی میں کیا تھا۔ موتی نامی ایک باکمال طوائف کا رقص ہم نے اپنے نچلے دھڑ پر پلنگ کی چادر ڈال کر دیکھا۔ یہ رقص دیکھ کر ہمارا ناپختہ ذہن اس نتیجے پر پہنچا کہ آئندہ بھی رقص دیکھنے سے پیشتر ہر مرتبہ اس مرحلے سے گزرنا پڑے گا۔ چنانچہ ایک مدت تک رقص کے نام ہی سے بدن میں ایک کپکپی محسوس ہوتی تھی۔ بعد میں تو فقط پلنگ کی چادر اور پشواز دیکھ کر یہی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ تو خدا بھلا کرے ناہید صدیقی اور شیما بی بی کا جن کے بے ضرر رقص دیکھ کر یہ خوف دل سے نکلا اور ہمارا بیا ڈ کھلا۔ جیسا کہ آپ نے ہماری باتوں سے خود بھانپ لیا ہوگا۔

شیما کرمانی اپنے ٹیبلوز اور موضوعاتی رقص میں ڈرامائی **situation** اور نظموں کی فنکارانہ انداز سے تشکیل و تجسیم کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ انہیں "رقصانے" کا ہنر جانتی ہیں۔ ایک ذہین، مشاق اور جدت پسند کو ریوگرافر کی طرح وہ اس رمز سے واقف ہیں کہ رقص اُس ساعت نایاب میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے جب رقاصہ نظر آنی بند ہو جائے اور صرف رقص نظر آئے! انگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے۔ رقص خواہ بھارت نٹیم ہو یا کتھک، منی پوری ہو یا اُڑیسی...... اس میں خیال اور جذبے کا اظہار آنکھوں، ابروؤں اور ہاتھوں کی جنبش اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے کیا جاتا ہے۔ اور یہی کلاسیکی انداز، رکھ رکھاؤ اور رہت ٹھاٹ شیما نے اپنایا اور برتا ہے۔

جس قسم کے ڈانس اور جس قماش کے ڈانسر آج کل زی ٹی وی اور اُس جیسی دوسری انڈین چینلز پر دکھائے جا رہے ہیں، اُن میں جسم کا صرف ایک حصہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر جذبے اور ہر ایسی خواہش کا اظہار و اعلان جس سے گھر بگڑے، اب صرف کولہوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ ہم تو بچپن سے یہی سنتے اور سمجھتے آئے تھے کہ کولھے صرف بیٹھنے، پتلون کو پھسلنے سے باز رکھنے اور اسکول میں بید لگوانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ تو اب دیکھا کہ پوری **emotional range** یعنی جذبات کی ساری سرگم کولہوں سے اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ، کیا بتائیں، دل پہ چھری سی چل جاتی ہے۔ مٹکنے مٹکانے اور ٹھمکا لگانے یعنی **hip-swinging** اور **wiggling** کو فنونِ لطیفہ کا درجہ دینے کا کریڈٹ ان چینلز کو جاتا ہے۔

یہ سب اپنی جگہ، مگر ہمارے یار طرحدار مرزا عبدالودود بیگ کہتے ہیں کہ ان ڈانسز میں اتنے کوک شاستری پینترے، ایسی بے حیائی اور اس قدر ستر کشائی اور عریانی ہوتی ہے کہ واللہ پلک جھپکنے کو جی نہیں چاہتا! کچھ علاج اس کا بھی صاحب نظراں ہے کہ نہیں؟

جمناسٹک اور ایسے ڈانس میں فرق یہ کہ جمناسٹک میں ایک **rhythm** آہنگ، لوچ اور حسن تشکیل ہوتا ہے۔ جمناسٹک کے کچھ قاعدے اور ضابطے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے وقتوں میں جمناسٹک کرتے وقت کم از کم نیکر پہننا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ زی ٹی وی والے ڈانسز میں چولی اور پشواز کی جگہ چار گرہ سے بھی کم کی دھجی سے ہماری بینائی اور ایمان کی آزمائش اس طرح کی جاتی ہے کہ: کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے۔ غالب نے غالباً ایسی ہی ستر پوشی کے لیے کہا تھا:

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
رہے مردنا چنے والے، سو وہ بھی اب ثانی غلط جگہ باندھنے لگے ہیں؟

جوش صاحب کا یہ مقولہ اب تو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکا ہے کہ رقص اعضا کی شاعری ہے۔ مرزا کو یہ قول اتنا پسند آیا کہ اکثر فرماتے ہیں، شاعری الفاظ کا رقص طاؤس ہے!

لکھتے لکھتے یونہی خیال آیا کہ "رقص" عربی لفظ ہے۔ ذرا لغت میں اس کے معنی تو دیکھیں۔ بعض اوقات لغت دیکھنے سے بھی کوئی نیا شوشہ یا شگوفہ ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی داد، بدقسمتی سے، صرف لغت مرتب کرنے اور اس کے پروف پڑھنے والے ہی دے سکتے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ بھی میری حیرت اور فرحت دلگشا میں شریک ہوں۔ اس لفظ کے دو معنی نکلے۔ پہلے تو وہی جس سے میں لغت دیکھنے سے پہلے بھی واقف تھا، یعنی ناچ۔ دوسرے معنی ملاحظہ ہوں، توجہ چاہتا ہوں: "اونٹ کی اچھلتے اور کودتے ہوئے دوڑ۔" گویا رقص شتر مع شتر غمزوں کے۔

حیرت ہوتی ہے کہ جس عرب نابغۂ روزگار نے یہ لفظ ایجاد یا وضع کیا، اُس نے ہزاروں برس پیشتر زی ٹی وی اور **pop** راگ اور رقص کی ایسی **realistic** تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ جس قدر عش عش کریں، کم ہے۔

فیض صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات لندن میں مخدومی ماجد علی صاحب اور محترمہ زہرا نگاہ کے یہاں ہوئی۔ یہ وہی ماجد صاحب ہیں جن سے ایک مشہور لطیفہ منسوب ہے۔ ایک دفعہ اُن کے باس یعنی وزیر خزانہ کے دفتر کے سامنے کچھ دور پر لوگ عزت مآب کے خلاف "ایوب خاں کا چچا! ایوب خاں کا چچا!" کے نعرے لگا رہے تھے۔ وزیر موصوف نے ماجد صاحب سے پوچھا "یہ لوگ کیوں شور مچا رہے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "سر! یونہی کچھ کنٹری کے بارے میں واویلا کر رہے ہیں!" مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ ماجد صاحب نے فیض صاحب سے میرا

تعارف کرایا یا نہیں۔ فیض صاحب اُس وقت حسب معمول ہجوم عاشقاں میں گھرے بیٹھے تھے۔ میں بھی حسب معمول بالکل خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ فیض صاحب اُن دنوں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور اُس وقت' موجودہ صورتِ حال پر بہت نپا تلا اور شگفتہ تبصرہ کر رہے تھے' جس میں تلخی وطنز کا شائبہ تک نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے' یا پھر وہ خود ہی حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔

ایک صاحب' جن کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی پلاس سے لکڑی میں سے زنگ خوردہ کیل کھینچ رہا ہو، وقفے وقفے سے اعلان فرما رہے تھے کہ پاکستان بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ میں یہ فقرہ سنتا ہوں تو اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے' کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ کسی نہ کسی لیڈر نے یہ بشارت نہ دی ہو کہ پاکستان بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے! صاحبو! کیسی نزاکت ہے کہ 45 سال سے بدستور چلی آرہی ہے! یہ تو بڑی مضبوط ساخت کی نزاکت معلوم ہوتی ہے!

دوسرے دن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیض آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے دامن میں منہ ڈالے' گم سم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے اُنہیں بتایا کہ یہ یوسفی صاحب کا نارمل پوز اور پڑوس ہے! وہ بہت شرمیلے' بند بند سے آدمی ہیں۔ جب تک ڈھائی تین سو حاضرین نہ ہوں' کھلتے نہیں! فیض صاحب کہنے لگے' تم نے تعارف کیوں نہ کرایا؟ میں نے کہا' فیض صاحب! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ یوسفی صاحب آپ سے کبھی نہیں ملے۔ کہنے لگے' ہاں؟ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے یاد نہیں۔ بڑی ندامت ہے۔ صبح ہی مجھے لے چلو۔

میں نے افتخار عارف سے کہا' فیض صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضرِ خدمت ہو کر اپنے مُشک کا تعارف کروا دے گا۔ جائے واردات وہی مرجع خلائق ماجد علی اور زہرا نگاہ کا دولت کدہ جہاں ماجد صاحب اردو کے بہترین مہمل اشعار سے جو انہیں بکثرت یاد ہیں' محفل کو گرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں' "عمدہ مہمل شعر کہنے کے لیے بڑی ذہانت اور تائید ایزدی درکار ہے جو ایسے ویسے شاعر کا کام نہیں۔ اردو شاعری میں ایک خرابی یہ ہے کہ گھٹیا آدمی بڑے بڑھیا شعر نکال سکتا ہے۔" اس کا سبب ردیف قافیے کی بیساکھیاں ہیں۔ پر غزل ہے بڑی ظالم صنف۔ اپنے چاہنے والوں کو کہیں کا نہیں رکھتی:

غزل کھا گئی نوجواں کیسے کیسے

شام کو ملاقات ہوئی تو فیض صاحب خواہ مخواہ اتنے محجوب تھے کہ خود مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصوروار ٹھہرا رہے ہیں کہ میری اور اُن کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اس انکسار اور حسنِ اخلاق سے میں اس لیے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں خیال تھا کہ انہوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی۔ سُنی سنائی تعریف پر ایمان لے آئے ہیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسبِ معمول اپنے خول میں بند' اور جب دونوں سینئر فریق شرمیلے واقع ہوں تو عزیزی افتخار عارف کا طوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے۔

اس کے بعد جب ملے تو یوں لگا جیسے وہ مجھے سالہا سال سے جانتے ہیں۔ یہ تو ہوئی لندن میں تعارفی ملاقات۔ اب ایک اور یادگار ملاقات کی جھلک ملاحظہ ہو۔ ہفتے کی صبح تھی' جو لندن کی صبح کے بجائے کسی اور ملک کی صبح معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے کہ شرمیلا سورج کئی دن بعد سیاہ بادلوں کا گھونگٹ اُلٹ کے پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ فیض صاحب جس خوبصورت مکان میں مقیم تھے وہاں ناشتے میں ایک دن پورج اور دوسرے دن کارن فلیکس اور نیم برشت انڈا ملتا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے کہ آج ہری مرچ' پیاز اور زیرے والے پاکستانی آملیٹ کی باری تھی۔ گہرے نیوی بلو سوٹ اور شوخ ٹائی میں وہ بہت سمارٹ لگ رہے تھے۔ وہ اپنا بستر آپ بناتے' کپڑے خود تہ کرتے اور کمرے کی چیزیں ٹھکانے سے رکھتے۔ کسی کو اپنا بنیان مشین میں بھی نہیں دھونے دیتے تھے۔ اس وقت زاد بوم سیالکوٹ کی باتیں کر رہے تھے جو ایامِ جلاوطنی میں ان کا محبوب موضوع تھا۔ دوسرا دل پسند موضوع وہ زمانہ تھا جب انہوں نے فلم بنائی تھی۔ اس کا ذکر وہ بڑی تفصیل اور للک سے کرتے تھے۔ ان موضوعات کے ساتھ مختصر وقت میں ایمرجنسی انصاف کرنے کے بعد صاحب خانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھئی یہ کیا ہر وقت غالب' غالب کرتے رہتے ہیں آپ لوگ؟ سودا پڑھیے' سودا۔ بڑا جان دار' بہت تہ دار شاعر ہے۔ اس پر صاحب خانہ بولے کہ "جوش صاحب کو اس پر بہت اصرار ہے کہ کلکتے یا سرگودھے جانا ہے' بولا جائے۔ سرگودھا جانا ہے' غلط ہے۔ اس لیے کہ گھوڑا کی دُم اور تالا کی چابی نہیں کہتے۔ تو جناب والا' خاکسار گریمر اور املے کے اسی قاعدے کے مطابق اسی املے میں جملے گھڑ کر عرض کرتا ہے کہ سودے کے قصیدے اور انشے کی غزلیں اب فیشن میں نہیں رہیں۔ محققین نے شفیقے کی زندگی میں نزاکت نامی ایک طوائف کا سُراغ لگایا ہے۔ سُراغ کیا' خود ان کے کلام میں ذکر ہے۔ بقول یوسفی صاحب "چہ دلا ور ست دُزدے کہ بکف سُراغ دارد۔" فیض صاحب آملیٹ کا ٹکڑا کاٹنے میں اتنے'

ملفوظات میزبان کو خاموشی سے سنتے رہے۔ جوش صاحب کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا۔

ناشتے کی میز کے پاس ایک اور مہمان جن کا شیو بڑھا ہوا تھا فرش پر آلتی پالتی مارے عجیب طریقے سے ناشتہ کر رہے تھے۔ وہ رات بھر کہیں سے نوش کر کے آئے تھے۔ صبح اپنی میزبان سے کہا کہ بی بی! ہم تو ملنگ آدمی ہیں۔ سوکھی۔ باسی روٹی سے ناشتہ کریں گے۔ ایسی روٹی فراہم کرنے میں چنداں وقت نہ ہوئی' اس لیے کہ لندن میں جو تازہ روٹی ''گریک بریڈ'' یا ''یونانی نان'' کے نام سے ملتی ہے' اُس میں یہ دونوں خوبیاں روزِ اوّل سے موجود ہوتی ہیں۔ ہم جس وقت پہنچے تو یہ مست ملنگ واقعی سوکھی روٹی کھا رہا تھا...... ایک پیالے میں ڈبو ڈبو کر جو ''رائل سلیوٹ'' سے لبریز تھا۔ تعارف ہوتے ہی ہمیں ''تم'' کہنے لگے اور اب کسی لمحے بھی ''تو'' کہہ سکتے تھے۔ فرمانے لگے ''تمھیں سُن کے افسوس ہوگا کہ آج کل مُدرکہ کام نہیں کر رہی۔'' ہم سمجھے کہ مُدرکہ سے مُراد ان کی بیگم ہیں جو باسی نان کی طرح نام سے یونانی نژاد معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے از راہِ ہمدردی پوچھا:

How long has she been unemployed?

جھنجھلا کر بولے' میری قوتِ مُدرکہ فیل ہوگئی۔

اب ہم یہ سمجھے کہ جیسے ان کی اور قوتیں باری باری جواب دے چکی ہیں' ویسے ہی یہ بھی کوئی قوت ہوگی جو اچانک دغا دے گئی۔ فیض صاحب نے صراحت کی کہ ان کی مُراد قوتِ ادراک سے ہے تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھرتے جانے کس ضمن میں یہودی لابی کا ذکر آیا تو کہنے لگے میرا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ نے عصا کو طور کے غیر متوقع واقعہ کے بعد رکھنا شروع کیا ہو گا۔ وہ ترنگ میں تھے۔ فیض صاحب بھی خاموش سنتے رہے۔ اُن کی کسی بھی بات کی تردید مشکل تھی۔ کہنے لگے' میں نے پروفیسروں تک کو اقبال کا یہ مصرع اس طرح پڑھتے سنا ہے' جو سراسر غلط ہے:

یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

اصل مصرع یوں ہے:

یا تُو خود آ! شکار ہو، یا مجھے، آ! شکار کر

ہم نے عرض کیا' مگر اس طرح تو مصرع وزن سے گر جائے گا۔ جھٹکا لگتا ہے۔ اس پر انہوں نے مصرع اپنی فی البدیہہ کمپوز کی ہوئی نون غنوی دھن میں گا کر سنایا' جس میں ہر حرف کی آواز منہ کے بجائے ناک سے نکل رہی تھی۔ اس میں سکتہ پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پوچھنے لگے' کہاں ہے جھٹکا؟ انہیں نظر نہ آیا' ورنہ شعر اور شکار دونوں کا جھٹکا ہو چکا تھا!

کچھ دیر بعد جیسے ہی نانِ شبینہ کا نشہ چڑھا تو کہنے لگے' صاحب! ایک نیا development ہوا ہے! یہ زمانے کو کیا ہو گیا؟ بیویوں نے مرنا ہی چھوڑ دیا! یہ ریت ہی دُنیا سے اُٹھ گئی۔ بخدا!''

یہ بُری خبر سنانے کے بعد اِن صاحب نے فیض صاحب کو شاعری سے متعلق چند ہدایات دیں۔ فیض صاحب کی ایک بہت ہی حسین نظم ''تنہائی'' کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ نظم اچھی ہے۔ مگر سنسان بہت ہے! اس میں تنہائی ایسے محسوس ہوتی ہے جیسے لندن میں سردی' یعنی لگتی ہے تو لگتی ہی چلی جاتی ہے۔ کم از کم ایک لائن میں تو محبوبہ کو ڈالیے'' اُن کا اصرار بڑھا تو فیض صاحب چائے کی چُسکی ایک سُریلی سی سِسکی کے ساتھ لیتے ہوئے بولے ''ہاں' بھئی بی بی' اگلے ایڈیشن میں ڈال دیں گے۔''

اردو ادب کی تاریخ میں تین مرنجاں مرنج اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جن کی ذاتی شرافت وشائستگی اور عظمت وبرگزیدگی اُن کی تحریر سے بھی جھلکتی ہے۔ یہ تینوں اپنے مزاج واقدار کی بلندی' شیرینی اور شائستگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیتے ہیں۔ اور اپنے لہجے میں اپنی طبیعت وکردار کا سارا حُسن لے آتے ہیں۔ یہ ہیں خواجہ الطاف حسین حالیؔ' رشید احمد صدیقی اور فیض احمد فیض۔ جہاں قول' فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا ہوا چھوڑ آئے' وہاں حرف اپنی حُرمت وتاثیر کھو دیتا ہے۔ خالی ظرف کی طرح لفظ بھی جتنے تھوتھے ہوتے ہیں' اتنے ہی زیادہ بجتے ہیں:

چھچھلے آنسو، چھچھلی لاگ

کچا پانی، کچی آگ

حرفِ بے تاثیر بُومرینگ کی مانند ہر بار شاعر کے پاس واپس آ جاتا ہے۔ جو حرف کسی تجربہ اور آدرش کی آنچ پر نہ تپایا گیا ہو وہ کبھی دل میں نہیں اترتا۔ یہ بات نہ صناعی سے آتی ہے' نہ عروض وریاض سے۔ شاعری میں فیض صاحب کا رشتہ اہلِ تال سے نہیں' اہلِ حال سے ملتا ہے۔ انہوں نے اس رمز کو ابتدائے سفر ہی میں پا لیا کہ صرف ایک جذبۂ صادق اور سوزِ دروں ہے جو:

حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

فیض صاحب کی طبیعت میں صبر وتحمل' قوتِ برداشت اور بُردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بلکہ بلحاظ مقدار ایسا لگتا تھا کہ کوٹ کوٹ کر نہیں' سالم بھر دی گئی ہے۔ لوگ اسی کو کاہلی اور آلکسی محمول کرتے تھے۔ اس کے بھی لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک نوجوان نے پوچھا ''فیض صاحب! انتظار کرتے کرتے اتنے دن ہو گئے۔ انقلاب کب آئے گا؟ ارشاد فرمایا'' بھئی بی بی...... آ جائے گا۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔''

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں۔ مثلاً انہیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے

سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور بُرائی نہیں سُن سکتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے اَدب اگر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن' زبان اور کان سب سوئچ آف کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ سے پوچھا' آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی؟ میں نے کہا ''فرصت اور فراغت تو بہت ہے۔ مگر کاہل ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعہ کی عیاشی میں پڑ گیا ہوں۔ اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو جانیے نری حرامخوری پر اُتر آیا ہے۔'' میں بہت دیر تک خود کو اسی طرح بُرا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے۔ پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اتنے قریب آ گئے کہ اُن کے سگرٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی۔ کہنے لگے ''بھئی! ہم کسی کی غیبت نہیں سُن سکتے۔ کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجئے۔ عفوو درگزر ثواب کا کام ہے۔''

سگرٹ کے ذکر پر یاد آیا کہ فیض صاحب کبھی ایش ٹرے کے محتاج نہیں رہے۔ ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ راکھ ہمیشہ ان کی ٹائی پر ہی گرتی تھی۔ کبھی اِدھر اُدھر گرتے نہیں دیکھا۔

فیض صاحب کے فطری عجز و انکسار اور حلم و برداشت کے بے شمار واقعات ہیں جن میں سے دو نمونتہً بیان کرتا ہوں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ وہ کیسے کیسے مرحلے سے آسان گزر جاتے تھے۔

یہ کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ سنا ہے کراچی میں ایک نجی محفل مشاعرہ تھی جو اتنی نجی بھی نہیں تھی۔ کوئی پچاس ساٹھ حاضرین تو ہوں گے جن میں سے چالیس تو شاعر تھے بقیہ مصرع اٹھانے والے۔ ایک صاحب پنگ پانگ کی گیند کی طرح اُچھل اُچھل کر داد دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ داد کے فقرے کسی کتاب سے رٹ کر آئے ہیں۔ چند یاد رہ گئے:

''بھئی واہ! کیا قیامت شعر نکالا ہے۔ غالب کی زمین اب آپ کی ہو گئی۔ واہ وا! میاں! جیتے رہو۔ ذرا پھر سے پڑھنا! کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔ پڑھتے جاؤ۔ جی خوش کر دیا۔ حضور پھر مرحمت فرمایئے۔ واللہ سیری نہیں ہو رہی! سبحان اللہ! کیا تیور ہیں۔ تعریف سے مستغنی ہے! کس رُخ سے مصرع لگایا ہے۔ تعریف نہیں ہو سکتی! ہائے! مقطع کیا ہے' گویا کلیجے میں میخ ٹھونک دی۔'' دوبارہ کرم ہو! رات کے ڈھائی بجے فیض صاحب کی باری آئی۔ کئی غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ جب اس شعر پر پہنچے:

ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورش بربطو نے

وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبل قیصر و کے

تو وہ صاحب بولے ''سبحان اللہ! سبحان اللہ! کیا ٹھاٹ' کیا طنطنہ ہے! ریاست بول رہی ہے!'' فیض صاحب ہولے سے مسکرا دیئے۔ پھر اُنہی صاحب کی فرمائش پر ایک اور غزل شروع کی۔ ایک مصرع پر اُن صاحب نے ایسی داد دی کہ نظام دین کے تنبو قناتوں کو سر پہ اٹھا لیا۔ بار بار وہ مصرع پڑھوایا۔ جب کوئی شاعر دوسرے شاعر کو بے تحاشا داد دے کر اس طرح بار بار مصرع پڑھوائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُسے اِس شعر میں کوئی خامی یا فنی سقم نظر آ رہا ہے جسے وہ بزبان شاعر اُجاگر کرانا چاہتا ہے۔ جب فیض صاحب نے وہ شعر چوتھی دفعہ پڑھا تو اُن صاحب نے مصرع ثانی' اصلاح کر کے' باآواز بلند پڑھ دیا۔ فیض صاحب نے قدرے سکوت کیا۔ پھر مسکرا کر مصرع کو اُسی طرح پڑھ دیا جس طرح وہ صاحب چاہتے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ فیض صاحب کے مصرع میں قطعاً کوئی سقم نہیں تھا! مشاعرہ ختم ہوا تو لوگوں نے اُن صاحب کے پرخچے اُڑا دیئے۔

ایک محفل میں فیض صاحب اپنی نظم ''رقیب'' سنا رہے تھے۔ جس کا شمار' انہی کی نہیں' اردو کی بہترین نظموں میں ہوتا ہے۔ محفل میں ہمارے یار طرحدار اور البیلے شاعر ساقی فاروقی بھی موجود تھے۔ وہ 25 سال سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اپنی آسٹرئین بیگم کو پیار میں گنڈی اور Rottweiler کتے کو ایک دلآزار نام سے پکارتے تھے۔ کتا تو اپنے نام اور ساقی کے پیار کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ مینڈک' کتے' خرگوش' مکڑے' بلے وغیرہ پر بہت خوبصورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی رُوح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے اُنہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں' ہم راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں رہے ہیں۔ جس دن سے وہ ہم پر مہربان ہوئے ہیں' انہوں نے زمین پر قدم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ اُن کا ہر قدم ہماری دستار فضیلت پر پڑتا ہے۔

نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی' خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لندن کی ایک ادبی محفل میں ایک اسّی سالہ بزرگ شاعر اپنے استاد پنڈت لبھو رام جوش آنجہانی کا سوا سو اشعار پر مشتمل مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ابھی آٹھ دس شعر ہی پڑھے ہوں گے کہ ساقی فاروقی نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ پھر خود کھڑے ہو گئے اور باآوازِ بلند فرمایا ''اب آپ بیٹھ جایئے۔ آپ کے استاد تو آپ سے بھی زیادہ نالائق تھے۔'' یہ کہا اور واک آؤٹ کر کے نزدیک ترین پب میں چلے گئے۔

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ فیض صاحب اپنی نظم ''رقیب'' سنا رہے تھے۔ اس نظم میں فیض نے رقیب کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھا اور دکھایا ہے۔

بہت کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے واردات عشق پر ایک جُگ بیت گیا ہے۔ ''شہرِ تمنا'' میں جس دھنک تلے دل پہلے پہل دھڑکا تھا وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہے کہ اُس کے سارے رنگ پگھل کر رگِ جاں میں اُتر چکے ہیں۔ لہو میں جو وحشتوں کا الاؤ بھڑکا کرتا تھا' اُس کے شعلے گردِ مہ و سال میں سیہ پوش ہوئے' لیکن دھیمی دھیمی تپش باقی ہے کہ آگ اب روشنی میں تبدیل ہو چکی اور یاروں کی اس بسنت بہار روشنی میں محبوب کا چہرہ اور بھی حسین ہو گیا ہے۔ اب رقیب سے بھی ایک گونہ قربت و یگانگت محسوس ہوتی ہے کہ اُس نے بھی اُنہیں گلنار ہونٹوں اور ساحر آنکھوں کو چاہا تھا۔ کون ناکام ہوا اور کون شادکام اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ رقیب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

فیض صاحب جب آخری لائن پر پہنچے تو ساقی فاروقی نے بلند آواز اور بڑے گستاخ لہجے میں کہا ''بس۔ نظم یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ آگے مت سنایئے۔'' فیض صاحب کو اپنی تمامتر شاعرانہ عظمت کے باوصف' دوستوں اور خوردوں کی دلداری اتنی عزیز تھی کہ اُنہوں نے بقیہ نظم نہیں سنائی۔ احمد فراز' زہرا نگاہ اور شہرت بخاری نے جو وہاں موجود تھے بہتیرا کہا کہ بقیہ حصہ بھی سنایئے۔ مگر فیض صاحب بولے ''نہیں بھئی! جب ساقی نہیں سننا چاہتا تو ہم کچھ اور سنائیں گے۔''

وہ کسی کی دل آزاری اور آزردہ خاطری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی نہیں' مروت اور دلداری کا یہ عالم بھی دیکھا کہ ایک دن حلقہ نیاز مندان لندن میں بیٹھے کلام سنا رہے تھے کہ ایک سردار جی انہیں لینے آگئے اور وہ اٹھ کر اُن کے ساتھ برمنگھم چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ سردار جی انہیں اپنی بیکری کا افتتاح کرانے کے لیے لے گئے ہیں! بعد میں کسی نے دبے لفظوں میں تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے کہ سردار جی نے ہمیں بڑی محبت سے بلایا تھا۔ برطانیہ یا پاکستان میں ہم سے کسی نے کتابوں کی دکان کا افتتاح نہیں کرایا۔ بسکٹ بُرے نہیں تھے۔

سردار جی تو ایک طرف رہے' فیض صاحب کو تو ان کے بسکٹوں سے بھی بوئے خلوص و وفا آ رہی تھی!

فیض صاحب نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام، عشق کے آڑے آتا رہا
اور کام سے عشق اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

خیر' شاعری کے بارے میں تو فیض صاحب نے غلط بیانی کی حد کو چھوتی ہوئی کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ رہا اُن کا عشق' تو یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ہمارے یہاں کاروبارِ عشق جس فراغت' محنت' مشقت اور خواری کا طالب ہے' فیض صاحب کی فطری کاہلی اُس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ خود کہتے ہیں کہ ''عشق کے لیے جتنی فراغت چاہئے' اُتنی مجھے نصیب نہیں ہوتی۔'' فیض صاحب کی ایک مداح خدیجہ بیگم اُن کی بے نیازی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ''میں بہت مزے مزے کے کھانے اُن کے لیے بڑے چاؤ چاہت سے پکاتی۔ مگر ہر بار دیکھا کہ جو چیز بہت نزدیک ہوتی بس وہی کھاتے رہتے۔ دال قریب ہے تو وہ کھا رہے ہیں۔ مچھلی دور ہے تو وہ طلب نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی کوئی فرق ہی محسوس نہیں کیا کہ بیگن کا بھرتا نوش جان کر رہے ہیں کہ بھیجا! شاہی ٹکڑے لے لیے ہیں کہ بگھارے آلو۔'' شاعر جب زندگی میں ہی ''لیجنڈ'' بن جاتا ہے تو یار لوگ اُس کے بارے میں طرح طرح کے قصے گھڑ لیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ فلاں شاعر یا ادیب حسین چہروں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ہم نے لندن میں چھ سات سال فیض صاحب کو اور اُن کے روز و شب کو کافی قریب سے دیکھا ہے۔ ہمیں تو وہ بے نیاز سے لگے۔ ہم نے تو پارٹیوں میں یہی دیکھا کہ اگر کوئی شاہی ٹکڑا خود چل کر اُن کے پہلو تک پہنچ گیا تو فیض صاحب نے ہمارے حصے میں آئے ہوئے بینگن کے بھرتے کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔

فیض کے زمانے کی شاعری کا پس منظر اور منظرنامہ کچھ یوں ہے کہ اردو شاعری ابھی پوری طرح گل و بلبل آشیانہ اور بجلی (اُس زمانے میں بجلی کو آسمان کی بجلی نہیں کہتے تھے) شبِ ہجر کی طوالت' دل و جگر سے خون کا اخراج' موت کے بعد بھی غیر شرعی خواہشات کا غلبہ' مزار پر صفائی' مرمت اور روشنی کا ناکافی انتظام' قبر کے اندر مرحوم کی شان میں فرشتوں کی بڑھتی ہوئی گستاخیاں' وغیرہ جیسے موضوعات سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا پائی تھی۔ عاشق کو فراق میں زیادہ مزہ آتا تھا:

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

ہم بھی ایک مدت تک اس شعر کی لطافت

احساس اور نزاکتِ خیال پر سر دُھنتے رہے' تا آنکہ ایک دن مرزا عبدالودود بیگ نے یہ کہہ کر سارا مزہ کرکرا کر دیا کہ اس صورت حال کا کریڈٹ طبیعت کو نہیں' صحت کو جاتا ہے!

فیض کی شاعری کا سارا اعجاز اور اس کی تمام تر پُر اسرار غمناکی اور نغمگی اُن کے منفرد لہجے میں مضمر ہے۔ لہجہ ہی بڑے شاعر کی چھب' چھاپ' تلک اور شناخت ہے۔ لہجہ لفظ کا تیسرا بعد ہے۔ لہجہ وہ طلسم ہے جس سے خزینۂ تاثیر کا سم سم کھلتا ہے اور دُنیائے معانی کا در دلکُشادا ہوتا ہے۔ یہ لفظ کو نیا مزاج دیتا ہے۔ تازہ توانائی' تیور اور کاٹ بخشتا ہے۔ لہجہ لفظ کا اعتبار ہے۔ لہجہ لفظ کا سمپورن ٹھاٹ ہے۔ یہ زیور نہیں، حرف کی حُرمت اور دمِ عیسیٰ کی حرارت ہے۔ یہ محرمِ رازِ نہاں خانۂ دل ہے۔ لہجہ نیتوں کا امین ہے۔ لہجہ آدمی کی پہچان ہے۔ لہجہ خود آدمی ہے۔

اور آدمی بھی کیسا۔ وہ آدمی جس کے دل میں کینہ وکدورت' بغض وعناد کا کوئی گزر نہ تھا۔ جس نے زندگی کے ہر رنگ اور انسان کے ہر رُوپ سے محبت کی اور ٹوٹ کے محبت کی۔

فیض کی شاعری محض الفاظ کی نگینہ سازی نہیں۔ نہ اُن کا فن مرصع ساز کا کام ہے۔ اُن کا ڈکشن' بنیادی طور پر' غزل کا ڈکشن ہے۔ نظم میں بھی۔ لیکن لہجہ اُن کا اپنا ہے۔ اس سے پہلے' اس لہجے میں' اور اس طرح کسی نے اپنے غمِ تنہائی کو غمِ زمانہ اور غمِ جاناں کو غمِ روزگار سے ہم آہنگ نہیں کیا تھا۔ اُن کے درد کا رشتہ اپنے عہد کے دُکھ اور عذاب سے جاملتا ہے۔ فیض کے مزاج میں جو ضبط اور ٹھہراؤ تھا وہ تمام وکمال انہوں نے اپنے دھیمے دھیمے اور غمناک لہجے کی شاعری میں سمو دیا ہے۔ مذمّم نمُردوں میں گلۂ حیات اور شکایتِ زمانہ و ابنائے زمانہ تو ہے' لیکن مایوسی' تلخی اور خشونت کا گزر نہیں' محتسب ایک سمبل اور علامت ہے۔ وہ اُس تک کو بُرا نہیں کہتے کہ ساری رونقیں اُسی کے دم قدم سے ہیں:

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اُسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، خُم کا، مے کا، پیمانے کا نام

لہجے میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک محسوس ہوتی ہے جو درد تھمنے کے بعد نہ صرف جان کو گھلا دینے والے کرب والم کا پتہ دیتی ہے' بلکہ قدموں کے تازہ نشان بھی ضبط کی اُس رہگذر پر دکھاتی ہے جہاں سے کوئی شائستہ حیات ابھی ابھی پا بجولاں اور مست و رقصاں گزرا ہے۔

فیض صاحب نے حرفِ سادہ کو اعجاز کا ایسا رنگ بخشا کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر پڑھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود' اُن کے چاہنے والوں کو اُن کی پڑھت کی اُکھڑی اُکھڑی طرز ایسی بھائی کی مشاعروں میں وہی شرح ومعیارِ بیان ٹھہری۔ گفتگو میں بھی وہ سگرٹ کے کش سے کوما' فل اسٹاپ لگاتے جاتے۔ سگرٹ منہ میں نہ ہو' تب بھی کش کی سسکی اُسی طرح لیتے رہتے۔ مصرعے اور فقرے کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ وقفے وقفے سے گھائل سی سسکی سنائی دیتی اور سننے والوں کا پیار' سکوتِ سخن میں حلاوتیں گھولتا چلا جاتا۔ درحقیقت وہ اپنا کلام اس طرح پڑھتے تھے جیسے شاعر اپنے دشمنوں کا کلام پڑھتے ہیں۔ یعنی صحیح شعر میں جابجا سکتہ پیدا کر کے۔ مگر یہ بھی اُن کی ایک ادائے دلبری تھی جس پر ہم ایسے نیاز مند تو فریفتہ تھے ہی' اُن کے نقالوں کو بھی اُن کا اندازِ شعر خوانی ایسا بھایا کہ پڑھتے وقت شعر کے علاوہ خود پر بھی سکتہ طاری کرنے لگے۔ کسی کہنے والے نے ازراہِ تفنن کہا بھی کہ فیض صاحب نے تحت اللفظ پڑھنے کی یہ مخصوص طرز دراصل اپنے نقالوں کا خانہ مزید خراب کرنے کی غرض سے ایجاد کی ہے۔

اس امر کی اب محض ایک تاریخی حیثیت رہ گئی ہے کہ فیض صاحب کا سیاسی مسلک کیا تھا۔ سیاسی عقائد اور اقتصادی نظریوں کے اختلاف و آویزش سے قطع نظر' دیکھنے اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ فیض صاحب کا اپنے مسلک و مشرب سے عہد وفا کتنا اُستوار تھا اور اُس پر کاربند رہنے میں انہوں نے کیسی پامردی اور استقامت کا ثبوت دیا۔ آزادیٔ فکر و اظہار' احترامِ آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ جس مسلکِ کج کلاہی کی سمت انہوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کر لیا' پھر اُسے تا عمر نہ بدلا۔ اور اُسی نسخۂ وفا میں علاجِ گردشِ لیل ونہار ڈھونڈا۔ فیض صاحب کے کمٹ منٹ اور استقامت کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ یوں تو ہمارے یہاں ایسے شاعر اور ادیب بھی ہیں جنہوں نے ہر دور میں ہر حکومت کی مخالفت کی۔ جیسے...... نام کیا لُوں' کوئی اللہ کا بندہ ہوگا۔ اور اپنی دانست میں ایسے بھی شیر بیشۂ ملازمت پیشہ ہیں جنہوں نے ہر حکومت کی حمایت و اطاعت کو بمنزلہ فرضِ منصبی انجام دیا۔ مثلاً...... اب نام کیا گنواؤں۔ سرِ فہرست اپنا ہی نام لیتے حجاب آتا ہے۔ آخر انکسار بھی کوئی چیز ہے۔ زراف کو اونٹ کی گردن پر اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ حکومتوں کو مزید خراب وخوار کرنے میں بعض اہلِ قلم سب سے آگے نہ سہی' سب سے پیچھے بھی نہیں رہے۔ سیاسی طاقت و اقتدار میں ازخود بھی بگڑنے اور گمراہ ہونے کی عظیم صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں۔ حکومتوں کا احوال پُر ملال تو دراصل Max Miller کی نوجوان ہیروئن جیسا ہوتا ہے:

When she was good, she was very very good, And when she was bad, she was very very popular.

مجھ ایسے ادیب بے تادیب کو بھی کبھار شاہی

اصطبل سے کوئی کاٹھ کا گھوڑا مع زین سنہری مل بھی جاتا ہے تو نہ اُس سے منزل طے ہوتی ہے' نہ خواہش جاہ و منصب کی تسکین ہوتی ہے۔ پنجابی کی ایک مثل ہے کہ گھوڑی چڑھدا تے لگدا تھانیدار نی مائے۔ یعنی جب وہ گھوڑی پر چڑھتا ہے تو بالکل تھانیدار لگتا ہے۔ مگر ہم گھوڑی پہ چڑھ کے بھی گھوڑی ہی لگتے ہیں۔

تذلیل نفسی کا کیس ہے۔

اس تناظر اور ایسی فضا میں ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو فیض اُس قبیلے کے آنکھ کا تارا نظر آتے ہیں جس کا اصل موضوع' اول تا آخر' انسان کا دُکھ اور اُس کا مداوا رہا ہے۔ فیض نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ دُکھ کسی اندھی مشیت کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ زندگی کا المیہ یہ

الرجال بھی نہیں ہے' جس کا اتنا رونا رویا جاتا ہے۔

تیسری دنیا قحط الرجال کی نہیں' قہر الرجال کی ماری ہوئی ہے۔

فیض صاحب کی نظریاتی وابستگی کچھ بھی رہی ہو' اُن کی شخصیت اور شاعری ہر تنازعہ اور تعصب سے بالاتر رہی ہے۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنی زندگی میں اس

یعنی وہ گھوڑی جس پہ تھانیدار چڑھتا ہے! میڈیا ہو یا ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کی دنیا' ہر دور میں اربابِ اقتدار کے ایسے ثناخوانوں کی کمی نہیں رہی جن کے ایجاب و قبول کا عالم جیمس جوائس کی **Molly Bloom** کی ہمہ تن سپردگی کی یاد دلاتا ہے:

"He asked me with his eyes, and " with his hands, yes and I said, Yes, I will, Yes"

خواتین و حضرات! یہ تحلیل نفسی کا مسئلہ نہیں'

ہے کہ انسان کے سارے دُکھ درد کا ''سرچشمہ'' خود انسان ہی ہے۔ لیکن اسی سے کچھ آس بھی بندھتی ہے۔ اس لیے کہ مرض قابل علاج اور جرم لائق تدارک و تعزیر ہے:

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی' یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر' یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

تیسری دنیا کے دُکھ اور اُس کے اسباب و علل پر فیض کی بڑی گہری نظر تھی۔ تیسری دنیا کا اصل دُکھ بھوک' افلاس اور قحط نہیں ہے۔ تیسری دنیا کا دُکھ قحط

طرح چاہا اور سراہا گیا ہو جس طرح فیض صاحب مرکزِ توجہات رہے اور کتنے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں نصف صدی سے زیادہ اقلیمِ سخن میں دلوں پر یوں راج رچا ہو؟ اور اتنی محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں؟ ساتھ ہی ساتھ' فیض قلعہ لاہور اور جیل میں بھی فروکش رہے۔ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ سرکاری رزق کے دروازے اُن پر بند کئے گئے۔ جلاوطنی اختیار کی معتوب رہے۔ اگر کوئی ملازمت ملی بھی تو اُس کی حیثیت اُس وظیفے سے زیادہ نہ تھی جو اعلیٰ حضرت نظام

دکن اُن لوگوں کا ازراہِ رحمِ خسروانہ مقرر فرما دیتے تھے جن سے وہ ہمیشہ کے لیے خفا ہو جاتے تھے۔ یہ وظیفہ عتاب کہلاتا تھا۔ مگر یہ کیسا قیدی ہے کہ دورانِ اسیری خود جیلر اس کے اعزاز میں محفل کا اہتمام کرتا ہے۔ اور یہ کیسا البیلا معتوب ہے کہ وزیرِ خزانہ اس کے اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کو افتخار اور شفاعت کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر محبوب الحق کے 5-Year پلان تو جلد یا بدیر تاریخ کے ردی خانے میں پہنچ جائیں گے جہاں وقت کی انتدار فراموش دیمک اُنہیں بہت باریک کُتر اور کُتر کے رکھ دے گی۔ کیا عجب کہ وہ صرف اسی ترجمے کی نسبت سے یاد رکھے اور بخش دیے جائیں۔ فیض کی شاعری اتنی سخت جان نکلی کہ انگریزی ترجمے بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ مجھے اس لئے کہنا پڑا کہ فیض کی شاعری میں پہلے پیار کی والہانہ فریفتگی اور سپردگی ہے، جس کی تاب انگریزی زبان نہیں لا سکتی۔ انگریزی casual affairs اور dating کے لیے بہت کارآمد و کارگر ذریعہ اظہار ہے۔ مرد زندگی میں عشق ایک ہی دفعہ کرتا ہے۔ دوسری مرتبہ عیاشی۔ اور اُس کے بعد نری بدمعاشی۔ انگریزی زبان دوسری اور تیسری صورتوں کے رازہائے سر بستہ کے اظہار کے لیے نہایت موزوں ہے۔ مرزا عبدالودود بیگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ پہلا عشق بالکل سچا' genuine اور پاک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی!

کچھ دیر بعد آپ فیض کا کلام ممتاز گلوکاروں سے سماعت فرمائیں گے۔ ایسا حسنِ اتفاق کم ہوتا ہے کہ خوبصورت کلام کو گانے والا بھی اچھا مل جائے۔ میر تقی میر نے تو اسی بات پر' اپنی عسرت و تنگ دستی کے باوجود' اچھی بھلی ملازمت پر لات ماردی۔ ہوا یہ کہ ایک دن اُن کے آقائے نامدار رعایت خاں نامی نے فرمائش کی کہ میر صاحب! اس گویے کے لونڈے کو اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجئے تو یہ اپنے ساز پہ درست کر کے گائے گا۔ میر صاحب نے اسے اپنی اور اپنے کلام کی توہین سمجھی۔ چنانچہ اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں کہ میں نے جواب دیا" یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ کہنے لگا' میری خاطر سے! چونکہ ملازمت کا پاس تھا' طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ چھ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دیئے۔ مگر یہ بات میری طبع نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر دو تین دن بعد گھر بیٹھ رہا۔ اُس نے ہر چند بلایا۔ نہیں گیا۔ اور اُس کی نوکری پر لات ماردی۔"

لیکن فیض کے کلام کی نغمگی نے گلوکاروں اور اُن کی گائیکی کو بھی شہرتِ عام اور بقائے دوام بخش دی۔ مہدی حسن نے اُن کی "گلوں میں رنگ بھرے......" والی غزل ایسی گائی کہ دونوں ایک دوسرے بلکہ ایک تیسرے سے منسوب ہو گئے۔ اقبال بانو نے "ہم دیکھیں گے' لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے" اپنی سدا سہاگن آواز میں ایسے جی جان سے گایا ہے۔ کہ سننے والے کا دل' وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے' دیکھنے کے لیے زندہ رہنے کو چاہتا ہے۔ مادام نور جہاں' فریدہ خانم' غلام علی مہناز نیرہ نور' ٹینا ثانی سبھی نے کلام کی گائیکی کا حق ادا کیا ہے۔ معاف کیجئے ہم طاہرہ سید کا نام لیا بھول گئے وہ بی بی تو ہمیں بہت ہی پسند ہیں۔ ہمارا املا بہت کمزور ہے۔ گانے کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں الفاظ کے ہجے بھی یاد کرا دیتی ہیں!

فیض کا شمار دنیا سے بہت کچھ لینے والوں میں نہیں ہوگا۔ وہ دُنیا کو بہت کچھ دے کر جانے والوں میں سے تھے۔ عظیم فنکار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ایک ساعت دُزدیدہ و نایاب کو بھی امر کر دیتا ہے اور لمحہ و شاداب کو ہمیشگی بخش دیتا ہے۔ اس کی ہر بات اک مقام سے ہوتی ہے۔ موضوع' ذاتی غم ہو یا انسان کا جنم جنم کا دُکھ فیض نے سطحِ محسوسات کو ایک نئی رفعت بخشی اور لہجے کو ایک نیا اعتبار اور آہنگ عطا کیا۔

یہ کہنا تو کسرِ بیانی ہوگی کہ فیض اپنے عہد کی آواز تھے۔ اُن کی آواز اُن کی اپنی آواز تھی۔ اس کی گونج اتنی دور تک اور دیر تک سنائی دے گی کہ اُن کا عہد اُن کی آواز سے پہچانا جائے گا۔ اس آواز نے آج کے دُکھ سے نڈھال لوگوں کو کل کے لیے جینے کا حوصلہ دیا۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے یہ عہد دیکھا اور امید اور درد میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنی۔ نصف صدی قبل لکھی ہوئی فیض کی نظم "بول" ہمارے دور کا عہد نامہ ہے' جس کے الفاظ میں رجز خوانوں کے نفس گرم کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس کے لحن میں عہد عتیق کی بشارتوں کا جاہ و جلال گونج رہا ہے۔

بول' کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

☆☆☆

ظفر اللہ پوشنی

فیضؔ اور زنداں

غالباً مجھے مرحوم میجر جنرل محمد اکبر خان کا مرہون منت ہونا چاہئے کہ ان کی وساطت سے مجھے اردو شاعری کے ایک شہنشاہ فیض احمد فیضؔ سے شناسائی ہوئی اور حیدر آباد جیل میں مدو سال اسیری گذارنے کا بصیرت افروز تجربہ بھی حاصل ہوا۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے فیضؔ صاحب کو صرف ایک دفعہ امرتسر کے ایک مشاعرے میں نظم سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہ نظم تھی جو بعد میں تمام اہل دانش میں حد درجہ مقبول ہوئی یعنی ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔'' نظم کی خوبیوں سے قطع نظر فیضؔ صاحب کا پڑھنے کا انداز کوئی زیادہ سحر انگیز نہیں تھا۔ ان دنوں فیضؔ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کے استاد تھے۔ اس کے بعد میں نے فیضؔ صاحب کو جنرل اکبر خان کے ڈرائنگ روم میں 23 فروری 1951 کو دیکھا جہاں مرحوم جنرل نے حکومت وقت کو بدلنے کا اپنا پلان پیش کیا۔ فیضؔ صاحب سے اگلی ملاقات 3 یا 4 جون کو حیدر آباد ریلوے سٹیشن کے قریب ہوئی' جب وہ اور میں دونوں پولیس کی تحویل میں تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ڈیڑھ دو سال بعد' جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کیا تھا تو فیضؔ صاحب نے انڈین آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور فوج کے پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں شامل ہو گئے۔ فاشزم کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم میں فیضؔ نے حسب توفیق حصہ لیا اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ دریں اثنا 1944 میں یہ بندۂ ناچیز بھی 18 برس کی عمر کو پہنچتے ہی فوج میں بطور کیڈٹ شامل ہو گیا اور مارچ 1945 میں کمیشن حاصل کیا۔ میری پوسٹنگ 16 پنجاب رجمنٹ میں ہوئی لیکن میں نے لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیضؔ کو دوران سروس فوجی وردی میں کبھی نہیں دیکھا۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو فیضؔ فوج ترک کر کے نئی مملکت کے شعبہ صحافت سے منسلک ہو گئے تھے۔ البتہ میں نے فوج میں سروس جاری رکھی۔ فروری 1951 میں میری پوسٹنگ اسکول آف سگنلز راولپنڈی میں تھی جب اکبر خان نے حکومت بدلنے کے پروگرام کی تکمیل کیلئے (جس کی پلاننگ وہ تقریباً دو برس سے کر رہے تھے) اپنے گھر پر ایک میٹنگ بلائی۔ اسی دوران میرے دوست میجر اسحاق محمد ایم سی (مرحوم) نے' جو جنرل اکبر کے زیر کمان بریگیڈ میجر رہ چکے تھے' جنرل صاحب سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ میں دو ایک بار ان کے دولت خانے پر حاضری بھی دے چکا تھا اور ان کے خیالات سے مستفید بھی ہو چکا تھا۔ چنانچہ 23 فروری 1951 کو جنرل اکبر خان نے اپنے گھر پر جن فوجی اور شہری لوگوں کو مدعو کیا ان میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔

راولپنڈی ''مقدمہ سازش'' کے مرکزی کردار میجر جنرل محمد اکبر خان' اُس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ وہ ایک خاصے متمول پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اُن چیدہ نوجوانوں میں سے ایک تھے جنہیں انگریز حکومت نے اُس دور میں کنگز کمیشن کیلئے منتخب کیا اور انگلینڈ کی شہرہ آفاق سینڈ ہرسٹ ملٹری اکیڈمی میں عسکری تربیت کیلئے بھیجا۔ سینڈ ہرسٹ سے کمیشن حاصل کرنے کے بعد اکبر خان فرنٹیئر فورس رائفلز میں تعینات کئے گئے۔ بعد میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف جنگ میں داد شجاعت کے عوض حکومت نے انہیں ڈی ایس او (D.S.O) کے تمغے سے نوازا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں ہندوستان کی تقسیم کے تھوڑے عرصے بعد کشمیر میں لڑائی شروع ہو گئی۔ بھارت کی فوج سرینگر کے ہوائی اڈے پر اُتری اور اس کی پاکستان کی طرف سے بڑھتے ہوئے پشتون قبائلیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اکبر خان نے جو ان دنوں بریگیڈیئر تھے' پاکستانی قبائلی دستوں کی کمان سنبھالی اور بہادری سے اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور انڈین فورس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اسی لڑائی کے دوران اکبر خان پاکستانی فوج کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی سے نہایت دل برداشتہ ہو گئے تھے جس نے انہیں حسب منشا کارروائیاں نہیں کرنے دیں۔ رفتہ رفتہ جنرل اکبر خان اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے بھی منحرف ہو گئے۔ اکبر خان نہایت ہیجان انگیز اور انتہا پسند طبیعت کے مالک تھے' انہوں نے حکومت کو تبدیل کرنے کے منصوبے بنانے

فیض صاحب کی جیل آمد پر ان کے داخلہ کوائف کا تاریخی ریکارڈ (بشکریہ منیزہ ہاشمی)

REGISTER OF CONVICTED PRISONERS

— 6 —

247

REGISTER No. 3.—Register of Civil Prisoners.

Register No. of prisoner	Name and Father's name	Age and sex	Occupation	Religion and caste	Sentence, with date	Name of creditor and amount of claim	Date of release if sentence is fully executed	Daily subsistence allowance granted by the Court
[illegible]	فیض احمد فیض ولد [illegible]		[illegible]	مسلم جٹ	25-3-55 [illegible] 1944	[illegible]	26-4-55	

Date of admission 25-3-55

Residence — Village 41 Empress Road Lahore

Descriptive marks [illegible]

Committing Court [illegible] Age 43 years

Health: On admission Good / On release Good — Weight: On admission 132 lbs. / On release 150 lbs.

Date of discharge Released on bail on 12-4-55 by the orders of High Court vide no 3138 d/12-4-55.

Cause of discharge

Period of imprisonment undergone — Months — Days

Date of discharge

PROPERTY OF PRISONER, INCLUDING ANY ARTICLES SUPPLIED BY DECREE-HOLDER.

Date	Clothes, jewellery, etc.	Cash Rs.	a.	p.	Receipt of the prisoner on release
	[illegible]	9	14	3	✓
[illegible]	[illegible]	50 / 47	[illegible]	—	Rupees fifty only [illegible]
Balance on 12-4-55	—	28	10		[illegible]

Disposal of unexpended balance and other remarks.

ACCOUNT OF SUBSISTENCE ALLOWANCE RECEIVED AND DISBURSED.

Received	Disbursed					
Amount	Month	Number of days for which allowance has	Cost of articles issued from jail stock as per Register	Amount disbursed in cash either	Total	Balance, if any

کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے؟ فیض صاحب کی جیل سے رہائی کی دستاویز (بشکریہ منیزہ ہاشمی)

شروع کر دیئے۔ میں اس قصے کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیونکہ میرا یہ مضمون راولپنڈی ''مقدمہ سازش'' کے متعلق نہیں ہے بلکہ فیض احمد فیض کے متعلق ہے۔ میرا اور فیض کا رابطہ چونکہ اس کیس کی بدولت ہی ہوا اور فیض کے ساتھ رہنے کا موقع بھی جیل ہی میں نصیب ہوا' اس لئے میں نے پس منظر کے طور پر درج بالا چند پیراگراف تحریر کرنا ضروری خیال کیے۔

چلئے اب سیدھے حیدرآباد جیل چلتے ہیں جہاں جون 1951 میں' یعنی آج سے نصف صدی پہلے' گیارہ فوجی افسران' تین سویلین (فیض بھی سویلین میں شامل تھے) اور ایک خاتون (بیگم اکبر خان) پولیس کی کڑی نگرانی میں لائے گئے۔ خاتون کیلئے ایک علیحدہ کمرہ اور احاطہ فراہم کیا گیا اور مرد حضرات کو دو وارڈز میں تقسیم کر دیا گیا جس میں ایک وارڈ کا نام ہم نے ''سرائے'' اور دوسرے کا ''خانقاہ'' رکھ دیا۔ چودہ مرد اسیروں میں سے صرف چار کو خانقاہ میں جگہ ملی' اور ہم باقی دس جن میں فیض بھی شامل تھے سرائے کے باسی گردانے گئے۔

فیض کی تمام یادیں میرے ذہن میں سرائے کی دیواروں اور سلاسل سے وابستہ ہیں مثلاً اپنے وارڈ سے عدالت میں جانے کیلئے تو فیض مغربی لباس پہن لیتے تھے' لیکن سرائے کے اندر ہمیشہ نہایت صاف' استری شدہ' سفید رنگ کا کرتا پاجامہ زیب تن ہوتا تھا۔ عطر اور خوشبو کا استعمال بھی بے دریغ کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے ان کی اس عادت' پر تبصرہ کیا تو فیض صاحب نے فرمایا کہ میاں یہ تو سنت ہے! اس شخص نے حجت کی کہ حضرت آپ کا بھلا مذہبی عقائد' روایات اور اعتقادات سے کیا تعلق؟!! فیض صاحب نے جواب دیا کہ ''کیوں نہیں' میں یقیناً اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک حصہ ہوں۔''

فیض صاحب سگریٹ بہت پیتے تھے۔ اس زمانے میں سگریٹ نوشی ابھی میں نے بھی ترک نہیں

کی تھی لیکن میں تو شاید دن بھر میں دس بارہ سگریٹ پھونکتا تھا اور فیض صاحب پچاس سگرٹوں کا پورا ڈبہ راکھ میں تبدیل کر کے ہی دم لیتے تھے۔ اسیر ہونے سے پہلے ہم میں سے اکثر لوگ وسکی اور بیئر سے کبھی کبھی شغل کر لیتے تھے' ہم میں دو تین صوفی بھی تھے' ایک ایسے بھی تھے جنہیں بلانوش کہا جا سکتا تھا' یعنی لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین' جن کا ابھی پچھلے سال ہی 83 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ یہ حضرت سردیوں کے دوران روزانہ شام کو وسکی کی بوتل سامنے رکھ کر ایک دو گھنٹے جام لنڈھاتے تھے' پھر آرام سے رات کا کھانا کھاتے تھے۔ فیض صاحب کا شمار بھی پینے والوں میں ہوتا تھا' لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جب وہ قید ہو گئے اور پینے کو نہیں ملی تو ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوا!!! ایک لحظہ کیلئے بھی اس بارے میں پریشان نہیں ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے ذکر کیا تو کہنے لگے "ارے بھائی' ملتی تھی تو چسکی لگا لیتے تھے' نہیں ملتی تو نہ سہی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جیل میں چار برس بغیر ڈرنک کے بڑے آرام سے گذار دیئے' بہترین نظمیں اور غزلیں بھی چسکی کی مدد کے بغیر تخلیق کی گئیں۔ میرے استفسار پر فیض نے ایک دن کہا کہ "شاعری کرنے کیلئے شراب کی مطلق ضرورت نہیں' بلکہ بقائمی ہوش و حواس آدمی بہتر لکھ سکتا ہے۔ شراب تو محض تلخی حیات سے کچھ دیر کیلئے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔"

فیض احمد فیض کو ہم نے جیل میں "کاہل" کا تخلص عطا کیا تھا جو ان کی خصلت کے عین مطابق تھا۔ وہ ہر کام نہایت سلوموشن میں کرتے تھے۔ شیو کرنا ہو یا لباس پہننا' چہل قدمی کرنی ہو یا گفتگو' ڈنر کھانا ہو یا نظم لکھنا' فیض صاحب اس مقولے پر سختی سے قائم تھے کہ "سج کے سونا ہوا! کھیلوں یا ورزش سے انہوں نے عمر بھر اجتناب ہی کیا' کم از کم جیل کے اندر تو وہ ان "فروعات" میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔ ہمارے وارڈ یعنی "سرائے" کے احاطے میں جیل والوں نے بیڈمنٹن' ڈیک ٹینس اور والی بال کھیلنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم میں سے بیشتر لوگ ان کھیلوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے' لیکن فیض صاحب (اور سید سجاد ظہیر بھی) آرام کرسی پر تحمل سے بیٹھ کر سگرٹ سلگا لیتے اور دور ہی سے "ویل ڈن" اور "گڈ شو" کے کلمات بکھیر کر کھیلنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے پر اکتفا کرتے۔ یار لوگوں نے بہت کوشش کی کہ ان دو بزرگوں کو جنبش دی جائے اور میدان کارزار میں لایا جائے لیکن "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے فیض اور سجاد ظہیر نے اپنی کاہلانہ روش ترک نہیں کی۔ فیض صاحب کو البتہ شطرنج کھیلنے سے دلچسپی تھی' لیکن کھیلنے کے انداز میں بے حد بے نیازی جھلکتی تھی اور ہمیشہ میجر اسحاق محمد اور بریگیڈیئر لطیف سے شکست کھا جاتے تھے! بازی ہارنے کے بعد عموماً فرماتے تھے "اچھا اگلی بار سہی!"

شاعری میں "آمد" کے متعلق بہت سنا تھا لیکن اس کا عملی مظاہرہ حیدر آباد جیل میں دکھائی دیا۔ جب فیض صاحب تخلیق کے عمل سے گذرتے تو ہمیں فوراً پتہ چل جاتا کہ غزل یا نظم بن رہی ہے۔ فیض برآمدے یا احاطے میں ٹہلتے نظر آتے' سوچوں میں غرق' کسی سے بات چیت نہیں' پھر اپنی کھولی کے اندر واپس چلے جاتے' میز پر پڑے ہوئے کاغذ پر کچھ لکھتے' پھر برآمدے میں آجاتے' ادھر اُدھر پھرتے' بے چینی کا عالم ہوتا' سگریٹ سلگاتے کش لگاتے' دھوئیں کے کچھ مرغولے چھوڑتے' پھر سگریٹ پھینک دیتے' کھولی میں واپس چلے جاتے' کرسی پر بیٹھتے' ایک نیا سگریٹ سلگا لیتے' کچھ لکھتے تیزی سے' پھر سوچنے لگ جاتے۔

یہ "آمد" کا منظر متعدد بار ہماری آنکھوں کے سامنے رونما ہوا۔ جب غزل (یا نظم) مکمل ہو جاتی تو فیض صاحب بالکل پرسکون ہو جاتے۔ جس طرح عورت بچے کو جنم دینے کے بعد' کرب سے آزاد ہو کر' آرام اور سکون سے لیٹ جاتی ہے۔ فیض صاحب اپنے تخلیقی عمل سے فارغ ہو کر' مسکراتے ہوئے کھولی سے باہر نکل آتے اور سب یار لوگ شور مچاتے ہوئے ان کو گھیرے میں لے لیتے۔ ہر طرف نئے بچے کو دیکھنے کی فرمائش ہوتی...... اور پھر فیض بعض اوقات سرائے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھ جاتے اور کہتے "عرض کیا ہے!"

"ارشاد ارشاد" غوغائے یاراں۔

"عرض ہے......

یادِ غزال چشماں ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں"

واقعی' میں بڑا خوش نصیب تھا کہ "دست صبا" اور "زنداں نامہ" کی درجنوں غزلوں اور نظموں کو اسی انداز سے تخلیق ہوتے دیکھا' اور انہیں شاعر کی زبان سے پہلی بار جیل کے برآمدے یا احاطے میں بیٹھ کر سنا۔

ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ جب "دست صبا" چھپ گئی اور کتاب کی کاپیاں جیل میں پہنچیں' تو میں نے نوٹ کیا کہ اس پر انتساب درج ہے "کلثوم کے نام۔" دل میں کھلبلی مچی کہ بھئی یہ کلثوم کون ہے۔ فیض سے پہلی بار استفسار کیا تو ٹال گئے۔ ساتھیوں سے پوچھا' کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کلثوم کون ہستی ہیں! ایک تجسس کی لہر تمام دوستوں میں پھیل گئی۔ جیل میں لکھے ہوئے پہلے مجموعہ پر جس خاتون کا نام ہے یقیناً فیض صاحب کی کوئی خاص چہیتی ہو گی۔ فیض خواتین میں بہت مقبول رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی پلے بوائے یا ڈان جوان (Don Juan) ٹائپ کے مرد تھے۔ غالباً ان کی شاعری خود بخود صنف نازک کو ان کی طرف راغب کر دیتی تھی'

ورنہ فیض تو بنیادی طور پر نہایت ہی آرام طلب تھے اور عورتوں کے پیچھے دوڑنا ان کی طبیعت کے عین برعکس تھا۔ بقول شاعر

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اُس آرام طلب کو!

لیکن فیض خواتین کا تعاقب بیشک نہ کرتے ہوں، خواتین ضرور ان کا پیچھا کرتی تھیں اور بعض تو بڑے زور و شور سے کرتی تھیں اور شاعر آخر رومانوی انسان ہوتا ہے، اگر اس پر التفات ہوگا تو ویسا ہی اس کا ردعمل ہوگا۔ یقیناً فیض کی محبوبائیں نہایت مخلص اور وفا شعار تھیں جبھی تو آپ نے فرمایا کہ

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

بات کچھ اور جانب چل پڑی! میں تذکرہ کر رہا تھا "دست صبا" کا، جس پر "کلثوم کے نام" کے انتساب نے فیض کے تمام ساتھیوں کو ایک اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا کہ یا مظہر العجائب یہ کلثوم بی بی کون ہے؟! فیض صاحب نے کئی دن تک مجھے اور دیگر اسیران محترم کو بیم و رجا کی حالت میں لٹکائے رکھا اور آخر ایک روز یہ اعتراف کیا کہ کلثوم تو دراصل ان کی زوجہ محترمہ ایلس کا اسلامی نام ہے! اس پر سب اہل دل کو شدید مایوسی ہوئی اور یار لوگ یہ کہتے سنائی دیئے کہ فیض نے تو مزہ ہی کرکرا کر دیا۔ فیض ساتھیوں کی مایوسی دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہے تھے اور ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے کہ "دیکھو کیسا اُلٹا زمانہ ہے، شاعر اپنی بیوی کے نام انتساب کرے تو یاسیت پھیل جاتی ہے، سب نامعقول کسی محبوبہ کی تلاش میں ہیں!" ہم سب فیض صاحب کی اس شرارت پر کئی دن تک تبصرہ کرتے رہے۔

فیض صاحب کا چھپکلیوں سے ڈرنا، جیل میں ایک دوسرے پر پانی پھینکنے کا معرکہ اور دیگر کئی دلچسپ واقعات کا تذکرہ میں اپنی کتاب "زندگی زنداں دلی کا نام ہے" میں کر چکا ہوں اس لئے ان قصوں کو اس مختصر سے مضمون میں دہرانا بیکار ہے۔ آخر میں میں یہ کہنا مناسب سمجھوں گا کہ فیض احمد فیض بحیثیت شاعر تو بلند ترین مقام پر ہیں ہی، بطور انسان بھی وہ بہت ہی اونچے آدمی تھے۔ ہر خاص و عام کے ساتھ ہمیشہ شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ جیل کی چار دیواری میں محبوس ہونے سے جو گھٹن پیدا ہوتی ہے اس کے باعث فیض کے مزاج میں کبھی چڑچڑا پن نمودار نہیں ہوا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اکثر لوگوں کی تعریف ہی کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی کسی کو برا کہتے۔ کسی سے بہت ناخوش ہوئے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیا کہ "وہ بہت پاجی ہے" یا "وہ نرا احمق ہے" یا کوئی اور نہایت مختصر سا تبصرہ۔ نظریاتی ہم خیالی اور ادبی ذوق کی وجہ سے فیض احمد فیض اور سید سجاد ظہیر میں بہت گہری دوستی تھی اور سید صاحب بھی فیض ہی کی طرح ٹھنڈے مزاج کے "پرسکون" مرنجاں مرنج انسان تھے۔ جب دونوں مل بیٹھتے تو تھوڑی بہت ہنسی ٹھٹول اور چٹکلے بازی کے علاوہ بہت اونچی سطح کی علمی اور ادبی گفتگو بھی ہوتی تھی جس سے دیگر احباب مستفید ہوتے تھے۔ کم از کم میں نے تو ان دونوں حضرات کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان سے حاصل کئے گئے علم کی بدولت میں نے زندگی کے بقیہ ایام زیادہ پرلطف انداز میں گذارے۔

دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں تنگدستی کا کیا گلہ کیجئے

راولپنڈی "مقدمہ سازش" کے 15 اسیر پچھلی چار دہائیوں میں ایک ایک کر کے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں، صرف یہ بندہ ناچیز ہی باقی رہ گیا ہے۔ اگلی مئی میں میری عمر 76 برس ہو جائے گی اور مجھے مشہور ادیبہ میوریل سپارک (Muriel Spark) کے یہ فقرے یاد آ رہے ہیں:

"70 سال کی عمر کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کسی جنگ میں شامل ہیں! آپ کے تمام دوست مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں، اور آپ مرنے والوں کے درمیان میدان جنگ میں کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔"

لیکن بقولِ فرانسیسی ایکٹر موریس شیولیر (Maurice Chevalier): "متبادل صورت سے بڑھاپا قابل ترجیح ہے۔"

(I prefer old age to the alternative)

☆☆☆

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہگار چلے گئے

آئی۔ اے۔ رحمن

فیض۔ مثالی ایڈیٹر

کچھ ایڈیٹر صرف لکھتے ہیں' کچھ ایڈیٹر دوسروں سے اچھا لکھوا لیتے ہیں' کچھ اخبار کو مکمل بنانا اور سجانا جانتے ہیں' فیض صاحب کو ہم نے تینوں میدانوں کا شہسوار پایا۔ اُن کی ایڈیٹری کا دور اس میدان میں نام پانے والے بہت سے حضرات سے کم تھا' لیکن صحافت پر اُن کی چھاپ وسیع اور گہری ثابت ہوئی۔ اُن کے زیر اثر'' پاکستان ٹائمز''' ''امروز'' اور'' لیل و نہار'' صحافت کے ایسے اعلیٰ ادارے بن گئے جہاں صحافیوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے فن میں نام کمایا اور خوبی یہ کہ نہ لیکچر پر انحصار تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ پر' انہیں اپنے کام' اسلوب اور طرز فکر کی رو سے ایسی مثال قائم کرنے میں ملکہ حاصل تھا کہ دوسروں کے دل میں تقلید کی خواہش غیر ارادی طور پر بیدار ہو جاتی۔

ہم نے صحافت میں قدم رکھا تو سنا کہ فیض چند منٹوں میں ایڈیٹوریل ارشاد کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بیان کئے جاتے تھے کہ ایک دن شام کو دفتر سے فون ہوا کہ آج ایڈیٹوریل نہیں ملا' فیض صاحب نے کہا'' اچھا'' آئے اور مسٹر منوگ (ماہر فن) کو کھڑے کھڑے اداریہ ڈکٹیٹ کر دیا' یا یہ کہ پطرس بخاری دفتر آ گئے اور فیض کو ساتھ چلنے کی دعوت دی' تھوڑی سی دیر کی مہلت چاہی کہ ایک اداریہ لکھ ڈالوں' فوراً کام مکمل کیا اور اپنے استاد کو انتظار کی زیادہ زحمت نہیں دی۔ ایسی کہانیوں سے فیض کی بہت سوچ کر بات کہنے کی عادت کا پتہ نہیں چلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اُن کے ذہن میں کوئی خیال دیر تک پگھل کر شعر کی صورت میں ڈھلتا تھا' اسی طرح اداریہ بھی ذہن میں دیر تک پروان چڑھنے کے بعد ہی قلم کی نوک پر آتا تھا۔ ہر اداریہ نویس کے ذہن میں مختلف مضامین' اُن کا پس منظر اور اُن کے بارے میں نقطہ نظر ایک ذخیرے کی شکل میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور عام موضوعات پر روایتی اداریہ لکھنا محنت طلب نہیں ہوتا' فیض کے لئے ایسے مضامین پر رائے دینا دوسروں کی نسبت شاید آسان رہا ہو' لیکن ایسا بھی ہوتا تھا کہ قبل از تحریر غور و فکر دیر تک کئے بغیر تسلی نہیں ہوتی تھی' اس بات کا صحیح اندازہ'' لوٹس'' کے ایک اداریے کی تکمیل کے موقع پر ہوا' ایک دن مسز ایلس فیض نے کہا' فیض'' لوٹس'' کے اداریے کے اساسی مفروضات پر غور کر رہے ہیں۔ دوسرے دن بتایا کہ پہلا ڈرافٹ مکمل ہو گیا ہے اور تیسرے دن اطلاع ملی کہ نوک پلک درست کر لی گئی۔ مسئلہ سرعت سے کام کرنے یا اُسے مناسب وقت دینے کا نہیں تھا بلکہ یہ احتیاط عادت بن گئی تھی کہ مضمون میں نہ تشنگی رہے نہ ابہام اور یہ کہ ایسا نہ لکھا جائے کہ چند دنوں بعد ہی باسی ہو جائے۔

فیض نے صرف اداریے نہیں لکھے' اُن کے بعض فیچر مضامین میں خیالات کی رعنائی اور زبان کا حسن اُن کی شاعری سے کم نہیں۔ اپنی صحافت کے آغاز میں بعض خصوصی رپورٹیں لکھیں جن کے مطلع سے ہی غزل کی شان کا پتہ چل جاتا ہے'' پاکستان ٹائمز'' میں ایک غریب الدیار کلرک تھا جس نے خاموشی سے اپنی زندگی کا چراغ گل کر دیا' اس واقعہ پر فیض نے نثر میں جو مرثیہ لکھا اُس میں افسوس کے ساتھ معاشرے کی پسماندگی پر بھرپور تبصرہ بھی شامل تھا'' گنگا رام کے مجسمے پر نظر پڑ گئی تو ہموطنوں کی احسان فراموشی اور تاریخ سے گریز پر ایک مبسوط مقالہ لکھ ڈالا' فلم (Rebellion of the hanged) کے Preview میں مناظر نے دل پر گہرا اثر ڈالا تو خود ہی کہہ دیا'' بھئی اس پر ہم ہی لکھ دیں گے۔'' یہ تمام تحریریں گہرا نقد ہی نہیں تھیں' مضامین کے انتخاب اور ان میں بحث کے انداز سے ایک بیدار صحافی کے لئے ترجیحات کے اشارے بھی ملتے تھے۔

لیکن خود لکھنے سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے اچھا کام کرانے کی صلاحیت فیض کی ایڈیٹری کا کمال تھا۔ نہایت ہلکے اشارے سے وہ بتا دیتے تھے کہ کون تساہل کا شکار ہو رہا ہے اور کسے اپنے فرائض کی بجا آوری میں محنت کے ساتھ مغز استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک رپورٹر سے پوچھا کہ شہر میں ہونے والے ایک پبلک فنکشن کی خبر کیوں نہیں دی' عذر پیش کیا گیا کہ منتظمین نے دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا۔ یہ معقول عذر نہیں کیونکہ رپورٹر دعوت ناموں کا محتاج نہیں ہوتا' اُس کا فرض خبر حاصل کرنا ہے' اس کے لئے خواہ ٹکٹ خریدنا پڑے یا کھڑکیوں کا استعمال کرنا پڑے۔ دعوت نامے کی مدد سے کسی محفل میں جا کر

تقریر کا خلاصہ بیان کرنا رپورٹر کے لئے قابلِ فخر نہیں۔ ہدایات پر عمل کی ضمانت ساتھیوں پر اعتماد سے ملتی تھی' کیسی ہی غیر معمولی خبر ہو صرف یہی پوچھنا کافی تھا'' آپ کو خبر کی صداقت پر یقین ہے؟'' یہی وجہ تھی کہ اخبار کو اپنی کسی خبر کی تردید کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فیض ڈیسک پر جمے رہنے والے ایڈیٹر نہیں تھے' ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا' اور سرکار میں بھی اُن کی شاعری کے مداح موجود تھے کہیں کہیں شاگرد بھی تھے' وہ ہمیشہ خبر کے لئے رپورٹر کے محتاج نہیں تھے' خبر اُن کے پاس براہ راست آتی تھی۔ 12 ستمبر 1998 کو'' امروز'' نے قائداعظم کی وفات پر جو شمارہ شائع کیا وہ اس لئے ممکن ہوا کہ فیض کو اس سانحہ کی خبر سرکاری اعلان سے بہت پہلے مل گئی تھی۔ اسی طرح پنجاب کے گورنر کا وائسرائے کے نام خفیہ مکتوب دہلی پہنچنے سے پہلے فیض نے شائع کر دیا۔

پاکستان میں مکمل اخبار کی روایت کی بنیاد ڈالنے میں فیض پیش پیش تھے۔ 1967 سے پہلے پاکستان کے علاقوں میں صحافت سیاسی مسائل پر بحث میں توانا اور دیگر مضامین کے حوالے سے خاصی لاغر تھی' '' پاکستان ٹائمز'' نے روز اول سے مکمل اخبار کا خاکہ پیش کرنا شروع کیا۔ ملکی اور غیر ملکی خبروں میں توازن' معاشرے کے مختلف طبقات کے مفادات پر توجہ' کھیل اور ثقافت میں دلچسپی' اور خصوصی مضامین پر بحث اخبار کے لازمی عناصر قرار پائے۔ برصغیر کے بعض حصوں میں ایسی روایات تھیں اور کسی حد تک برطانوی اخبارات کی نظیر بھی سامنے تھی' لیکن پاکستان کی نئی صحافت میں وسائل کی کمی کے باعث مکمل اخبار مرتب کرنے میں مشکلات کم نہ تھیں۔

فیض کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبارات ایک واضح سیاسی مسلک کے علمبردار تھے۔ اُن کا نمایاں ترین پہلو افتادگانِ خاک کی آواز بلند کرنا تھا۔ مالی اور سماجی طور پر کمزور طبقات کے درد کا احساس فیض کی شاعری میں پہلے سے موجود تھا۔ ٹریڈ یونین میں کام کرنے کے حوالے سے اُنہیں محنت کشوں کے استحصال کا علم بھی تھا' سیاسی نقطۂ نظر کی بنیاد تھی ہی عوام کی حاکمیت' لہٰذا لٹے پٹے عناصر اور محنت کشوں کو یقین تھا کہ فیض کے اخبار میں اُن کی آواز کو ضرور جگہ ملے گی۔ یہی نہیں بلکہ کل عوام کو شہری آزادیوں کے مقام سے آگاہ کرنے میں فیض اور اُن کے ساتھیوں کا کردار بھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکے گا۔

فیض نے اخبار میں ایڈیٹر کی حیثیت بھی متعین کی۔ اُن کا معاملہ معاصر مدیران سے مختلف تھا۔ وہ اخبار کے مالک نہیں تھے' اور نہ اخبار کے مالکان کے خاموش پارٹنر بلکہ اُن کی واضح سیاسی اور معاشرتی ترجیحات تھیں۔ ایسی صورت میں یہ طرح ڈالنا کہ اخبار مالکان کی نہیں ایڈیٹر کی مرضی سے چھپتا ہے آسان نہیں تھا۔ قسور گردیزی مرحوم سناتے تھے کہ ایک دن کراچی میں میاں افتخار الدین کی پارٹی کے لیڈروں نے شکایت کی کہ اُن کا اخبار ایسی شدت سے اُن کی حمایت نہیں کر رہا تھا جو اُس کا فرض تھا' اور فیض سے شکایت کی جائے' فون پر کال بک کرائی گئی' میاں افتخار الدین نے فیض سے بات کی' لاہور کے موسم کا حال پوچھا' دو چار رسمی جملے اور تبدیل ہوئے' بات ختم' مدعیان کی شکایت کا اشارہ تک نہیں۔ دوستوں نے شکایت جاری تو رکھی لیکن سمجھ گئے کہ ایڈیٹر کو ہدایات نہیں دی جا سکتیں کہ اخبار میں کیا چھاپنا ہے اور کس طرح چھاپنا ہے۔ یہ تو صرف ایک قصہ ہے' فیض کے ساتھ کام کرنے والے صحافی ایڈیٹر کی آزادی اور خود مختاری کی بہت سی داستانیں سنا سکتے ہیں۔ غالباً صرف دو مواقع ایسے تھے جب ملک کی ہنگامی سیاست اور ادارے کی مالی حالت نے فیض کی آزاد روش میں خلل ڈالا' ایک'' سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے خلاف متنفقہ اداریہ کی اشاعت اور دوسرا اخباری کارکنوں کے ساتھ اُجرت کے بارے میں تنازعہ۔ پہلے معاملے کا جواز کبھی ممکن نہ ہوا' البتہ دوسرے معاملے میں حمید ہاشمی جیسے معتبر ٹریڈ یونینسٹ نے بھی فیض کو بری کر دیا۔

فیض اکثر کہتے تھے کہ تدریس اُن کا محبوب ترین پیشہ ہے' لیکن شاید صحافت سے اُنہیں عشق' تدریس سے بھی زیادہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی کی تعمیر میں' سیاسی اور سماجی ارتقا کے لئے وہ ثقافت کا کردار کلیدی مانتے تھے' اور ثقافت کی ترویج آزاد صحافت کے بغیر ممکن نہیں' بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ کسی قوم کی ثقافت کا اندازہ ثقافتی کارروائیوں سے زیادہ اُس کے اخبارات سے کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہ اچھا ہی ہوا کہ فیض کا صحافتی سفر مختصر رہا۔ اُن کی پرواز بلندی کی طرف ہی جاری تھی کہ اُنہیں یہ سفر منقطع کرنا پڑا۔ یوں بھی شاعری کی طرح صحافت میں بھی بسیار نویسی معیارِ کمال نہیں۔

☆☆☆

آئی اے رحمٰن، ساجدہ اقبال سید، فیض احمد فیض، عبداللہ ملک

شبنم شکیل

''یہ جان تو آنی جانی ہے''

میں نے پہلی مرتبہ جب اپنی گڑیا کی شادی رچانے کا فیصلہ کیا تو اس کے اخراجات کے لئے میری والدہ نے مجھے 2 روپے دیئے اور کہا۔ دودھ منگوا لو اور کھیر بنا لو۔ میں نے گھر میں پڑے ہوئے پرانے دیئے اٹھائے، ان میں سے جلی ہوئی روئی نکال پھینکی اور انہیں دھو چکا کر اُن میں کھیر جمالی۔ شادی کی خبر میرے والد تک بھی پہنچی۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا۔ ''تمہیں گڑیا کے نکاح پر گواہوں کی ضرورت بھی پڑے گی کہو تو اپنے دوستوں کو بلا لوں۔'' دراصل میری والدہ بھی سب بیویوں کی طرح شوہر کے دوستوں کے خلاف تھیں اس لئے وہ ایسے بہانے تلاش کیا کرتے تھے۔ مجھے گواہوں کی ضرورت والی بات تو سمجھ نہیں آئی نہ آج تک آسکی ہے مگر میں نے انہیں اجازت دے دی۔ شادی مریم تاثیر کے گڈے سے طے پائی تھی۔ گواہوں میں ڈاکٹر تاثیر' صوفی تبسم صاحب' ڈاکٹر سید عبداللہ اور پطرس بخاری شامل تھے۔ چار بجے شام مریم ایک جھلمل کرتا فراک پہن کر آئی اور آ کر یہ خوش خبری سنائی۔ ''بلو بدتمیز نے گڈے کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں۔'' یہ بلو ڈاکٹر تاثیر کے صاحب زادے تھے جو اب سلمان تاثیر کہلاتے ہیں۔ یہ خوش خبری سنانے کے بعد مریم نے خالص انگریزوں کی طرح کندھے اچکا کر کہا "I am sorry but we will have to postpone the marriage." یہ سن کر میں نے ایک دل خراش چیخ ماری اور مریم کو دھکا دیا۔ لڑائی کی آوازیں باہر صحن میں بیٹھے ہوئے مردوں تک جا پہنچیں۔ کیس پیش ہوا۔ سید عبداللہ نے کہا۔ ''لیجئے عابد صاحب برات حاضر دولہا غائب۔ عابد صاحب قائداعظم کے جانے کے بعد پاکستان کی بھی بالکل یہی حالت ہے۔'' سید صاحب کی عادت تھی کہ وہ ایک جملے کو بار بار دہرایا کرتے تھے میں یہ سمجھی وہ مجھے چھیڑ رہے ہیں۔ میں نے زمین پر پچھاڑیں کھانا شروع کیں۔ دولہا لاؤ۔ ابھی لاؤ۔ میری بڑی بہن شیریں نے کہا۔ ''شادی رہنے دو۔ ابھی منگنی کر لو۔'' فیض صاحب کی بیٹی منیزہ کو ابھی اُردو بولنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ تھی بھی بہت چھوٹی۔ اس نے اپنی ہی بنائی ہوئی اردو میں مجھے مشورہ دیا ''منگنا کر لو'' 'تم چپ رہو' میں نے چلا کر کہا۔

مہمان خواتین و حضرات دم بخود' اتنے بڑے بڑے دانشور موجود مگر مسئلہ ایسا گھمبیر تھا کہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ اتنے میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ پھر میرے بھائی نے آ کر کہا ''چاچا فیض آئے ہیں۔'' ''بس مسئلہ حل ہو گیا۔'' صوفی صاحب نے چٹکی بجا کر کہا۔ ''شبنم کی گڑیا کی شادی فیض سے کر دی جائے ''وہ ہم سب میں سے زیادہ قربانی دینے والا شخص ہے۔ بارات کا دولہا بننا اُسی کو زیب دیتا ہے'' پرانے رسالوں کو کاٹ کر سہرا بنایا گیا اور فیض صاحب کے سر پر سجا دیا گیا۔ انہوں نے دبی زبان میں' بہت دھیمے لہجے میں' احتجاج بھی کیا اور کہا کہ وہ ایک نظر اپنی ہونے والی دُلھن کو دیکھنا چاہتے ہیں مگر صوفی صاحب نے انہیں ڈانٹ دیا۔ ''فیض تم احتجاج بہت کرتے ہو۔ دوسروں کی خوشی کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' فیض صاحب تیار ہو گئے۔ میں نے اس سے پہلے فیض صاحب کو' اپنے چاچا جی کے رُوپ میں دیکھا تھا مگر آج پہلی مرتبہ انہیں ان نظروں سے دیکھا جن سے ایک ساس اپنے داماد کو دیکھتی ہے۔ وہ مجھے اچھے لگے۔ گڈے سے' پیارے سے' شہزادے جیسے۔ نکاح ہو گیا۔ اُن کے سفید براق کرتے' پاجامے پر خوب کھیر ملی گئی۔ انہیں مہندی لگائی گئی اور کاجل سے ان کے کپڑوں کو سیاہ داغوں سے بھر دیا گیا۔ فیض صاحب اپنی مخصوص گونگی مسکراہٹ لبوں پر سجائے بیٹھے رہے۔ چپ چاپ۔ فیض صاحب کو دوسروں کی خوشی بہت عزیز تھی شائد اسی لئے ان کی حیثیت ہمیشہ بارات کے دولھا جیسی رہی۔

شادی کے بعد صوفی صاحب نے تجویز پیش کی کہ شبنم اور اس کی گڑیا کو بخاری کی موٹر میں سیر کرائی جائے۔ کار اس وقت بخاری صاحب کے علاوہ کسی کے پاس نہ تھی، باقی سب حضرات تانگوں پر یا پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے ایک پان کی دکان پر لے جایا گیا۔ وہاں سب نے ایک ایک ٹھنڈی بوتل پی اور ایک ایک پان کھایا۔ بل شاید پانچ روپے بنا۔ سب نے اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا کسی کی جیب سے اٹھنی نکلی کسی کے دو پیسے۔ مگر پانچ روپے پورے نہ ہو سکے۔

اب یہ حضرات پان والے کو باور کرانے کی کوشش کرنے لگے کہ وہ بہت بڑے شاعر' ادیب ہیں۔ بڑے آدمی ہیں۔ کسی نے کہا میں اسلامیہ کالج کا پرنسپل ہوں' کسی نے کہا میں دیال سنگھ کالج کا۔ کسی نے کہا میں گورنمنٹ کالج کا۔ دکان دار نہیں مانا۔ آخر یہ طے پایا کہ فیض صاحب کو یرغمال کے طور پر پان والے کی دکان پر بٹھا کر گھر سے پیسے لائے جائیں۔ فیض صاحب چپ چاپ دکان میں جا کر بیٹھ گئے۔

ان واقعات کو ایک زمانہ گذر گیا۔ اس کے بعد ساٹھ اور ستر کی دہائی سے لیکر 1984ء تک میری فیض صاحب سے بہت طویل ملاقاتیں رہیں۔ میں نے انہیں بالکل مختلف نہیں پایا وہ ویسے ہی تھے۔ دوسروں کی خوشی کے لئے قربانی دینے والے۔ دوسروں کو اُجلا دیکھنے کے لئے اپنے لباس پر سیاہی برداشت کرنے والے، دوسروں کی آزادی کے لئے اپنے آپ کو گروی رکھوانے اور پھر بھی چپ رہنے والے۔ میں نے ان کے منہ سے کبھی کسی کی برائی نہیں سنی۔ میری تھڑدلی طبیعت نے انہیں کئی دفعہ دوسرے ادیبوں' شاعروں کی غیبت کرنے پر اُکسانا چاہا۔ ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ ''چاچا جی فلاں کی تحریروں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ کچھ خاص تو ہیں نہیں۔'' ''اچھا ہے بھئی اچھا ہے۔ ٹھیک ہے۔'' وہ سگرٹ کا کش لگا کر دور خلاؤں میں تکتے ہوئے کہتے۔ ''اچھا وہ جو شاعر ہے بالکل روایتی قسم کا' اتنی شہرت کیسے مل گئی اُسے'! میں کہتی۔ ''وہ بھی ٹھیک ہے کئی بہت اچھی چیزیں بھی لکھی ہیں اُس نے۔'' جواب ملتا۔ ایک دفعہ میں بہت سنجیدگی سے بحث پر اتر آئی۔ ''یہ بات تو غالب ڈیڑھ سو برس پہلے کہہ گئے ہیں' انہوں نے کونسی نئی بات کہی ہے۔!'' میں نے کسی شاعر کے حوالے سے کہا۔ ''شبنم' اساتذہ سب کچھ کہہ چکے ہیں بس لہجہ مختلف تھا۔'' چلئے بات ختم۔ فیض صاحب کسی سے گلے شکوے کے بھی ہرگز قائل نہ تھے۔ زیادتی کرنے والے خود شرمندہ ہو جائیں تو ہو جائیں۔

ایک دفعہ میں ماڈل ٹاؤن اُن کے گھر میں بیٹھی تھی کہ ایک صاحب آئے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔ ''سر' میں فلاں صاحب کو آپ کے ہاں لانا چاہتا تھا مگر وہ تو ڈر گئے کہنے لگے فیض کے گھر جاؤ تو سی۔ آئی۔ ڈی پیچھے لگ جاتی ہے گاڑی کا نمبر نوٹ ہو جاتا ہے۔'' فیض صاحب مسکرائے اور بولے ''بھئی سی۔ آئی۔ ڈی والوں کے پاس بھی تو کوئی کام ہونا چاہئے۔ انہیں اپنا کام کرنے دو۔ جو ڈرتے ہیں انہیں ڈرنے دو۔ کوئی ہماری وجہ سے کسی تکلیف میں کیوں پڑے۔'' ان صاحب کے جانے کے بعد میں نے فیض صاحب کو ذرا افسردہ دیکھا۔ تھوڑا سا چپ۔ میرا دل بھر آیا۔ میں نے کہا۔'' چاچا جی یہ صاحب غلط بیانی کر رہے تھے۔ کسی نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ سب لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' کہنے لگے ''ہاں۔ مگر آج کل ذرا محتاط ہی رہنا چاہئے۔'' یہ اس دن کا واقعہ ہے جب اندرا گاندھی قتل ہوئیں، شاید اس واقعے کا بھی اُن کے دل پر اثر تھا۔

اُن جیسی کشادہ دلی شاید ہی کسی اور کو نصیب ہو سکتی ہے۔ ایک دن انہیں اپنے ہاں مدعو کرنے گئی تو اُن سے پوچھا۔ ''فلاں صاحب آپ کے دشمنوں میں سے ہیں مگر وہ شکیل کے دوست ہیں، اگر آج میرے گھر پر وہ بھی ہوئے تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟'' انہوں نے بہت پیار سے کہا۔ ''ہمیں تم عزیز' تمہارے مہمان بھی عزیز' جسے چاہو بلالو۔'' خواجہ خورشید انور کے انتقال کے دن بھی اتفاق سے اُن سے ملاقات ہوئی بہت دل گرفتہ معلوم ہوتے تھے۔ کہنے لگے۔ ''میرا دوست مر گیا سب لوگ بہت پیار سے اُس کی باتیں کر رہے ہیں مجھے رشک آ رہا ہے۔ کیا لوگ میرے مرنے کے بعد مجھے بھی اتنی ہی محبت سے یاد کریں گے؟'' اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد فیض صاحب ہم سے رخصت ہو گئے' ہمیشہ کیلئے۔ اب انہیں کون بتائے کہ لوگ انہیں کس کس بہانے' کس کس موقع پر یاد کرتے ہیں کیونکہ

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

☆☆☆

خالد سعید بٹ اور فیض احمد فیض

سرفراز اقبال

خواب کا نقش

آج صبح ساجدہ نے مجھے فون کر کے یاد دلایا کہ میں نے فیض صاحب کے حوالے سے کچھ یادیں "ماہِ نو" کے ناظرین کے ساتھ Share کرنی ہیں۔ اس سے پہلے ساجدہ جعفر کے آفس سے فاروق صاحب نے فون کیا تھا۔ میں نے تعمیل حکم میں ضرور کچھ نہ کچھ تو ماضی کو دہرانا ہی تھا...... ویسے فیض صاحب کے متعلق تو آپ مجھ سے باتیں کیجئے اور میں بے تکان بول سکتی ہوں۔ شاید وقت کی رفتار تھم جائے میں نہیں تھک سکتی۔

فیض صاحب کے ساتھ میرا رشتہ ایسا تھا جس کا واقعی کوئی نام نہیں تھا۔ عمروں کا تفاوت اپنی جگہ...... لیکن ایک عجیب قسم کے احساسات تھے۔ میں صرف اپنی بات کروں گی۔ فیض صاحب کے حوالے سے دوسرے احباب جانیں یا فیض مرحوم خود جانیں مجھے فیض صاحب میں ایک مکمل گھمبیر اور پرخلوص انسان ملا۔ ایسا جس سے سب کچھ Share کیا جا سکتا تھا۔ میرے بچوں کے مسائل ہوں یا میرا کوئی ایسا مسئلہ جو میں حل نہ کر سکوں بس فیض صاحب سے بات کرو اور وہ حل۔ شاید محبت اور عقیدت مل جائیں تو اُس میں بے پناہ طاقت آ جاتی ہے۔ جذبوں میں اگر صداقت ہو تو ایسے رشتے آپ کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔

فیض صاحب کی شاعری اور صحافت یہ تو ادیب حضرات جانیں۔ میں تو فیض کی شاعری کی نغمگی میں اتنا سکھ محسوس کرتی ہوں کہ ان کا شعر مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ فیض صاحب کی شاعری کے ساتھ ان کی شخصیت بھی اتنی ہی بھرپور تھی۔

فیض کی معیت میں انسان جبر سہنے کے طریقے سیکھ کر پرُ اُمید رہتا ہے اور منزل کی جدوجہد اُسے زندہ رکھتی ہے۔ فیض صاحب نے ایک پر آشوب زندگی گزارتے ہوئے بھی ہر وقت ایک گونجتی مسکراہٹ کو اپنے چہرے کی رونق بنائے رکھا۔ عجیب طرح کا شخص تھا اور عجب قسم کی قسمت لے کر آیا تھا۔ یعنی اسے محبت اور دشنام دونوں کا بیک وقت سامنا تھا۔ بھٹو صاحب کے عہد میں ہماری اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے فیض صاحب کو لینن انعام کی واپسی کا مطالبہ بار بار کیا گیا بھی مشرقی پاکستان ہماری اپنی سیاسی اور فوجی ناکامی کی وجہ سے علیحدہ ہوا۔ لیکن ہمارے فیض صاحب کو بُرا بھلا کہا جا رہا ہے کہ یہ سب روس کی وجہ سے ہوا اور الزام کس پر۔ ایک معصوم سا انسان جو انسانیت کی برابری کا خواب دیکھتا رہا۔ مارکسزم کا سحر ہی اتنا تھا یہ معصوم لوگ آئرن کرٹن کے فریب کو نہ سمجھ سکے اور خوبصورت سحر کی اُمید میں زندہ رہے۔ ایسی اُمید جو دانشور دلاتے ہیں لیکن اکثریت ناامید ہو جاتی ہے۔

فیض صاحب بہت شاکر و صابر انسان تھے۔ اُنہیں ہر حال میں صبر کا مظاہرہ کرنا آتا تھا۔ جیل میں بھی کوئی پرواہ نہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

مجھے یاد ہے فیض صاحب کہا کرتے تھے۔

"جب ہم قید تنہائی کاٹ رہے تھے تو پہرے دار کی ڈیوٹی تھی کہ وہ روز شام کو ہمیں گھما لائے۔ سنتری بادشاہ کا جی چاہتا تو وہ سیر کیلئے لے جاتا لیکن جب اس کا جی نہ چاہے تو منہ پھیر کر کھڑا ہو جاتا۔ ہم اُس پہرے دار کو کبھی تنگ نہیں کرتے تھے بس اس کی طرف پیٹھ پھیر کر بیٹھ جاتے اور ہمیں اُس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا۔" کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ میں تو اپنے متعلق جانتی ہوں۔ کہ یہ میں تو تھڑدلی ہوں ہی لیکن یہاں تو بڑے بڑے سیاستدان جیل کی سلاخیں برداشت نہ کر سکے اور اس ملک سے فرار ہو گئے اور کئی دوسرے لوگ اپنے گھر کے پرتعیش ماحول میں بھی بلڈ پریشر کا شکار ہو گئے۔ پھر یہ لوگ دعوے کرتے ہیں کہ ہمیں بھی بڑا مانو! کیسے؟

اتنا بھرپور کردار Conviction والے ہی ادا کر سکتے ہیں کیونکہ محبت کی سچائی انسان کو طاقت بخشتی ہے۔ فیض صاحب کو وطن سے اتنی محبت تھی اور اسی محبت نے اتنے دکھ دیئے کہ اسی وطن میں ان پر جیل مسلط کی گئی۔ بقول فیض کے جدوجہد ہی انقلاب کا سرچشمہ ہے۔ فیض صاحب کو مناظر اور مطالعہ حسن فطرت سے زیادہ انسانوں سے محبت تھی۔ وہ مستی دروازے کی بدرو کو بھی یاد کرتے ہیں۔ چاندنی جو بدرو اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑتی تھی انہیں اک سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ چاندنی کی پراسراریت میں کھو کر منظر کے بدوضع ہونے کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ دراصل فیض صاحب نے زندگی کے ہمیشہ

اچھے رخ کو ہی دیکھا حالانکہ انہیں مسلسل اذیتوں سے واسطہ پڑا، اسی لئے تو اشفاق احمد نے انہیں صوفی کا خطاب دیا ہے۔ گوتمی مسکراہٹ لئے ہوئے اپنی نشست پر شانت بیٹھ کر دنیا کو انقلاب کی راہ پہ ڈال دیا وہ شاعر تھا اُس نے شاعری کے ذریعہ تو جو کیا سو کیا اپنی شخصیت کا بھی بھرپور تاثر چھوڑا۔ 79ء میں میں اپنے بچوں' ڈاکٹر غزالہ اور ڈاکٹر ندیم کے ساتھ لندن گئی، فیض صاحب جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان دنوں وہ روس میں تھے، میں نے لندن جاتے جاتے انہیں خط لکھ دیا کہ میں لندن جارہی ہوں میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب فیض صاحب کی طرف سے تار ملا کر میں فلاں تاریخ کو پہنچ رہا ہوں۔ فیض صاحب لندن آگئے پھر ہم تینوں...... میں' ڈاکٹر غزالہ اور فیض صاحب آئرلینڈ چلے گئے کیونکہ ان دنوں لندن سب جلاوطن سیاستدانوں کا گڑھ بنا ہوا تھا...... ویسے لندن کی فضائیں جلاوطنوں کے لئے بہت سکون افزا ہیں کہ ہمارے سبھی '' بھگوڑے لوگ '' لندن میں اپنے دن گزارتے ہیں۔ ہاں تو ہم تینوں اسی لئے آئرلینڈ چلے گئے تا کہ غزالہ کیلئے آئرلینڈ میں کوئی جاب ڈھونڈیں اور سکون سے باتیں کریں۔ وہاں پر فیض صاحب نے حفیظ جالندھری مرحوم کے متعلق بہت سے ایسے انکشافات کئے جو کہ وہ پاکستان میں ہوتے تو کبھی نہ کرتے' دراصل فیض صاحب ہر شخص کی عزت کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ شاید میرے ساتھ اس لئے Share کر لیتے کہ انہیں یقین کامل تھا کہ میں ان کے اعتبار کو دھوکا نہیں دوں گی حالانکہ وہ باتیں ایک کیسٹ cassette میں اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ وضع دار اتنے تھے کہ حفیظ جالندھری مرحوم نے سلسلہ وار فیض کے خلاف '' سیارہ ڈائجسٹ '' میں لکھنا شروع کیا۔ فیض صاحب نے پلٹ کر جواب نہیں دیا...... اب لیاقت ہال راولپنڈی میں مشاعرہ تھا جس میں حفیظ جالندھری نے تو موجود ہونا ہی تھا، مجھے یاد ہے فیض صاحب کہنے لگے '' آؤ کہیں چائے پیتے ہیں تا کہ میں دیر سے جاؤں اور چپ چاپ تھوڑی سی دیر میں مشاعرہ پڑھ کر آجاؤں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری موجودگی حفیظ صاحب کو پریشان کر دے۔ '' اتنا ظرف عام انسان میں کہاں ہوتا ہے۔ یعنی

اسی کیہ کیہ جندے جالیا تسی کیہ کیہ لیکاں لائیاں
واہ دے ہجن

کیہیاں کیتیاں تسی ساڈے نال برائیاں

چھوٹی چھوٹی اچھائیاں انسان کو بڑا بناتی ہیں اور بڑا پن عہدوں سے نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے سے ملتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے فیض صاحب کیلئے P.I.A والوں کی محبت کا مظاہرہ دیکھا ہوا یوں کہ فیض صاحب صبح 9 بجے جاگے اور تیار ہو کر مجھ سے کہنے لگے، '' بھئی بہت بُرا ہوا دس بجے میرا جہاز لاہور جائے گا اور گیارہ بجے میری بہت اہم میٹنگ ہے، اب تم مجھے جلدی سے ایئرپورٹ پہنچا دو۔'' ان دنوں میں ہارلے سٹریٹ میں تھی۔ گاڑی میں فیض صاحب کا اٹیچی کیس رکھا اور گاڑی کو دوڑاتے ہوئے میں ائیرپورٹ پہنچی تو جہاز کی سیڑھی ہٹائی جا رہی تھی، اب کیا ہو؟ میں اور فیض صاحب دونوں حیران کاؤنٹر پہ کھڑے ہیں۔ '' بھئی ہمیں ضرور لاہور پہنچنا ہے دوسری فلائٹ کیلئے ہمیں بک کرلو'' آپ 50 روپے دے دیجئے آپ کو اگلی فلائٹ سے لاہور بھجوا دیں گے...... (ان دنوں لاہور کی ٹکٹ سو روپے تھی) فیض صاحب نے بلا حجت 50 روپے اُس کے حوالے کئے اور ہم دونوں کھڑے تھے کہ اچانک اندر سے ایک پی آئی اے کا افسر باہر آیا '' فیض صاحب آپ! کیا ہوا؟ آپ اندر آیئے '' اور جلدی سے چائے کا آرڈر دیا۔ اور فوراً ہی 50 روپے لا کر واپس کر دیئے '' فیض صاحب آپ کو دیر کرنے کا حق ہے لیکن ہمیں آپ سے آدھا کرایہ لینے کا حق نہیں کہ آپ فیض صاحب ہیں'' ۔ وہ صاحب ذرا باہر گئے تو فیض صاحب اُس شخص کی محبت کو محسوس کرتے ہوئے بہت ہی معصوم لگے۔

'' دیکھو بھئی یہ کتنی محبت تم لوگ ہم سے کرتے ہو ہم نہ تو وزیر ہیں نہ ہی مشیر اور نہ ہی کوئی بیورو کریٹ۔ پھر ہم گلہ کریں تو کس بات کا کریں۔ تم لوگوں کی محبت نے تو جنت اس دنیا میں ہی دکھا دی......''

میں سوچتی ہوں خوشی کا پیمانہ ہر بڑے آدمی کا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ فیض صاحب کو وہ چائے اور وہ پچاس روپے بہت خوشی دے گئے کیونکہ خوشی اور قناعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اب جس کا فقدان ہے۔ 80ء کے بعد سے تو ہم لوگوں میں قناعت نام کی شے رہی ہی نہیں، عجیب قسم کی ہوس اور لالچ نے ہر گھر میں ڈیرا ڈال لیا ہے۔ شاید چند لوگ ایسے ہوں لیکن میں تو ایسے لوگوں سے محروم ہوں۔

میں فیض صاحب کو اس لئے بھی زیادہ admire کرتی ہوں کہ ان کو میں نے بہت سے لوگوں سے بہت ہی مختلف پایا...... اللہ کے کرم سے پاکستان کے تقریباً سبھی دانشوروں سے میری صاحب سلامت رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اس لئے مجھے موازنہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی...... سبھی لوگ اچھے ہیں لیکن وہ سب سے الگ اور سب سے مختلف تھے اور شاید ان جیسا کوئی اس صدی میں پیدا ہو جائے تو ہو جائے۔ پچھلی صدی فیض کی صدی ہے، علامہ اقبال اپنی جگہ لیکن فیض صاحب بس فیض صاحب ہی ہیں۔ یہ میری اپنی رائے ہے اور ہر کسی کو رائے دینے کا حق ہے۔ تو جوان نسل کو فیض کی شاعری کا شعور ہونا چاہیے کہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

فیض احمد فیضؔ ...... چند یادیں، چند باتیں

فیضؔ صاحب اردو کے عظیم شاعر تھے۔ عربی زبان و ادب کے ممتاز عالم اور علم حدیث سے بخوبی واقف، وہ انگریزی کے نامور انشا پرداز بھی تھے اور صحافت کے مرد میدان بھی!۔ تعلیم و تدریس کے فن میں دست گاہ رکھتے تھے۔ لینن انعام یافتہ تھے۔ عالمی شہرت و مقبولیت سے سرفراز تھے۔ ان سب خصوصیات کے علاوہ وہ ایک بھلے مانس اور عظیم انسان بھی تھے۔

انسان دوستی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اس جذبے کی سرحدیں لامحدود تھیں۔ فیضؔ صاحب کی شخصیت کی خنک چھاؤں میں ہر ایک کو پناہ حاصل تھی چاہے وہ امیر ہو یا فقیر، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، گورا ہو یا کالا، لبنانی ہو یا ویتنامی، فلسطینی ہو یا پاکستانی۔ ان سبھوں کے لئے ان کا در دل باز تھا۔ اس چھتنار درخت سے استفادہ کرنے والوں میں یہ راقم بھی شامل رہا ہے۔

میں نے فیضؔ صاحب کا نام بچپنے میں سنا تھا۔ کالج کے زمانے میں ان کی نظم و غزل بھی پڑھی تھی۔ 1959ء میں سکھر کے پاک و ہند مشاعرے میں انہیں دور سے دیکھا بھی تھا لیکن ملاقات کی صورت 1964ء میں نکلی اور ایسی نکلی کہ اس کا سلسلہ 1982ء میں میرے بیرون ملک جانے سے قبل تک جاری رہا۔ اس پہلی ملاقات کی نوعیت عجیب و غریب تھی۔ میں ان دنوں جامعہ کالج ملیرسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ تھا۔

یہ درس گاہ کراچی شہر سے چودہ میل دور ایک ویرانے میں واقع تھی۔ وہاں شہری ہنگامہ آرائی اور ہماہمی ناپید تھی۔ کالج کے اوقات تدریس کے بعد ہُو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میں جامعہ کے سٹاف کوارٹر میں فروکش تھا۔ اسی زمانے میں میری شادی ہوئی تھی۔ میری بیوی...... روشنیوں کے شہر کی رہنے والی، اس شہر خموشاں سے بے حد دل گرفتہ تھی۔ میں جامعہ کی ملازمت چھوڑ کر کراچی شہر آنے کی سوچ رہا تھا۔ اسی دوران میں یہ خبر ملی کہ سر عبداللہ ہارون کالج میں اردو لیکچرر کی ایک آسامی خالی ہوئی ہے۔ کسی نے یہ بھی بتایا کہ اس کالج کے پرنسپل فیضؔ صاحب ہیں اگر ان تک کسی ذریعے سے رسائی ہو جائے تو نوکری پکی ہے۔ میں سیدھا آپا ہاجرہ مسرور کے پاس پہنچا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے فوراً ایک زوردار قسم کا تعارفی خط فیضؔ صاحب کے نام لکھ کر مجھے دیا۔ میں دوسرے دن فیضؔ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نہایت تپاک سے ملے۔ خط کھول کر پڑھا۔ کافی دیر تک مسکراتے رہے پھر مجھ سے حال احوال پوچھا۔ میں نے اصل حقیقت بیان کر دی۔ کہنے لگے درخواست دے دو۔ انٹرویو میں میرا ووٹ تمہارے لئے ہوگا۔ میں مطمئن ہو کر آ گیا۔

انٹرویو بورڈ میں اور اراکین کے علاوہ بیگم مجید ملک بھی تھیں۔ فیضؔ صاحب مسکرا مسکرا کر میری ہر مطبوعہ چیز اور دیگر اسناد سب کو دکھاتے رہے حتیٰ کہ دراز سے ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تعارفی خط بھی نکال کر بورڈ کے سامنے پیش کر دیا۔ پھر تنخواہ کے متعلق استفسار کیا گیا۔ مجھے جامعہ میں تین سو سے زیادہ تنخواہ مل رہی تھی۔ مفت کا رہائشی کوارٹر بھی تھا۔ غرض میں انٹرویو دے کر مطمئن گھر لوٹ گیا۔

چند ہی دنوں کے بعد فیضؔ صاحب کا ایک پیغام ملا جو بڑا ہی حیران کن تھا۔ ”میں تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ میں اس پیغام کا مطلب نہیں سمجھ سکا اور بھاگم بھاگ ان کے پاس پہنچا۔ کہنے لگے کہ ”میں نے انتہائی کوشش کی کہ تمہیں اتنی تنخواہ تو مل جائے جو تم جامعہ کالج میں پا رہے ہو۔ لیکن انتظامیہ راضی نہیں ہوئی۔ میں مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کم تنخواہ پر آؤ۔ تمہاری گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں۔“ اس روز فیضؔ صاحب کے اداس و مضمحل چہرے کو دیکھ کر مجھے عبداللہ کالج میں ملازمت نہ ملنے کا ذرا بھی افسوس نہ ہوا۔ البتہ یہ خوشی ضرور ہوئی کہ ان سے ملاقات کی سبیل تو نکلی۔

اتفاق سے کچھ عرصے بعد مجھے اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر ممتاز حسین کی وساطت سے جامعہ کالج سے زیادہ تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور میں شہر آ گیا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ گرمیوں کی تعطیلات شروع ہونے سے قبل کالج کے مالک نے مجھ سمیت چالیس اساتذہ کو برطرف کر دیا تاکہ تین مہینے کی تنخواہ بچائی جا سکے۔ میں اس واقعے سے بے حد دل برداشتہ

ہوا۔ اسی وقت طے کرلیا کہ اب کبھی کالج کی ملازمت نہیں کروں گا۔ اس بیکاری میں فیض صاحب یاد آئے۔ سیدھا ان کے پاس پہنچا اور اسلامیہ کالج کی صورت حال بتائی۔ انہیں میری روداد سن کر بے حد قلق ہوا۔ اسی وقت عمر قریشی صاحب کے نام انگریزی میں ایک خط لکھا اور کہنے لگے کہ ''اسے لے کر پی آئی اے چلے جاؤ۔ قریشی وہاں ڈائریکٹر تعلقات عامہ ہیں۔ تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کردیں گے۔''

میں فیض صاحب کا خط لے کر قریشی صاحب کے پاس پہنچا۔ موصوف نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کہیں میری کھپت ہو جائے' مگر میں اس وقت صرف اردو کا ایم اے تھا۔ اکاؤنٹس' مینجمنٹ اور سیلز سے بالکل ہی ناواقف۔ پی آئی اے میں بھی بات نہیں بنی لیکن میں نے اپنی ناکامی کی یہ بات فیض صاحب کو اس لئے نہیں بتائی کہ وہ سن کر ملول و افسردہ ہو جاتے اور میں ان کے مسکراتے چہرے پر اپنے دکھوں کی پرچھائیاں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

اسی دوران میں 1965ء کی جنگ چھڑ گئی۔ ایک دن صدر میں فیض صاحب مل گئے۔ خیریت پوچھی۔ میں نے کہا ہنوز بیکار ہوں۔ کہنے لگے کہ میں آج کل وزارت اطلاعات ونشریات کے دفتر میں بیٹھتا ہوں۔ کل صبح میرے پاس آجاؤ۔ چنانچہ دوسرے دن وہاں پہنچا۔ فیض صاحب نے اسی وقت ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اور نامور شاعر حفیظ ہوشیار پوری کے نام ایک خط لکھا کہ مجھے ریڈیو پروگرام دلوایا جائے۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ''ڈان'' اخبار والے اپنا اردو ایڈیشن نکالنے والے ہیں۔ ابراہیم جلیس کا وہاں بہ حیثیت ایڈیٹر تقرر ہو چکا ہے۔ تم ان سے بھی مل لو۔ پھر انہوں نے ابراہیم جلیس کے نام بھی ایک پرزور سفارشی خط لکھ کر میرے حوالے کردیا۔ میں ان دونوں بزرگوں سے ملا۔ حفیظ ہوشیار پوری صاحب نے ریڈیو میں پروگرام دلوادیا۔ البتہ ''ڈان'' میں کام نہ بنا اس لئے کہ اردو ایڈیشن شائع کرنے کا منصوبہ ملتوی کردیا گیا اور خود ابراہیم جلیس کو وہاں سے جانا پڑا۔ ان دونوں ادبی شخصیتوں سے میرے تعلقات ان کی زندگی کے آخری دم تک رہے۔ یہ فیض صاحب ہی کا احسان تھا۔

1968ء میں ''سیارہ'' لاہور ''عبدالعزیز خالد نمبر'' نکال رہا تھا۔ مجھے اس کے لئے کراچی کا ریجنل ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے کراچی کے مختلف ادیبوں اور برگزیدہ شخصیتوں سے مضامین و پیغامات حاصل کر لئے۔ معاملہ صرف فیض صاحب کا رہ گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ عبدالعزیز خالد سراسر اسلامی نظریے کے شاعر ہیں۔ وہ ''فارقلیط'' اور ''منحمنا'' جیسی سیرت کی منظوم کتابوں کے مصنف ہیں اور اُدھر فیض صاحب بقول شخصے ''دہریہ'' ہیں۔ ''کمیونسٹ ہیں۔'' دین و مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ ترقی پسند خیالات کے حامی ہیں۔ وہ بھلا خالد صاحب کو کہاں گھاس ڈالیں گے۔ میں اسی تذبذب میں رہا کہ ان کے پاس جاؤں یا نہیں۔ ابھی تک تو انہوں نے کسی معاملے میں انکار نہیں کیا لیکن کہیں خالد صاحب کی شاعری کے متعلق اپنی رائے دینے سے انکار نہ کر بیٹھیں۔

ایک ادارہ — ایک تاریخ — ایک نام

ینگ تھنکرز اکیڈمی - ڈیرہ غازی خان ڈویژن

ہمارا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
بنی نوع انسان کی خدمت کیلئے ہمارے ساتھ ہاتھ بڑھائیے

چیئرمین - شاہد قیصرانی
وائس چیئرمین - عتیق الرحمٰن خان
سیکرٹری جنرل - صاحبزادہ رحیم آصف مجددی
جوائنٹ سیکرٹری - ڈاکٹر محمد خالد خان

[illegible]
ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے مرے مہرباں ستم کیا ہے
[illegible]

[illegible]

آخر ایک روز میں نے ہمت کی اور خالد صاحب کے تمام مجموعہ ہائے کلام لے کر فیض صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا اور دبی زبان میں مدعا بیان کیا:

''میں اس نمبر کا علاقائی مدیر ہوں۔ میری عزت اور اعزاز یہ کا معاملہ ہے۔ آپ اس کے لئے پیغام مرحمت فرما دیں۔''

وہ سن کر چپ رہے۔ میں بھی خاموشی سے اٹھ آیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس بار فیض صاحب کی زبان پر ''نہیں'' ہوگا۔

ہفتہ عشرہ کے بعد فیض صاحب کا پیغام ملا کہ آجاؤ۔ جب پہنچا تو ''عبدالعزیز خالد نمبر'' کے لئے انہوں نے اپنا پیغام تھما دیا۔ مجھے مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی! مسرت اس بات پر کہ میری عزت رہ گئی' حیرت اس امر پر کہ فیض صاحب تو اپنے مارکسی اصول ونظریے کے کٹر پابند ہیں' پھر خالد جیسے اسلامی نظریات رکھنے والے شاعر کے لئے اپنا پُر اثر پیغام کیسے لکھ دیا۔

فیض صاحب کی وساطت سے مجھے ریڈیو پاکستان سے مسلسل پروگرام مل رہا تھا۔ اس طرح میری حالت سنبھل گئی۔ چونکہ کوئی مستقل ملازمت نہیں تھی' اس لئے میں نے ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں نئی نسل کے لئے ''کونپل'' کے نام سے قسط وار ناول لکھنا شروع کیا۔ جب اس کی چوبیس قسطیں چھپ گئیں تو انہیں کتابی صورت میں شائع کرانے کا ارادہ ہوا۔ سوچا اس پر کسی کا ''پیش لفظ'' ہونا چاہیے۔ میرے لئے فیض صاحب سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مسودہ بغل میں دبائے ان کے پاس پہنچ گیا اور اظہار مدعا کیا۔ انہوں نے اسے رکھ لیا اور کہنے لگے کہ ''پہلے پڑھ لوں' پھر لکھ دوں گا۔'' مجھے فیض صاحب کی یہ گفتگو سن کر جو مسرت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میں نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ میری ادنیٰ سی تحریر وقت کے عظیم شاعر کی نظروں سے گزرے گی۔ ایسا شاعر جس نے اردو شاعری کے دھارے کو یکسر موڑ کر رکھ دیا' جس کی اپنی نگارشات دنیا کی بے شمار زبانوں میں ترجمہ ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ جس کے علم وفضل کا یہ عالم ہے کہ سرسید احمد خان کی قائم کردہ علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری تک پیش کی گئی...... حقیقت یہ ہے کہ اس روز بیروزگاری کے باوجود میں اپنی قسمت پر نازاں تھا۔

جب کئی ہفتے گذر گئے تو میں نے فیض صاحب کے گھر فون کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کالج جا چکے ہیں۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد فیض صاحب سفید رنگ کی فوکسی ڈرائیو کرتے ہوئے کالج پہنچے۔ جب وہ گاڑی سے باہر آئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے ناول کا مسودہ بغل میں دبائے چلے آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے کہ ''یہ مستقل میرے ساتھ رہتا ہے۔'' پھر آفس میں آنے کے بعد انہوں نے سگریٹ سلگائی' ہلکے ہلکے کش لئے' لیٹر پیڈ اٹھایا اور پھر بہت ہی خوبصورت سا ''پیش لفظ'' لکھ دیا۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصے بعد نیشنل بک فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔ میرے دیرینہ کرم فرما جناب ابن انشا نے مجھے کہا کہ میں اس ادارے کے سربراہ یونس سعید صاحب سے ملاقات کروں۔ جب میں موصوف کے پاس پہنچا اور ان سے میرا انٹرویو ہوا تو میں نے چپ چاپ ''کونپل'' کا مسودہ آگے بڑھا دیا۔ جیسے ہی انہوں نے ورق الٹا' فیض احمد فیض کے ہاتھ کا لکھا ہوا ''پیش لفظ'' نظر آیا۔ انہوں نے اسے پڑھا اور اسی وقت مجھے فاؤنڈیشن میں ملازمت دے دی اور یہ بھی طے کیا کہ یہ ناول اسی ادارے سے شائع ہوگا۔ فیض صاحب کا لکھا ہوا ''پیش لفظ'' ان کی اپنی ہی تحریر میں شامل اشاعت ہوگا۔ فیض صاحب کے اسی ''پیش لفظ'' نے مجھے فاؤنڈیشن میں ملازمت دلوا دی۔

اتنا لکھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ فیض صاحب کی شاعری کا تو پورا ریکارڈ موجود ہے' لیکن مجھ جیسے ان گنت افراد کی فلاح وبہبود کے لئے' معاشی استحکام کے لئے' قلبی راحت وطمانیت کے لئے وہ چپکے چپکے جو کارنامے انجام دیتے رہے ہیں' ان کا ریکارڈ تو صفحۂ دل کے سوا کہیں بھی موجود نہیں حالانکہ یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جو ان کی شاعری سے بھی زیادہ وسیع وعریض ہے اور اسی ریکارڈ نے انہیں دنیا کا عظیم انسان بنا دیا۔

فروری 1984ء میں جبکہ میں سعودی عرب میں مقیم تھا' میرے عزیز دوست اور عربی زبان کے نامور شاعر محمد احمد قلی نے مجھ سے کہا تھا:

''میں فیض صاحب کی بہت قدر کرتا ہوں۔ یہ صرف شاعری ہی نہیں' انسانیت کا محسن ہے۔ ہر کسی کے لئے روتا ہے' ہر کسی کا دکھ اس کے سینے میں موجود ہے۔ میں اس سے بیروت میں مل چکا ہوں۔ بہت ہی بھلا مانس ہے۔''

یہ بھلا مانس جس کی ہم نے صحیح طور پر قدر نہیں کی' ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا۔ چکبست نے شاید فیض ہی کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں، محفل تری آباد رہے

☆☆☆

فقیر وحید الدین

یادیں فیض احمد فیض کی

فیض فطرتاً بہت اچھے دوست، بہت اچھے انسان اور بہت اچھے دانشور کی حیثیت سے ہر کہیں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پرخلوص دوستی کے متعلق میرے احساسات اور تجربات آج بھی وہی ہیں جو کئی سال پہلے تھے۔ جب ہم لوگ دہلی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں اکٹھے رہے، اس زمانہ کی دلچسپ ملاقاتوں کی یاد ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔

فیض اس وقت بھی شعر کہتے تھے لیکن اب تو انہیں بحیثیت ادیب، شاعر، نقاد، اور صحافی آفاقی شہرت حاصل ہے ان کی شہرت اور کمال فن میں ان کے جوہر طبع کو زیادہ دخل ہے یا مشق و جستجو کو، یہ سوال اگرچہ کئی بار ذہن میں ابھرا لیکن اس کا صحیح جواب پروفیسر محمد سلیم چشتی صاحب کی ایک ملاقات میں خود بخود مل گیا۔ سلیم چشتی صاحب علامہ اقبالؔ کے ہم عصر اور محفل اقبال کے خوشہ چیں ہونے کے علاوہ 1928ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں لیکچرار بھی رہے ہیں۔ ان دنوں وہ ایف اے کی کلاس کو انگریزی اور بی۔ اے کے طلبا کو اردو پڑھاتے تھے۔ فیض نامی متین و ذہین لڑکا بھی فرسٹ ایئر میں ان کا شاگرد تھا۔ چشتی صاحب کا بیان ہے کہ:

''یہ لڑکا اپنی شرافت، سنجیدگی، بردباری، کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے میری ساری کلاس میں ممتاز تھا۔''

اکتوبر میں جب کالج میں (Tutorial group) بنے تو حسن اتفاق سے یہ لڑکا چشتی صاحب کے گروپ میں شامل ہو گیا۔ چشتی صاحب نے اپنے فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اس گروپ کا نام ''اخوان الصفا'' رکھا۔ طے پایا کہ گروپ کے زیر اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی جائے۔ انہوں نے پہلے مشاعرہ کے لئے یہ مصرع طرح تجویز کیا تھا۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

نومبر 1928ء کے پہلے ہفتے مرے کالج میں پہلی مرتبہ یہ محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں مذکورہ بالا نوجوان نے بھی جس کی عمر 16 سال یا کچھ زیادہ تھی ایک غزل پڑھی اور جب یہ شعر سنایا۔

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

چشتی صاحب فیضؔ کے شعر موزوں کرنے کی اس استعداد سے نہایت متاثر ہوئے اور ان کے ایک ہم جماعت رحمت اللہ بیدل سے کہا۔

''اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح مشق سخن کرتا رہا تو آگے چل کر اس کا شمار ہندوستان کے پہلی صف کے شعراء میں ہوگا۔''

چشتی صاحب کی اس پیش گوئی کو اب 36 سال گزر چکے ہیں اور آج واقعی فیض کا شمار نہ صرف ہندو پاک کے دانشوروں میں ہے بلکہ اپریل 1962ء میں انہیں روس کا سب سے بڑا اعزاز ''لینن پرائز'' بھی حاصل ہو چکا ہے۔ یہ پرائز اس سے قبل ہندوستان میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو ملا تھا، اور امن عالم کے قیام کی کوششوں کے سلسلے میں انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور گھانا کے صدر نکرومہ کو بھی مل چکا ہے۔ پہلے اس اعزاز کو ''سٹالن پرائز'' کہا جاتا تھا لیکن خروشیف کے زمانے میں اسے لینن پرائز کا نام دیا گیا۔ یورپ میں طویل عرصہ قیام کے بعد فیض گذشتہ سال اپنے وطن واپس آئے ہیں اور ان کا نام ملکی صحافت، قومی ثقافت، آرٹ، ادب اور شاعری کی زینت بنا ہوا ہے۔ وہ ثقافتی سرگرمیوں، علمی مجلسوں اور شعری محفلوں کے رُوحِ رواں ہیں۔

ان کی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خاصی دلچسپ تو ہیں لیکن عام نہیں ہیں۔

فیض صاحب 1911ء میں سیالکوٹ جیسی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے جسے شاعر مشرق علامہ اقبالؔ جیسی ایک باعزت ہستی کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ ان کے اکثر بزرگ زراعت پیشہ تھے۔ لیکن فیضؔ کے والد سلطان محمد خاں ذی حیثیت ہونے کے علاوہ اہل علم اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ وہ کئی سال امیر عبدالرحمٰن کے ہمراہ افغانستان میں رہے، اردو، انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں افغانستان کے دستوری قوانین اور ''توزک امیر'' انگریزی میں ایک ناول (TheWazir's Daughter) جس کا اردو ترجمہ ''دختر وزیر'' کے نام

سے شائع ہوا بھی شامل ہیں۔ فیض کو بچپن میں مسجد شیخ حسام الدین بھیجا گیا جہاں انہوں نے مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی سے قرآن شریف پڑھا اور مکتب میں میر حسن کے شاگرد رہے۔ 1927ء میں سکاچ مشن اسکول سے میٹرک اور 1929ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف۔اے پاس کیا۔ فیض کو ان دنوں مولوی میر حسن سے عربی پڑھنے کا موقع ملا چونکہ عربی ان کے منتخب مضامین میں شامل تھی۔ جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہونے لگے تو اس موقع پر انہیں علامہ اقبال کی تائید و معاونت حاصل تھی۔ علامہ کا خط لے کر وہ کالج گئے۔ داخل ہوئے، 1931ء میں اعزاز کے ساتھ بی۔اے پاس کیا اور عربی میں آنرز کیا' 1933ء میں انگریزی اور 1934ء میں عربی میں ایم۔اے پاس کر کے MAO کالج امرتسر میں لیکچرار بن کر چلے گئے۔ وہاں 1939ء تک انگریزی' اردو' اور عربی پڑھاتے رہے' 1940ء میں ہیلی کالج لاہور آ گئے اور 1942ء تک انگریزی کے لیکچرار رہے پھر اپنے محسن اور استاد مجید صاحب کی تحریک پر 1942ء میں فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں بطور کیپٹن ان کا تقرر عمل میں آیا۔ 1943ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی ہوئے' قیام پاکستان سے ذرا قبل قائداعظم محمد علی جناح کے زیر سرپرستی لاہور سے انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نواب افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت حیات کی تجویز اور تحریک پر فیض احمد فیض کو اس نئے انگریزی روزنامہ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ فیض دسمبر 1946ء میں فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آ چکے تھے چنانچہ 2 فروری 1947ء سے ''پاکستان ٹائمز'' کی باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی۔ ''پاکستان ٹائمز'' جیسا انگریزی روزنامہ نکالنا اس زمانے میں مسلمانان پنجاب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا لیکن فیض کی خداداد ذہانت اور شب و روز کی جدوجہد نے اسے کامیابی کی ایسی راہ پر ڈال دیا کہ پھر وہ اکثریتی فرقے کے دباؤ' حکمرانوں کی سخت گیری اور ناموافق حالات کے روکے نہ رک سکا۔

شروع میں ''پاکستان ٹائمز'' سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس میں چھپتا تھا لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد اخبار ''ٹریبون بند'' ہو گیا اور بلڈنگ مع پریس ''پاکستان ٹائمز'' کے لئے خرید لی گئی جہاں سے وہ اب تک شائع ہوتا ہے' اردو روزنامہ ''امروز'' بھی انہی کی ادارت میں جاری ہوا' مولانا چراغ حسن حسرت اور ایوب کرمانی ان کے معاون اور رفیق ادارت تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کے لئے جو جدید راہیں اور نئی منزلیں تلاش کیں آج ملک کی پوری اردو صحافت ان پر چل رہی ہے اور کئی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کر چکی ہے۔ خبر نویسی' اداریے' مقالات' وقائع نگاری' تدوین کے نئے زاویہ نگاہ اور کتابت و طباعت سے لے کر تصاویر تک کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جن کا تجربہ پہلی بار ''امروز'' میں کیا گیا لیکن فیض کی ادارت میں ان اخبارات نے کاروباری منفعت سے زیادہ عوام کی ذہنی نشوونما اور احساسات کی رہنمائی اور بیداری کا کام کیا۔

میرے علم میں ہے کہ فیض نے کسی سے اصلاح نہیں لی' کبھی محض نمود و نمائش اور داد و ستائش کے لئے شعر نہیں کہا۔ انہوں نے شاعرانہ تخلص کی رسم بھی نہیں اپنائی بلکہ ان کا موجودہ نام فیض احمد فیض فوجی ملازمت کے آغاز پر محض اتفاقی طور پر کسی نے کاغذات پر رقم کر دیا جسے بعد میں انہوں نے تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور آہستہ آہستہ وہ ملک بھر میں بلکہ ساری دنیا میں فیض احمد فیض مشہور ہو گئے' ان کا پہلا مجموعہ کلام 1941ء میں ''نقش فریادی'' کے نام سے شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ ''دست صبا'' 1953ء کے دور اسیری کی یادگار ہے اور اس کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام جس کا نام ''زنداں نامہ'' اور سرنامہ سودا کا یہ شعر ہے

اے ساکنان کنج قفس، صبح کو صبا
سنتے ہیں جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

کہاں اور کن حالات میں مرتب ہوا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ بہرحال یہ 1956ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ ایک بار تینوں مجموعوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا تذکرہ ہوا۔ فیض نے بتایا کہ وہ ان تینوں کو یکجا کر کے عنقریب شائع کرنا چاہتے ہیں' جس کا نام ہو گا ''دست تہ سنگ''۔ نثر میں فیض کی تصنیف ''میزان'' کے نام سے 1961ء میں شائع ہو چکی ہے جو در اصل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

فیض سے جو لوگ پہلی بار ملتے ہیں ان کی کم آمیزی سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض اور کبر و نخوت دو متضاد باتیں ہیں۔ ان کی کسر نفسی اور بے نیازی کا رنگ کچھ قریبی دوستوں ہی سے پوچھئے۔ وہ خاموش لیکن جہاں دیدہ اور جہاں بین انسان ہیں۔ جب دیکھتا ہوں کچھ سوچتے ہوئے پاتا ہوں۔ واقعات زمانہ کی افتاد اور حوادث گرد و پیش کی نامساعدت کا نہ ان کے ذہن پر کوئی منفی اثر ہوتا ہے نہ سوچ پر۔ بہت سے بڑے بڑے مسائل کا تجربہ وہ یوں کرتے ہیں جیسے وہ بالکل روایت اور معمول کے مطابق تھے۔ ان کی اہمیت عارضی اور ان کا حل یقینی ہے' زندگی میں آزمائشوں اور مصائب و آلام کو انہوں نے اس سے زائد شاید ہی سمجھا ہو کہ ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور گزر گیا لیکن دوسروں کا دکھ درد دیکھنا اور برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ گفتگو کے دوران ایک دفعہ میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''فیض! جیل کتنی بار گئے؟''
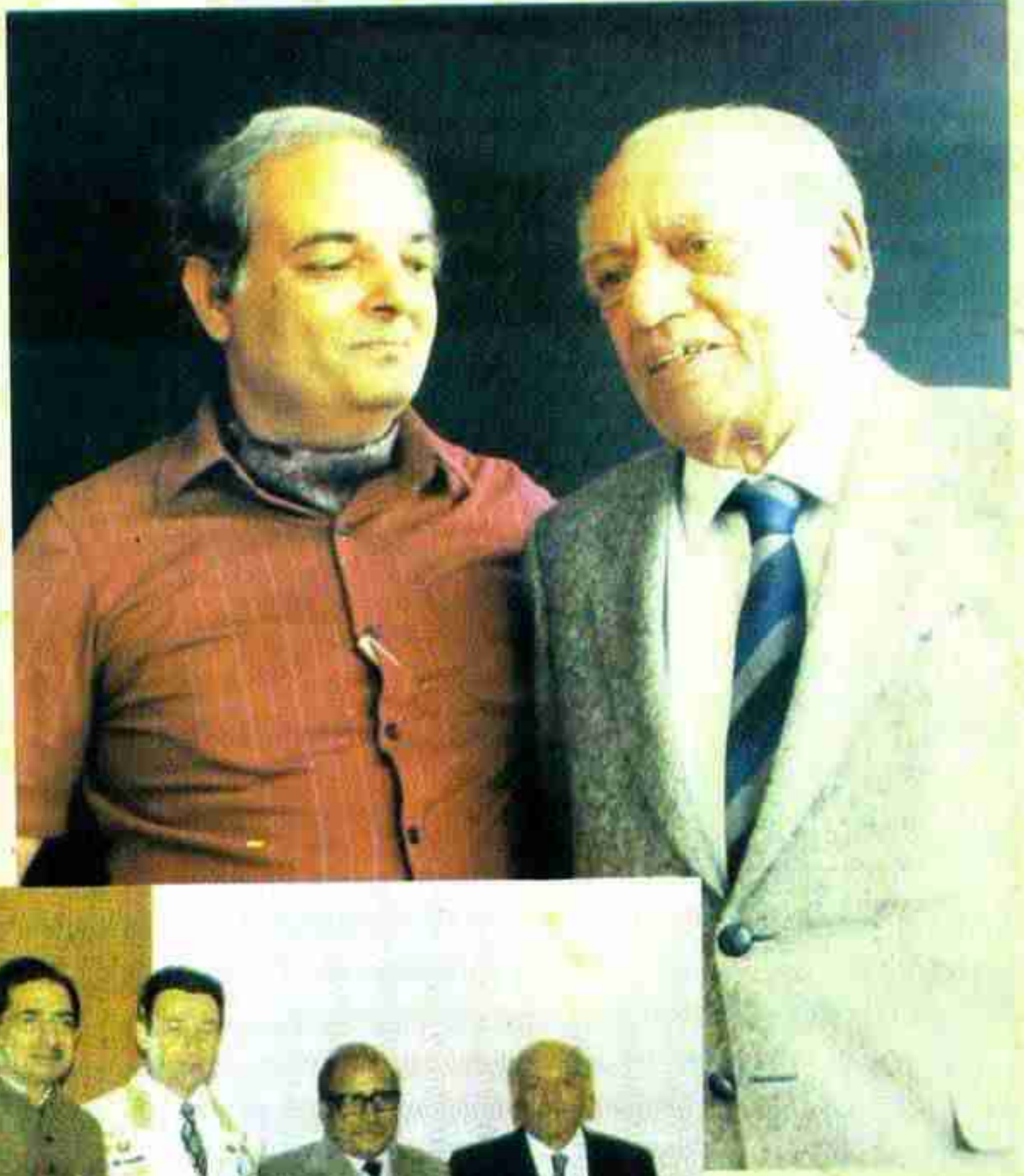
فیض احمد فیض
اور

فیض احمد فیض آئی اے رحمان
اور روسی سفیر سرنوف

قتیل شفائی
منیر نیازی
فیض احمد فیض
احمد ندیم قاسمی
ڈاکٹر سلیم اختر اور
سعادت سعید

فیض احمد فیض
احمد ندیم قاسمی
ڈاکٹر سلیم اختر اور
شبنم شکیل

فیض احمد فیض اور
سرفراز اقبال

بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ ''بس کوئی تین بار۔''

مزید تحقیق کی' تو اسی بے پروائی اور مختصر انداز میں کہا: ''پہلی دفعہ ایک دن کے لئے' دوسری دفعہ چار سال اور تیسری دفعہ چار ماہ۔''

آج کل فیض سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل ہیں' لیکن انہوں نے جتنے دن اپنا تعلق صحافت سے رکھا اخلاقی جرأت' بے باکی' بے خوفی اور حق گوئی کی چٹان بن کر رہے۔ مصلحت کوشی' چاپلوسی اور قصیدہ نویسی کو انہوں نے انسانی فطرت اور افراد کے اخلاق و کردار کے لئے ہمیشہ گھن سمجھا جو پہلے فرد کو لگتا ہے' پھر اجتماعی زندگی کی حمیت کو کھا جاتا ہے۔ فیض نے واقعی نظریاتی اور عملی اعتبار سے ہوا کے رُخ پر بادبان کھولنے کی رسم نہ کبھی قبول کی اور نہ اسے رواج دیا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1948ء میں ''امروز'' کی ایک خبر پر لاہور کے ایک پولیس افسر کو بہت غصہ آیا۔ بات وارنٹ اور مقدمے تک پہنچی۔ فیض گرفتار ہو کر ڈپٹی کمشنر ظفر الاحسن کی عدالت میں پہنچے۔ انہوں نے کہا ''شخصی ضمانت داخل کر کے آپ رہا ہو سکتے ہیں۔''

فیض نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ملک کے ممتاز ماہر قانون محمود علی قصوری کو علم ہوا تو فوراً فیض کی پیروی کے لئے عدالت پہنچے۔ فیض نے انہیں بھی روک دیا کہ صفائی دینا مطلوب ہی نہیں ہے وکالت اور پیروی کیسی؟ عجب کشمکش تھی' بالآخر عدالت نے سرکاری وکیل مقرر کرنے کی ہدایت کی جس نے ان کی صفائی میں دلائل دیئے۔ عدالت نے یہ دلائل قبول کرتے ہوئے انہیں باعزت بری کر دیا۔

فیض واپس آئے۔ ''امروز'' میں ایک ایسا مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس کے نیچے ان کے دستخط بھی شائع ہوئے۔ ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' کی تاریخ میں پہلی مثال تھی کہ ایڈیٹر کے دستخط کے ساتھ ایڈیٹوریل شائع ہوا ہو۔

فیض کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو سننا اور مطالعہ کرنا ایک ہی جیسی بات ہے۔ موڈ میں ہوں تو آہستہ آہستہ کتنے ہی مشکل سے مشکل مسائل و افکار کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں' سبک خرام' سبک کلام لیکن جو کچھ کہتے ہیں بہت خود اعتمادی اور پختہ یقین کے ساتھ بچے تلے انداز میں' گویا ذہنی الجھاؤ سے وہ نا آشنا ہیں۔ ان کی یہ سب مفید اور قیمتی باتیں قومی سرمایہ اور ادب کا حصہ ہیں جسے بدقسمتی سے محفوظ نہیں کیا جا رہا۔ اشعار کی صورت میں اب تک ان کے جو ادب پارے شائع ہوئے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ ان کا زیادہ حصہ فیض کی بے نیازی اور قلندرانہ طبیعت کی بدولت ضائع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے ادب' نوع انسان کی تاریخ' سماجی و ثقافتی قدروں' قدیم و جدید علم کے گہرے اثرات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ بحیثیت انسان' بحیثیت انسان دوست اور بحیثیت دانشور وہ اس نسل کے لئے ایک نصیحت سے کم نہیں ہیں۔ دیرینہ تعلق خاطر کی بنا پر مجھے ان کی صحبت میں وقت گزارنے کا موقع اکثر ملتا ہے۔ کبھی وہ کرم فرماتے ہیں' کبھی میں جاتا ہوں' بعض ملاقاتوں کی یادداشتیں ذہن میں اس طرح محفوظ رہ جاتی ہیں جنہیں فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔

ایک ملاقات کے دوران کوئی صاحب ان سے اردو ادب کی ترقی اور جمود پر گفتگو کر رہے تھے۔ فیض نے کہا۔ ''میں اردو ادب کی ترقی کی رفتار سے مطمئن ہوں...... دراصل ادیبوں کا ایمان کمزور ہو گیا ہے......'' پھر کہا۔ ''شاعری میں جمود نہیں ہے' جب پٹرول کم ہوتا ہے تو گاڑی رُک جاتی ہے' لیکن عارضی طور پر...... پھر چل پڑتی ہے۔''

ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ آزاد نظم کو لوگ شاعری ہی نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے عروض سے باہر شاعری کا تصور خود فریبی ہے۔

فیض نے کہا۔ ''کسی بات کو صرف اس لئے شعر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عروض میں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لئے ہے بھی کہ نہیں۔ اسے کہنا آتا ہے یا کہنے کے لئے اس کے پاس الفاظ اور سلیقہ ہے۔ اگر اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ کہہ رہا ہے تو وہ شعر یقیناً نہیں ہے۔''

بحث کچھ آگے بڑھی تو فیض نے مزید کہا ''راستے اور منزل کے بغیر شاعری کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ شاعر' ادیب اور دانشور کو بنیادی طور پر آگاہ ہونا چاہئے کہ سچ کیا ہے۔ جھوٹ کیا ہے۔ عارضی کیا ہے۔ مستقل کیا ہے۔ حقیقت کیا ہے۔''

فیض کو گفتگو کے موڈ میں دیکھ کر میں نے دریافت کیا۔ ''فارسی اور اردو شاعری نے آپ کے ذہن اور خیالات کو کس حد تک متاثر کیا ہے؟'' جواب میں کہا ''فارسی میں ایک شاعر حافظ کو ٹھیک سے پڑھا ہے اور اردو میں میر اور غالب کو غور اور دلچسپی سے پڑھا ہے' اقبال ایسا ہے کہ اُسے پڑھتے وقت کوئی اور نظر میں نہیں جچتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر ہی وہ ہیں۔ فکر اور شعریت دونوں میں' ہمہ گیر اور آفاقی۔''

فیض نے اردو شاعری پر اثر انداز ہونے والے تاریخی حوادث کا تجزیہ بھی کیا ہے اور ان محرکات کا ذکر بھی جو کبھی ترقی ادب کا نشان بنے اور کبھی جمود کا پیغام۔ انہوں نے کہا'' اردو شاعری کا بڑا حصہ اس جمود و یاس کی یادگار ہے جو وکٹورین دور کے برطانوی اخلاق نے پیدا کی۔ دراصل یہ ایک مصلحت آمیز منافقت تھی' جو سنجیدگی کے روپ میں ادب کی قدروں پر مسلط ہوئی اور اس کی ساری شوخی اور ندرت چھین کر لے گئی۔''

(یہ مضمون فیض کی زندگی میں لکھا گیا)

☆☆☆

فیض کے بارے میں بیگم مجید ملک کے خیالات

فیض صاحب میں صلاحیت تھی، خلوص بھی بہت تھا، بچوں سے بھی بہت محبت کرنے والے تھے دوستوں کے دوست تھے۔ مجید صاحب کا دل بھی لگا رہتا تھا ریٹائر ہونے کے بعد۔ فیض صاحب بھی کہیں سے آتے تو یہیں ٹھہرتے تھے۔ جن لوگوں کو شعر و ادب سے دلچسپی نہیں تھی ان سے بھی فیض کی دوستی تھی۔ فوج کی وردی اتارنے کے بعد وہ ''پاکستان ٹائمز'' آ گئے بعد میں جیل چلے گئے۔ میں ان سے ملنے جاتی تھی، کتابیں بھی لے جاتی تھی۔ نہ کبھی مجید صاحب نے کچھ کہا نہ کسی حکومت کے آدمی نے کہ تم وہاں کیوں فیض سے ملنے جاتی ہو۔ میری بچی حیدر آباد میں پڑھتی تھی میں اس کو بھی فیض سے ملوانے لے جاتی اور ان کیلئے ڈھیروں کتابیں بھی کہ جیل میں کافی پڑھنے لکھنے والے لوگ موجود تھے۔ بعد میں پتہ چلا کوئی سازش نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس زمانے میں ایسا سمجھ لیا گیا تھا کہ فیض بغاوت کرنے کی Conspiracy کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی تو کوئی ایسی خواہش نہیں تھی، وہ Ambitious بالکل نہ تھے کہ کسی اچھی جگہ پہنچ جائیں۔ بڑی خداداد ذہانت کے بھی مالک تھے۔ ''پاکستان ٹائمز'' کو انہوں نے لکھنے کا نیا انداز دیا۔ اخبار نویسی میں ان کے اپنے کمالات تھے۔ مجید ملک صاحب میں پرکھ تھی جس سے انہوں نے ٹیلنٹ ڈھونڈا اور فیض ان میں بہت اہم ہے۔ فیض میں یہ بات ضرور تھی کہ فیض با ادب بہت تھا۔ مجید ملک کو ہمیشہ مجید بھائی کہا کرتا تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب بھی انتساب کی۔ مجید بھائی اور آمنہ بہن کے نام۔ ''شام شہر یاراں'' ہے اس کا نام۔

ہم سے اس کا رشتہ ایسا تھا جس طرح کسی کا چھوٹا بھائی Talented نکل جائے۔ مجھ سے تو بڑے تھے، مجید صاحب سے چھوٹے تھے۔ آج بھی میرے ایلس کے ساتھ، ان کے بچوں اور فیملی سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ میں ابھی بیمار تھی تو دونوں بچیاں اور ایلس مجھے ملنے بھی آئیں۔ مجید ملک صاحب کی دوسروں سے جو الفت تھی اس سے میں مستفید ہوئی۔ فیض جب یہاں آئے تو میری دوست تھیں شوکت ہارون، ان کی اماں لیڈی ہارون سے کہہ کر عبداللہ ہارون کالج کا پرنسپل بنوا دیا۔ کالج لیاری میں تھا۔ انہیں گھر مل گیا تھا۔ ایلس بھی کام کرتی تھیں۔ فیض کالج چلے جاتے تھے۔ لیاری کے لوگوں نے فیض کے حوالے سے کام کیا۔ غریبوں کا علاقہ تھا، کالج اور لیاری کے لوگوں نے شاید فیض فاؤنڈیشن بنائی ہوئی ہے فیض کے کام اجاگر کرنے کیلئے۔

فیض محبوب شاعر تھا۔ میں نے انڈو پاک مشاعرہ کروایا تو اس میں حسرت صاحب بھی تھے زہرہ نگاہ بھی تھیں بہت کامیاب رہا۔ ہندو شعراء بھی دلی سے آئے تھے۔ بڑے بخاری صاحب نے اس کو Preside کیا۔

ایک اور مشاعرہ کروایا۔ کالج کا Festival week تھا۔ فیض نے ایک دن Preside کیا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے دوسرے دن Preside کیا۔

فیض کے متعلق میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ انہیں مجید ملک صاحب بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک محبت کا رشتہ تھا۔ ان کی بچیاں بہت اچھی اور باسلیقہ ہیں۔ فیض کی والدہ ہمارے گھر آتی تھیں۔ ایک دفعہ میلاد شریف میں شریک ہوئیں۔ ہم انہیں خالائی کہا کرتے تھے۔

☆☆☆

فیض احمد فیض

میری ایک مدت سے یہ آرزو تھی کہ میری کسی کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت جناب فیض احمد فیض کریں۔ جب میری کتاب ''یاران میکدہ'' چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو میرے دل میں یہ خیال آیا کیوں نہ اس کتاب کی رونمائی کی تقریب کی صدارت فیض صاحب سے کرائی جائے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے دوست سہراب اسلم سے مشورہ کیا اور اس سے کہا کہ اپنی کتاب کی رونمائی کی صدارت فیض صاحب سے کرانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا یہ اچھی بات ہے' ضرور کراؤ۔ میں نے سہراب اسلم سے کہا میری تو فیض صاحب سے شناسائی نہیں۔ کیا میں انہیں لانے کے لئے احمد ندیم قاسمی' عابد حسن منٹو' محمود علی قصوری یا سی آر اسلم سے رابطہ کروں اور ان سے کہوں کہ وہ فیض صاحب سے میری کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت کے لئے کہیں۔

سہراب اسلم نے کہا فیض صاحب ان سب کو انکار کر دیں گے وہ ہرگز نہیں مانیں گے اور نہیں آئیں گے۔ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا تم استاد دامن سے جا کر ملو وہ فیض صاحب کے بڑے گہرے دوست ہیں۔ فیض استاد دامن کا کہا مانتے ہیں وہ استاد دامن کو انکار نہیں کریں گے۔ بس یوں سمجھو وہ دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں۔ میں یہ مشورہ کر کے استاد دامن کے پاس پہنچا تو انہوں نے فیض صاحب کی صدارت کی تجویز قبول کر لی اور دعویٰ کیا کہ وہ فیض صاحب کو صدارت کے لئے لے آئیں گے۔ جب انہوں نے فیض صاحب سے صدارت کے لئے میری غیر موجودگی میں کہا تو فیض صاحب نے ہنستے ہوئے کہا استاد جی آپ کی مت تو نہیں ماری گئی۔ نہ میرے سامنے کتاب ہے اور نہ کوئی بندہ ہے آپ حکم دے رہے ہیں کہ تقریب میں ایک گھنٹہ قبل جانا ہے اور ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر جانا ہے۔ فیض صاحب کی بات سن کر استاد دامن ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں تمہیں بندہ نظر نہیں آتا۔ قمر یورش میرا بیٹا ہے ہم نے اسی طرح جانا ہے۔ فیض صاحب نے ہاتھ جوڑ کر استاد دامن سے معافی مانگتے ہوئے کہا اچھا استاد جی جیسا آپ کا حکم ہے ویسے ہی تعمیل کی جائے گی۔ فیض صاحب تقریب رونمائی کے اجلاس میں ایک گھنٹہ پہلے پاک ٹی ہاؤس پہنچے تو وہاں حاضرین تو کجا منتظمین جلسہ بھی غائب تھے ان کا خیال تھا قمر یورش کا دماغ خراب ہے فیض صاحب تھری اسٹار ہوٹل سے نیچے کسی ہوٹل میں نہیں آتے۔ منتظمین نے مجھے کہلوا بھیجا کہ تم اپنی تقریب رونمائی ملتوی کر دو ہم لوگ شوکت علی گلوکار کے ساتھ فلیٹیز ہوٹل میں شام منا رہے ہیں' وہاں آ جاؤ۔ میں نہیں مانا کیونکہ میں بہت خوش تھا قدرت نے آج مجھے ایک سنہری موقعہ دیا تھا اس کو کیسے ضائع کر دیتا۔ میری یہ دیرینہ خواہش تھی میری کتاب کی تقریب رونمائی کی صدارت فیض صاحب کریں مگر ایسا موقعہ مجھے اس سے قبل نہ ملا تھا۔ اب اپنے خواب کی تعبیر پر میں دل میں پھولا نہ سما رہا تھا اور اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔

جب میں فیض صاحب کو لینے کے لئے ان کی کوٹھی پر گیا تو ان کی بیگم ایلس نے کہا ہمارے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں لہٰذا تم ابھی سے سواری کا انتظام کر لو ورنہ شام ہو جانے کے بعد یہاں کوئی سواری نہیں ملتی میں نے ایک ٹیکسی کرایہ پر لے لی۔ فیض صاحب کو بتایا میں نے تو بہت کوشش کی کہ کسی دوست کی کار مل جائے مگر کہیں سے کار نہ مل سکی۔ فیض صاحب نے سن کر کہا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی مجھے کہہ دیا ہوتا میں کسی دوست سے کار مانگ لیتا۔ مجھے فیض صاحب کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ ان کے اس رویئے نے مجھے فیض صاحب کی عظمت کا اور بھی معترف بنا دیا۔ ہاں تو جناب فیض صاحب پر کچھ لکھنے سے قبل میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں فیض صاحب کو نہیں جانتا۔ یہ الفاظ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ یہی الفاظ انہوں نے میرے بارے میں میری کتاب ''یاران میکدہ'' کی تقریب رونمائی کی صدارتی تقریر کی ابتدا میں کہے تھے۔ فیض صاحب نے فرمایا تھا ''میں قمر یورش کو نہیں جانتا میں اس تقریب کی صدارت کے لئے جناب استاد دامن کے حکم سے حاضر ہوا ہوں۔''

فیض صاحب نے حاضرین کو بتایا چند روز ہوئے قمر یورش میرے گھر آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کے لئے دی تھیں۔ میں یہ کتابیں پڑھ کر حیران ہوا کہ قمر یورش تو میرا دوست ہے۔ میرا ساتھی ہے' میرا ہمسفر ہے یعنی ہم جب محنت کشوں میں کام کرتے تھے تو یہ بھی ہمارے ساتھ کام کرتے تھے۔

میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس بڑھاپے میں کتنے لوگوں کو یاد رکھ سکتا ہوں' لاکھوں کروڑوں لوگوں میں گھوم پھر چکا ہوں۔ یہ عمر کا تقاضہ ہے۔ آج کل میری یادداشت مجھے اکثر دھوکہ دے جاتی ہے مگر میں پھر بھی لوگوں کے نام یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور بعض دفعہ پہچان بھی لیتا ہوں۔ فیض صاحب نے کہا میں سکھ سردار جی تو نہیں ہوں کہ کہوں مجھے آپ کا نام تو یاد ہے

شمیم اشرف ملک، امین مغل، قمر یورش، فیض احمد فیض

مگر آپ کی شکل بھول گیا ہوں۔ مجھے اکثر نام بھول جاتے ہیں واقعات اور شکلیں یاد رہتی ہیں۔

1950ء کا ذکر ہے جب میں نے فیض صاحب کو پہلی مرتبہ محنت کشوں کے جلسہ عام میں دیکھا۔ خاکسار ان دنوں ریلوے لوکو ورکشاپ میں مزدور تھا۔ ساتھ ہی ریلوے ورکرز یونین میں مزدوروں کے محبوب رہنما مرزا ابراہیم کی قیادت میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کا کام کرتا تھا میں ایک ان پڑھ مزدور تھا میرا کام جلسہ میں تقریریں کرنا نہ تھا بلکہ وہاں مزدوروں کے جلسوں میں دریاں بچھانا اور دریاں لپیٹنا اور سٹیج لگانا تھا۔ عقل انسانی کا مادہ تو اب بھی نہیں اس زمانے میں اچھا خاصہ عقل سے پیدل تھا۔ انہیں دنوں میں ایک نوجوان شخص کو بڑی باقاعدگی سے جلسوں میں آتے ہوئے دیکھتا تھا۔ یہ شخص گندمی رنگ' درمیانے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ یہ شخص سفید صاف شفاف لباس میں ہوتا تھا' جلسہ گاہ میں عموماً گھنٹہ دو گھنٹہ وقت سے پہلے آجاتا تھا اور ایک کرسی کھینچ کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا تھا اور خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ عام لوگ رات کو سوتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں مگر یہ شخص دن کو کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتا تھا۔ میں اس شخص کو دیکھ کر اپنے دل میں اندازہ لگاتا تھا کہ یہ ضرور کوئی خفیہ پولیس کا انسپکٹر ہے جو ہمارے جلسوں کی رپورٹ لینے آتا ہے۔ میں اس بات کا بھی معترف تھا کہ یہ جو ہنس کے پروں کی طرح سفید اور صاف شفاف قمیض پاجامے میں ملبوس خفیہ انسپکٹر ہے' شریف آدمی ہے۔ یہ شخص ہمارے جلسوں پر کرائے کے غنڈوں سے حملہ نہیں کراتا' نہ باوردی پولیس کے ذریعے جلسہ ختم کرنے کا حکم دیتا ہے اور نہ ہی ہمارے ورکروں کو زدوکوب کراتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا جیسے وہ نشیلے انداز میں بڑبڑاتا بھی ہے۔ میں کافی عرصہ تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہا۔ عرصہ دراز کے بعد میرے ایک مزدور ساتھی رفیق نور احمد نے مجھے بتایا کہ جسے تم غلط فہمی سے خفیہ پولیس انسپکٹر سمجھ رہے ہو' یہ تو پاکستان کے مایہ ناز ترقی پسند شاعر جناب فیض احمد فیض ہیں۔ میں اس انکشاف پر اپنے دل میں سخت شرمندہ ہوا پھر بھی مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق نہ ہوا۔ میں اپنے دل میں سوچتا تھا اگر یہ مایہ ناز ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض ہیں تو

جب تمام ترقی پسند فنکار اکٹھے گروپ کی شکل میں ہمارے جلسوں میں آتے ہیں تو یہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آتے۔ احمد ندیم قاسمی' عبداللہ ملک' حمید اختر' احمد راہی' قمر اجنالوی' نصیر انور' حسن اعزاز' صفدر میر' ہاجرہ سرور' خدیجہ مستور' نازش کاشمیری' عارف عبدالمتین' عابد حسن' سی آر اسلم' ریلوے کے مزدوروں کے جلسوں میں اکثر تشریف لاتے تھے' مزدوروں کی سٹیج پر چھوٹے موٹے ثقافتی پروگرام بھی کرتے تھے۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے شباب کا تھا اور یہ بات میری سمجھ میں نہ آتی تھی' اپنے دل میں سوچتا تھا یقیناً کہیں گڑبڑ ہے' اگر یہ ممتاز ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض ہیں تو ان کے ساتھ روایتی شاگردوں کا ٹولہ کیوں نہیں جو سگریٹ پھونکتے اور پان چباتے ہوئے منت منت کے بعد شعر سنانے کے بعد کہتے ہیں لاالاستاد ہاتھ ملا کیسا عمدہ میں نے شعر کہا ہے' مگر یہ شخص تو بسم اللہ کے گنبد میں بند رہتا ہے۔ پھر میں نے اس مسئلہ پر سوچنا بند کر دیا اور اس خیال کو زبردستی اپنے دماغ سے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ فیض صاحب قید و بند سے رہا ہو کر تشریف لائے تو میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پھر صبح ہو گی" کے عنوان سے شائع ہو کر مارکیٹ میں آ چکا تھا۔ میں رفیق سندھی خاں کو ساتھ لے کر فیض صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' ان دنوں فیض صاحب ریڈیو پاکستان کے بالمقابل کوٹھی میں رہتے تھے۔ ہم دونوں جب ڈرائنگ روم میں پہنچے تو وہ کمرہ واقعی ایک آرٹسٹ کے کمرے کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی' بڑے بڑے مصوروں کی خوبصورت روغنی تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں' بڑا صاف شفاف پاکیزہ ماحول تھا۔ فیض صاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے' مسکراتے ہوئے اٹھے' بڑے پیار سے ملے۔ رفیق سندھی خان نے فیض صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "فیض صاحب! یہ میرے دوست مزدور افسانہ نگار قمر یورش ہیں' انہوں نے ساہیوال جیل میں کہانیوں کی یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ آپ کی نذر کرنے آئے ہیں۔" میں نے کتاب ان کے حضور پیش کی' وہ مسکرائے اور شکریہ کے ساتھ مجھ سے کتاب لے لی اور وعدہ کیا کہ وہ اسے ضرور پڑھیں گے۔ فیض صاحب جیل سے آنے کے بعد ہمارے جلسوں اور جلوسوں میں بہت کم آتے تھے غالباً وہ اپنی دال روٹی کے چکر میں پھنس گئے ہوں گے۔ کبھی کبھی ترقی پسندوں کے جلسوں میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی مگر وہ کسی کو یاد رکھنے کے معاملے میں روز اول کی طرح تھے۔ شاید ان کا کلیہ یہ تھا کہ زندگی کی طویل شاہراہ پر مسکرا کر ملو اور بھول جاؤ۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فیض صاحب یا تو مغرور ہیں یا ان میں زیادہ بناوٹ ہے' کسی کو لفٹ نہیں کراتے۔ یہ بات نہیں ہے۔ میرے مشاہدہ میں جو بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ جب خاص دوستوں کا حلقہ ہو تو پھر کھلتے تھے' اپنے من پسند موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کا چہرہ فروزاں ہو جاتا تھا۔ اس میں مسحور کن جاذبیت آ جاتی تھی۔ وہ بڑے شیریں انداز میں کھل کر گفتگو کرتے تھے اور علم و دانش کے موتی رولتے تھے۔ بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں سلجھاتے تھے' ان کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا ورنہ عام طور پر چپ شاہ بنے رہتے تھے۔ فیض صاحب معصوم ذہن' متین چہرہ اور وسیع القلب انسان تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کے چہرے پر جوانی کی سی تازگی اور شادابی تھی ان کی مسکراہٹ میں بڑی کشش تھی اور یہی ان کی محبوبائی شان تھی۔ فیض صاحب اپنی ذات کو کائنات سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ چاند کو بھی اپنی دھرتی کا ایک ٹکڑا تصور کرتے تھے۔ وہ مغرور نہیں' صاف گو ضرور تھے۔ پاکستان کے ترقی پسند دانشوروں میں واحد شاعر تھے جنہوں نے اپنے آپ کو ڈی کلاس کیا تھا اور اپنی زمین بلا معاوضہ کسانوں میں تقسیم کی تھی۔ میں فیض صاحب کی خدمت میں تین سال کے بعد حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فیض صاحب بہت بدل گئے تھے۔ نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ عادات کے لحاظ سے ان میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی وہ اب واقعی فوجی کپتان دکھائی دیتے تھے۔ ان میں جوانوں کی سی پھرتی آ گئی تھی۔ اب وہ چاک و چوبند رہتے تھے

فیض صاحب پوسٹل یونین کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے

حالانکہ اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ اب ان میں چیتے کی سی لپک پیدا ہو چکی تھی اور شاعری میں بھی نئی توانائی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے حسین خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئے تھے انہوں نے بڑے بڑے ممالک کا دورہ کیا تھا۔ عظیم دانشوروں سے ملے تھے' ان سے تبادلہ خیال کیا تھا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ اب وہ ہر وقت گم سم نہیں رہتے تھے' پہلے تو یہ حالت تھی فیض صاحب چپ چاپ الگ تھلگ رہتے تھے اور سگریٹ پھونکتے رہتے تھے' ان کے ہونٹوں سے ہر وقت سگریٹ چپکا رہتا تھا۔ ان کی شب بیدار خواب آلودہ آنکھوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرت رات بھر لیلیٰ کے گھر کی دربانی کرتے رہے ہیں۔ فیض صاحب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ غضب کی ہوتی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر نئی نویلی دلہن کی طرح شرمیلے انداز میں مسکرانا' گردن جھکا لینا آپ کی مخصوص عادت تھی' دوستوں میں درویش صفت رومانی شاعر مشہور تھے۔ اب انقلابی شاعر تھے' بہت کم لوگوں نے انہیں مزدوروں کے جلسوں میں تقریریں کرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ میں نے اکثر ان کی مزدوروں کے جلسوں میں تقاریر سنی ہیں۔ فیض صاحب کا شعر پڑھنے کا انداز نہایت بور تھا جیسے شعر نہیں پڑھ رہے کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں فیض صاحب اب صرف متوسط طبقہ کے رومانی شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی شاعری ڈرائنگ روم سے نکل کر ہر طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی اب صحیح معنوں میں عوامی شاعر بن رہے تھے کہ پروانہ اجل آ گیا۔ 20 نومبر بروز منگل دوپہر کے وقت روزنامہ امروز کے دفتر میں میں اپنے دوست محمد افضل خاں کے ساتھ فیض صاحب کے متعلق بات چیت کر رہا تھا کہ اتنے میں ٹیلی پرنٹر پر فیض صاحب کی ناگہانی موت کی خبر آئی میں تو یہ خبر سن کر ششدر رہ گیا مجھے ان کی وفات کا یقین نہ آ رہا تھا۔ فیض صاحب کی موت کے اس غیر متوقع حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میرے جسم کو سرد کر دیا۔ ایک لمحہ کے لئے میرے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں بے کار ہو گئیں۔ مجھے خیال آیا وہ کتنے عظیم انسان اور کتنے عظیم شاعر تھے۔ میں آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا' میری آنکھیں بند ہوتے ہی تصور کا دریچہ کھل گیا اور میرا ماضی' بیتے ہوئے ایام' گذری ہوئی ساعتیں ذہن کے پردے پر کسی فلم کی جگمگ جگمگ کرتی ہوئی تصاویر کی مانند ابھر ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ وہ امن کے علمبردار تھے' منصف مزاج تھے' فراخ دل سے بحیثیت انسان وہ بہت اچھے تھے۔ ہر خوبی ان میں موجود تھی۔ فیض صاحب نصف صدی تک اپنی شاعری کے فن کے ذریعے جادو جگاتے رہے۔ وہ لفظوں کے ساحر تھے' جذبات کے صناع' احساسات کے مصور' محبت کے نقیب' حسن کے پرستار اور انقلاب کے شیدائی۔ میرا دل ان کی ناگہانی موت پر فرط غم سے لبریز ہو گیا۔ میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا' ساری فضا غم میں ڈوب گئی۔ میں سوچنے لگا وقت کا قافلہ کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے' زندگی کتنی ناپائیدار ہے اور موت کتنی بے رحم اور اٹل حقیقت ہے' کوئی کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا' انسان موت کے سامنے کتنا بے بس و مجبور ہے۔ میری آنکھوں میں ایک آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا' میرے ہونٹوں سے دبی دبی سسکیاں نکلنے لگیں' ایک ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ فیض صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے ایک عجیب احساس ہوتا ہے ایک ایسی شخصیت' ایک ایسا پیارا انسان جو لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگوں کے دلوں میں بستا تھا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے فیض صاحب نے اپنی زندگی میں دولت نہیں بنائی نہ ہی محلات کھڑے کئے البتہ اپنے اعلیٰ اخلاق اور ہمدردانہ رویے سے دوست بنائے ہیں' ان کے دوست پاکستان میں ہی نہیں دنیا بھر کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں' بلا امتیاز مذہب و رنگ و نسل کے۔ میں سمجھتا ہوں وہ اس لحاظ سے دنیا کے امیر ترین انسان تھے۔ جب انہوں نے سفر آخرت اختیار کیا تو ان کے گھر میں اتنے لوگ جمع تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ہر شخص خواہ ان کا دوست تھا یا دشمن جنازے کو کندھا دینے کے لئے بے تاب تھا۔ جس وقت فوت ہوئے انہوں نے استاد دامن کے مکان کے لئے اخبار نویسوں کو بلایا ہوا تھا وہ استاد دامن کے لئے کسی اچھے ہوادار مکان کا بندوبست کرنا چاہتے تھے۔ جب اخبار نویس فیض صاحب کے گھر پر پہنچے تو فیض صاحب کی بجائے ان کی میت بستر پر پڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

یوسف بلوچ

فیض احمد فیضؔ اور مزدور

فیض احمد فیضؔ شاعر' ادیب' صحافی اور روشن خیال دانشور تھے۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے محنت کشوں کے ہمدرد اور دوست بھی تھے۔ دکھی انسانیت سے پیار و محبت اُنہیں زمانہ طالب علمی سے ہی تھا۔ امرتسر میں اُن کے زمانہ طالب علمی اور بعد میں اُستاد کے طور پر انہوں نے سیاسی طور پر ہر اُس تقریب میں حصہ لیا جو انگریز سامراج کے خلاف اور برصغیر کی آزادی کے لئے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد اُنہوں نے پاکستان کے ان پڑھ محنت کشوں کو آزادی کے ثمرات کا شعور دینے اور اُن کے دکھوں کا مداوا بننے کے لئے بہت کام کیا۔

پاکستان میں سب سے پہلے ڈاکخانہ جات کے ملازمین کی انجمن سازی کے لیے انہوں نے ٹریڈ یونین کو منظم کیا اور ملازمین کو تعلیم یافتہ کیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی پہلی ملکی سطح کی قومی مزدوروں کی تنظیم پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر بنائے گئے جبکہ مرزا محمد ابراہیم صدر تھے۔ انہوں نے ملک بھر میں محنت کشوں کی صحت مند انجمن سازی کے لئے دورے کئے اور اس تنظیم میں محنت کشوں کو متحد و منظم کیا اور ساتھ ہی ساتھ محنت کشوں کو سٹڈی سرکل کے ذریعہ تعلیم بھی دیتے رہے تا کہ وہ اپنے اچھے' بُرے کو پہچان سکیں۔

فیض احمد فیضؔ کافی عرصہ تک گڑھی شاہو میں یوگنڈا ہاؤس میں جو ریلوے ورکرز یونین کا دفتر ہے' شام کو جا کر بیٹھتے۔ ریلوے کا محنت کش طبقہ بہت کم پڑھا لکھا ہوتا تھا اور عام کارروائی انگریزی میں ہوتی تھی فیض احمد فیضؔ اُن کو ملنے والی چارج شیٹیں یا اُن کی کوئی بھی درخواست ہوتی مزدوروں کو انگریزی میں نہ صرف لکھ کر دیتے بلکہ اکثر خود اپنے ہاتھ سے ٹائپ بھی کر کے دیا کرتے تھے۔ یہ ان کا بہت بڑا احسان تھا ان کم پڑھے لکھے محنت کشوں پر آج بھی جو ملازمین ریٹائر ہو چکے ہیں اُنہیں یاد کرتے ہوئے اُنہیں اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ کوئی غرور یا رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ جب بھی ملتے بڑے خلوص سے ملتے۔ میں اُنہیں جب بھی ملتا ریلوے کے حوالے سے تو بہت خوش ہوتے اور مرزا ابراہیم کی خیر خیریت معلوم کرتے۔ مجھے اُن سے عقیدت کی حد تک پیار تھا اُن کی وفات پر مرزا ابراہیم کی قیادت میں ریلوے ملازمین نے جلوس کی صورت میں شرکت کی۔ اُن کے گیت' غزلیں' ہم محنت کشوں کے لئے تھیں۔ میں اپنے خیالات قتیل شفائی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

فیض ترے مداحوں میں شامل اک شخص قتیل بھی ہے\
جانے اس کو ملتا ہے ان سنگ زنوں سے کیا انعام

☆☆☆

ایلس فیض کی زیر صدارت فیض صاحب کی سالگرہ پر مزدوروں کے جلسے سے یوسف بلوچ خطاب کر رہے ہیں
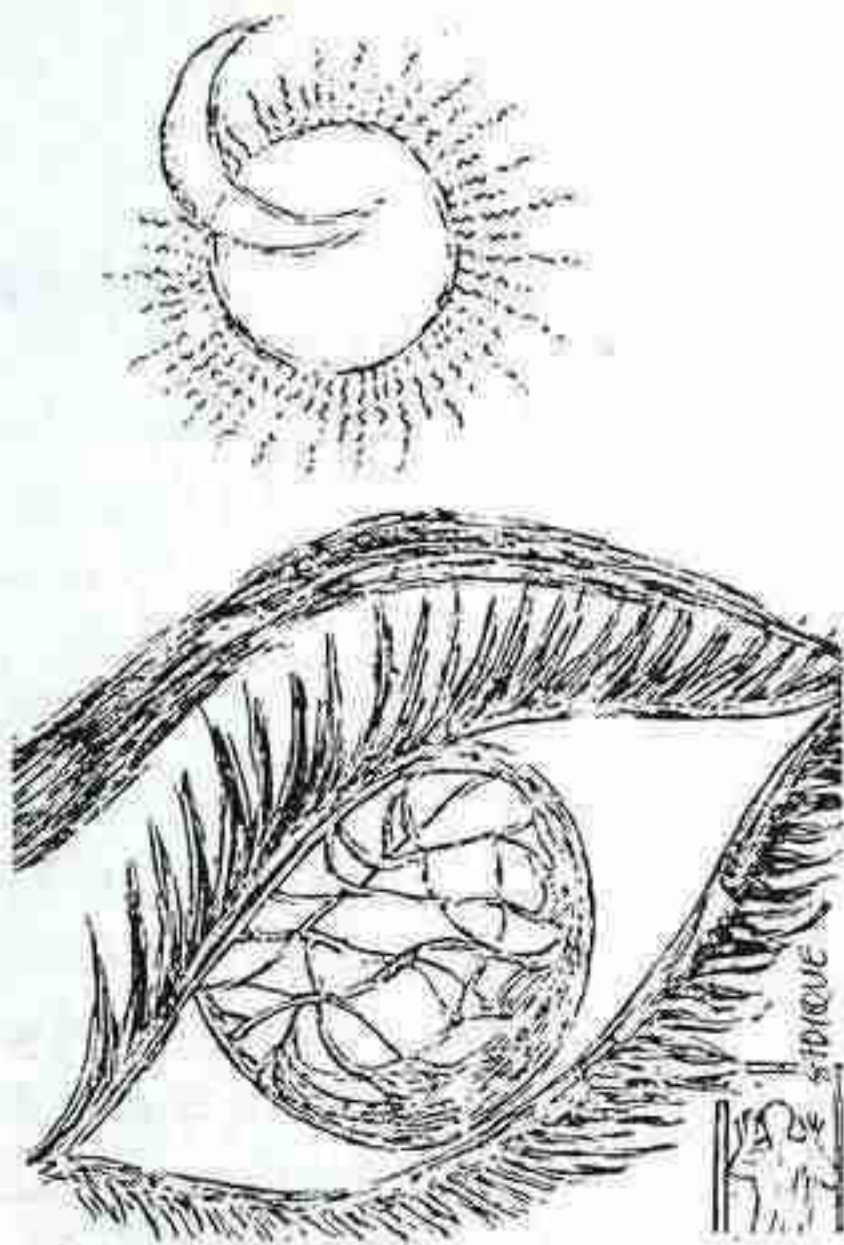
ختم ہوئی بارشِ سنگ

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

زنداں کی ایک صبح
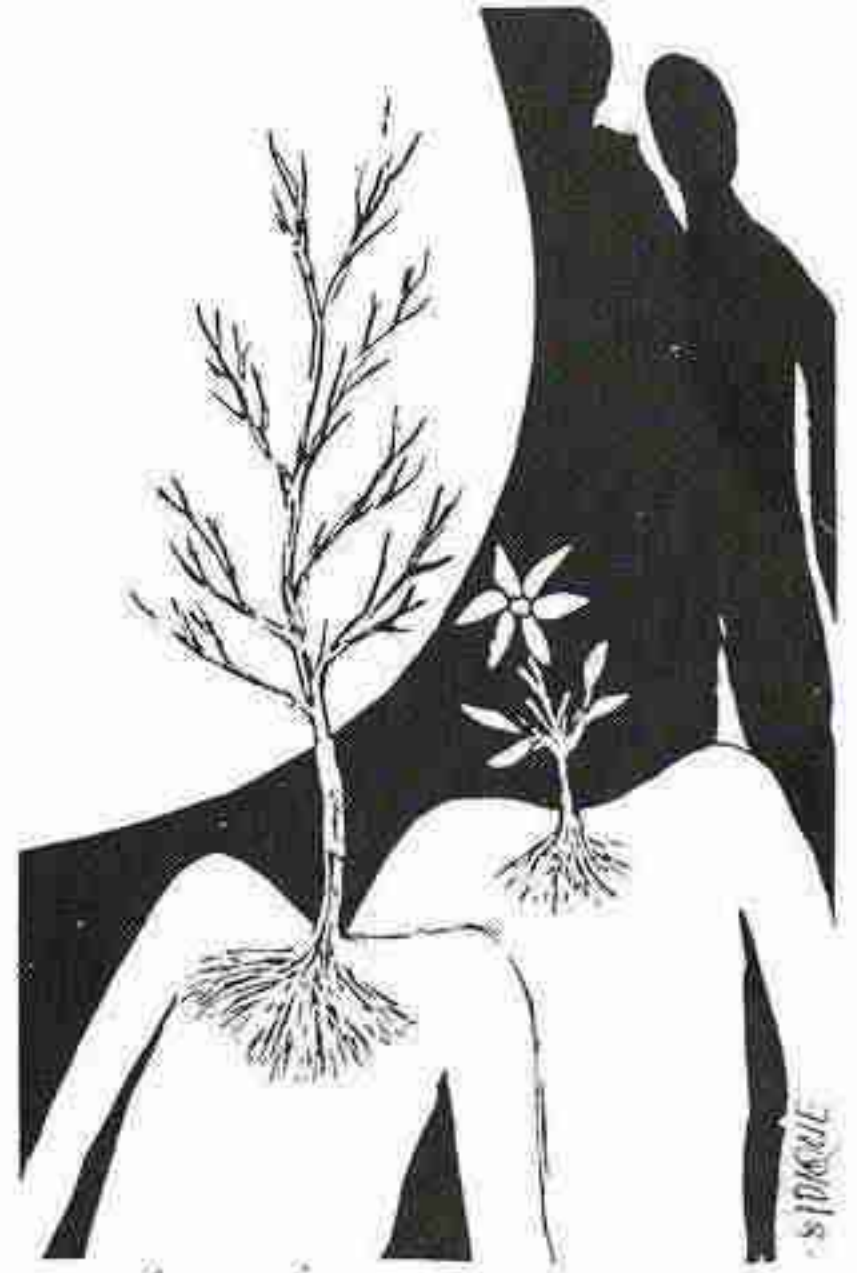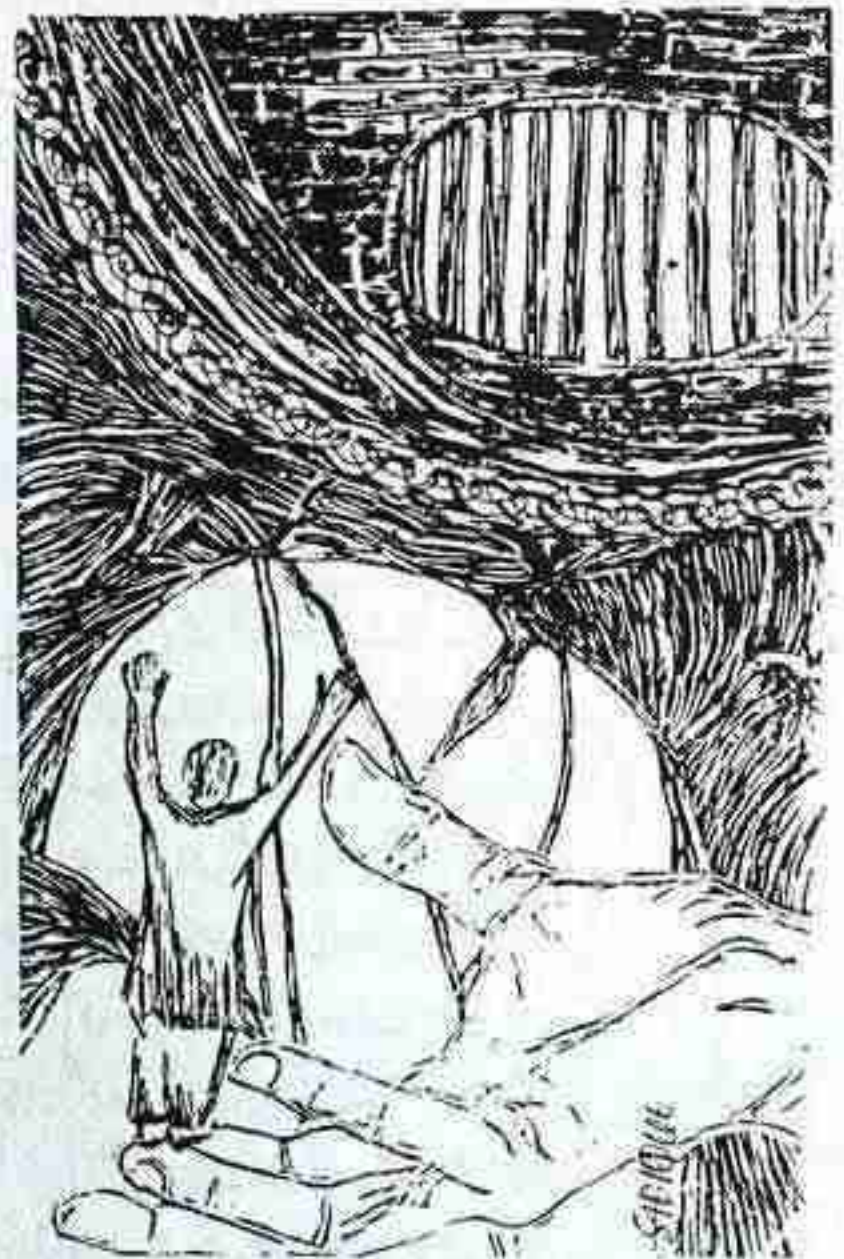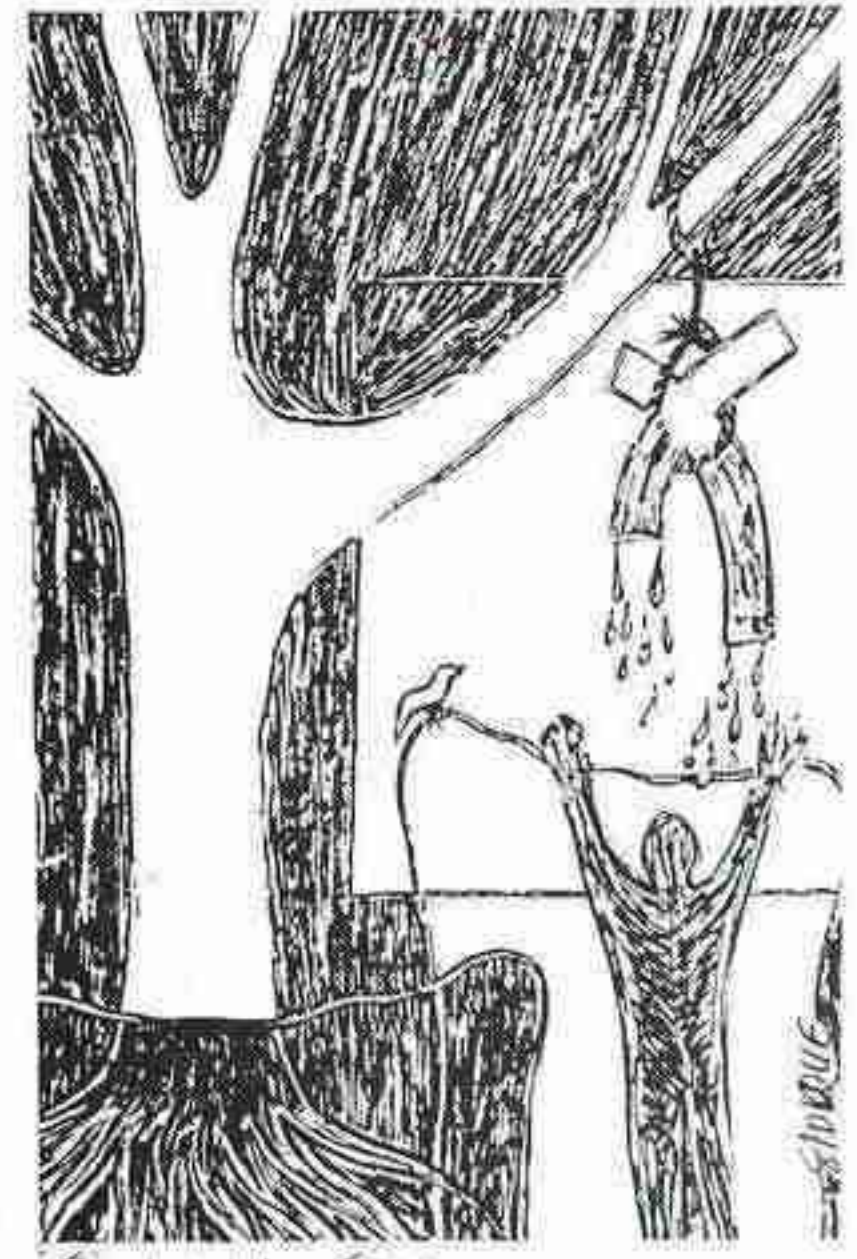
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
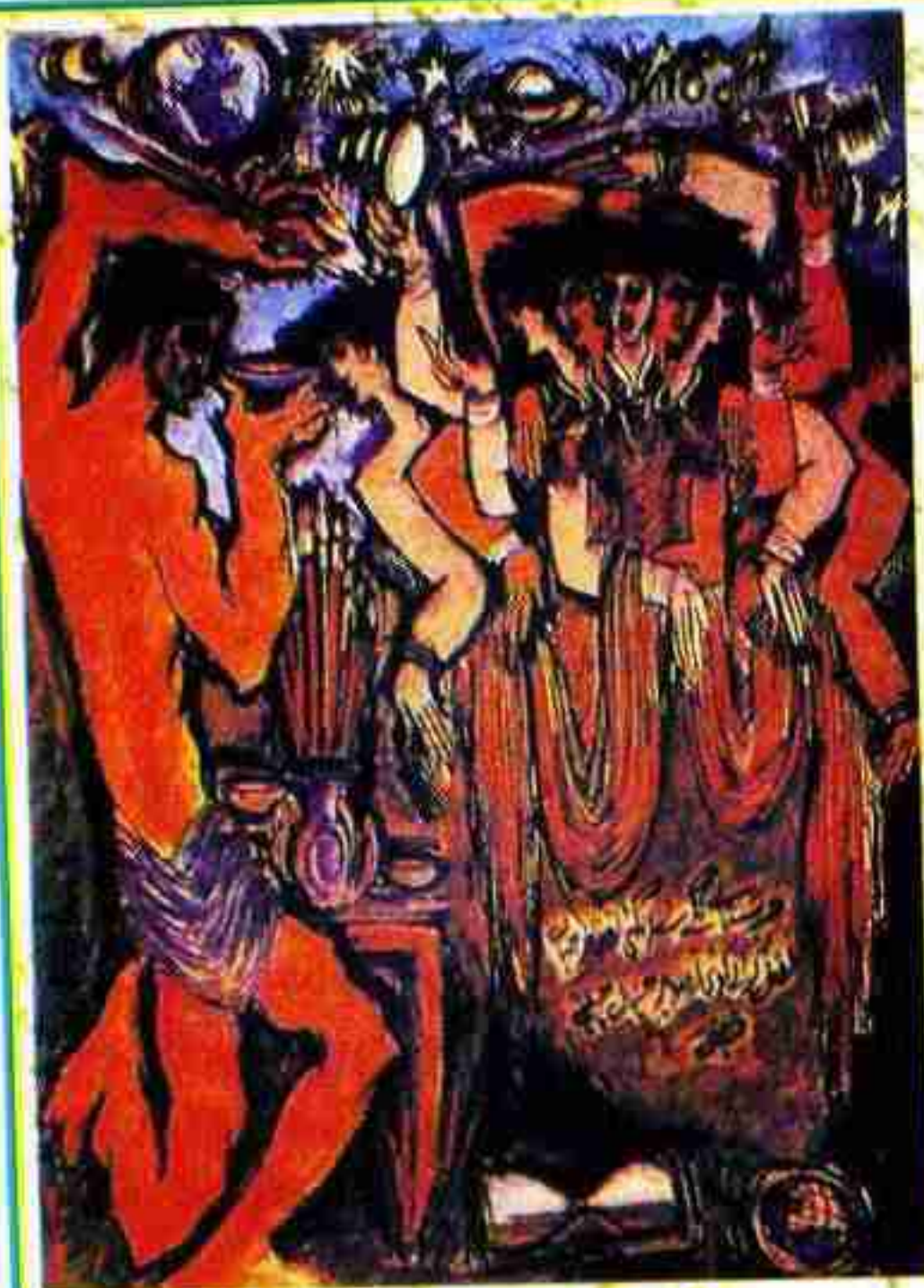
عمل = صادق

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم

نقش کرنے کوئی تصویرِ حسیناں چلے

دستِ تہہِ سنگ

عمل: سلیمہ ہاشمی

ابوالخیر کشفی

نذرِ فیض

اربابِ ہوش منزلِ آسودگی میں ہیں
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آئے ہیں
جس دل سے زندگی کو ملی لحنِ سرمدی
نغمے مرے خیال کے اُس دل سے آئے ہیں
صحرا کی ریگ چشمۂ مہتاب بن گئی
جگنو نظر کے روزنِ محمل سے آئے ہیں
تیغِ جفا بھی عشق کے قدموں پہ جھک گئی
مایوس ہو کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
کشفی ادائے دوست کے سانچے میں ڈھل گئے
جو "آئینہ" ہے اس کے مقابل سے آئے ہیں

☆☆☆

احمد فراز

بیادِ فیض

قلم بدست ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دنیا کا تذکرہ لکھوں
لکھوں کہ تو نے محبت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں
جہاں یزید بہت ہوں، حسینؑ اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمیں کو بھی کربلا لکھوں
ترے بغیر ہے ہر نقش "نقشِ فریادی"
تو پھول "دستِ صبا" پر ہے آبلہ لکھوں
مثال "دستِ تہہ سنگ" تھی وفا ان کی
سو کس طرح انہیں یارانِ باصفا لکھوں
حدیثِ کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو قصۂ تعزیرِ ناروا لکھوں
جگہ جگہ ہیں "صلیبیں مرے دریچے میں"
سو اسمِ عیسیٰ و منصور جابجا لکھوں
گرفتہ دل ہے بہت "شامِ شہرِ یاراں" آج
کہاں ہے تو کہ تجھے حالِ دلبرا لکھوں
کہاں گیا ہے "مرے دل مرے مسافر" تو
کہ میں تجھے رہ و منزل کا ماجرا لکھوں
تو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے "نسخہ ہائے وفا"
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں
"شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں"
خدا نکردہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

☆☆☆

افتخار عارف

نذرِ فیض

جو فیض سے شرفِ استفادہ رکھتے ہیں
کچھ اہلِ درد سے نسبت زیادہ رکھتے ہیں
رموزِ مملکتِ حرف جاننے والے
دلوں کو صورتِ معنی کشادہ رکھتے ہیں
شبِ ملال بھی ہم رہ روانِ منزلِ عشق
وصالِ صبحِ سفر کا ارادہ رکھتے ہیں
جمالِ چہرۂ فردا سے سرخ رو ہے جو خواب
اس ایک خواب کو جادہ بہ جادہ رکھتے ہیں
مقامِ شکر کہ اس شہرِ کج ادا میں بھی لوگ
لحاظِ حرفِ دلِ آویز وسادہ رکھتے ہیں
بنامِ فیضؔ، بجانِ اسدؔ فقیر کے پاس
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

☆☆☆

اختر حسین جعفری

نوحہ

وہ جو پیش و پس میں تھی روشنی
سرِ سطرِ شوق رہی نہیں
یہ چراغ کیسا بجھا دیا، شبِ منتقم مرے سامنے
ابھی اس حرم کے طواف میں تھے قدم مرے
مجھے کیوں ہو دعویٰ ہمسری کہ بہت فرو تھے علم مرے
ابھی اس کے منبر و بام سے

پس دوپہر یہ عجیب قحط ہوا پڑا
رگِ ساز میں کوئی پارۂ دل لخت لخت اٹک گیا تو فغاں
کی شکل بدل گئی
کسی کوہ پر، کسی مقتلِ شبِ ذات میں
کہیں طبل و دف کی صدا نہیں کہ مزاحمت کی سپاہ کا وہ
رجز گزار چلا گیا

مرے سامنے، شبِ منتقم!
یہ چراغ کیسا بجھا دیا
مرے جسم و جاں میں سکت کہاں کہ نحیف لو کی مدافعت
میں حصار ہوں
نہ دگار سینے میں سانس تھے
جو اکھڑتے دم کی عبادتوں پہ نثار ہوں
ابھی درسِ مکتبِ لحنِ ہجر تھے کم مرے
ابھی اس حرم کے طواف میں تھے قدم مرے
مجھے کیوں ہو دعویٰ ہمسری کہ بہت فرو تھے علم مرے
ابھی اس کے منبر و بام سے

زرِ صبح اس کا گراں بہت مرے عصرِ شب خام سے
یہ عجیب قحط صدا پڑا مرے شہر میں سرِ شام سے

☆☆☆

ادا جعفری

وہ جو فیض تھا

وہ چلا گیا
وہ جو آبروئے چمن بھی تھا
جو نثار سرو و سمن بھی تھا
جو غرورِ دار و رسن بھی تھا

کہ قبائے گل میں جو رنگ تھے
وہ اسی کے داغِ جگر سے تھے
جو صبا کے نقشِ قدم ملے
وہ اسی کی حدِ نظر سے تھے

وہ جو اس کے لہجے کی نغمگی
وہ جو نغمگی کا طلسم تھا
وہ ثباتِ عشق کی بات تھی
وہ جمالِ درد کا اسم تھا
وہ گواہی شب و روز تھا
کہ دعائے دل میں جو سوز تھا
وہ اسی کے حرفِ سخن سے تھا
وہ امینِ دولتِ غم رہا
وہ اسیرِ خاکِ وطن سے تھا
جو وفا کے نام پہ سو طرح
کبھی جی اٹھا کبھی مر مٹا

وہ مسیح و خضر نہ تھا مگر
وہ غزل سرا جو چلا گیا
تو کھلا ہے اہلِ دیار پر
وہ جو فیض تھا الم آشنا
وہ تو انجمن میں تھا ایک ہی
جسے ڈھونڈتی ہے صدی صدی
جسے موت بھی نہیں چھو سکی

یہ جو دشتِ شب میں چراغ ہیں
اسی خوش نوا نے جلائے ہیں
اسی زخم زخم نگاہ نے
مہ و آفتاب لٹائے ہیں
مری آنکھ کو، تری آنکھ کو
جو کرن کرن سے سجا گیا
وہ چلا گیا! وہ چلا گیا!

☆☆☆

اظہر مقصود

تنہائی

دور تا حدِ نظر کوئی نہیں کوئی نہیں
راہرو کا تو گماں بھی نہیں امکاں بھی نہیں

شاملِ حال ستارے، نہ مہِ نیم شبی
نہ کوئی شمع فروزاں نہ کوئی پروانہ
منتظر اُس کیلئے دل جو نہ آئے گا کبھی
پھر بھی مشتاق دلِ زار دلِ دیوانہ

نغمہ مے نہ کہیں ساغر و مینا کی کھنک
در پہ دیتی ہی نہیں اب تو ہوا بھی دستک

دل دھڑکنے کی صدا صاف سنی جاتی ہے
یاد بھی اب تو کوئی پاس نہیں آتی ہے

ایسے لگتا ہے میرے جسم میں اب جاں بھی نہیں
راہرو کا تو گماں بھی نہیں امکاں بھی نہیں
دور تا حدِ نظر کوئی نہیں کوئی نہیں

☆☆☆

افضل احسن رندھاوا

فیض احمد کیلئے ایک نظم

آج راتیں سوگوار!
اب کہاں وہ اہلِ دل
جو خس و خاشاک کو
بے پناہ شفقت سے ہاتھوں پر سجائیں
اور سینے سے لگائیں
روندی جاتی خاک کے ذرات کو
چوم کر سورج بنائیں

بام و در گریہ کناں!
اب کہاں اہلِ نظر
جن کی نظریں بخشتی تھیں بانکپن،
حسنِ عالم تاب، سنگ و خشت کو
اور تحفظ ہر در و دیوار کو

دل گرفتہ، ہیں قفس!
وہ جو عالی مرتبت
جن کے دم سے رونقیں،
جشنِ بہاراں، ہاؤ ہو، کنجِ قفس،
جن کے دل کی لو سے
تنہائی کی راتوں میں چراغاں
جن کے دم سے تھا قفس کا نام اتنا معتبر
اب قفس میں لوٹ کر نہ آئیں گے
میں، اک وہ شوریدہ سر
جن کی شوریدہ سری سے
ان کا تھا قائم بھرم
ان کو تنہا چھوڑ کر چلتے بنے
اور ان کی دسترس میں اب نہیں

سرنگوں لوح و قلم!
کس لہو کی روشنائی
کون زخمی انگلیاں
داستانِ غم کریں گی
اب رقم
اور اپنے دامنِ صد چاک پر
ثبت کر کے لفظوں کی
حرمت کی مہر
کون ہنستا جائے گا
اب کے کوئے یار میں، اغیار میں
لے کے یوں اپنا علم

قتل گاہیں محوِ حیرت!
کون سے عشاق اب
قتل ہونے کے لئے
اپنے سر اپنی ہتھیلی پہ دھرے
رقص کرتے آئیں گے
کون ایسا سر بلند
موت جس کے خوف سے
لرزاں و ترساں رہی
دستِ قاتل کو
شکستِ فاش دینے آئے گا
یہ ڈری سی بستیاں!
نیند میں ڈوبی ہوئی
سب کی سب نوحہ کناں!
بند دروازے دلوں کے
کھٹکھٹانے آئے گا اب
کون آدھی رات کو
کون سی آواز اب
صورِ اسرافیل پھونکے گی یہاں
کون مُردوں کو جگانے آئے گا

☆☆☆

پروین شاکر

فیض کے فراق میں

تہہِ خاک
کیسا چراغِ وقت نے رکھ دیا
کہ سیاہ پوش ہوئی ہوا،
کفِ دستِ بادِ صبا سے پھول یہ کیا گرا
چمنِ نگاہ میں اب بہار کہیں نہیں
ہمہ شہرِ راہ میں اور نگار کہیں نہیں
پلِ سبز پر کوئی نجمِ راہ فروز اب نہیں خیمہ کش
وہ غبار اٹھا ہے کہ سوجھتا نہیں راستہ
مرے ماہتاب کہاں ہے تو
کوئی اور بھی ہے نظامِ مہر و نجوم جس کو رواں ہے تو
ترے فرشِ نیلوفری پہ کون سے برج کی یہ کشش بڑھی
کہ سپہرِ ہفت آئنہ میں رقص اتنا ہی لکھا تھا ترے لئے
مرے نے نواز
قبائے ساز ترے فراق میں چاک ہے
وہ سکوت شہرِ سخن میں ہے
کہ صدائے گریۂ شبنم شب تار دل کو سنائی دے
تہہِ ہفت تجلۂ نور ایک ہی خواب ہے
کوئی معجزہ ہو کہ شکل تیری دکھائی دے!
کوئی سلسلہ ہو کہ راہ پھر سے سجھائی دے!

☆☆☆

ایوب خاور

کون اترے گا لحد میں میرے شاعر کے لئے

ان گنت خاک نشیں، خاک بسر، خاک ثمر
ایک عشاق کا مجمع ہے کہ جو
نشۂ غم میں نڈھال
بہکے بہکے ہوئے قدموں سے جنازے کی طرف جاتا ہے
ہونٹ مصروفِ عزاداری و مہتابِ سخن
اور سرِ دیدہ و دل
ایک تسبیحِ الم جاری ہے
حلقۂ بام سے اک درد کی جھنکار اٹھی
''پرچمِ شعر و سخن'' میں جسدِ فیض کی تکفین کرو
زیرِ سر، عشق کا آئین رکھو
عدم آباد کی دوری سے سفر گرد انگوٹھوں کی کہانی باندھو
ربِ کعبہ کی طرف لوٹنے والوں کی نشانی باندھو!
شانۂ صبر پہ اک عہدِ محبت کا عروج
اور اک قافلۂ دیدہ و دل
وارثانِ سخنِ فیض......!
کہو!
دیدہ و دل سے کہو...... آہ و فغاں آہستہ
کہ علمدارِ محبت کو ابھی رزقِ زمیں ہونا ہے
کون اترے گا لحد میں مرے شاعر کے لئے
جو بھی اترے اسے کہہ دو
اسے کہہ دو کہ نہیں...... چشمِ نمناک سے آنسو نہ ٹپکنے پائے
تنِ فیض بہت نازک ہے
کوئی کنکر کسی پہلو بھی نہ چبھنے پائے
دیکھنا! حرف کی پوروں میں کوئی زخم نہ لگنے پائے
اس کے لفظوں سے ابھی غازۂ فردا نہ اترنے پائے
شاخِ شانہ سے لحد میں گلِ تر کی صورت
میتِ فیض رکھو!

وارثانِ سخنِ فیض
ذرا آہستہ
صورتِ حرفِ صبا آہستہ
بسترِ خاک میں ٹھنڈک ہے بہت
اور ذرا آہستہ

☆☆☆

حسن داد خان

''کرو کج جبیں پہ سرِ کفن''......

دردِ دل سے شہرِ حیات تک کوئی شور ہے نہ صدا کوئی
کہ متاعِ لوح و قلم لئے پھر اس انجمن سے اٹھا کوئی
نہ حدیثِ شوق ہی گفتنی نہ نشاطِ فکر ہی دیدنی
نہ حکایتیں نہ شکایتیں نہ درازِ دستِ دعا کوئی
صفِ کہکشاں بھی ہے مضمحل مہِ نیم شب بھی اداس ہے
جو بجھا کے مشعلِ جان و دل اسی راستے سے گیا کوئی
جو رکا تو ''کوہِ گراں'' تھا وہ جو چلا تو ''جاں سے گزر گیا''
رہِ یار تجھ کو ملا نہ تھا کہیں ایسا آبلہ پا کوئی
''کرو کج جبیں پہ سرِ کفن'' کہ عیاں ہو چہرے سے بانکپن
چل اس اہتمام سے اے صبا کہ بکھر سکے نہ بساطِ فن

☆☆☆

خیال امروہوی

فیض صاحب بھی گئے جن سے تھا
محنت کا وقار

نہ جانے کیا ہوئی قالب گری شعر و تخیل کی
نہ بادہ ہے نہ میخانہ نہ گل کاری نہ ساقی ہے
نظامِ فکر و فن آسیب تاراجی کی زد پر ہے
کلیمی ہے نہ دراکی، نہ براقی ہی باقی ہے
سکوتِ مرگ ہے اور زندگی کی نارسائی ہے
عجب انداز کی اس دور میں بے دست و پائی ہے
روایت سے بغاوت کا صلہ انساں نے کیا پایا
بنامِ ارتقا آتشِ جہنم کی جلائی ہے
جمالِ عقل پر الزام ہے الحاد جوئی کا
جمودی ذہن کی ہر یاوہ گوئی ارتقائی ہے
خرد بیزار تہذیبوں کے افسانوں سے ظاہر ہے
جہالت بڑھ تو سکتی ہے، فراست مر نہیں سکتی
ہمیں جس طرز سے تہذیب کا پیکر بدلنا ہے
ابھی اس کو نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلنا ہے

☆☆☆

ساجد پال ساجد

واس کیپٹل

محبتوں کے چراغ روشن رہیں ہمیشہ
یہ سُرخ آندھی
دُھواں دُھواں سی
منافرت کے ملوں کی چمنی
دلوں کی آلودگی اُٹھائے
گرنجی آنکھوں سے دیکھتی ہے
کہ باغِ ہستی کے بھُورے بن میں
سکوں کی بستی کہاں کہاں ہے؟
کہاں ہے وہ اسودِ محبت؟
جہاں سے رودِ حیات بن کر
ازل کا چشمہ اُبل رہا ہے
دلوں میں انوار بھر رہا ہے
وہ نیلی نیلی سی جھیل آنکھیں
جو برگِ گُل پر سجی ہوئی ہیں
تمام سمتیں ہیں اُن کی سمتیں
وہ جانِ جاں اعتبارِ جاں ہیں
زمین اُن کی، زمان اُن کا
مکین اُن کے، مکان اُن کا
مگر انہیں طاقتوں کے پیچھے
ہزار آتش فشاں کھڑے ہیں
جو دشمنی سے لدے ہوئے ہیں
حسد کی بارود سے بھرے ہیں
چڑھی ہوئی ہے جو سُرخ آندھی
یہ اک دھماکہ ہے خوئے بد کا
گرنجی آنکھوں کا سُرخ شعلہ
حسد کے بارود کی عطا ہے
جو نیلی آنکھوں کی شورہ پُشتی سے جل رہا ہے
جو ایشیا کے دھرم نواسی
پریمیوں کو جلا رہا ہے
محبتوں کے چراغ روشن رہیں ہمیشہ
ہرا رہے باغ زندگی کا
ہمارا اپنا معاملہ ہے
ازل کا چشمہ اُبل رہا ہے
دلوں میں انوار بھر رہا ہے

☆☆☆

شان الحق حقی

قطعۂ تاریخ وفاتِ فیض

مجاہد مخلص رفیق عالی کلام

ہو گئی گو عمر یک روزہ کی شام
اور چمکے گا ابھی تو ان کا نام
وہ رفیق مخلص عالی کلام
"فیض سب جادو نگاہوں کے امام"
(۱۴۰۵ھ)

☆☆☆

سلیم شاہد

وہ گواہ رات مکر گیا

میرے عشق کا وہ مزاج داں
وہ وکیل میرے گناہ کا
وہ ستارہ صبح کی راہ کا
یہ قدم قدم پہ عدالتیں
وہ گلی گلی میں کچہریاں
مرے ہر سخن میں مشیر تھا
مرے ہر بیان میں ہم زباں
ابھی سر پہ ہیں وہ جرح کے دن
ابھی روزِ عدل میں دیر ہے
شبِ ہجر ہے، شبِ تار ہے
بڑا بوجھ ہے بڑا بار ہے
وہ چراغ ہے شبِ ہجر کا
وہ پیام ہے میرے وصل کا
ابھی روزِ عدل میں دیر ہے
یہ جو فردِ جرم کا ڈھیر ہے
کئی موسموں کی جدائیاں
کئی منزلوں کی مسافتیں
ابھی دور ہیں وہ جرح کے دن
ابھی سو رہو دلِ مطمئن
مرے عشق کا وہ مزاج داں
جو گواہ بھی ہے وکیل بھی
جو دلیل بھی ہے سبیل بھی
سرِ خواب کس نے جگا دیا
ابھی دور ہے میرا فیصلہ
وہ ستارہ صبح کی راہ کا، کہو کیا ہوا
وہ وکیل میرے گناہ کا، کہو کیا ہوا
وہ گواہ جو میرے حق میں تھا، کہو کیا ہوا
وہ گواہ رات مکر گیا
وہ ستارہ ٹوٹ کے مر گیا

☆☆☆

صوفی فقیر محمد فقیر

''فیض ہوئے ہیں مر کے امر''

جو اہل خبر ہو جاتے ہیں
جو اہل نظر ہو جاتے ہیں
بن جاتے ہیں جو جانِ فن
جو اہل ہنر ہو جاتے ہیں
ہو جاتے ہیں وہ زود اثر
اور دیر اثر ہو جاتے ہیں
جو زندہ رہ کر مرتے ہیں
وہ زندہ تر ہو جاتے ہیں
وہ قیمت میں بڑھ جاتے ہیں
وہ لعل و گہر ہو جاتے ہیں
دُنیا کو روشن کرتے ہیں
وہ شمس و قمر ہو جاتے ہیں
مرنے کو سب مرتے ہیں مگر
اب فیضؔ ہوئے ہیں مر کے امر

☆☆☆

طاہر نظامی

گم شدہ صدائیں

دھند لکا ہے شام کا
ملگجی فضائیں ہیں
جھٹپٹے کا عالم ہے
درد سے فضا ساری چُور اور بوجھل ہے
جسم و روح گھائل ہیں
زخم زخم شاخیں ہیں
طائروں کی آوازیں منجمد ہیں چھوں پر
ہر طرف اداسی ہے
چیختی ہوائیں ہیں
اور ان ہواؤں میں
گم شدہ صدائیں ہیں

☆☆☆

عبدالعلی شوکت

پیکرِ خلوص و درد

نئے خدنگ، بنائی نئی کماں تو نے
نئے ہدف کی سنائی ہے داستاں تو نے
خلوص و درد کے جذبات ہو چکے ناپید
کیا ہے جذبِ محبت کو جاوداں تو نے
کیا ہے زندہ شہادت کا بانکپن پھر سے
کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں تو نے
جہاں بھی ظلم و ستم کے پھریرے لہرائے
وہیں پہ دفن کئے جبر کے نشاں تو نے
ترا کلام ہے صوتِ ہزار و نغمۂ گل
کیا ہے نسخۂ عہدِ وفا بیاں تو نے
جلائے عالمِ اوہام میں خرد کے چراغ
کیا فروزاں جہالت کا آسماں تو نے
غبارِ گردشِ ایّام چھٹ گیا آخر
کہ دی ہے وادیٔ سینا میں بھی اذاں تو نے
تری صدا سے ہیں لرزاں بتانِ کبر و عناد
عطا کی زیرِ نگینوں کو بھی زباں تو نے
یہ بزمِ فیضؔ ہے یہ شامِ شہرِ یاراں ہے
رموزِ زیست سبھی پر کئے عیاں تو نے

☆☆☆

علی سردار جعفری

فیض کے نام

کل تھا جب میں جیل میں تنہا
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تری آواز کی شبنم
گھانس کے لب تر کر جاتی تھی
گُل کے کٹورے بھر جاتی تھی
شام کی رنگت بن کر اکثر
روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
چاندنی کا ملبوس پہن کر
آم اور املی کے پیڑوں پر
تھک کر جیسے سو جاتی تھی
اور میں تیرے نازک میٹھے
پیارے گیتوں کا گلدستہ
اپنے دھڑکتے دل سے لگائے
خوابوں کی نیلی وادی میں
آہستہ آہستہ چلتا
جیل سے باہر آ جاتا تھا
ظلم کے دل پر چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
کیسی ہے یہ قید کی دنیا؟
قلب و نظر کی محرومی ہے
تاریکی اور تنہائی میں
پتھر کی خاموش ہنسی ہے

آج ہے جب تو جیل میں تنہا
میں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
یہ میری آواز ہے لیکن
صرف مری آواز نہیں ہے
جوش، فراق، آنند اور بیدی
عصمت، ساحر، کرشن، کیفی
میری زباں سے بول رہے ہیں
ہند کے سارے لکھنے والے
ناچنے والے، گانے والے
اپنی محبت کے گلدستے
تیری جانب بھیج رہے ہیں
جلتی ہوئی یہ شاخ اٹھا لے
دیکھ اس میں کیا پھول کھلے ہیں
شعلہ، بجلی، نغمہ بن کر
بچھڑے ساتھی آن ملے ہیں
دور ہے گو لاہور کی بستی
اونچی زنداں کی دیواریں
دل اور روح کے بیچ میں حائل
پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
سانس کا زیر و بم ہے یکساں
ہم آہنگ ہے چاپ قدم کی
ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
ایک ہی لیلیٰ ایک ہی محمل
ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل
میٹھا ہے راوی کا پانی
ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں
ساون بھادوں بن کر برسیں
سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
بجتی رہے بادل کی چھاگل
دل میں ہوک نہ اُٹھنے پائے
پیٹ میں بھوک نہ جاگنے پائے
گیہوں کا ہر خوشہ سر پر
زریں تاج پہن کر آئے
ماؤں کے سینے دودھ سے چھلکیں
ہنستی رہیں بچوں کی پلکیں
زلفوں کے گہرے سائے میں
رنگ برنگے آویزوں میں
ننھے ننھے جگنو چمکیں
چولہے دہکیں، روٹیاں مہکیں
شاخیں لہکیں، چڑیاں چہکیں
بانہیں کھنکیں، چوڑیاں گائیں
شانوں پر آنچل لہرائیں
امن و امان کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
اس مقصد کے آگے سارے
ظالم، دشمن، ڈاکو، قاتل
سہمے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
بستی بستی، جنگل جنگل
ظلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
زنجیروں کے کالے حلقے
ناگ ہیں، پھن پھیلائے ہوئے ہیں

ظلم سے لیکن ڈرنا کیسا!
موت سے پہلے مرنا کیسا!
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے"

☆☆☆

غیور میم غیور

گلشن میں گُل باغ بہاری نہ رہا
فخرِ قلم شعلہ نگاری نہ رہا
شعروں کے چمن کی فیض یابی نہ رہی
جو فیض کہ باقی تھا سو جاری نہ رہا

شعروں میں جواں، فیض رہے گا برسوں
ہر دل میں نہاں، فیض رہے گا برسوں
دنیا سے جدا ہو کے ادب دنیا میں
سرکار جہاں، فیض رہے گا برسوں

☆☆☆

فرحت جاوید امتیازی

جمالِ ہستی کا استعارہ

وہ نازِ پیکر
وہ عشق پیشہ، وہ صدق شیوہ
چاند ایسا
سوہنا سا
جس سے روشن تھی آنکھ میری
وہ نین میرا
وہ چین میرا
غمگساری کی آن جس سے
دوستداری کی شان جس سے
وہ میرا دلبر، وہ میرا ساتھی
وہ میرا نقاد، میرا محسن
محبتوں کا سفیر تھا جو
رفعتوں کا امین تھا جو
حرف و آہنگ کی آبرو تھا
ایک نغمہ، ایک جام اور اک سبو تھا
خوش نظر تھا وہ خود نگر تھا
گھنا شجر تھا، وہ چارہ گر تھا
محبتوں کا وہ نامہ بر تھا
خواب آسا رفاقتوں کا
بہار آگیں صباحتوں کا
جانگسل سی مسافتوں کا
----- وہ رازداں تھا
وہ آبروئے دوستاں تھا
سائبانِ مہرباں تھا
جسم و جانِ گلستاں تھا
آگہی کا آسماں تھا
شعر و نغمہ کی پالکی میں
بٹھا کے مجھ کو،
گُل بداماں وہ مغنی،
ریشمی لہجوں کا شاعر، خوش فکر اہلِ سخن
حرف و صوت و لفظ و معنی کا رازدار و کوہکن
رس گھولتا، وہ بولتا، ہنستا چمن!
نظر سے اوجھل
ہو گیا ہے دھیرے دھیرے
آگہی کے آسماں کا وہ ستارا
زندگی کا موج دھارا
وہ میرا پیارا......
جمالِ ہستی کا استعارہ!!

☆☆☆

قتیل شفائی

آج کی شام فیض کے نام

اب تک تیری یادوں کی مے چھلک رہی ہے جام بہ جام
اے ہم سب کے بچھڑے ساتھی، آج کی شام ہے تیرے نام
تو نظروں سے دور ہے لیکن دل سے کسی کے دور نہیں
دھڑکن دھڑکن پہنچ رہا ہے تیری چاہت کا پیغام
چاپ ترے لفظوں کی اب تک صاف سنائی دیتی ہے
اب بھی تیرے پیار کا سایہ مہک رہا ہے گام بہ گام
تو نے وطن سے دور بھی گائے گیت وطن کی عظمت کے
تیرے حصے میں آئے ہیں پھر بھی رقیبوں کے دشنام
تو نے اپنے فن کا مرہم رکھا زخمی حرفوں پر
لیکن کچھ ناحرف شناسوں نے چھینا تیرا آرام
ظالم لوگوں نے لکھے جو اپنے دل کی کالک سے
تیری ایک خموشی نے دھو ڈالے وہ سارے الزام
بے انصافی کی اس رو کو ختم بھی ہونا ہے آخر
ہر آغاز کا پیچھا کرتا رہتا ہے اس کا انجام
ستر سال کی عمر تیری پھیلی ہے ستر صدیوں پر
لوح و قلم کے مالک نے لکھا ہے تیرے لئے دوام
تیرے مداحوں میں شامل فیض اک شخص قتیل بھی ہے
جانے اس کو ملتا ہے ان سنگ زنوں سے کیا انعام

☆☆☆

ماتم کی آواز

ماتم کی آواز نے میرا سارا وجود پہنا ہوا ہے
اور میرے اندر پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی ہیں
میرے خوابوں نے طلوع ہونا
اور میری تعبیروں نے زندگی پانا چھوڑ دیا ہے
شام اور رات کے بیچ
اندھیرا لانے والی پرچھائیں کو کس نے دیکھا ہے
مگر وہ تو بھری دوپہر تھی!
سورج ہمارے وجود کو ننگا کر کے ضرب لگا رہا تھا
ہم کہ جنہیں بہت مار کھانے
بہت ذلتیں سہنے
اور بہت ہزیمتیں برداشت کرنے کی عادت ہے
ہم اپنی تمام تر بزدلی کی وراثت کے باوجود
شہر کے دوسرے کنارے سے آنے والی
رونے کی آواز میں آواز ملا کر
رو رہے تھے۔
ہمارے بے آواز ہونٹ
بے شباہت چہرے
اور بے سماعت کان
بے بدن ہوا کی طرح
وحشتوں کے کواڑ پیٹ رہے تھے
ہمارے سینوں کی آبائی بستیوں کا مکین
ہم سے رُخصت ہو رہا تھا
ہمارے لڑکپن کو اُس نے
خواب آشنا کیا تھا
اور ہمارے خوابوں کی مانگ میں
تعبیر کا سیندور بھی اس نے ہی لگایا تھا
اس زمیں کی فصلوں کے قہقہوں سے
اس کی آنکھیں جاگتی تھیں
اور اس زمین کی کھلی ہوئی کھڑکیاں
اسی کے لیے روشنی تھیں
وہ نہ مانگتا تھا، نہ التجا کرتا تھا
وہ نہ وحشتیں پہنتا تھا
نہ جنوں بولتا تھا
اس کی صحراؤں سے بھی شناسائی تھی
اور دریاؤں سے بھی
اس کو سناٹوں سے بھی بات کرنی آتی تھی
اور طوفانوں سے بھی
ہمارے اعمال کی سیاہیاں دھونا
اور ہمارے بیمار امروز کی مسیحائی کرنا
اس کا شیوہ تھا۔
یہ زمین کہ جس نے نفرتیں پہنی ہوئی ہیں
اس کی محبت کی قبا کھینچ لی گئی ہے'
یہ زمین کہ جس کی بنجر مٹی
سوکھی ہڈیوں کو جنم دیتی ہے
اس کی زندگی کی خواہش دفن کر دی گئی ہے
سمندروں کی گہرائیاں بھی،
اب ہماری آنکھوں میں آ جائیں
تب بھی ہم اُسے نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں
ماتم کی آواز نے ہمارا سارا وجود پہنا ہوا ہے
اور ہمارے اندر پرچھائیاں بھی معدوم ہونے لگی
ہیں

☆☆☆

یہ طبل کوچ کا ہے

زخم نے پھر میرے ہاتھوں پہ حنا باندھی تھی
درد کے کاسنی پازیب بجاتی ہوئی
وحشت میں جنوں چھا گئی
ژولیدہ ہوا کہتی تھی،
خواہش خواب
ہزیمت کا بدن پہنے ہے
سانس کے چمپئی چہرے کی ردا
کھینچے ہے
کوئے لاحاصلی
کھینچے ہے حصار فرقت
قافلہ دیکھے ہے سرمایۂ جاں لٹتا ہے
کیسی ساعت ہے رفاقت کا دیا بجھتا ہے
یہ طبل کوچ کا ہے
یا کہ ٹھہر جانے کا
یا چراغ شب اُمید کے بجھ جانے کا

☆☆☆

کشور ناہید

زمین محبت ہے تیرے دم سے

زمین محبت ہے جس کے خوں سے
وہ اپنے ہی دیس سے نکلنے کی داستاں ہے
وہ جس کے شعروں میں غم عیاں ہے
وہ جس کے ہونٹوں کے نام کر دوں
حلاوتوں کے بھی زمانے
محبتوں کے بھی فسانے
وہ جس نے ہر قامت ستم کو
قرینہ حوصلہ سمجھ کے
تو اب آسندگان کے کشکول
کی عطا جان کے کہا تھا
کہ صبر کے دن
بہت ہی تھوڑے، بہت ہی کم ہیں
میں کیسے مانوں
کہ میری ساری ریاضتوں میں
شکست ساز شب مسلسل

نہ بار پائے
میں اپنے گھر میں بطور قیدی ہی دن گزاروں
میں اپنے کھیتوں میں ہل چلاؤں
مگر نہ رزق زمین پاؤں
میں اپنے دیوار و در کی چھاؤں میں
دشمن وطن کو فراغ پاؤں

☆☆☆

کنول فیروز

کھوئی ہوئی حیات کو پا کر چلا گیا
اک جشن آگہی کا منا کر چلا گیا
اُس سا نہیں ہے دوسرا کوئی سرِ حیات
اک رُوپ پیار کا تھا جو آ کر چلا گیا
وہ فیض تھا کہ جس سے زمانہ تھا فیض یاب
انسانیت کے گیت سنا کر چلا گیا
لینن پرائز یافتہ وہ تھا سفیرِ امن
وہ چاہتوں کی جوت جگا کر چلا گیا
پرچم وفا کا سُرخ وہ رکھتا تھا اپنے ساتھ
قصرِ تعصبات گرا کر چلا گیا
جس کی کتابِ زیست تھی تفسیرِ صبح نو
شب کی قرارداد مٹا کر چلا گیا
وہ جس نے احتجاج کا لہجہ دیا ہمیں
وہ راہِ انقلاب • دکھا کر چلا گیا
انسان دوست اُس سے بڑا کون تھا کنولؔ
اپنی صلیب آپ اُٹھا کر چلا گیا

☆☆☆

گفتار خیالی

ہر انساں کی سوچ میں خوشبو اُن کے سچے شعروں کی
وہ لکھتا تھا
جذبوں کی گہرائی سے سوچوں کی سو جھل تنویروں سے
وہ لکھتا تھا
مشک سیاہی اور صندل کی ٹہنی سے
فکر رسا پہ اُس کی افشاں
ماضی......فردا......حال
حل کرتا تھا......وہ عمرانی دُکھ کے ادق سوال
شعر و ادب کی اعلیٰ منزل
اُس کی سوچ کا حاصل تھا
اُس کا ہر احساس تعلّم خیز قمر کی محفل تھا
جس لحظہ سنسان فضائیں
محشر کر دیں مایوسی کے لمحوں کو
فکر و خرد پر
سناٹوں کی یورش کر دیں
اور اوراق سے تحریروں کی رخصت ہو
اُس دم وہ آوازوں کا ہر دم جوت جگاتا تھا
جس سے سناٹوں کا ہر عفریت
فنا ہو جاتا تھا
اور، ادراک پہ لفظ کے موتی
اُس کا نام بناتے ہیں
فیض کچھ ایسا فیض کہ جس سے
جذبوں اور اُمنگوں کے سب باغ ہرے ہو جائیں
کھوئی سوچ کا کھوٹ ہٹے
احساس کھرے ہو جائیں

☆☆☆

ماجد صدیقی

اَب تُو جو نہیں تو کون کہے

جانے پہ ترے قریہ قریہ کیا کہیے کیا ویرانی ہے
سُونے ہیں سماعت کے آنگن آنکھوں میں عجب حیرانی ہے
مشکل ہے کوئی کچھ کہہ گزرے، چپ رہنے میں آسانی ہے
منسوب ہیں عقل و خرد جس سے نایاب وُہی نادانی ہے

دل بیچے جان خریدے جو، کوئی بھی تو شخص نہیں ایسا
آئے نہ نظر اک کنگرہ بھی چاہت کے عرش بریں ایسا
زینت ہو جو وقت کے جھومر کی ملتا ہی کہاں ہے نگیں ایسا
ہو مشک ختن ہی جس کی مہک، غنچہ نہ کھلے گا کہیں ایسا

مقصد کی بلندی سے، تجھ سی حاصل ہی یہاں نسبت ہے کسے
ہر حرف میں اشک سمونے کی اس شہر میں اب فرصت ہے کسے
جس عیب پہ تُو مغضوب رہا اب بزم میں ایسی لت ہے کسے
اس خاک چمن کے ذرّوں سے تجھ ایسی بھلا رغبت ہے کسے

بانہوں میں پڑی زنجیروں کو اک طرزِ تکلم تُو نے دیا
دل دل میں سلگتے جذبوں کی کلیوں کو تبسم تو نے دیا
ہیبت سے دبک جانے والی چاہت کو تلاطم تو نے دیا
ہونٹوں پہ مچلتے لفظوں کو موجوں سا ترنم تو نے دیا

سکھ چین گنوا کر ہستی کے، تو کود پڑا زندانوں میں
معتوب رہا تو اپنوں میں، محبوب رہا بیگانوں میں
اس دیس سے الفت میں کیا کیا حدت تھی ترے ارمانوں میں
روشن تھے الاؤ تن میں ترے، تھا خون کہاں شریانوں میں

لفظوں کے دہانے وا کرکے آہن کو زباں تک دی تو نے
ہیروں سی، زرِ خالص جیسی، ہر بات تھی جو بھی کہی تو نے
لفظوں کو خرام ابر دیا، معنی کو جلا بخشی تو نے
کرنے کو نہیں کیا کچھ سیکھا ہر زخم کی بخیہ گری تُو نے

محبوب سے نسبت کے ناتے نسبت تھی رقیبوں تک سے تجھے
وا جن پہ ترے تھے روزن ور، آنکھیں تھیں تجھی، بازو تھے کھلے

محمد فیروز شاہ

شبِ یاس آ کے ٹھہر گئی، غمِ ہجر دل پہ رقم ہوا
وہ جو حسن زادِ سفر میں تھا، وہی لٹ گیا کوئی دم ہوا
کوئی لفظ تھا کہ خیال تھا تیرے شعر جیسا جمال تھا
وہ ملال شامِ مفارقت کہ نصیبِ عہدِ ستم ہوا
یہ جدائیوں کی رُتیں ہیں یا ہے گھڑی عذابِ الیم کی
کہ جو آشنائے وفا ہوا وہی نذرِ رسمِ الم ہوا
تیرے حرف حرف کی روشنی اُسے زندہ کر گئی تا ابد
رہِ صدقِ عشق میں کوئی سر، کوئی ہاتھ بھی جو قلم ہوا
کسی چشمِ خواب نصیب میں تیرا عکس جب بھی چمک اٹھا
چلے آنسوؤں کے وہ قافلے تیرا نام جن کا علَم ہوا

☆☆☆

یہ حد بھی پھلانگی یُوں تو نے وہ لوگ بھی تھے محبوب ترے
لپسنا ہی مقدر رہا جن کا شہ زوروں کے قدموں کے تلے

تھک ہار کے رُکتے قدموں کو تحریکِ سفر کی دی تو نے
تھی راہِ ستم میں صعوبت جو اپنے ہی بدن پہ سہی تو نے
ہر آنکھ میں کیا کیا بیداری لفظوں کی کھنک سے بھری تو نے
توضیح کریں کیا اُس شب کی جس شب کی سحر تھی کی تو نے

تُو نے ہی کہا تھا اک جانب، اب چارۂ ہجراں کوئی نہیں
تاریکیٔ شب جو دور کرے وہ صبح درخشاں کوئی نہیں
"شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں"

اب تو جو نہیں تو کون کہے، گمنام ہیں اہلِ ہنر کیونکر
کیوں خیر دبا دی جاتی ہے زوروں پہ ہیں فتنہ و شر کیونکر
گھورے جو کوئی زور آور کو ہوتا ہے وہ زیر و زبر کیونکر
پرواز کرے جو مرضی کی کٹ جائیں اُسی کے پر کیونکر

☆☆☆

محسن بھوپالی
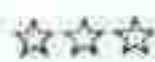
فیضِ زندۂ جاوید

آنکھ سے دور ہوتے ہوئے آج بھی
فیض ہے 'ہم زباں' 'ہم سخن' 'ہم نشیں'
کون کہتا ہے ہم میں نہیں ہے
یہ احساس عجزِ بصارت کا مظہر
یہ افسونِ بُعدِ نظر
یہ گماں کا یقیں ہے

گزرتے ہوئے وقت سے ماوراء
آج بھی فیض ہے 'ہم زباں' 'ہم سخن' 'ہم نشیں'
کون کہتا ہے ہم میں نہیں
فیض اور اک فن کی اکائی میں موجود ہے
فیض ..... امن و محبت کی فرمانروائی میں موجود ہے

☆☆☆

منظور کاسف

آبروئے سخن

دلربا حرف گر، شہریارِ سخن
تیری دریوزہ گر دولتِ علم و فن
گنگ الفاظ کو تو نے گویائی دی
تیرے لہجے کی خوشبو سے مہکا چمن
سنتِ قیس و منصور زندہ ہوئی
معتبر ہو گئی رسمِ دار و رسن
دستِ قاتل جھٹکنے کی جرأت ملی
زہرِ امروز میں شہدِ فردا بھرا
تیرے لب پہ ہمیشہ تبسم سجا
امن کا روشنی کا پیمبر بھی تھا
تیرے افکارِ تازہ کے انوار نے
نیم تاریک راہوں کو روشن کیا
تیرے الفاظ کی کہکشائیں کمال
حلقۂ بام، سائے، شجر، رہگذر
حسنِ آفاق، انسانیت کا جمال
نسخہ ہائے وفا تیرے فکر و نظر
رنگ، خوشبو، صدا، مے و مینا و جام
تیرے حرف و سخن آگہی کے علم
کوچے، بازار، گلیاں، چراغوں کی لو
پھول، دستِ صبا، حُسنِ لوح و قلم
سارے الفاظ، جذبے بصد احترام
تیری عظمت کو کرتے رہیں گے سلام

☆☆☆

منو بھائی

نعرہ حق دا، ضد منصور والی

دیوا آس دا بلے ہنیریاں وچ
نویں فجر دا سانوں یقین دیوے
کجھ رحمتاں عرش دی مہربانی
کجھ نعمتاں سانوں زمین دیوے

☆☆☆

باس مٹی دی، روپ گلاب والا
بھید قلم دا، لکھ کتاب والا
مزہ شہد دا، ڈنگ عذاب والا
وچ شوق دے نشہ شراب والا

☆☆☆

چپ رات نالوں مہربان جیہڑی
سخن سحر دوپہر دے نور ورگا
مینہ جیٹھ دا، دھپ سیال والی
چھاں بوہڑ دی، میوہ کھجور ورگا

☆☆☆

عقل عاشقاں، سوچ دیوانیاں دی
فکر ماپیاں، بھول ایانیاں دا
پینڈے ندی دے، ڈونگھ سمندراں دا
سفر تھلاں دے، صبر مہانیاں دا

☆☆☆

وعدہ شیریں دے نال فرہاد والا
تانگھ عشق دی بہت ضرور والی
چولا یوسف دا نین یعقوب والے
نعرہ حق دا ضد منصور والی

☆☆☆

ایہناں وچوں جے اک وی ملے نعمت
ساڈی شان نوں کل جہان من جائے
ایہہ نعمتاں کٹھیاں ہو کے تے
کدی فیر وی آون تے فیضؔ بن جائے

☆☆☆

سید سجاد ظہیر

کچھ ''دست صبا'' کے بارے میں

مقدمہ ''سازش راولپنڈی'' کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدرآباد' سندھ) میں تھا۔ دسمبر 1952ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز سپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں' وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے ''چھٹی'' وافر تھی۔ انہیں دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ ''دست صبا'' شائع ہو گئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے مونہہ سے سن چکے تھے' اور انہیں بار بار پڑھ چکے تھے' لیکن اس خبر سے ہم میں سے ان قیدیوں کو جو ادب سے مس رکھتے تھے' ایک غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو ''دست صبا'' کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر منجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گذر جانے کے بعد' جب لوگ ''راولپنڈی سازش'' کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ 1952ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔ بہت دنوں سے لوگ' جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بد اندیش ہیں' اردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ اردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً 1930 سے شروع ہوتا ہے۔ اور ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی ''دست صبا'' اور ''زنداں نامہ''۔ احمد ندیم قاسمی کی ''شعلۂ گل'' علی سردار جعفری کی ''پتھر کی دیوار'' احتشام حسین کی ''تنقید اور عملی تنقید'' اور مجنوں گورکھپوری کی ''نقوش و افکار'' (منجملہ دیگر کتابوں کے) اس دعوے کی شہادت میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ' جس میں گرمی بھی ہے' حرکت بھی' توانائی بھی' ناسا عد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے' بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اسے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدے اور تصادم کے طوفانوں سے گذر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے لگتی ہیں۔

''زنداں نامہ'' کی بیشتر منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران میں لکھیں۔ یعنی جولائی 1953ء سے مارچ 1955ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید با مشقت سزا دینے کے بعد اہل اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں منٹگمری جیل اور مجھے حیدرآباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ بھیجا گیا۔ ہم ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی نہ کر سکتے تھے تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالات زندگی میرے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں اس کے باوجود جب میں ان ذہنی' جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا' تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا ہے۔ شاید بے لاگ تنقید کے لئے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے' زندگی اور اپنے وطن کو ثمر بار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب' ہمارا درد' ہماری نفرتیں اور رغبتیں مشترک تھیں اس لئے فیض کے ان اشعار سے میں غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اپنی فیاضی سے مرصع

کر دیتا ہے اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے تو کبھی میرا ذہن اس کے تخیل کی شادابی اور فرحاں گل کاریوں سے کسب شعور کرتا جہاں جدید علم کی ضیا پاشیاں انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت۔

فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ان اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب وتمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت اس کا نرم شیریں اور مترنم اندازِ کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوا ہے۔ اس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے اس کے خیالات میں ان سچائیوں اور جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور معطر بھی تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہی ہے۔ البتہ فیض کے تمام چاہنے والے 'نقش فریادی' 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' کے شیدا ہونے کے باوجود ان سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں' ان کے مقابلے میں جو کہ وہ کر چکے ہیں زیادہ گراں قدر ہوں گی۔

فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر

سجاد ظہیر کے نام

فیض احمد فیض

اپنے دوست سجاد ظہیر کی موت پر یہ نظم فیض نے دہلی میں ستمبر 1973ء میں لکھی جب وہ ماسکو سے سجاد ظہیر کا جسدِ خاکی لے کر دہلی آئے تھے۔ یہ نظم فیض احمد فیض کے مجموعۂ کلام "شام شہرِ یاراں" میں شامل ہے۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن پہ اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیِ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحرگہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جام ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جام الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

احمد ندیم قاسمی

فیض کی شاعری کا طلسم

فیض نے اپنے عصر کی اتنی بلیغ اور اتنی جمیل ترجمانی کی ہے کہ اس کی ذات اسکی زندگی ہی میں ایک تحریک ایک ادارے ایک روایت کا مرتبہ اختیار کر گئی تھی۔ اس کے ہم عصر شعراء میں بے شمار ایسے ہیں جن کے ہاں فیض کے نرم لہجے اور ان کی مخصوص لفظیات کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی میں اقبال اور جوش کے بعد فیض سے زیادہ شاید ہی کسی شاعر نے اپنے معاصرین اور اپنے قارئین کو اس شدت اور گہرائی سے متاثر کیا ہو۔

فیض انسانی معاشرے میں ایک مثبت انقلاب کا داعی تھا تا کہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہو سکے جس کی بنیاد عدل و انصاف' مساوات اور انسان کے وقار پر ہو۔ اس انقلابی امنگ کے باوجود اس کے ہاں انقلابیوں کی سی گھن گرج کی بجائے ایک مترنم سرگوشی کا سا انداز ہے۔ اس نے زندگی کو بھی کے لئے بامعنی، بھرپور اور خوبصورت بنانے کے لئے شاعری کو ایک ذریعہ قرار دیا' مگر مجال ہے کہ اس کے ہاں کہیں بھی پند و موعظیت کی یبوست راہ پا سکے۔ اس کی شاعری پھول کی پتیوں پر شبنم کے اترنے کی مثال ہے مگر اس کے باوجود اس کی کاٹ آہنی ہے۔ دراصل فیض کی سرگوشی قاری اور سامع کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتی ہے' انقلاب کے حوالے سے جو شور بلند ہونا چاہئے وہ فیض کی شاعری میں نہیں بلکہ اس کے اثرات میں پوشیدہ ہے چنانچہ فیض کی نغماتی سرگوشی کو اپنے اندر اتار لے جانے والے کے باطن میں جو قیامت برپا ہوتی ہے اس کو فیض کے مثبت انقلاب کی شروعات سمجھنا چاہئے۔

فیض کی شاعری کا آغاز رومان و وجدان میں لپٹا ہوا ہے مگر جلد ہی زندگی کے کڑے اور تلخ حقائق اس خول کو چٹخا دیتے ہیں اور وہ ذاتی دکھ کے ساتھ ہی عالم انسانی پر مسلط دوسرے بے شمار دکھوں کی جلن بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے فن میں محبت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ وہ جادو جگاتا اور وہ وہ طلسم کاری کرتا ہے کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت میں فیض کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔

ان دو بڑی قوتوں کا امتزاج بھی فیض کا اسلوب قرار پاتا ہے۔ یہ امتزاج اتنا متوازن ہے کہ نہ تو فیض کو محبت کرتے ہوئے اپنے انقلابی نظریات کی قربانی دینے کی ضرورت پیش آئی اور نہ اس نے انقلابی موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں پر سے نظریں ہٹا لینے کے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اسے عشق اور انقلاب...... دونوں سے یکسو بیک وقت محبوب رہے اور یوں فیض کا نہ صرف اپنا اسلوب خاص صورت پذیر ہوا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے شاعروں کا بھی ایک اسلوب متعین کر دیا۔ ماضی میں ساحر لدھیانوی اور حال میں احمد فراز اس کی خوبصورت اور بلیغ مثالیں ہیں۔

فیض بہت پڑھے لکھے شاعر تھے۔ عالمی ادب کے علاوہ انہیں قرآن و حدیث کا بھی امتیازی علم حاصل تھا۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ عربی کے بھی طالب علم تھے' چنانچہ بعض نجی صحبتوں میں وہ اپنے موقف کی تائید میں قرآن کی بعض آیات اور احادیث کے بعض ٹکڑے بے تکان سنا دیتے تھے۔ اس کے باوجود بحیثیت شاعر انہوں نے فکر و حکمت کی گہرائیوں سے شاید شعوری طور پر گریز کیا یا پھر یہ سوچا کہ جب اس دور میں علامہ اقبال فکر و حکمت کی معراج کو چھو چکے ہیں تو اس دور کے کسی دوسرے شاعر کو ذرا سوچ سمجھ کر اس طرف کا رُخ کرنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں اگر فیض ایسا نہ کرتے تو اردو شاعری پر دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ایک اور احسان بھی کر جاتے' جس طرح غوغائے انقلاب ان کے ہاں مترنم شعر میں ڈھل گیا ہے اسی طرح وہ فکری شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا دیتے۔ اگر فیض فکر و حکمت کے مسائل سے (بظاہر شعوری طور پر) گریز نہ کرتے تو ان کی شاعری بیسویں صدی میں غالب کی توسیع ثابت ہوتی کہ غالب ہماری اردو شعری روایت کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے شعور کو بھی شعر میں ڈھال دیا۔

فیض کی ڈکشن کو دیکھئے کہ جس طرح غالب نے اپنے وقت میں اردو غزل کی زبان سراسر بدل ڈالی اور جس طرح اقبال نے اردو شاعری پر زبان کے معاملے میں بھی متعدد جہات کھول دیں۔ اس طرح کا انقلاب فیض کی ڈکشن میں نہیں مگر فیض اپنی طلسم کاری سے

یہاں بھی باز نہیں آیا۔ اس نے اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کی مروجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں سے استعمال کیا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے' ان کے دامان معانی میں وسعتیں پیدا ہو گئیں اور وہ مروجہ روایتی مفہوم دینے کے بجائے فیض کے لہجے سے تر و تازگی حاصل کر کے نئے مفاہیم سے لد گئے' قاتل' بسمل' عدو' دار و رسن' قفس اور صیاد وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ وہ گھس گھسا کر اور پٹ پٹا کر بے معنی ہو رہے تھے مگر فیض کے معجز نما لمس نے انہیں نئی زندگی بخش دی۔

فیض نے خواجہ حافظ شیرازی کی ڈکشن کو اپنی غزلوں میں اتنی استادانہ مہارت سے برتا کہ فارسی کی یہ ساری ترکیبیں' سبھی علامتیں اور تشبیہیں اور استعارے اور پیکر اردو کا سرمایہ بن گئے۔ فیض نے اپنے کمال فن سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک خاص نقطہ نظر' ایک خاص موقف' ایک خاص نظریہ کی شاعری بھی بلکہ شاعری ہی شاہ پارۂ فن ہوتی ہے۔

فیض کو سامراج سے نفرت ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے۔ محکومی اور غلامی سے نفرت ہے۔ گنے چنے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے' جبر اور ظلم سے نفرت ہے۔ اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شاعری میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی مگر فیض کے ہاں شور کی کوئی کیفیت ہے ہی نہیں...... دراصل ان سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوع انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آ گئی ہیں اور یوں فیض کی مقصدی شاعری اس اعلیٰ معیار کی شاعری ہے جس کے علاوہ کوئی اور معیار ابھی تک انسانی ذہن کو سوجھا ہی نہیں۔

فیض اپنا جتنا بھی سرمایہ نسلوں کے سپرد کر گیا ہے وہ اتنا گراں بہا ہے کہ آئندہ صدیوں تک فیض کے فن کی نو بہ نو توجیہات ہوتی رہیں گی اور پڑھنے والے اس کے کلام کے مطالعے سے کچھ زیادہ ہی مہذب' زیادہ منصف مزاج اور باطنی لحاظ سے زیادہ ہی خوبصورت ہوتے رہیں گے۔ فیض کے صرف لہجے اور صرف زبان اور صرف انداز بیان پر درجنوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ نقادوں کو صرف اپنے ذاتی اور غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ مطالعے کے نتائج کو سمیٹنے کی ضرورت ہے۔ وہ فیض کو سنبھل کر اور رک رک کر پڑھیں گے تو انہیں محسوس ہو گا کہ ان مترنم لفظوں کے عقب میں ہمارا ماضی بول رہا ہے' ہمارا پورا حال کراہ رہا ہے اور ہمارا پورا مستقبل جگمگا رہا ہے۔

فیض نے پاکستان کو اور تیسری دنیا کو بلکہ پوری دنیا کو فن اور رجائیت اور انسان کے روشن مستقبل پر اعتماد کی صورت میں بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے باوجود میں فیض کی رحلت کے بعد بار بار کہہ چکا ہوں کہ فیض کی رحلت سے ہم تہذیبی اور ثقافتی اور فنی لحاظ سے غریب ہو گئے ہیں۔ غریبی کا یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر فیض دو چار سال اور زندہ رہ جاتا تو ہماری تہذیب کچھ زیادہ پُر مایہ ہو جاتی اور ہمارا ادبی افق کچھ زیادہ روشن ہو جاتا۔ فیض کے جسد خاکی کے زیر خاک چلے جانے سے ہمیں اپنے غریب ہو جانے کا احساس ہوتا ہے' ورنہ فیض تو اپنا بہت کچھ لٹا کر ہمیں تہذیبی لحاظ سے بہت امیر' بہت باثروت بنا کر رخصت ہوا ہے۔

☆☆☆

پاکستان ٹائمز کے ادارتی عملے کے ہمراہ گروپ فوٹو

خواجہ احمد عباس

فیض احمد فیضؔ

''اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے''
فیضؔ کی شاعری سے صرف یہ سرخی لی گئی ہے۔
اگر چاہوں تو یہ سارا مضمون اس کے شعروں سے بھر سکتا ہوں۔ فیضؔ کی شاعری ذاتی شاعری تھی (جیسے ہر شاعری کو ہونا چاہئے) کیونکہ ان کا دل اور دماغ ترقی پسند تحریکات سے ہم آہنگ تھا۔ اس لئے وہ ''عالمی'' بلکہ ''آفاقی'' شاعری بھی تھی۔

دو تین برس ہوئے ہم ایک دوسرے سے بھوپال میں ملے...... اور باتوں کے علاوہ بیروت میں جو خون بہہ رہا تھا اس کا بھی ذکر آیا۔ تب فیضؔ نے ایک چھوٹی سی اپنی نظم سنائی جو کہ فلسطین کے مجاہد اور تارک الوطن مرد اور عورتوں کے بارے میں تھی۔ یہ نظم انہوں نے فلسطینیوں کے کیمپ میں بھی سنائی تھی اور یہ کمال تھا کہ ساتھ میں نہ کوئی سنگیت تھا اور نہ کوئی آہنگ تھا مگر شاعر جوان کی زندگی کا حال بیان کر رہا تھا کوئی آنکھ نہیں تھی جو آنسوؤں سے بھری نہیں تھی۔ وہ فیضؔ کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ یہی نظم انہوں نے بھوپال میں بھی سنائی اور یہاں بھی سننے والوں کی وہی حالت ہوئی جو کہ بیروت والوں کی ہوئی تھی۔ شاید کوئی آنکھ ہو جو نم نہ ہوئی ہو۔

فیض احمد فیضؔ کی زندگی میں کتنے ہی اُتار چڑھاؤ ہیں۔ پہلے وہ امرتسر کے ایک کالج میں تقسیم ہند سے پہلے انگریزی کے پروفیسر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور میں رہنا پسند کیا اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہوئے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور ان کی شاعری بھی ترقی پسند تحریک کی ترجمان بن گئی۔

پاکستان کے اولین دور میں راولپنڈی ''سازش کیس'' میں ملوث ہو کر گرفتار ہوئے اور کئی برس جیل میں رہے۔ جہاں انہوں نے وہ نظم کہی جس کا ایک شعر ہی ترقی پسند شاعری کا انقلابی منشور ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

یہ شعر انہوں نے اس وقت کہا تھا جب ان پر راولپنڈی ''سازش کیس'' چل رہا تھا اور ہر قسم کی پابندی ان پر لگا دی گئی تھی۔ کاغذ اور قلم پر بھی پابندیاں تھیں دوسرے غیر سیاسی قیدی بھی فیضؔ سے مرعوب تھے۔ اس لئے جب وہ دو تین سال کے بعد رہائی پاتے تو فیض احمد فیضؔ کے پاس آتے اور ایک پیغام ان کے باہر جو بھی ساتھی تھے ان کے نام لے جاتے۔ یہ پیغام زبانی ہوتا اور شعروں کی شکل میں ہوتا۔ باہر جو ساتھی تھے ان میں کھلبلی مچ جاتی۔

''کیا ہوا جو اتنے خوش نظر آرہے ہو؟''
''میرے بھائی فیض احمد فیضؔ کا ایک اچھوتا پیغام جیل سے آیا ہے!''
''کوئی شعر ہے یا پوری غزل!''
''پوری غزل معلوم ہوتی ہے۔ سنو گے تو پھڑک اٹھو گے!''

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

شعر کیا تھا دنیائے انقلاب کا ایک پیغام تھا' ایک چیلنج تھا۔

فیضؔ نے کوئی نثری ریکارڈ اپنی زندگی کے بارے میں نہیں چھوڑا۔ ویسے ان کی ہر غزل اور ہر نظم اپنے پڑھنے والوں کے نام ایک محبت بھری چٹھی ہے۔ اس کو یہی سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔ بعض اوقات تو وہ لمبے لمبے خطوں کا جواب بھی شعر یا اشعار میں دیا کرتے تھے۔ اس طرح اس شاعر کی زندگی کی یادوں کی کہانی — جو ہر طریقے سے بیان کی جاسکتی ہے، اس کے شعروں کی شرح، اس کی جیونی کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ کون نوجوان نثر نگار اس کا بیڑہ اٹھائے گا؟ سب فیضؔ کے چاہنے والے' سب تنقید نگار اور اس کے سب دوست اپنی یادوں کو کریدیں گے تو بات بن جائے گی اس میں مسز فیضؔ کو اپنی یادوں کو قلم بند کردینے سے ہی پورا کام نہیں ہوسکتا کیونکہ پردہ در پردہ ہزاروں مردوں اور عورتوں سے ان کے روحانی اور سماجی تعلقات تھے۔ جن میں ان کی بیوی کے علاوہ ان کے دوستوں اور ہم عصروں کا کافی حصہ ہے۔

فیضؔ کی خود لکھی ہوئی کوئی پوری سوانح عمری اگرچہ نہیں ہے مگر (ہندوستان میں کم اور پاکستان میں زیادہ) بہت کچھ دوسروں نے لکھا ہے۔

اس سلسلے میں ''متاع لوح و قلم'' بہت اہم ہے کیونکہ اس میں فیضؔ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے' فیضؔ کی تقریریں' اہم مضامین جو لکھے گئے اور نشر ہوئے، ریڈیو کی تقریریں' دیباچے' جو فیضؔ صاحب نے لکھے ہیں' انٹرویو جو اخباروں کو اور ریڈیو کو دیئے' فلم اور ڈرامے جو انہوں نے لکھے اور ترتیب دیئے اور سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں فیضؔ کے خطوط ہیں۔

☆☆☆

عبداللہ ملک

فیض کا فلسفۂ زیست اُس کے اپنے خطوط کی روشنی میں

فیض ہشت پہلو شخصیت کے حامل ہیں' ہر پہلو اپنے اندر ایک دنیا پوشیدہ رکھے ہوئے ہے اور چونکہ زندگی میں انہوں نے بے پناہ تجربات کیے ہیں اس لیے ان کی شخصیت اور بھی متنوع اور ساتھ ہی متنازعہ فیہ بھی بنتی جا رہی ہے۔ یہ فیض کی شخصیت کا تنوع ہی ہے جو انہیں اشرافیہ میں جنم لینے کے باوجود طبقہ محرومین کا دم بھرنے پر مجبور کرتا رہا ہے اس تنوع میں انہوں نے کون کون سے پاپڑ نہیں بیلے۔ معلمی کی' شاعری کی' ترقی پسند تحریک کے روح رواں بنے۔ فاشزم کے خلاف میدان جنگ کے سپاہی بنے' صحافت کی' ٹریڈ یونین کے قائد بنے اور انہی حوالوں سے سیاست کی وادیٔ خارزار کے راہی ہونے کا الزام بھی مسکراتے ہوئے اپنے اوپر چسپاں کروا لیا اور راولپنڈی سازش کیس میں ملزم ٹھہرائے گئے۔ غرضیکہ کون سا صحرا ہے جس کی صحرا نوردی فیض کا مقدر نہیں ٹھہری۔ یہ تمام سیاحتیں' تمام صحرا نوردیاں الگ الگ کتاب کا عنوان بن سکتی ہیں لیکن مجھے اس وقت صرف ان کے جیل سے لکھے گئے خطوط کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔

فیض 9 مارچ 1951ء کو گرفتار کیے گئے اور انہوں نے پہلا خط 7 جون 1951ء کو حیدر آباد جیل سے لکھا یہ تمام خطوط انہوں نے انگریزی میں اپنی بیگم ایلس کو لکھے۔ جس وقت یہ خط لکھے گئے اس وقت ان کی اشاعت کا خیال ذہن میں ہوگا بھی نہیں کیونکہ اس وقت تو ان کو اپنی زندگی کے انجام تک کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ خود بھی ان خطوط کی اشاعت کے موقع پر لکھتے ہیں۔

"ظاہر ہے یہ کوئی ادبی تصنیف نہیں ہے۔ نجی خطوط ہیں جو قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں' کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش بے کار ہے۔ صرف اتنا ہے کہ جیل خانے میں رفع الوقتی کے بہت محدود ذرائع میں سے ایک ذریعہ خط و کتابت بھی ہے۔"

نجی خطوط ویسے بھی انسانی کمزوریوں کو واشگاف کر دیتے ہیں اور جیل اور سفر تو ایسے مراحل ہوتے ہیں جہاں انسان چاہنے کے باوجود اپنی کمزوریاں نہیں چھپا پاتا۔ ظاہر ہے ایسے عمل کے دوران جو خطوط لکھے جائیں گے وہ لکھنے والے کے اندر بیٹھے ہوئے انسان کو اور بھی عیاں کر دیں گے۔ اس کی محبتیں' اس کی نفرتیں۔ اس کی جرأت و ہمت' اس کی بزدلی' اس کی کمینگی' خود غرضی بھی ان خطوط میں نکھر کر سامنے آ جائیں گی۔ کیونکہ جیل تو ویسے بھی جگہ ہی ایسی ہے جہاں کمزوریاں جنم پاتی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جیل بھیجنے والوں یعنی حاکموں کا مقصد وہ نہیں ہوتا جس کا وہ اٹھتے بیٹھتے اعلان کرتے ہیں کہ جیل خانہ بگڑے ہوئے اور سماج کے راندے ہوئے انسانوں کی اصلاح کا ذریعہ ہے بلکہ ان کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے طبقاتی سماج میں جیل کی زندگی کا فلسفہ ہی کمینگی' خود غرضی' لالچ اور اپنی ذات کی افزائش کا فلسفہ ہوتا ہے قیدی کی آزادی جب چھین لی جاتی ہے اور اس کو سپرد زنداں کر دیا جاتا ہے تو یہ جسمانی اذیت کا ہی عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ روحانی عمل بھی ہوتا ہے جو عام طور پر ضمیر کے قیدیوں کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ آزادی سے محروم کر کے ایک چار دیواری میں محصور کرنے کا مطلب کیا یہ ہے کہ اسے ہر وقت یہ احساس دلایا جائے کہ وہ مجبور ہے' وہ حاکم کا بندہ ہے' وہ چھوٹی سے چھوٹی آسائش بھی جسے وہ باہر کی زندگی میں آسائش سمجھتا بھی نہیں تھا اس سے محروم کر دیا جائے وہ ان آسائشوں کے لیے ترسنے لگے اب اس کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ یہ محسوس کرنے کی کوشش کریں کہ فیض 9 مارچ 1951ء کو گرفتار ہوتا ہے اور پہلا خط وہ 7 جون 1951ء کو لکھتا ہے اور یہ خط وہ شروع ہی اس طرح کرتا ہے۔

"تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت ہی دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لیے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے۔"

اب اس سے زیادہ مجبوری کا کیا اظہار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک وقت تھا کہ 1946ء تک پنجاب کی جیلوں میں سرخ مرچ نہیں دی جاتی تھی اور جو عام قیدیوں کو دال یا سبزی ملتی تھی اس میں سرخ مرچ ڈالی ہی نہیں جاتی تھی۔ سگریٹ کا تو ذکر ہی کیا اسی طرح سے ماچس کی ایک ڈبی جیل میں نعمت غیر مترقبہ ہوتی تھی اور سیاسی قیدی یا بی کلاس کے حامل لوگ عام

قیدیوں کی نگاہوں میں قابل تکریم ہی اس لیے ٹھہرتے تھے کہ ان کے پاس سُرخ مرچ بھی ہوتی تھی اور سگریٹ اور ماچس بھی۔ یہ بھی طبقاتی تقسیم ہوتی ہے اور سیاسی قیدیوں اور عام قیدیوں کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جیل انسان سے جو آسائشیں چھینتی ہے وہ کتنی معمولی ہوتی ہیں لیکن جیل کے اندر کتنی اہم صورت اختیار کر جاتی ہیں اس کا اندازہ فیض کے ایک خط کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

''آج ہمارے کیمپ میں ایک ہلکا سا ہنگامہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک حکم کے مطابق ہمیں دوبارہ رات کو بند ہونے کی ہدایت جاری کی گئی تھی لیکن یہ حکم عمل درآمد سے پہلے ہی منسوخ کر دیا گیا۔ رات کو بند ہونے یا نہ ہونے میں جسمانی طور سے تو کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا لیکن نفسیاتی اعتبار سے یہ فرق کافی اہم ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب راتیں اتنی حسین ہوں جیسی کہ آج کل ہیں۔ کبھی کبھی جب میں رات کو جلدی سو جاتا ہوں اور منہ اندھیرے آنکھ کھل جاتی ہے تو صحن زنداں کے سکوت اور صبح کی دلکشی سے عجب فرحت اور تسکین ملتی ہے۔ میں بار بار اس کی تکرار نہیں کرنا چاہتا کہ سفر کیسا ہی ست رفتار کیوں نہ ہو منزل قریب ہے۔ اس لئے جو دن باقی ہیں ان میں ہم جتنی بھی مسکراہٹیں فراہم کرسکیں فراہم کر کے بقیہ دن گزار دیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا ہی کرو گی۔''

فیض ان سطور میں ایک طرف چلتے چلتے زندانیوں کی مجبوریوں کا ذکر کرتا ہے تو دوسری طرف حوصلے بلند کرنے کی بھی باتیں کرتا ہے۔ دراصل ان خطوط میں فیض مجبوریوں' محرومیوں اور تلخیوں کا ذکر ضرور کرتا ہے لیکن ان کو خطوط کا موضوع نہیں بناتا چلتے چلتے ان کا ذکر کرتا ہے دراصل بنیادی طور پر امیدوں اور خوش آئند مستقبل کا شاعر ہے اور ہر خط میں وہ ان باتوں کا اعادہ کرتا ہے اصرار کرتا ہے' اور بنیادی طور پر یہی اس کا فلسفہ زیست ہے جو جیل میں اور بھی نکھرا ہے۔

ان خطوط میں انسانی مسرت اور زندہ رہنے کے ولولوں کا جس طرح اظہار ہوتا ہے وہ شاذ ہی حسیات میں اس سے پہلے ہوگا فیض زنداں کی یاس و ناامیدی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔

''تمہارا 23 تاریخ کا لکھا ہوا خط بچوں کی تصاویر سمیت آج ملا۔ تمہارے بچے کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے بڑے نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں اور باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا

فیض صاحب ریلوے ورکرز یونین سے خطاب کرتے ہوئے

ہے کہ میں انہیں اپنے سامنے بڑے ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ تمہاری نگرانی میں ان کی تربیت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ ان کی تربیت میں میرا تو اتنا ہی حصہ ہو سکتا تھا کہ انہیں خوش رہنا سکھاؤں اور ان کی خوب ناز برداری کروں اگر وہ خودغرض، کم ظرف اور حریص نہ بن جائیں (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) اور اگر ان میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزت ہے اور کیا نہیں ہے تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی بسر کریں ٹھیک ہے۔ ہمارے دوست سرجیت سنگھ نے کہا تھا "Peace Comes From Within"۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو میں انہیں بتاتا کہ اس کے صحیح معنی کیا ہیں۔ اب صحیح طور سے پتہ چلا ہے کہ اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دُکھ درد سب مفارقتیں 'سب سختیاں' سب صعوبتیں' غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے جو باہر سے اُس کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس' خطا کاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے جس کا کوئی مداوا' کوئی علاج نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر اپنے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے خلاف اگر اپنی نیکی اور بے گناہی پر یقین ہو جیسا کہ اس مصیبت میں مجھے اور تمہیں ہے تو سب بے وجہ کی تکالیف وحادثات شعر کی اصطلاح میں سمندِ شوق کو تازیانے کا کام دیتے ہیں۔"

جیل کی کیفیات پر جس چابکدستی سے فیض نے اظہار خیال کیا ہے اس کی مثال محال ہے اور چونکہ عام قاری اور تنقید نگار بھی جیل کی زندگی سے عام طور پر لاتعلق ہوتا ہے اس لیے وہ زنداں جانے والے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن جن کیفیات سے ان اسیروں کا گذر ہوتا' جس رُوحانی کرب سے وہ دو چار ہوتے ہیں اسے وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنی روح کا حصہ نہیں بنا سکتے۔ جس طرح سے روٹی روزگار کے لیے بیرون ملک جانے والوں کا صرف ایک پہلو ہماری نظر میں ہوتا ہے ان کے شب و روز میں جو زہر گھلا ہوتا ہے' جو بے کیفی ہوتی ہے اس کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ پاتے اور ہم صرف بجٹ کے موقع پر سمندر پار سے آنے والے زرِ مبادلہ کا ذکر کر دیتے ہیں یہی حال فیض کا ہے' کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ عیش کر رہا ہے' سیر و سیاحت کر رہا ہے لیکن اس رضا کارانہ جلاوطنی کا جو کرب اس کو سہنا پڑ رہا ہے اس کو جاننے کے لیے بھی ایک اور فیض درکار ہے۔

جیل انسان کو چڑچڑا بنا دیتی ہے وہ غصیلا ہو جاتا ہے وہ بات بات پر لڑنا شروع کر دیتا ہے اور بہت حد تک وہ ناامید و مایوس ہو جاتا ہے اسے انسان کے مستقبل پر سے امید اٹھ جاتی ہے۔ لیکن فیض کی انسان دوستی اس کے اعتقادات کی پختگی اور آدرش سے لگن نے اس کو زندہ و توانا رکھا۔ جیل کی تمام صعوبتیں اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں کی چمک نہیں چھین سکیں لیکن لطف یہ ہے کہ اس پختگی کے باوجود وہ اپنے خطوط میں نہ لیکچر دیتا ہے نہ فلسفہ بگھارتا ہے حالانکہ وہ سالہا سال تک معلمی کرتا رہا ہے لیکن اس کے باوجود کم گو رہا ہے اور خطوط میں بھی کم گوئی موجود ہے۔ وہ ان خطوط میں نہ فلسفی بنا ہے نہ مبلغ اور تو اور وہ تلخیوں اور محرومیوں پر بھی غیض و غضب کا اظہار نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کی تحریر سے کسی قسم کے غم و ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے دشمنوں سے بھی ناراض دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ جگہ جگہ اس کی تحریروں سے ان کے لیے جذبہ ترحم مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"تمہیں پہلے نہیں لکھ سکا جس کا افسوس ہے لیکن یہاں ہر کام بہت دھیرے دھیرے ہوتا ہے اور خط لکھنے کے لیے کاغذ آج ہی ہاتھ آیا ہے۔ میں اور دوسرے ساتھی چار تاریخ کی صبح کو سپیشل ٹرین کے ذریعے یہاں پہنچے ہم نے جس ٹھاٹھ سے سفر کیا دیکھنے کی چیز تھی صرف بینڈ باجے کی کسر رہ گئی ورنہ جلو میں اور تو سب کچھ تھا۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہی یوں محسوس ہوا کہ سب پریشانیاں دور ہو گئی ہیں۔ سفر کا لطف' دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی لذت' پُر تکلف کھانا' بہت سی نعمتیں یک بارگی ہاتھ آگئیں اتنے دنوں کے بعد جب وہ مجھے اچانک گھر سے لے گئے تھے پہلی بار مزے کا کھانا' اس سفر کی دوپہر نصیب ہوا۔ بھنا ہوا مرغ' پلاؤ' فروٹ کاک ٹیل اور آئس کریم (افسوس کہ بھوک نہیں لگ رہی تھی) اور اس پر اضافہ دنیا کی سب سے عزیز چیز یعنی انسانوں کی صحبت' جس سے اتنے دن محروم رہے! ان سب باتوں کی وجہ سے دل دوبارہ پر سکون ہے اب تمہیں بتانے میں کچھ ہرج نہیں کہ یہ تین چار دن جو لاہور میں گزرے ایام اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا جو خود کو بہت عزیز ہو لیکن ان کے لیے کچھ معنی نہ رکھتی ہو غلط اور ناجائز بات ہے۔ اس نظر سے دیکھو تو آئیڈل ازم یا اصول پرستی بھی خودغرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے اس لیے اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھاتے ہیں۔ اس زمانے میں دل و دماغ پر اور بھی کئی باتوں کا انکشاف ہوا اپنے بارے میں بھی دوسروں کے بارے میں بھی۔ اپنے میں ایسی بہت سی کمزوریاں نظر آئیں جن کا وجود پہلے گمان میں نہ تھا دوسروں میں کمینگی اور عالی حوصلگی کے ایسے پہلو دکھائی دیے جو پہلے معلوم نہ تھے اس سارے تجربے کے لیے دل احسان مند ہے خیال ہے کہ جب یہاں سے نکلیں گے تو غالباً اپنی شخصیت پہلے سے زیادہ مکمل اور منظم ہوگی میں نے یہ بھی اچھی طرح محسوس کر لیا ہے کہ آدمی کے

لیے مناسب یہی ہے کہ جو کچھ وہ ہے اسی پر قناعت کرے اور جو کچھ وہ نہیں ہے وہ کچھ بننے کی کوشش میں وقت اور محنت ضائع نہ کرے اس طرح کی کوشش سے حماقت اور خود فریبی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں۔

''ہاں' تو میں کہہ رہا تھا جب سے میں یہاں پہنچا ہوں خوف و خطر کا قطعی کوئی احساس دل میں باقی نہیں رہا (اگر چہ یہ احساس پہلے بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا وہ اس وجہ سے کہ نہ صرف مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جسے اخلاقی طور سے گناہ کہہ سکیں بلکہ کوئی ایسا ارتکاب بھی نہیں کیا جسے رسمی یا قانونی طور سے جرم ٹھہرایا جا سکے) اب تو یوں ہے کہ اگر کوئی یاد نہ دلائے تو خیال بھی نہیں آتا کہ ہم جیل خانے میں ہیں یوں لگتا ہے کہ ہم اپنے مرضی سے یہاں ہیں اور اگر یہاں سے باہر جانے کو جی چاہے تو کوئی ہمیں روک بھی نہیں سکتا۔ جیل میں ہمارا گھر اچھا خاصا ہے کھانے پینے کو کافی ملتا ہے گری کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ اسیری کے سب سے بُرے دن کٹ چکے ہیں اس لیے کہ اب اور کچھ بھی ہو نہ قید تنہائی کا سامنا باقی ہے نہ پولیس کی تکلیف دہ پوچھ گچھ کا ڈر ہے اور اپنی جان اور ناموس دونوں سلامت ہیں اب تمہاری اور بچوں کی تصویریں سامنے رکھ کے میں خوشی سے مسکرا سکتا ہوں تمہاری یاد سے پہلے کی طرح دل نہیں دکھتا اور یہ یقین پہلے سے بھی زیادہ محکم ہو چلا ہے کہ زندگی خواہ کچھ بھی دکھائے بالآخر بہت خوب شے بھی ہے اور بہت حسین بھی۔''

اس قدر کٹھن حالات میں مسکراتے رہنا یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔ فیض کو یہ مقام اس کی انسان دوستی نے عطا کیا ہے انسان دوستی کا جذبہ اس کی رگ و پے میں سرایت کر کے اس کے خون کا حصہ بن گیا ہے اس کی شخصیت اس انسان دوستی کے بغیر جانی ہی نہیں جا سکتی۔ فیض کی واحد پہچان' فیض کا تشخص' فیض کا آدرش ہی انسان دوستی ہے چنانچہ جیل خطوط کے اقتباسات فیض کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں وہی فیض جو مکمل انسان نظر آتا ہے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔

o o o

''...... مجھے تمام وقت یہ خیال ستاتا رہا کہ مسرت اور خود فراموشی کے چند لمحے گزر جانے کے بعد ان بے چارے بیوی بچوں کے دل میں رنج و فراق کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو جائے گا۔ لذت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اگر وقتی لذت کے بعد اس لذت سے زیادہ دکھ اٹھانا پڑے تو اس لذت سے گریز کرنا چاہیے۔ اس سوال کا حل مشکل اس لئے ہے کہ اس لذت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم زندگی کی چھوٹی موٹی تفصیلات میں اتنے الجھے رہتے ہیں کہ اخلاق و فلسفے کے بے کار مسائل سے الجھنے کے لئے نہ وقت ہے نہ دماغ۔ مثال کے طور پر ابھی کچھ دن پہلے ہمیں ایک ریڈیو سیٹ عنایت ہوا تھا اور سب لوگ اس میں ایسے ہی منہمک رہتے ہیں جیسے بچے بھی اپنے فلمی گانوں میں۔ پھر ہمارے وارڈ کی کالی بلی نے دو تین بہت نازک سفید اور سیاہ بچے دیئے اور سب لوگ پرورش

CASH MEMO

1649

Y. Faiz
9/11

تاریخ، جیل اور سامان رسد کی مہنگائی پر نظر رکھیں، جیل دستاویز

اطفال کے پیچیدہ مسائل میں غرق ہو گئے۔ اس کے بعد عید کے کھانے کی تفصیلات پر بحث و تکرار شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ بیسیوں مسائل اور بھی ہیں۔ مثلاً کوٹھڑیوں کے پردے کیسے ہوں گے؟ پڑھنے کی میزیں کب ملیں گی؟ صبح کی چائے کس وقت آئے گی' وغیرہ وغیرہ' اور اس تمام مدت میں یکساں دنوں کی ساکن سطح پر یاد کے سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور وقت کی نبض دیکھتے دیکھتے سست رفتار ہوتی جا رہی ہے۔ اب دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور صبح جب ہم چائے کے لئے اٹھتے ہیں تو رات کا اندھیرا کچھ کچھ باقی ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے سال کے بعد شب کے خاتمے پر اندھیرے میں پو پھٹنے کا سماں اور چاند کے ہلکے نقرئی رنگ کو روپہلی بنتے دیکھا ہے۔ جیل کی دیواروں کے باوجود یہ سب کچھ حسین ہے اور ایسے لمحوں میں زندگی کی سب بے وفائیوں کے باوجود اس کا شکرانہ ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

O O O

''آج تمہارا خط ملا' بڑی راحت ہوئی' آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ دعا ہے کہ تمہیں (بلکہ ہمیں) یہ دن کئی بار دیکھنا نصیب ہو۔ ان دس برس میں ہم نے بہت سا سکھ دیکھا ہے اور تھوڑا سا دکھ بھی۔ لیکن ہم نے یہ تمام دن دیانت داری اور سکون خاطر سے گزارے ہیں اور زندگی میں سب سے اہم بات یہی ہے' تو آؤ ان بیتے ہوئے دنوں کا شکرانہ ادا کریں' یہ دس برس ایسی دولت ہے جسے کبھی فنا نہیں اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اگر کسی کا عقلی یا آسمانی احکامات پر ایمان نہ ہو تو نیکی اور اخلاق کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو لمحہ حق و صداقت کی پرورش میں گزرے وہ بجائے خود خوشی کا ایسا خزینہ بن جاتا ہے جسے کوئی رہزن لوٹ نہیں سکتا۔ نہ کوئی جابر ضبط کر سکتا ہے۔ شاید مذہبی اصطلاح میں توشۂ آخرت کے صحیح معنی یہی ہیں۔

''تم نے اپنے گھر کی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تنہائی کتنی کڑی اور جدائی کے یہ لمحے کتنے گراں ہیں۔ ان کو دل سے دھویا تو نہیں جا سکتا لیکن ان کا بوجھ اس تصور سے کم ضرور کیا جا سکتا ہے کہ بیتے ہوئے دن کیسے اچھے تھے اور آنے والے دن کتنے بہتر ہوں گے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ جب سے جیل خانے کا دروازہ بند ہوا ہے میں کبھی ماضی کے پیراہن کو تار تار کر کے اسے مختلف صورتوں میں دوبارہ بنتا رہتا ہوں اور کبھی آنے والے دنوں کو دام تصور میں مقید کر کے ان سے اپنی مرضی اور پسند کے مختلف مرقعے ترتیب دیتا رہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ بیکار سا شغل ہے اس لئے کہ خوابوں کو حقیقت کی زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تخیل کے بل پر گرد و پیش کی دلدل سے پاؤں چھڑا سکتا ہے۔ فراریت بری بات ہے لیکن جب ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہوں تو آزادی کی واحد صورت یہی رہ جاتی ہے۔ اسی نسخے کے طفیل مجھے جیل کی سلاخیں بہت ہی حقیر اور بے حقیقت دکھائی دینے لگی ہیں اور بیشتر اوقات ان کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔''

O O O

''تمہارا دوسرا خط مجھے ابھی ملا' غالباً میرا پہلا خط پہنچ گیا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے شادی کی سالگرہ کی تاریخ پھر غلط لکھی۔ لیکن اب کے ایک ہی دن کا فرق تھا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہ دن اتنا اہم نہیں جتنے وہ روز و شب ہیں جو اس دن کے بعد آئے۔ ان سارے دنوں کی یاد اور ان سب نعمتوں کا احساس جو زندگی نے عطا کی ہیں' بہت سے لوگوں کی دوستی اور محبت' تمام بہاریں' سب برساتیں' جھمکتیں اور شامیں' غروب آفتاب اور طلوع ماہتاب' الفاظ اصوات' رنگ و بو کا حسن' لطف و انبساط کی بے انت واردات' ان سب باتوں سے جیل کی بے رونقی میں دل پر ایسی مسرت طاری ہوتی ہے جس سے ہم پہلے آشنا نہ تھے۔ اگر دو چار دوستوں نے دعا کی یا زندگی میں درد و کرب کے چند لمحے پیش آئے تو ان نعمتوں کی میزان کے سامنے ان کی کیا وقعت ہے؟ کچھ بھی نہیں! یہ احساس پوری طرح جیل خانے ہی میں میسر آ سکتا ہے اس لئے کہ جیل خانے کی دنیا باقی دنیا سے الگ تھلگ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ایک طرح کی ''اگلی دنیا'' ہے جو روزمرہ دنیا سے اتنی دور دراز اور ایسی بلند و بالا معلوم ہوتی ہے کہ اس کی نارسا بلندیوں پر سے انسان' نیچے کی انسانی دنیا کو' بہت بسیط اور جامع نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی دیکھنا چاہے تو۔ ہم تو بیشتر اوقات ادھر دیکھتے ہی نہیں' دامن دل کھینچنے کے لئے ہر گوشۂ تنہائی کی اپنی دلچسپیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔''

O O O

''تمہارے خط پہلے سے زیادہ بشاش معلوم ہوتے ہیں جو خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ شائد تم نے یہ بشاشت مجھے خوش کرنے کے لئے اختیار کی ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل خوش ہوتا ہے۔ ہمارے دوست اور بہی خواہ اپنا من لبھانے کے لئے جو خوش آئند افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔ میں انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن ان افواہوں سے قطع نظر اس میں کیا شبہ ہے کہ آخر کار حالات سدھر ہی جائیں گے۔ جو بھی دن گزرتا ہے اس سے نجات کی منزل کا فاصلہ اور کم رہ جاتا ہے چنانچہ اس آزمائش کے خاتمے تک محض صبر و تحمل درکار ہے۔ ہاں اس خیال سے تسکین اور تسلی ضرور ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہمیں بھولے نہیں اور ہماری افتاد کے لئے ان کے دل میں ہمدردی موجود ہے اور جب اس ہمدردی کا اظہار ہمعصر دنیا کی ایک ایسی عظیم شخصیت کی جانب سے ہو جیسے کہ

پال راپسن ہیں تو افتخار سے سر اونچا ہو جاتا ہے۔''

O O O

''دی ڈپلومیٹ'' کے مصنف ''جیمس آلڈرج'' ہیں اور ''ھیڈ بوڈلے Head Bodley'' نے شائع کی ہے۔ میں نے بہت زمانے سے ایسی اچھی کتاب نہیں پڑھی۔ تم بھی کہیں سے حاصل کرنے کی کوشش کرو تا کہ جو لطف مجھے ملا ہے اس میں شریک ہو سکو۔ ناول کا موضوع تو ایران میں برطانوی ریشہ دوانیاں ہے لیکن اس کی خوبی موضوع کی وجہ سے نہیں ہے۔ خوبی اس اخلاقی اور جذباتی کشمکش کے بیان میں ہے جو عالمگیر تو تمیں ایک فرد کی ذات پر نازل کرتی ہیں اور اس بارے میں کہ یہ اکیلی جان اس کشمکش کی صلیب سے کیسے عہدہ برا ہوتی ہے۔ ایک طریقے سے اس میں اس بے چارگی اور مایوسی کا جواب ملتا ہے جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ یہ احساس ہمیں اس لئے گھیرے رہتا ہے کہ انسانی مسرت کی جدوجہد بظاہر اتنی طویل اتنی گراں اور اتنی دائمی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایک فرد کی ذات بالکل ہیچ اور نزار دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ جبھی ہوتا ہے اگر تم اس جدوجہد کو ایک فرد کی نظر سے دیکھو بلکہ یہ کیفیت پیدا ہی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم انسانی رنج و ناخوشی کے مسئلے کو ذاتی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ان مسائل کو انفرادی نقطہ نظر سے دیکھنا حماقت ہے اس لئے کہ انسانی رنج و راحت ہمارا تمہارا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے کسی شخص کیلئے عاشقی یا اپنے بچے کی علالت ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر یوں نہیں ہے تو اسے دیکھنے کا ایک ہی صحیح طریقہ ہے۔ اور وہ اجتماعی نقطہ نظر ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھو تو یہی جدوجہد شجاعانہ با مقصد اور امید افزاء نظر آتی ہے۔ اس طور سے مسائل پر نگاہ ڈالنا مشکل اس لئے ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی خود پسندی کی وجہ سے کبھی پوری طرح اقرار نہیں کرتے کہ ہماری ذات قطعی غیر اہم ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خود پسندی ہے یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا۔ افسردگی، بددلی اور خود ترحمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گلہ کارفرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات ہماری ذاتی تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔ دراصل ہمارے تمہارے جیسے لوگ جن کی شخصیتیں بالکل مکمل اور مربوط نہیں ہیں اپنی ذات کو اس ذات کی حدود سے پرے زیادہ بڑی چیزوں سے یک جان نہیں کر سکتے جس کے نتیجے میں ناخوشی اور شکست کا احساس لازمی ہے۔ اس امر میں شاید میں تم سے زیادہ قصوروار ہوں۔ لیکن یہ بھی ایک قسم کی خود پسندی ہے مگر شاید مختلف اور زیادہ گھٹیا قسم کی۔''

O O O

''......... تمہاری قوت برداشت پر دل بہت نازاں ہے۔ شاید میں نے لکھا تھا کہ اپنی شخصیت کی گہرائیوں کا کم از کم ایک بار امتحان ضرور ہونا چاہیے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ وہاں کیا ہے کیا نہیں ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی نہ کبھی یہ امتحان پیش نہ آئے۔ اگرچہ بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی باری کبھی نہیں آئے گی۔

''اگر اس قصے کا خاتمہ بالخیر ہوا اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا تو سارے دکھ درد کے باوجود یہ سودا سودمند ثابت ہوگا۔ اس کا موذی اور غیر اخلاقی پہلو صرف ایک ہے اور وہ ہے بیش قیمت وقت کا مجرمانہ زیاں۔ عمر کے غلط حصے کا ایک پورا سال ختم ہو چکا ہے اور بہت تھوڑے وقت میں جو بہت کچھ کرنے کو ہے اس میں سے کوئی بھی کام پورا نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے جیل خانے کی نفسیاتی الجھنیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ اس جبری فراغت سے کوئی مفید کام نکل سکے اگرچہ اس کا احساس اور اس کی تمنا دل میں مستقل رہتی ہے۔''

O O O

''خط و کتابت میں ہم پھر پیچھے رہ گئے ہیں اس لئے کہ تمہارے تین خط یکبارگی وصول ہوئے جس سے دل خوش بھی ہے اور نادم بھی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ حساب برابر ہو جائے۔ شاید تمہیں عجیب لگے لیکن یہاں خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب یہاں ان چیزوں کی یاد جو دل کو عزیز ہیں زیادہ ستانے لگے تو یہ یادیں اتنی شفیق، خوبصورت اور گرمانے والی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے مدوجزر میں رکاوٹ ڈالنے کو دل نہیں چاہتا۔ تم کہو گی کہ یہ اپنی کاہلی اور سہل انگاری کا جواز پیدا کرنے کا ایک بہانہ ہے اور تمہارا کہنا ٹھیک بھی ہے۔ میں نے شاید پہلے بھی لکھا تھا کہ جیل خانے کی زندگی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی خودغرضیاں وافر اور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ قید سے پہلے پردہ نشین خواتین کی ذہنیت کا کبھی ایسا صحیح شعور پیدا نہیں ہوا تھا جیسا کہ اب ہے۔ یہ ذہنیت ہر قیدی کی عام ذہنیت ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کم ظرفی، گھٹیا پن، چھوٹی چھوٹی الجھنوں سے اتنی لگن کہ وہ عالمگیر مسائل دکھائی دینے لگیں اور واقعی اہم اور غیر ذاتی مسائل سے قطعی بے تعلقی، کینہ پروری، بدمزاجی، کبھی خود سری، کبھی خاک بوسی، کبھی ہاتھ پاؤں ہلانے سے قطعی گریز اور کبھی بے وجہ کی بھاگ دوڑ یہ سب باتیں مقید اور محکوم زندگی کے عام ذہنی اور عملی لوازمات ہیں جو آسانی سے آزاد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کچھ اچھے یہاں کی زندگی میں بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگلے دن میں نے دہلی سے ہندوستانی موسیقی کے لئے ریڈیو کھولا (ہمارے پاکستانی ریڈیو پر جو چیز موسیقی کہلاتی ہے اس میں بعض عطائی لوگوں کی چیں چاں کے علاوہ کچھ سننے میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سب اچھے موسیقار

برکت علی خاں' رفیق' پکھراج وغیرہ وغیرہ ریڈیو والوں پر حرام ہیں) تو معلوم ہے ہم نے کیا سنا۔ تم کبھی نہیں بوجھ سکوگی۔ ریڈیو پر اس زمانے کے سب سے بڑے وائلن بجانے والے Yehudi Menuhin انڈین فلم فیسٹول ہال میں Bach اور Pagannini کے نغمے بجا رہے تھے۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں سوچا تو بہت رشک بھی آیا اور غصہ بھی۔ اس ملک کو قائم ہوئے پانچ برس ہو چکے ہیں اور ان پانچ برس میں ہم نے اپنے لوگوں کے لئے حسن' تہذیب اور پاکیزہ فرحت کا کوئی بھی سامان فراہم نہیں کیا۔ اگرچہ اس دوران میں اور طرح طرح کے ''تماشے'' ہر روز برپا ہوتے ہیں۔ ہمیں صرف یہی سوجھتا ہے کہ دنیا بھر کے خالی الذہن بڑے بوڑھوں کو یک جا کریں پھر ان سے خرافات کا طومار اگلوائیں جنہیں کوئی بھی رتی بھر اہمیت نہیں دیتا۔ یا یہ کریں کہ کچھ لوگوں کو نشستن و خوردن اور گلا پھاڑنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور پھر برخاستن کے بعد یہ سب کچھ بھول جائیں۔ ہندوستان ہم سے بڑا ملک سہی لیکن کلچر یا تہذیب کا تعلق ملک کے سائز سے نہیں ہوتا۔ سوچنے اور رہنے سہنے کے آداب و اطوار سے ہوتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ اگر بہت عمدہ تہذیب برت نہیں سکتے تو کم از کم اس کے نمونے تو دیکھ سکیں۔ خیر شاید کبھی نہ کبھی ایسے دن بھی آئیں گے اور شاید مجھے اس بارے میں لکھنا بھی نہ چاہئے۔''

O O O

''یہ سن کر خوشی ہوئی کہ اب بھی ایسے لوگ باقی ہیں جنہیں ہم جیسے راندۂ درگاہ لوگوں کی صحت میں دلچسپی ہے۔ ہماری صحت' میں جس پر یہاں کے سب لوگ رشک کرتے ہیں بالکل اول درجے کی ہے البتہ اس سے تھوڑی سی تشویش ہے کہ لائل پور جیل میں جو وزن گھٹایا تھا وہ دوبارہ بڑھنے لگا ہے...... (فیض نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔) کے بارے میں سن کر رنج ہوا۔ نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی جنہیں زمانے کی شقاوت اور خود غرضی نوجوانی میں مایوسی اور ذلت کا شکار بننے پر مجبور کرتی ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کی اپنی زندگی میں بدی کا زہر گھل جاتا ہے بلکہ پھر یہی زہر ان کے ذریعے سے دوسری زندگیوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ اس کا الزام کس پر ہے اور آدمی گنا ہگار کسے ٹھہرائے؟ اس اجتماعی دکھ درد کے علاوہ جو صرف معاشرتی انقلاب ہی سے دور ہو سکتا ہے انفرادی رنج و ملال کے ایسے اسباب بھی بہت ہیں جو تھوڑی سی محبت' شفقت اور سمجھ بوجھ سے اگر دور نہیں کئے جا سکتے تو کم ضرور کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن محبت اور شفقت کی طلب میں پکارنے والے اتنے زیادہ ہیں اور دینے والے اتنے کم کہ درد جگر اور شکست دل کا مداوا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ بہر حال اس کی تلاش میں تگ و دو پھر بھی لازم ہے اور جیسا کہ تم نے لکھا ہے اپنی بھلائی اسی میں ہے کہ آدمی دوسروں سے نیکی کرتا رہے البتہ اس کے عوض میں کسی صلے یا احسان مندی کی توقع نہ رکھنی چاہئے ورنہ یقیناً مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اگر آدمی نیکی کے عوض میں نیکی کی توقع رکھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دنیا کا نظام بجائے خود نیک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوچ غلط ہے اس لئے کہ ایک نیکوکار نظام میں سبھی کو نیک ہونا چاہئے اور کسی کو خاص طور سے نیکی کرنے کے لئے زحمت اٹھانے کی ضرورت نہ ہونی چاہئے۔''

O O O

''تمہارے دو خط ملے۔ ایک آج اور دوسرا ایک دن پہلے۔ دوسرا خط پڑھ کر خاص طور سے خوشی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ تو جوان حسیناؤں کی صف سے ہمارے مداح کب کے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ ان میں تو اپنا چرچا اس زمانے میں تھا جب ہم شعر میں عاشقانہ رونا دھونا کیا کرتے تھے۔ اگر انہیں ہمارا کلام اب بھی پسند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ نئی نسل ایسی کم عقل نہیں جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔ اور انہیں بالغ زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر جذبات کا شعور بھی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم اور زیادہ خوش کن ایک عام آدمی کی رائے ہے جو تم نے بیان کی ہے۔ اس لئے کہ اپنے ذاتی سکون خاطر کے علاوہ رائے عامہ کا تعلق اس حقیقت سے بھی ہے جس سے ہمارا مستقبل وابستہ ہے۔ اس وقت یہ تعلق شاید دور کی بات معلوم ہو لیکن دراصل یہ دور کی بات نہیں' بالکل فوری اور سامنے کی حقیقت ہے اس لئے خاطر جمع رکھو۔''

O O O

''...... یہ حسن جسے زندگی کبھی کبھی بے نقاب کرتی ہے کیسی عشوہ طراز اور کیسی سیماب صفت چیز ہے اور زندگی اسے آشکار کرنے کے لئے کیسے عجیب و غریب لمحے اور کیسے عجیب و غریب مقامات انتخاب کرتی ہے بالکل ہمارے قدیمی محلوں کی کسی پردہ نشین حسینہ کی طرح۔ اور شاید اسی وجہ سے اس حسن سے لو لگائے رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے گزشتہ بار اپنی نظمیں تمہیں براہ راست نہیں بھیجیں آئندہ ایسا ہی کروں گا...... کے بارے میں تمہاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں لیکن ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا چاہئے' ان پر فوری طور سے سفید و سیاہ کا حکم لگا دینا ٹھیک نہیں۔ ان ہی صاحب کی مثال لے لو۔ وہ جیسے ہیں' ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایک زمانے میں بہت سے اچھے لکھنے والوں کو عوام سے روشناس کروانے اور انہیں روزی بہم پہنچانے میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ اور جب ان سے بہتر لوگ تحریک کا ساتھ

چھوڑ گئے تھے تو یہ اپنے ساتھ رہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں ان کا تجارتی مفاد بھی تھا اور بعض اوقات انہوں نے لوگوں کی احتیاط سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے اور اس سے تصویر کے دوسرے رخ کی نفی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے حق و ناحق کے Down Right فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے لیکن تمہیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو بھی برداشت کر لینا چاہئے جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔"

O O O

"......... میں صرف جسمانی تکلیف کا نہیں سوچ رہا ہوں اگرچہ وہ بھی اپنی جگہ صبر آزما چیز ہے مجھے زیادہ خیال اس شگفتگی اور خوش مزاجی کا ہے جو اپنے اندر ہوتی ہے اور جسے بہت زیادہ جسمانی سختی چوس لیتی ہے۔ پھر جب کلیجہ جل بھن کر کباب ہو جاتا ہے تو آدمی زندگی کے حسن و خوبی سے لطف اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ مشکل سے مشکل اور تلخ سے تلخ زندگی میں بھی لطف و انبساط کا کچھ نہ کچھ سامان بہم رہتا ہے جس سے محروی کسی طرح برداشت نہیں کرنی چاہئے۔ جب کاروبارِ کائنات بہت ہی نامنصفانہ اور غیر معتدل ہو تو کچھ نہ کچھ تلخی تو ضرور محسوس ہو گی لیکن اس تلخی کو اس سرور و تحیر پر غالب آنے نہیں دینا چاہئے جو نعمت زندگی کی عطا ہے اور جس کی وساطت سے حسن کائنات کے مخفی خزینے بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔"

O O O

"تمہارے جس دوست کی بیوی کے بارے میں تم نے پوچھا ہے ان کا مسئلہ وہی ہے جو اور ہزاروں لاکھوں کا ہے یعنی جائداد اور روپے پیسے کے جھگڑے۔ جب تک ذاتی ملکیت کا موجودہ نظام قائم ہے اس مسئلے کا کوئی قطعی حل تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہر ذاتی مسئلے کی طرح اس سے نپٹنے کی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اس سے بلند و بے نیاز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ آدمی اس کے نیچے دب کر رہ جائے۔ دوسری صورت کچھ ایسی سود مند نہیں اس لئے پہلی ہی صورت کا کوئی نسخہ برتنا چاہئے' اس کی خاطر ظاہر داری' مصلحت کوشی' لجاجت' تغافل جو کچھ بھی کرنا پڑے ٹھیک ہے تا کہ اپنے اور دوسروں کے رنج و ناخوشی میں کچھ کمی ہو سکے' یہ کوئی سیدھا اور بندھا ہوا نسخہ نہیں ہے۔ جس کسی سے جیسے بھی بن پڑے ویسے کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ بارآور زیادہ بامعنی اور زیادہ اہم چیزوں پر مرکوز رکھے جو ایک طرح سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما راستہ ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود ہی نہیں۔"

O O O

For Singing Tomorrows"

بہت حسین ترکیب ہے۔ ہاں سب کچھ آنے والے نغمہ سنج دنوں کے لئے ہے۔ آج کا دور بھی' آنسو بھی' کلفت بھی اور محرومی بھی۔ اور اگر آج کا دن موجود ہے تو کل کا دن بھی برحق ہے۔ اس طرح ہر دکھ بھرا دن جو گزرتا ہے۔ اپنی تسکین اپنے ساتھ لاتا ہے۔ یہ تسکین ساتھ لاتا ہے کہ جو دن گزر چکا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکا اور اس کے بعد جو بھی دن آئے گا اُس سے مختلف ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ اس سے بہتر ہو' اس لئے لازم یہی ہے کہ آنے والے دنوں پہ نظر جمائے رکھیں اور بیتے ہوئے دنوں کو جملہ ساکنانِ عدم کے ساتھ دفن ہو جانے دیں۔"

O O O

"اگرچہ مجھے اپنے دل میں یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ لیکن اگر ہمیں کلفت اور انتظار کے کچھ اور دن بھی بسر کرنے پڑے تو مجھے اس سے بھی قوی یقین ہے کہ اُمید اور تحمل کے سہارے ہم انہیں بھی گزار دیں گے۔ جب تک زندگی باقی ہے کسی مصیبت کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ کسی نہ کسی طرح سب نقصانات پورے ہو جاتے ہیں اور ہر دکھ درد کی تلافی ہو جاتی ہے' اہم چیز صرف اپنی زندگی اور اپنی جان ہے جو خیر تمام بھی ہے اور اُمید برحق بھی۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی باقی ہے۔"

O O O

"......... دانشمندی اسی میں ہے کہ ناگوار صورتِ حالات کا امکان بھی پیشِ نظر رہے' آئندہ کے بارے میں انسانی علم بہت محدود ہوتا ہے اور تکلیف دہ حادثات کے امکانات ہمیشہ موجود' اس لئے ہر کسی کو اس حد تک فلسفی ضرور ہونا چاہیے کہ جو بھی صورت پیش آئے اسے زیادہ ششدر یا سراسیمہ ہوئے بغیر قبول کر لے۔ ہم تو اس بارے میں بہت زیادہ فلسفی ہیں۔ اوّل یہ جانتے ہوئے کہ خیر کی ہار کبھی نہیں ہوتی اور دوم یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میں اتنی ہمت اور سمجھ بوجھ موجود ہے کہ کل جو بھی سامنے آئے گا تم اسے دلجمعی اور حوصلے سے برداشت کر لو گی۔ اصل میں تمہیں یہی کچھ کہنے کے لئے بلایا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ کہنے کی ایسی کچھ ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی خاص معاملہ نہیں جسے فوری طور پر حل کرنا ضروری ہو۔ کبھی فراغت سے سب باتیں طے کر لیں گے گھر بیٹھ کر یا جہاں بھی مقدر ہمیں ملنے کی اجازت دے۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں کہ ادھر جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے تم کوئی اور نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرو۔ یا کوئی نئے وسوسے اپنے دل میں لاؤ۔ یہاں کی صورتِ حال میں کسی نئی بات کا اضافہ نہیں ہوا۔ وہی صورت ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ یعنی امید کا ایک دودھیا بادل ہے اور اس کے ساتھ بے یقینی کی ایک سیاہ دھاری۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ اس سیاہ دھاری کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔"

O O O

"اب سے پہلے مجھے اس بات پر بڑا مان تھا کہ اپنے میں اور جو بھی عیب ہو ہم نے جان بوجھ کر کسی کے دکھ میں اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ مان بری طرح ٹوٹ چکا ہے اگرچہ اس میں بھی خطا میری نہیں۔ جیسے تم نے لکھا ہے تمہارے ابا کی علالت میں بھی زیادہ دخل اپنی بچیوں کی ناگہانی مصیبتوں پر ان کے دلی رنج و غم کو ہوگا۔ ان کے نحیف و نزار دل کو کتنا ملال ہوگا کہ ان کی دونوں بچیاں جو کہیں کالے کوسوں دور نکل گئی ہیں اپنی مصیبت میں انہیں پکار رہی ہیں لیکن وہ ان تک پہنچ نہیں سکتے۔ میں ان کا درد اپنے دل میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم بھی ایسی ہی افتاد سے دو چار ہیں۔ لیکن اول تو ان کے پاس وہ ذہنی سہارے موجود نہیں جو مجھے میسر ہیں۔ پھر ہم ایک دوسرے سے اتنے دور بھی نہیں اور اس کے علاوہ آج کل کے اندھیرے سایوں سے پرے بقیہ زندگی کا روشن راستہ بھی ہماری نظر میں ہے۔ لیکن خدا نہ کرے کہ مجھے بڑھاپے اور ضعیفی کے عالم میں کسی ایسے دکھ کا سامنا کرنا پڑے جب آدمی صرف ماضی ہی پر نگاہ دوڑا سکتا ہے اور مستقبل کا سہارا باقی نہیں رہتا۔ بہرحال جن حالات کا مداوا اپنے بس میں نہ ہو ان کی خاطر دل جلانا بے کار ہے' ہم اپنے بیچارے غمزدہ والدین کے لئے یہی کر سکتے ہیں کہ جس قدر محبت اور دلجوئی ممکن ہو سکے انہیں بہم پہنچائیں اور ان پر یہی ظاہر کریں کہ ہم زندگی سے اتنے زخم خوردہ نہیں ہیں جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور کسی نہ کسی دن ستارے موافق ہو ہی جائیں گے تو بات وہیں پہنچتی ہے جہاں سے چلی تھی یعنی یہ کہ ہم دوسروں کو رنج و خوشی برداشت کرنے میں جبھی امداد دے سکتے ہیں جب ہم اپنی ناخوشی کو قابو میں رکھیں۔ کسی دوسرے کو خوش کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی خود خوش نظر آئے یہ بعض اوقات مشکل تو ہوتا ہے لیکن کرنا ہی چاہیے۔

یہ لکھا ہی تھا کہ تمہارا خط آ گیا۔ یہ سال ختم ہونے کو ہے اور شاید ہماری آزمائش بھی۔ اس لئے دل خوش رکھو اور براؤننگ کی نظم ربی بن عذرا یاد کرو۔

"میرے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی منزل تک چلو
بہترین دن تو ابھی آگے آئیں گے"

سوال یہ نہیں کہ کونسی چیز کس چیز کے قابل ہے' کیا شہرت اس قابل ہے کہ اس کے لئے دل لہو کیا جائے یا وصال اس قابل ہے کہ اس کے لئے فراق جھیلا جائے۔ بات یہ ہے کہ اگر تن میں جان ہے اور آدمی اپنی دیانت اور خلوص باطن کے بھروسے پر سر اٹھا کر چل سکتا ہے تو زندگی میں جو بھی پیش آئے' رنج ہو یا راحت' ہر چیز اپنی اپنی جگہ اچھی ہے اور اس کا کسی اور چیز کا بدل ہونا ضروری نہیں یہ خط اس خیال سے لمبا نہیں کرنا چاہتا کہ اگر اس ہفتے کے آخر میں تمہارا آنے کا ارادہ ہے تو چلنے سے پہلے تمہیں مل جائے۔"

O O O

"اب تک بری خبر تمہیں پہنچ چکی ہوگی۔ اس سے اپنا دل زیادہ پریشان نہ ہونے دو۔ جیسے ہم نے پچھلے دو سال گزار لئے یہ بھی گزار لیں گے۔ اصل میں کوئی مصیبت اتنی بری نہیں ہوتی جیسی کہ بظاہر نظر آتی ہے اور جب گزر جائے تو بہت عجیب لگتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اتنے ہراساں کیوں تھے! ذرا سوچو تو اس نئی مصیبت کے آخر کیا معنی ہیں؟۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی مزید جدائی۔ اگر تم گرد و پیش پر نگاہ دوڑاؤ تو ہندوستان' پاکستان میں تمہیں شاید ہی کوئی نیک آدمی ایسا ملے گا جس نے برطانوی عہد میں اس سے زیادہ جیل کاٹی ہو۔ اور کسی کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ بدقسمتی سے نیکی اور نجات کی کوئی سہل راہ نہیں ہے' اس راہ میں ہم سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ کسی طرح غیر معمولی نہیں ہے۔"

O O O

"اور وہ شخص جو زندہ اور بیمار ہے لیکن اسے صحت یاب ہونے کی امید ہے اس شخص سے بہتر ہے جو زندہ اور بیمار ہے لیکن شفا سے ناامید اور پھر یہ شخص اس سے بہتر ہے جو کہ مر چکا ہے۔

"اور جو مر چکا ہے وہ تو کوئی شخص ہی نہیں اس لئے وہ نہ کسی سے بہتر ہے اور نہ بدتر اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بھی زندہ ہے وہ کسی نہ کسی سے بہتر ہے اس لئے اسے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس سے مجھے کرمانی کا وہ قصہ یاد آ گیا جس میں "دو صورتیں ہیں" کی تکرار ہے اور پھر مجھے ہنسی آ گئی۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ بہت وزنی اور سنجیدہ معاملات کے بارے میں ہمارا رویہ قطعی غیر سنجیدہ ہے' تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ہے ہی اس قدر واہیات۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ تمہارے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے اور تمہارے تھکے ہوئے کاندھوں پر لمبے عرصے کے لئے مزید بوجھ لاد دیا گیا ہے۔ لیکن اپنا دل مضبوط رکھو اور ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو تم سے کہیں زیادہ کم نصیب ہیں۔ یہ امتحان کیسا ہی سخت کیوں نہ ہو آخر گزر جائے گا۔ تم یہ سوچو کہ جس دن یہ ختم ہوگا وہ دن کیسا عمدہ ہوگا۔"

O O O

"نہ جانے تم اس نئی افتاد سے کیسے نپٹ رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ پہلے ہنگامی ردعمل کے بعد ویران اور تنہا دنوں کے طویل سلسلے کے خیال سے اپنا دل ضرور پژمردہ ہوگا لیکن ابھی تک ایسا کوئی احساس نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف جو بھی دن گزرتا ہے اپنا ذہن کچھ زیادہ باآرام' متوازن اور پرسکون معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مستقبل کے بارے میں کوئی بے یقینی باقی نہیں رہی۔ منزل مقرر ہو چکی ہے اس لئے ہر بیتے ہوئے دن سے فاصلہ ایک قدم کم رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور سے پرسوں ایک ہفتہ پورا ہو

جائے گا (سزا کی میعاد کا ایک ہفتہ) اور تین ہفتے کے بعد ایک مہینہ گزر چکا ہوگا۔ میں نے اس کا حساب یوں لگایا ہے کہ اگر کوئی رعایت نہ بھی ہو اور پوری میعاد (قید بامشقت میں عام طور سے ہر سال مشقت کے عوض چند ہفتے معاف کر دیئے جاتے ہیں' جیل کے سالانہ معائنے پر بھی کچھ رعائت ملتی ہے) کاٹنی پڑے تو بھی تیس مہینے بنتے ہیں یعنی ایک سو بیس ہفتے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرسوں صرف ایک سو انیس ہفتے باقی رہ جائیں گے اور بات ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اپنے لئے اتنا کام تجویز کر رکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا اس مختصر عرصے میں اسے پورا کیسے کریں گے' تم یہ سمجھ لو کہ ہم غلام بھیک نیرنگ کی طرح ایف آر سی ایس کرنے چلے گئے ہیں یا کسی اور دوست کی طرح ڈاکٹریٹ کا تھیسس لکھ رہے ہیں۔ یہ کام ختم ہو چکے گا تو واپس آ جائیں گے۔ ندامت صرف اس بات پر ہے کہ ہم یہاں آرام سے بیکار بیٹھے ہیں اور تم پر اپنے لیے اور بچوں کے لئے روزی حاصل کرنے کی ذمہ داری ہے جو مردوں کا کام ہے اور اچھے مرد یہ کام عورتوں پر نہیں چھوڑا کرتے۔ یہ خیال آتا ہے تو ندامت سے پسینہ آ جاتا ہے لیکن کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

O O O

"جیسے میں نے لکھا تھا میں نے تو نئے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا ہے۔ صرف تم لوگوں کی خیر و عافیت کے بارے میں کبھی دل کو پریشانی ہوتی ہے لیکن تمہاری ہمت اور بہادری کا سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس بہادری سے جسم و جاں پر کیا گزرتی ہے۔ ایسے حالات میں درد دل کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہئے اور اپنے غم کے سامنے سر جھکانے پر نادم نہ ہونا چاہیے۔ البتہ تحمل اور برداشت کے پل صراط پر قدم میں کوئی لغزش نہیں آنی چاہیے اور دنیا والوں کے سامنے سر نہیں جھکنا چاہیے۔"

O O O

"دیکھو دو ہفتے گزر بھی گئے (اب صرف ایک سو اٹھارہ باقی ہیں) اور دن بہت تیزی سے نہ سہی لیکن پھر بھی مستقل اور بدستور گزرتے جا رہے ہیں۔ تمہیں شاید کوہ پیماؤں کا قاعدہ معلوم ہو۔ وہ یہ ہے کہ اگر چڑھائی سخت اور طویل ہو تو صرف اگلے قدم کو دیکھنا چاہئے اور جس چوٹی تک پہنچنا ہے ادھر نگاہ نہ کرنی چاہئے۔ ورنہ جب تک وہاں پہنچ نہ جائیں وہ ہمیشہ اتنی دور دکھائی دے گی کہ حوصلہ ہار دینے کو جی چاہے گا۔ صرف ایک قدم اور اس کے بعد اگلے قدم پر توجہ ملحوظ رکھو تو اچنبھا ہوگا کہ فاصلہ اتنی جلد گھٹ گیا۔ اس یکسوئی کی وجہ سے خوف اور بددلی سے بھی نجات ہو جاتی ہے۔ تم نے پوچھا ہے کہ اس دوران میں عمر اور وقت اپنی جوانی اور شکل و صورت پر جو غضب ڈھائیں گے اس کا صلہ کیا ہے۔ ایک بڑی حقیقت جو میں نے یہاں دریافت کی ہے یہ ہے کہ اپنی عمر اور شکل و صورت صرف اجنبی اور بیگانہ لوگوں کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اور جس عمر میں بیگانے ادھر توجہ دینے لگتے ہیں اس عمر میں آپ بیگانوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے جیسے اجنبی دنیا سے تعلقات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اپنی نجی دنیا کے رشتے زیادہ گہرے' زیادہ مکمل اور زیادہ آسودہ ہوتے جاتے ہیں۔ جس طرح ہر روز سماجی دنیا بتدریج زیادہ بیگانہ ہوتی جاتی ہے اسی انداز سے ہر روز اپنے عزیز تر ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ محبت اور دوستی کا صرف یہی ایک سرمایہ اپنے پاس رہ جاتا ہے اور جذباتی آسودگی کے لئے اسی خزینے پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ فطرت کے نظام میں جوانی کی دولت سے محرومی کا صلہ یہی ہے کہ بیتے ہوئے دنوں سے جو کچھ ورثے میں ملتا ہے اس کا شعور اور اس کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ جب براؤننگ نے لکھا تھا کہ بڑھاپے تک میرے ساتھ چلو۔ تو یقیناً ذاتی تعلقات کی یہی گہرائی اور استواری اس کے ذہن میں ہوگی جو صرف عمر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ مجھے تو اب یہ گمان ہونے لگا ہے کہ صحیح محبت اور دوستی سن رسیدہ ہونے سے پہلے ممکن ہی نہیں۔ یہ رشتے ان ہی لوگوں کے مابین ممکن ہیں جو جوانی کے لہو و لعب کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں جب طرح طرح کے دلکش چھلاوے دامن دل کھینچتے ہیں۔ جوانی کی عاشقی تو سب مایا ہے' سب فریب نظر ہے اگرچہ ہر فریب نظر حسین بھی ہوتا ہے اس لئے قابل قدر بھی۔ شاید تمہیں ہماری عقل و حکمت پر ہنسی آ رہی ہوگی اس لئے بس کرتے ہیں۔"

O O O

"........ میں بہار کے نام ایک سلام لکھنا چاہتا ہوں اور زندگی اور امید اور محبت کے نام بھی جن کا ہر بار نیا جنم لینا ایسا ہی ابدی عمل ہے جیسا کہ خزاں کی غارت گری۔ ان دلوں کے نام بھی جو غم سے جل کر مصفا ہو جاتے ہیں اور ہر نئی کلی کے نام بھی جو بے دھڑک فنا اور نیستی کو للکارتی ہے۔ جی چاہا تھا کہ کراچی کے طلبہ کے لئے بھی کچھ لکھوں' لیکن اس خیال سے نہیں لکھا کہ شاید میں ان سے پورا انصاف نہ کر سکوں۔ یوں بھی ایسی نظم میں اسی موضوع کی تکرار ہو گی جو میں ایرانی طلبہ کے بارے میں لکھ چکا ہوں یہ میری سب سے اچھی نظموں میں سے ایک ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اپنے بچوں کو اس سے کم درجے کی چیز پیش کروں۔ شاید بعد میں کبھی کسی اور موقع پر انہیں خراج ادا کر سکوں اصل میں اب اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ اعتماد پیدا ہو جائے تو ارادہ ہے کہ پرانی رزمیہ نظموں کے پیمانے پر کوئی بڑی چیز لکھوں جس میں اپنے دور کی عظیم الشان کشمکش حیات کا بیان ہو سکے اس لئے کہ ہمارا دور شاید

تاریخ کا سب سے شجاعانہ اور ولولہ انگیز دور ہے۔ نہ جانے یہ کبھی لکھا جا سکے گا کہ نہیں۔ لیکن ارادہ ضرور ہے۔''

O O O

''ایک اور ہفتہ ختم ہونے کو ہے اور یہاں ہوا کے بوجھل پن میں اور دھوپ کی تیزی میں موسم گرما کی تاثیر پیدا ہو چلی ہے۔ گرما کو انگریزی میں **Summer** کہتے ہیں اور بہار کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن ہماری گرمیوں کو بہار کا موسم کہنا بالکل مضحکہ خیز بات ہے اور اس موسم کے خاتمے کو خزاں کہنا بھی بے تکا پن ہے۔ اصل میں بہار اور خزاں تو جذباتی اور حزنیہ الفاظ ہیں جن کا گرمی سردی سے بہت کم تعلق ہے۔ ان کا مفہوم تو ہے غم روزگار اور اس سے نجات' درد و غم کی ابتداء اور اُس کا خاتمہ' دل جلانے کے دن اور پیار کرنے کے دن' تلخی برداشت کرنے کا عزم اور سکھ کا سانس' آسائش' خوشحالی اور افلاس و محرومی' ہمارے ہاں تو بہار کا ایسا کوئی موسم نہیں آتا۔ صرف گرمی سردی کا موسم آتا ہے۔ پھر مختلف لوگوں کے لئے موسم گرما کا پیغام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ موسم قریب آئے گا تو تم اس کی آمد پر ہراساں ہوگی' لیکن میں اس کا خوشنودی خاطر سے انتظار کر رہا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں موسم کی ہر تبدیلی خوش آئند ہوتی ہے۔ کبھی کبھار کسی عزیز چہرے کے دیدار کے سوا یہاں کی زندگی میں یہی واحد تبدیلی ہے جسے ہم جانتے ہیں اس کے علاوہ موسم تبدیل ہوتا ہے تو اور بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ زمین اور آسمان اور پیڑوں کی رنگت بدل جاتی ہے' رات کو سونے کی جگہ' پڑھنے' گپ کرنے اور سونے جاگنے کے اوقات' زندگی کا روزمرہ معمول اور سوچ اور احساس کا پیرایہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور اگر کسب لطف اور حیرت نگاہ کی حس باقی ہو تو یہ سب کچھ بہت عجیب اور بہت اچھا لگتا ہے' دل کو فرحت ہوتی ہے۔

جیل خانے میں آدمی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے۔ میں ان لذتوں کا ذکر کئے جا رہا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تنہا محنت کش عورتوں کے لئے اور ہم جیسے تنگ دستوں کے بچوں کے لئے اس موسم کے کیا معنی ہیں اور ان لوگوں کے لئے کیا معنی ہیں جو ہم سے بھی زیادہ تنہا اور محتاج ہیں! اپنی مصیبت میں ان کی مصیبت بھی شامل ہے۔ اپنی تنہائی کے ساتھ ان کی تنہائی بھی لگی رہتی ہے اور دنیا بھر کی دکھی ماؤں کا دکھ اور سب فرقت زدہ بیویوں اور محبوباؤں کا درد اور سب بچوں کے آنسو جنہیں ظالم ہاتھ ان کے اپنوں کے پاس جانے سے روکتے ہیں لیکن ان کے درد کے ساتھ ان کی ہمت اور ان کا تحمل بھی اپنے ساتھ لگا رہتا ہے' یہ ایک دوسرے کی تلافی کرتے رہتے ہیں اس لئے دل ٹھوکر نہیں کھاتا۔

''تم اس بات سے رنجیدہ ہو کہ کسی نے تمہیں لارڈ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز کے جرائم کا طعنہ دیا۔ یہ واقعی بہت تکلیف دہ اور دل دکھانے والی بات ہے لیکن قومی منافرت کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شے پر محیط ہوتی ہے اور کوئی بھی شکار ہاتھ آ جائے خواہ وہ کیسا ہی معصوم اور بے گناہ کیوں نہ ہو' اسے ایذا پہنچانے سے نہیں چوکتی۔ اسی لئے ایسی منافرت اور تعصبات سے جنگ و پیکار ضروری ہے۔ اسی سبب سے ہم نفرت اور تنگ نظری کے خلاف انسان دوستی اور اخوت کی عالمگیر جدوجہد میں شامل ہیں۔ جہاں تک طعنہ زنی اور تہمت تراشی کا سوال ہے میرے اپنے ہم وطنوں میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو گزشتہ واقعات کے بعد مجھے بھی ایک خونخوار طالع آزما سمجھتے ہوں گے۔ ایسے الزامات پر مجھے اکثر ہنسی آتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ جو لوگ مجھ سے واقف ہیں ان کی نظر میں یہ تہمتیں بالکل بے معنی ہیں اور جو ناواقف ہیں ان کی رائے بالکل بے وقعت ہے۔ یہی بات تمہارے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ''جو لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں'' ان کے بارے میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو حضرت عیسیٰ کا تھا۔ صرف اخلاق کی وجہ سے نہیں بلکہ عملی مصلحت کی خاطر۔ یوں نہ کرو تو اپنا سکون و اطمینان انہی بہتان طرازوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور دنیا میں ایسے افراد کبھی کم نہیں ہوتے۔''

O O O

''آج ایک اچھا جملہ پڑھا تھا۔ کوئی ماں آسانی سے اپنا بچہ کسی کے حوالے نہیں کرتی۔ اور ہم میں سے ہر کوئی ایک بچہ اپنے دل میں لئے پھرتا ہے۔ یہ بچہ مستقبل ہے۔ صرف اپنا ہی نہیں ساری دنیا کا مستقبل۔''

O O O

''.....تم چاہو تو خواتین کے بارے میں اپنی فلسفیانہ بحث پھر سے شروع کریں۔ تم کہتی ہو کہ ہمارے فلسفے میں یہ نقص ہے کہ کج فہم لوگ اسے اپنے مقصد کے لئے مسخ کر لیتے ہیں جس سے بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر یہ لوگ ہر بات میں معقول اور نارمل ہوں تو کج فہمی یا کج روی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں سمجھانے بجھانے یا ان کی کسی طرح دستگیری کرنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یوں نہیں ہے تو کیا انہیں بالکل ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ اگر جہنم میں جاتے ہیں تو جائیں؟ مجھے تم سے اتفاق ہے کہ اپنے ذاتی آرام اور سکونِ قلب کی خاطر یہی بہتر ہے اور بیشتر دانشمند لوگ یہی کرتے ہیں لیکن ایک چھوٹی سی اقلیت ان خدائی فوجدار قسم کے لوگوں کی بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس صورت حال میں انہیں ضرور مداخلت کرنی چاہئے۔ اس خیال سے کہ شاید اس طرح کسی کی بہتری ہو جائے۔ یہ خیال عام طور سے

غلط ثابت ہوتا ہے' تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟۔
میں اپنے بارے میں بتا سکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے
کہ بہت ہی کم انسان ایسے ہوتے ہیں جو فطری اور
بنیادی طور سے بد ہوں (میں افراد کا ذکر کر رہا ہوں
اداروں یا جماعتوں کا نہیں) اور بیشتر لوگوں کی فطرت
میں مختلف تناسب سے نیکی اور بدی دونوں شامل ہوتی
ہیں۔ ابتدائے عمر میں اس امتزاج کی صورت بدلتی
رہتی ہے لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ ایک خاص
سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ تب اسے بدلنا مشکل ہو
جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے کچھ زیر وزبر ضرور کیا جا سکتا
ہے۔ عارضی طور ہی سے سہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈانٹ
ڈپٹ کرنے یا کڑکنے گرجنے سے یہ کام نہیں ہو سکتا
البتہ محبت اور دوستی موثر ہو سکتی ہے۔ کیا اس دردسر سے
کچھ حاصل بھی ہوتا ہے؟ عام طور سے نہیں ہوتا لیکن
کبھی کبھار' باید و شاید' ہوتا بھی ہے۔ بہر صورت اس
کام میں ہاتھ ڈالنے کو جی ضرور چاہتا ہے۔ شاید اپنی
نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ خود پسندی کی وجہ سے اور
حماقت یہی کہتی ہے کہ شاید تم اس قابل ہو کہ کسی کا بھلا
کر سکو خواہ جواب میں تمہیں برائی ہی کیوں نہ ملے۔
اور اگر کوئی یہ جتانے کی کوشش کرے کہ یہ محض حماقت
ہے تو ضد میں آ کر آدمی اپنی بات پر اور بھی ڈٹ جاتا
ہے اور یہ بھی خود پسندی کی ایک صورت ہے۔ غالباً تم
سمجھتی ہوگی کہ یہ سب خرافات ہے جو کہ غالباً ہے اس
لئے بحث بند۔"

O O O

"........ ہمارا جیل خانہ تو کسی اور دنیا کا ایک
گوشہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں نہ حادثات زمانہ کا گزر
ہے اور نہ زندگی کے خطرات کی آزمائش۔ یہاں نہ
زندگی کا وجود ہے نہ موت کا اور جیتے جاگتے انسان جو
ہنستے ہیں روتے ہیں پیار کرتے ہیں اور لڑتے جھگڑتے
ہیں سب کسی ضخیم افسانوی کتاب کے کردار معلوم
ہوتے ہیں جو ابھی تصنیف بھی نہیں ہوئی۔ یہ محسوس
کرنے کے لئے کہ ہم بھی زندہ ہیں اور ہم بھی زندوں
کی برادری میں اور ان کے دکھ درد میں شامل ہیں تخیل
پہ کافی زور دینا پڑتا ہے۔ لیکن شاید یہ بھی پوری طرح
صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جہاں تک جذبات کا تعلق
ہے جیل خانے میں کوئی بھی بات پوری طرح صحیح نہیں
ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ ان طویل اور بے رنگ شب و
روز میں جہاں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی اور
موت سے پرے کسی غیر مادی دنیا میں داخل ہو چکے
ہیں وہیں یکا یک ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب زندگی
سے اپنی یگانگت اور وحدت وجود کا بہت شدت سے
احساس ہوتا ہے۔ محبت اور روشنی اور مسکراہٹ کی تلاش
میں لکھو کھا دلوں' ان گنت انسانی جسموں کے درد و
شجاعت' عالی ظرفی اور کلفت و آلام سے یک جان
ہونے کا احساس۔ اور پھر وہ لمحے آتے ہیں جب غلیظ'
زرد دیواروں' دھول اور مٹی' زنجیروں' چہروں' وردیوں
اور ان سب لعنتی چیزوں پر نظر پڑتی ہے جسے جیل خانہ
کہتے ہیں تو یکا یک کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ موج در
موج کراہت اور بیزاری کا سیلاب اندر سے اٹھتا ہے
جس میں اپنی ذات اور باقی ہر چیز غرق ہو جاتی ہے۔
پھر ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ کوئی ننھا سا بیج سیاہ بوجھل
مٹی کو بہت سلیقے سے ہٹا کر ایک ننھی سی کونپل زمین
سے برآمد کرتا ہے اور اُسے دیکھ کر دل بے پناہ اور
ناقابل بیان مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے' اور تمام
وقت دل جانتا ہے کہ اسی سبز کونپل کے ننھے ہاتھوں
میں حقیقت بھی ہے اور ابدیت بھی۔ جیل کی دیواریں
اور پہرے دار اور وردیاں سب جھوٹ ہیں سب غیر حقیقی
ہیں۔ اسی صورت سے دل یہ بھی جانتا ہے کہ ہم میں
سے ہر ایک لحد میں سو جانے کے بعد بھی جینے والوں کی
ملکیت اور ان کے رنج و راحت میں دخیل رہتا ہے۔
جیل میں محرومیاں بہت ہیں۔ لیکن جینے اور ہنسنے اور
پیار کرنے کے اسباب میں یہاں بھی کمی نہیں ہوتی۔"

O O O

"........ تم نے پوچھا تھا کہ ایک نیا لباس
خریدنے کے بعد تمہیں کچھ گناہ کا احساس کیوں ہو رہا
ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا فرائڈ کے نظریے سے
کوئی تعلق ہے۔ میری رائے میں یہ احساس اس وجہ
سے ہوتا ہے کہ کہیں دیکھنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم ایام
غم میں سوگ منانے کے بجائے خوشی منا رہے ہیں اور
ہمیں بے حس یا سنگدل نہ تصور کریں۔ لیکن یوں سوچنا
بالکل احمقانہ بات ہے اس لئے کہ غم اور تکلیف ہی کا
زمانہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب خوش دلی اور بشاشت سب
سے زیادہ درکار ہوتی ہے اور دل کی ڈھارس بندھانے
کے لئے ظاہری شکل و صورت کے بناؤ سنگھار سے بہتر
کوئی چیز نہیں۔ جیل میں ہم جو فیشن پریڈ کرتے رہتے
ہیں اس کا راز یہی ہے۔ جسمانی راحت کے علاوہ اس
سے حوصلہ بھی بلند رہتا ہے۔ جہاں تک رائے عامہ کا
تعلق ہے شاید میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ روحانی
آسائش کے لئے نہ صرف اسے بھی کبھی کبھی نظر انداز
کر دینا چاہئے بلکہ اس پر کھلم کھلا لعنت بھیجنی چاہیے۔"

O O O

"یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم اور تم جیسے لاکھوں
کے لئے روزمرہ زندگی کی اس رسی پر قدم جمائے رکھنا
کتنا مشکل ہوگا جو دن بہ دن باریک اور زیادہ طویل
ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اپنا توازن قائم رکھنا تو اس لئے
لازمی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کبھی کسی دن
اسی رسی سے اتر کر ہم بھی کسی سبزہ زار پر آرام کریں
گے اور پھولوں کو کھلتے ہوئے اور بچوں کو گاتے ہوئے
دیکھیں گے۔ محنت اور سختی اور دکھ تو جب بھی ہوگا لیکن
اس کے قابل محبت اور زندگی کی آسودگی اور بارآوری
بھی ہوگی۔"

O O O

"جیسے تم نے کہا ہے اس بات سے بہت ڈھارس ہوتی ہے کہ نیکی اور دوستی کا وجود فنا نہیں ہوا اور دنیا سب ظلم و ستم کے باوجود دراصل مشفق اور مہربان ہے کیونکہ اس کی اکثریت ہمارے تمہارے جیسے حقیر غم زدہ لوگوں پر مشتمل ہے جو بدی سے نفرت کرتے ہیں اور جو تھوڑا بہت ان کے پاس ہوا سے اپنے سے زیادہ کم نصیبوں کو راحت پہنچانے کیلئے قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً اگلے ہی دن کوئی نیکی بہت بڑھیا مٹھائیوں کا ایک بڑا سا بکس میرے لئے چھوڑ گئی۔ دریافت کرنے پر صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی مس صاحبہ چھوڑ گئی ہیں اس لئے میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کس کا شکریہ ادا کروں۔ شاید تمہاری نئی سہیلیوں میں سے کوئی ہو۔ بہرحال یہ خیال جسے بھی آیا شیرینی سے زیادہ شیریں تھا۔"

O O O

"تم نے جس زور شور سے اپنے ڈانٹ ڈپٹ والے فلسفے کی حمایت کی ہے اس سے بہت لطف آیا۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا کا کاروبار اسی فلسفے کی بنیاد پر چلتا ہے اس لئے اس کی تحقیر کیسے کر سکتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی طرف سے پہلا پتھر نہ پھینک مارنے کا میرا جو فلسفہ ہے وہ تمہارے فلسفے کے مقابلے میں نسبتاً غیر اہم ہے اور اس فلسفے سے صرف شاعری پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ بڑھیا شاعری ہو۔ لیکن ڈانٹ ڈپٹ کے فلسفے کی پیروی میں بعض اوقات پیچیدہ مسائل کو سادہ بنا کر یک طرفہ فیصلے کئے جاتے ہیں جس سے مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ بعینہ میرے فلسفے کی پیروی میں سادہ مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سے بھی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اختلاف کے باوجود تمہارے فلسفے کا احترام کرتا ہوں لیکن تم میرے فلسفے پر کام کرنے کو قطعی تیار نہیں ہو۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہئے ورنہ تمہارے فلسفے کی نفی ہو جائے گی۔ لیکن ہم دونوں مجبور ہیں۔ میں گم کردہ راہوں' بد اعمالوں اور نکموں کی امداد کرنے پر ویسے ہی مجبور ہوں جیسے تم انہیں ناپسند کرنے پر مجبور ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ ان دونوں فلسفوں کے امتزاج سے کوئی جارحانہ انسان دوستی کا نظریہ تشکیل دیا جائے لیکن یہ تو ہمارے آنے کے بعد ہی ہوگا۔ جب تک ہم دونوں اپنی اپنی پسند اور ناپسند پر قائم رہیں۔"

O O O

"خیر مذاق ایک طرف' اگر سنجیدگی سے بات کریں تو تم یہ موضوع جاری رکھو' کوئی چھوٹا موٹا سکینڈل نہ صرف زندگی میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے بلکہ دل بہلانے کے لیے موضوع گفتگو بھی مہیا کرتا ہے بشرطیکہ اس میں کوئی بدمزگی کا مضمون نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی باتوں پر زیادہ توجہ دینا بے کار ہے' کم از کم میں تو نہیں دیتا۔"

O O O

"جیل خانے میں ذہنی کیفیات کے جو مختلف دور گزرتے ہیں ان کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں ان میں سب سے زیادہ ضدی کیفیت وہ ہے جسے طبی زبان میں Prison Coma کہنا چاہیے۔ ایک طرح کی خمار آلود نیم بیداری۔ جب ہر چیز کہیں دور چلی جاتی ہے اور سب کچھ غیر اہم اور بے وقعت نظر آتا ہے' جب کوئی درد باقی رہتا ہے اور نہ کوئی راحت اور عرش بریں بے آباد معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی گزر جاتی ہے جیسے اور سب کچھ گزر جاتا ہے۔ لیکن جب تک طاری رہتی ہے یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو گی اور آدمی کسی ایسے کیڑے کی طرح بن جاتا ہے جو زیر زمین بے سدھ پڑا ہو۔"

O O O

"آج کل چاند نکلتا ہے' گداز اور بادلوں سے اداس اداس اور راتیں ایسی حسین ہیں جیسے کوئی درد۔ جب شام ڈھلتی ہے تو میں اپنے عقبی دروازے کے باہر جا بیٹھتا ہوں یا جا کھڑا ہوتا ہوں۔ سامنے ہسپتال کا سبزہ زار ہے اور پرے سڑک کا کچھ حصہ نظر آتا ہے جو ڈرگ روڈ کو جاتی ہے۔ مہاجروں کی جھگیوں کا ایک جھنڈ ہے اور ایک نارنجی رنگ کے ٹیلے پر میرے سامنے ایک چھوٹا سا مینار ہے جو غالباً پانی یا گیس کی

فیض احمد فیض، ایلس فیض، سلیمہ اور منیزہ

نیکی ہے۔ جس کے دندانے دار پہلو میں ایک برہنہ
بلب جلتا رہتا ہے۔ اس سے ذرا اونچائی پر ایک اور تیز
روشنی ایک تناور درخت کے سبز سینے کو منور کرتی ہے اور
اس سے آگے کے موڑ پر ایک اور روشنی سے سڑک پر نور
کا ایک تالاب سا نظر آتا ہے۔ جس میں کبھی کبھار کسی
دوڑتی ہوئی کار اور کبھی کسی سست رو راہگیر کی جھلک لمحہ
بھر کے لیے ابھرتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ سر
پر بادل پیچ و خم کھاتے رہتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ
ان کی ہر حرکت کے ساتھ رات کا موڈ بدل جاتا ہے۔
رات کا چہرہ کبھی روشن مسکراہٹ سے کھل اٹھتا ہے اور
کبھی ابدی افسردگی سے دھندلا جاتا ہے اور میں یہ
نظارہ کرتا رہتا ہوں۔ کبھی رات کی معیت میں کبھی

Please verify

Rs 445-0-9

at his credit

14/9/53

اکیلے۔ رات سے الگ۔ اور اس میں بہت تسکین ہے
اور بہت درد ہے اور دل دونوں کے لیے احسان مند
ہوتا ہے۔ درد کے لیے بھی۔ تسکین کے لیے بھی۔ اس
لیے کہ دونوں گواہی دیتے ہیں کہ حالات کے موذی
روگ کے باوجود دل زندگی سے بہرہ ور ہے اور اس
روگ کے باوجود زندگی خوب اور صحت مند ہے۔"

O O O

"..........تم نے پوچھا ہے کہ دوسروں کی
زندگی میں دخل دینا چاہیے کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں ضرور
دینا چاہیے بشرطیکہ آدمی دیانت داری سے محسوس
کرے کہ اس سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر
نیک نتیجہ برآمد ہو تو شکریے یا احساس مندی کی توقع نہ

رکھنی چاہیے اور نتیجہ برعکس ہو تو سب الزام اپنے سر لینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میرے ساتھ ایسا کئی بار ہو چکا ہے لیکن مجھے اس کا ذرا بھی تاسف نہیں۔ اس کھیل میں ایسے ہوتا ہی ہے۔ ظاہر ہے آدمی یہ کھیل کھیلنے پر مجبور نہیں لیکن یوں دیکھیے تو آدمی اپنے سوا کسی کے لیے کچھ بھی کرنے پر مجبور نہیں اور اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔''

O O O

''آج صبح جب میں ناشتہ کرنے بیٹھا تو یکا یک بدر کی یاد آئی اور دل بلبلا اٹھا' میں بہت دیر تک کچھ افسردگی سے سوچتا رہا کہ انسانی دوستی کیسی فانی اور بے حقیقت شے ہے اور انسان کا دل کتنا ناشکرا ہے۔ بدر غالباً ہمارا واحد مخلص دوست تھا لیکن ہم نہ کبھی اس کے گھر گئے ہیں نہ کبھی اس کے بیوی بچوں کی خبر لی ہے' یوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے اور ایسے ہی ہونا چاہیے مرنے والے کیسے بھی عزیز کیوں نہ ہوں بہرحال زندگی سے لاتعلق ہیں اس لیے انہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے۔

''جو مرنے والے یاد میں زندہ ہوں کیا وہ جینے والوں کی زندگی ہی کا جز و نہیں ہوتے اس لیے کہ یاد ایسی ہی حقیقی شے ہے جیسے کوئی ذہنی تجربہ یا واقعی ملاقات' پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ مرنے والوں کی نیکی جینے والوں کی یادداشت میں ایک مثبت اور موثر عنصر کے طور سے زندہ رہے بشرطیکہ اس یاد سے جو درد وابستہ ہو اسے کسی طور سے الگ کیا جا سکے یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ جو درد موت جیسی لاعلاج چیز سے وابستہ ہو وہ بے کار اور بے مقصد شے ہے اور بے مقصد دکھ اٹھانا حوصلہ شکن بھی ہوتا ہے' غیر اخلاقی بھی۔ بہرحال کسی دن صوفی یا حسرت کو ساتھ لے کر بدر کے گھر والوں سے مل آنا۔''

O O O

''اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں' دن ڈھل رہا ہے اور چند ہی لمحوں میں دیواروں اور درختوں پر تانبے اور کانسی کے رنگ کی روشنی کی آخری کرن بجھ جائے گی۔ پھر پرندوں کی آوازیں گنگ ہو جائیں گی اور وقت ٹھہر جائے گا' جس دن بیڈمنٹن کا کھیل نہ ہو یہ کافی برا وقت ہوتا ہے' نہ اتنی روشنی موجود ہوتی ہے کہ باہر بیٹھ کر پڑھ سکیں نہ اتنا اندھیرا کہ بجلی روشن کر سکیں (ویسے یہ ہم کر بھی نہیں سکتے اس لیے کہ دن میں بجلی بند رہتی ہے اور شام میں کافی دیر سے کھلتی ہے) اس وقت اگر آنکھیں الفاظ شناخت بھی کر سکیں تو دماغ ان کے معنی وصول کرنے سے انکار کر دیتا ہے' اس وقت سوچ بچار کرنا بھی اچھا نہیں اس لیے کہ گزرے ہوئے دن کی خاموش جانکنی خیالات کو افسردگی میں رنگ دیتی ہے۔

''ہمارے ہاں اس وقت کے تعلق سے جو تصورات وابستہ ہیں اب میں انہیں زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمارے محاورے میں ''دونوں وقت ملتے ہیں۔'' دن کی پراسرار گھڑی۔ جب کنواریوں کو کھلے میں ننگے سر کھڑے ہونے سے منع کیا جاتا ہے' جب کوئی نیا کام شروع نہیں کیا جاتا' نہ کوئی مردہ دفنایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تلاوت بھی نہیں کرتے' یہ عقائد تو اس زمانے سے چلے آ رہے ہیں جب سورج ایک زندہ دیوتا مانا جاتا تھا اور اندھیرا ایک زندہ عفریت۔ اب دیوتا اور عفریت تو مر مرا چکے لیکن جان بہ لب دن کی افسردگی اب بھی حقیقت ہے جو اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک رات اس کی موت کا یقین اور اگلی صبح کی پیدائش کی امید ساتھ لیے آنہیں پہنچتی''

O O O

''منٹو کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ سب کمزوریوں کے باوجود مجھے نہایت عزیز تھے اور اس بات پر مجھے کچھ فخر بھی ہے کہ وہ امرتسر میں میرے شاگرد تھے۔ اگرچہ یہ شاگردی کچھ برائے نام ہی تھی اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی آتے ہوں۔ البتہ میرے گھر پر اکثر صحبت رہتی تھی اور چیخوف' فرائڈ اور موپساں اور نہ جانے کس کس موضوع پر گرما گرم مباحثے ہوتے تھے۔ بیس برس گزر چکے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ ہمارے شرفاء جنہیں دور حاضر کے فنکار کی شکست دل کا نہ احساس ہے نہ اس سے کوئی ہمدردی غالباً یہی کہیں گے کہ منٹو مر گیا تو اس کا اپنا قصور ہے۔ بہت پیتا تھا۔ بہت بے قاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ صحت کا ستیاناس کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ایسے ہی کیٹس نے بھی اپنے کو مار رکھا تھا۔ برنز نے بھی۔ موزارٹ نے بھی۔ اور بھی کئی نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب معاشرتی حالات کی وجہ سے فن اور زندگی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں تو دونوں میں سے ایک کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔ دوسری صورت سمجھوتہ بازی کی ہے جس میں دونوں کا کچھ حصہ قربان کرنا پڑتا ہے اور تیسری صورت ان دونوں کو یکجا کر کے جدوجہد کا مضمون پیدا کرنے کی ہے جو صرف عظیم فنکاروں کا حصہ ہے۔ منٹو عظیم نہیں تھا لیکن بہت دیانتدار بہت ہنرمند اور قطعی راست گو ضرور تھا۔ میرے خیال میں اس کا گھر تمہارے راستے ہی میں ہے گزرتے ہوئے وہاں سے ہو آنا اور میری طرف سے بہت پیار اور دلی تعزیت پہنچا دینا۔''

☆☆☆

آفتاب احمد

"لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم"

اس مضمون کے ابتدائی حصے میں جب فیض کی اس رائے کا ذکر آیا تھا کہ "عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے سامنے فرد کی ذاتی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دیتی ہیں تو ہم نے اس پر تفصیلی گفتگو فیض کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد تک اٹھا رکھی تھی۔ واقعہ یہ کہ فیض کی یہ رائے جس کا اظہار انہوں نے "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں کیا تھا 'ان کے ہاں ایک نہایت بنیادی ذہنی تبدیلی اور ان کی شاعری میں ایک نئے موڑ کی نشان دہی کرتی ہے۔ اس ذہنی تبدیلی کے زیرِ اثر فیض معاشرے میں شاعری کے مقام اور منصب اور اس کی ذمہ داری کے بارے میں جس نتیجے پر پہنچے وہ انہوں نے "دستِ صبا" کے ابتدائیے میں غالب کے ایک مشہور شعر:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

کے استعارے سے استنباط کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے:

"اگر غالب کے دجلے سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلے کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ 'اس کے بہاؤ 'اس کی ہیئت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔"

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں 'مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر 'اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔"

اسی ابتدائیے میں آگے چل کر فیض لکھتے ہیں:

"حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت 'زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔

یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اسی لیے طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش اور کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی توفیق و استطاعت پر ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا ہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔ کوشش کیسی ہی حقیر کیوں نہ ہو زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔"

فیض کے اس بیان کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر میں آپ کو یاد دلانا چاہوں گا کہ اس باب میں ہمارے بعض دوسرے بڑے شاعروں کا کیا رویہ رہا ہے۔ میر اور غالب کو ناقدریٔ زمانہ کے احساس کے باوجود اپنے شاعر ہونے پر ناز تھا۔ اس کا اظہار اپنی نظم و نثر میں انہوں نے بارہا کیا ہے۔ شاعری غالب کے نزدیک معنی آفرینی کا نام تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ "آئینہ زدن و صورت معنی نمودن کار نمایاں است۔" اس لحاظ سے وہ معاشرے میں شاعر کے ایک خاص مقام و مرتبہ کے قائل تھے۔ غالب کے بعد ہمارے ہاں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے تحت ایک ایسا دور آیا کہ جس میں ہمارے بڑے بڑے شاعر شاعری سے کچھ برکشیدہ خاطر ہو گئے اور شعر و ادب اور فن کے دوسرے مظاہر کو بے کار چیزیں سمجھنے لگے۔ حالی نے قدیم غزل گوئی سے باقاعدہ توبہ کی اور کفارہ ادا کرنے کے لیے ایک قومی نظم یعنی "مسدس" لکھی۔ اقبال بھی اسی نظریے کے قائل تھے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"

مختصر یہ کہ حالی اور اقبال شاعر تو تھے اور شاعری کو انہوں نے ترک بھی نہیں کیا مگر ان کے دل میں یہ خیال ضرور تھا کہ کارِ جہاں کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں شعر و ادب اور فن سے دلچسپی ایک سدِّ راہ کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا قوم کے لیے یہ کوئی مفید چیز نہیں۔ اس کے برعکس فیض کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فن کو کارِ جہاں کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں حائل نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک وہ اس عمل میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے چنانچہ فیض نے شاعری کو کبھی مذموم اور بے کار چیز نہیں سمجھا اور نہ اپنے شاعر ہونے پر کبھی نادم ہوئے۔ شاعری بھی ان کی نظر میں

زندگی کی عام جدوجہد میں شریک ہونے کا ایک ذریعہ تھی اور اس سے الگ ہونا ان کے لیے اپنے منصب ہی سے نہیں بلکہ خود زندگی سے فرار کے مترادف تھا۔ وہ بطور فن بھی شاعری کی اہمیت کے قائل تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے بارہا کیا ہے۔ طاہر مسعود کے انٹرویو میں ان کا یہ بیان موجود ہے کہ ''خالص رومانوی اور خالص غنائیہ شاعری کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے اس کی اپنی جمالیاتی افادیت ہے۔''

شاعر کے مقام و منصب اور اس کی ذمہ داری کے متعلق فیض کا نقطۂ نظر جس ذہنی تبدیلی کا مظہر ہے اس کے محرکات کی نسبتاً تفصیلی توضیح ایک بعد کی تحریر یعنی ''فیض از فیض'' (دستِ تہ سنگ) میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''34ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور 35ء میں میں نے ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں ملازمت کرلی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقاء صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی' پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی' مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا یہ تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کرکے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے بھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں' مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی' بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے' اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں' خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا ''نقش فریادی'' کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے' اس نظم کا عنوان ہے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ''

ادب و شعر کے بارے میں فیض کے اس نقطۂ نظر پر ان کے حامیوں اور مخالفوں میں بہت قیل وقال ہوتی رہی ہے۔ شاعر کا کام مشاہدہ ہے' اس میں تو کسی کو کلام نہیں ہو سکتا اور فیض اس کے حق میں غالب سے سند بھی لائے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجاہدہ بھی شاعر کے فرائض میں شامل کیا ہے جو اُن کا اپنا اضافہ ہے اور یہ اضافہ دراصل ترقی پسند نظریۂ ادب کا حصہ ہے جسے انہوں نے اوپر نقل شدہ بیان میں نئے دبستان کھل جانے'' کے مترادف قرار دیا ہے اور جس کی پیروی میں انہوں نے اپنی زندگی اور شاعری کو ایک نئے آدرش کے حصول کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

یوں تو فیض نے عشق و عاشقی بھی کی اور زندگی کی حسین چیزوں کا لطف بھی اٹھایا مگر اپنے آدرش کی خاطر جو راہ انہوں نے اختیار کی اس پر چلتے ہوئے جو کچھ بھی ان پر گزری اسے نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیا۔ اپنے مسلک کے بارے میں فکری سطح پر ان کے ہاں کسی قسم کے شکوک و شبہات یا کسی داخلی الجھن کا سراغ نہیں ملتا' یہاں اعتماد و یقین کا ثبات ہے' فیض کے فکر و احساس کا سفر طویل ہوتے ہوئے بھی مختصر ہے' اس لیے کہ اس میں کوئی پیچ و خم نہیں آتے۔ ایک زمانے تک وہ ایک رجائی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی ''گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج رہے۔'' ہاں آخر میں ان کے ہاں جو یاس و نومیدی نظر آنے لگی تھی تو وہ گردوپیش کے نامساعد اور ناخوشگوار حالات کا نتیجہ تھی نہ کہ آدرش پر یقین و اعتماد میں کسی کمی کا۔ اس یقین و اعتماد میں صلابتِ فکر و احساس کے علاوہ تاریخی قوتوں کے ادراک و شعور کا فیضان بھی شامل تھا۔ اسی کی بدولت ان کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو فیض کی زندگی بذاتِ خود ایک مکمل اور مربوط نظم ہے جس میں کوئی جھول نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فیض شاعر ہونے کے علاوہ پختہ عزم و ارادہ کے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ کہا ایک خاص مقصد کے تحت سوچ سمجھ کر کہا۔ اس لیے کہ وہ ایک روشن اور دنیا کے مسائل سے آگاہ دماغ بھی رکھتے تھے اور ان کا نقطۂ نظر ان کی عقل و فکر نے متعین کیا تھا مگر......

اور یہ ''مگر'' شاعر فیض کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ بنیادی طور پر مجرد خیالات کے شاعر نہیں حسیات کے شاعر تھے۔ بطور شاعر ان کی دنیا' حواس خمسہ کی دنیا تھی۔ وہ چیزوں کو محسوس کرکے جانتے اور پہچانتے تھے۔ ان کی فکر بھی ان کے رگ و پے میں پیوست ہو کے ان کے لیے جذبہ بن جاتی تھی۔ چنانچہ اپنے مسلک پر ان کا یقین اور اعتماد ان کی جوئے سخن کی ایک ایسی موج تہ نشیں ہے کہ جو صاف جھلکتی ہوئی تو نظر آتی ہے مگر جو سطح آب پر آکر کوئی طوفان نہیں اٹھاتی۔ یہ ہے دراصل نظریے کا خلاقانہ استعمال اور اسی میں فیض کے شاعرانہ کمال کا راز مضمر ہے۔

حسیاتی شاعر ہونے ہی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد اور آدرش کو ایک تصور یا ایک خواب کی شکل میں نہیں دیکھتے' بلکہ ایک خالص انسانی محبوب کی شکل میں دیکھتے ہیں اور اس سے اسی طرح کے عشق کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ایک منفرد جذبے کے شاعر ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں تاثر کا ارتکاز ہے۔ ان کے لفظ

و بیان کے خطوط اور دائرے ایک واضح نقش بناتے ہیں وہ اپنے جذبات کو گنجلک اور خلط ملط نہیں ہونے دیتے۔ ان کے ہاں کوئی نفسیاتی ٹکراؤ اور پیچیدگی بھی نہیں۔ ان کے جذبات کی بے ساختگی ہی ان کے شعر کی زود اثری کی ضامن ہے۔

فیض نے اپنی نظم ''دو عشق'' میں ایک جگہ دعویٰ کیا ہے کہ

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی

واقعہ یہ ہے کہ اگر انہوں نے اپنی زندگی میں جنوں کا کوئی فرمان واپس نہیں پھیرا تو شاعری میں بھی فن کے تقاضوں اور جمالیاتی قدروں سے بھی رُوگردانی نہیں کی بلکہ ہمیشہ ان کا احترام کیا اور انہیں عزیز جانا اور ان کے جملہ عناصر اس سادگی و پُرکاری سے اپنی شاعری میں سمودیے کہ وہ لوگ بھی جو اُن کی شاعری کے نفسِ مضمون سے ذہنی طور پر کوئی سروکار نہیں رکھتے یا طبعاً اس سے ابا کرتے ہیں' اس کی دل کشی کے قائل ہیں۔ فیض کی شاعری کی اس منفرد خصوصیت ہی کی بنا پر بعض ترقی پسند نقادوں کو ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ ان کے اسلوب و انداز میں جمال کی بہتات اور جلال کا فقدان ہے' اصل بات یہ ہے کہ فیض کے ضمن میں جمال و جلال کی بحث ہی لاحاصل ہے۔ ان کے تخلیقی عمل کی بھٹی سے مس خام بھی کندن بن کر نکلتا ہے۔ یہ نہیں کہ فیض کے ہاں جمال ہی جمال ہے مگر ان کے جلال پر بھی جمال کی گہری چوٹ پڑی ہوئی ہے۔ ان کا لہجہ سوائے چند ابتدائی نظموں کے'' جمال پرست'' شاعر کا لہجہ نہیں اس میں ایک وزن اور وقار کے ساتھ ساتھ ان کے'' شوق کی صلابت'' اور'' لہو کی حرارت'' ہر جگہ نمایاں ہے اسی لیے تو ان کی شاعری میں'' پُرسوز و نشاط انگیز'' غزل خوانی کی سی کیفیت ہے جو'' اندیشۂ دانا'' کو جنوں آمیز کرتی ہے۔

راشد اور میرا جی کی طرح شاعری فیض کے لیے محض انکشافِ ذات کا نام نہیں' ترسیل و ابلاغ کو بھی اس میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ فیض نے اس رائے کا اظہار بارہا کیا ہے' وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنا حرفِ مطلب پہنچانا چاہتے تھے' چنانچہ انہوں نے ایک ایسی طرزِ سخن ایجاد کی جو حسین اور دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ جانی پہچانی اور مانوس بھی تھی۔ فیض نئے زمانے اور تازہ و جدید فکر و احساس کے شاعر تھے مگر انہوں نے روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھا بلکہ اس کے زندہ عناصر اور قدیم اسالیب بیان سے پورا فائدہ اٹھایا اور ان میں سے بعض کو اپنی جودتِ طبع سے اپنے کلام میں ایک نئی زندگی بخش دی۔ طوق و دار' منصور و قیس' جنون و عشق' گل دامنی و کج کلہی' صحرا و گلستان' یہ رات اور بادِ سحر' جیسی علامات اور اصطلاحات ہماری ادبی روایت کا حصہ ہیں مگر فیض کے ہاں وہ نئے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔

فیض نے اگرچہ اپنے زمانے کی تلخ حقیقتوں کے بارے میں اپنے ردِ عمل اور تاثرات کا اظہار کھل کر' صاف اور واضح انداز میں بھی کیا ہے لیکن اکثر انہوں نے مروجہ علامات و استعارات سے کام لیتے ہوئے اپنے حرف و معنی کے پیکروں کو ایک خاص اسلوب سے تراشا ہے۔ اسی اختراعی صلاحیت کی بدولت وہ الفاظ کے نہایت دلفریب حسین اور اچھوتے مرکبات اور نقوش بھی تیار کرتے ہیں' ہم نے ان کے کلام کے تجزیے کے دوران بارہا دیکھا ہے کہ فیض کے ہاں یہ مرکبات اور نقوش کس کس عنوان سے آئے ہیں اور انہوں نے ہر ہر مقام پر کیا جادو جگایا ہے۔ یہ خصوصیت فیض کو اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ فیض کے لیے اس قسم کے پہلو دار اور ایمائی اندازِ سخن کا ایک مفید پہلو یہ ہے کہ جانے پہچانے اور مروجہ علامات و استعارات کے استعمال سے قاری سے ذہنی قربت حاصل کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ فیض کا کمال یہ ہے کہ وہ اظہار و بیان کے ان پرانے سانچوں میں اپنے نئے معانی و مطالب کی جان ڈال دیتے ہیں کہ ان میں معاصرانہ زندگی کے حالات و کوائف بلکہ بعض اوقات آمنے سامنے کے واقعات و واردات کی آہٹیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

فیض کے اس ایمائی اندازِ سخن کا ایک اور پہلو جس کا ضمنی طور پر ذکر ہو چکا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے آدرش کو ایک جسم و جان رکھنے والے' جمال لب و رخسار کے حامل محبوب کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس قسم کی ایمائیت کی مثال بھی اردو شاعری کی ایک جانی پہچانی روایت میں موجود ہے۔ ہمارے صوفی شعراء نے محبوبِ حقیقی کو اکثر محبوب مجازی کے رنگ میں دیکھا ہے اور اس رنگ میں اس کا ذکر کیا ہے' غزل کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ قاری کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ ان کی کون سی تفسیر پسند کرتا ہے مثلاً داغ کے اس شعر کے بارے میں آپ کیا کہیے گا:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

تصوف پسند حضرات کے لیے یہاں اشارہ محبوبِ حقیقی کی طرف ہے اور غزل پسند حضرات کے لیے محبوبِ مجازی کی طرف۔ فیض نے اس روایت کی پیروی کرتے ہوئے اپنی آدرش کو محبوب مجازی کا روپ دے دیا ہے اور پھر جس طرح اسے چاہا ہے اور جس طرح اس کی ہر ادا پر اپنے دل و جان نچھاور کیے ہیں وہ ہم صرف عشق کے جذبے ہی سے منسوب کر سکتے ہیں' نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ترقی پسند اور انقلابی

شاعری میں بھی وہ مانوسیت آ گئی ہے جو ہماری غزل کی عشقیہ شاعری میں ہے' فیض نے انقلاب کی بات بھی محبوب کی بات بنا دی ہے:

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

ذرا اس شعر کا لب و لہجہ ملاحظہ کیجیے مگر صرف اس شعر ہی میں نہیں' فیض کے ہاں عام طور پر بول چال کی زبان کا لب و لہجہ اور محاورہ' جس بے ساختگی اور سہولت سے استعمال ہوا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اردو غزل کی روایت سے کتنی گہری شناسائی تھی اور انہوں نے کس حد تک اس سے کسب فیض کیا تھا۔ یہ بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو انہیں جدید شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔

فیض کی کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' ان کے تقریباً پچاس برس کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ مسلسل حالات و کوائف کے بارے میں اپنے تاثرات کا حساس اظہار شعر کی زبان میں کرتے رہے۔ گویا وہ اپنے اس ارادے پر کاربند تھے کہ

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

جو کچھ ان کے دل پہ گزرتی رہی' وہ بھی ایک عالم ہے جس کی ہم نے ابھی مختصر سی سیر کی ہے' اگر مجھ سے اس سیر یعنی فیض کی شاعری کے بارے میں اپنا مجموعی تاثر بیان کرنے کو کہا جائے تو میں عرض کروں گا کہ محبت کا جذبہ فیض کی شاعری کا محور ہے یا یوں کہیے کہ یہ وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے ان کے فکر و احساس کی تمام شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اس جذبے کی ابتدائی صورت تو وہی "رعنائی خیال" ہے جسے غالب نے "اک شخص کے تصور" سے منسوب کیا ہے مگر یہی جذبۂ محبت جب وسعت اور بالیدگی پاتا ہے تو پھر وہ 'اک شخص کے تصور' ہی کو نہیں بلکہ حیات و کائنات کو اور دنیا میں رہنے والے انسانوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس کا اظہار فیض کی زبان سے یوں ہوا ہے۔

ویس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حسنِ آفاق جمالِ لب و رخسار کے نام

فیض کی شاعری اسی قسم کے جذبۂ محبت سے جلا پاتی اور نور و نغمہ اخذ کرتی ہے۔ ان کی انسان دوستی بلکہ انقلاب پسندی کی بنیاد بھی جذبۂ محبت ہے۔ اگر کسی کو انسانوں سے کوئی لگاؤ ہی نہ ہو تو وہ انسانوں کی حالت بدلنے کی فکر کیوں کرے۔ فیض طبعاً انسان دوست تھے اور فکری سطح پر وہ ایک ایسے سیاسی اور معاشی تصور پر یقین رکھتے تھے جس کے ذریعے ان کے خیال میں انسانوں کے لیے ایک بہتر نظام زندگی کو ترتیب دیا جا سکتا ہے' گویا ان کی ترقی پسندانہ فکر ان کی انسان دوستی ہی کی اگلی منزل تھی۔

بیسویں صدی میں ترقی پسند فکر و خیال سے مراد سوشلزم یا زیادہ واضح لفظوں میں کارل مارکس کے نظریات سے ابھرنے والی تحریک تھی۔ لینن کی سربراہی میں 1917ء کا روسی انقلاب اسی تحریک کا کارنامہ تھا۔ اس انقلاب کے بعد معاشی' سیاسی اور معاشرتی نظام کی نئی تشکیل و تعمیر کی ایک عظیم الشان تجربہ گاہ سوویت یونین کی شکل میں دنیا کے سامنے آئی۔ 1920ء کی دہائی کے آخر میں عالمگیر کساد بازاری نے رائج الوقت سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں ہلا دیں۔ 1930ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں جرمنی میں ہٹلر کی نازیت اور پھر اٹلی میں مسولینی کی فسطائیت نے سر اٹھایا 1936ء میں خانہ جنگی کے بعد سپین میں جنرل فرانکو کی آمریت قائم ہوئی۔ ان تمام واقعات نے مارکس کے نظریات کو جن میں جمہور کی طاقت اور معاشی انصاف کے تصور کو خاص اہمیت حاصل تھی' فروغ دیا اور دنیا بھر کے فکری حلقوں میں ان کا چرچا عام ہوا۔ جس طرح آج سے دو سو سال پہلے انقلاب فرانس کے تصورات نے یورپ کے فکر و خیال اور ادب و شعر کو متاثر کیا تھا اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ 1917ء کے انقلاب روس نے یورپ ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے فکر و خیال میں ایک ہل چل مچا دی۔ 1936ء کے قریب برصغیر میں ادب و شعر میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی جس نے ایک نئی قسم کی حقیقت پسندی کو جنم دیا۔ فیض جس طرح اس تحریک سے وابستہ ہوئے اس کے بارے میں "فیض از فیض" (دستِ تہِ سنگ) سے اقتباس نقل کیا جا چکا

فیض احمد فیض اور ڈاکٹر آفتاب احمد

ہے۔

ترقی پسند مجموعہ فکر و خیال کو فیض نے صرف ذہنی طور پر ہی نہیں بلکہ دل و جان سے اس طرح قبول کیا کہ اپنی زندگی اور شاعری کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ فیض کی یہ وابستگی ان کی زندگی کے آخر تک قائم رہی۔ اس کی داستان جس میں دگرگوں حالات کے باعث یاس و نومیدی کے لمحات بھی شامل تھے، ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں ترقی پسند ادب کی تحریک بطور تحریک اب ختم ہو چکی ہیں۔ اس تحریک نے اردو ادب کو جو کچھ دیا اس کا جائزہ لینے کا یہ موقعہ نہیں فقط یہ عرض کروں گا کہ فیض بلاشبہ اس تحریک کے سب سے مؤقر اور سب سے عظیم شاعر تھے۔ یہ تحریک کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فیض جیسا صاحب کمال شاعر مل گیا۔ وہ عام ترقی پسند شاعروں سے بہت مختلف تھے۔ یہ ان کی شاعری کے اسلوب سے بالکل واضح ہے۔ اس سلسلے میں ان پر اعتراضات بھی ہوئے۔ علی سردار جعفری اور بعض دوسرے ترقی پسند ادیبوں نے برملا فیض کی نظم "صبح آزادی" کے بعض حصوں پر کڑی تنقید کی اور شعری تخلیق کے اس نادر نمونے یعنی اس شعر کو۔

کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

موہوم و مبہم اور نہ جانے کیا کچھ قرار دیا۔ بہر حال فیض ترقی پسند ضرور تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ بڑے اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں انہوں نے فن کے تقاضوں سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ وہ بطور شاعر اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے جن میں ادب برائے زندگی کی ذمہ داری بھی شامل تھی، چنانچہ فیض کا آئینہ سخن ایک منفرد قسم کا آئینہ ایام ہے۔ اس میں فیض کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی حقیقتوں اور خوابوں کی جھلکیاں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ صرف اپنے وطن ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے حالات و کوائف سے فیض کے ربط و تعلق نے ان کی شاعری کو ایک بین الاقوامی جہت عطا کر دی ہے اور اسے اپنے زمانے کی پہچان بنا دیا ہے۔ یہ بات اردو کے کسی دوسرے جدید شاعر کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔

سائرہ بٹ۔ ساجدہ اقبال سید۔ فیض احمد فیض۔ بشریٰ جعفر۔ بیگم ملک محمد جعفر۔ ملک محمد جعفر۔ ڈاکٹر ایوب مرزا ڈاکٹر خالد سعید بٹ۔ مسز نصیر

پروفیسر خواجہ مسعود

فیض......روح عصر کا ترجمان

ایلس کے نام 12 جنوری 1954ء کو ایک مکتوب میں فیض لکھتے ہیں "کیٹس کا قول ہے کہ حسن صداقت ہے اور صداقت حسن، لیکن حسن اسی صورت ہی انبساط ذوق کا سامان پیدا کرتا ہے جب اس میں تخلیقیت ہو یعنی جب یہ دیکھنے والے کے جذبات و احساسات اور فکر و عمل کو حسن عطا کرے۔"

جب حسن صداقت کا نقیب ہو تو اخلاقیات و جمالیات کے مابین سب فاصلے مٹ جاتے ہیں، فن و سیاست ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور فیض کی انقلاب آفریں شاعری کا سحر زمانوں پر محیط ہو جاتا ہے۔

فیض خیال آرائی کے اس فن سے آشنا تھے جو ان کے عہد کے حسن کا تقاضا تھا۔ ان کا فن عوام الناس کی تحریک کا ایک ہتھیار ہے۔ ان کا شمار اردو کے اعلیٰ پائے کے غنائیہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی غنائیت جہاں ان کی اپنی زندگی کی کہانی ہے وہاں ہمارے مصیبت زدہ ادوار کی سرگزشت بھی ہے۔

فیض روح عصر کے سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ وہ روشنی کی جستجو میں اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے والے مفلوک الحال عوام کا ضمیر اور شعور تھے۔ اپنے حساس دل کی بدولت خیال کی بلندیوں تک جا پہنچے تھے۔ Orpheus کی طرح ہاتھوں میں بربط اٹھائے وہ دنیا کے اس وسیع و عریض جنگل میں گھومتے پھرتے جہاں ہر طرف بدنیتی اور ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ وطن کی گلیاں ہوں کہ جہاں کوئی سر اٹھا کر چلنے کی جرات نہیں کر سکتا یا بموں کا مارا جلتا ہوا بیروت، فیض ہر طرف بربط کے سر بکھیرتے پھرتے۔ ان کی شاعری اپنے دور کے کرب و نشاط کی ایسی داستاں ہے جو بے مثال ہے۔ ان کی شاعری مسحور کن اور اداس نغمگی ہے۔

ان کی شاعری پر حسن کی مہر ثبت ہے جو ایک سدابہار لطف فراہم کرتی ہے۔ فیض نہ صرف ناقابل بیان کے اظہار میں ید طولیٰ رکھتے تھے بلکہ ہر حال میں زندگی کی مسرتوں سے مالا مال دکھائی دیتے تھے جو انسان، تاریخ اور ترقی پر غیر متزلزل یقین کا اظہار ہے حتیٰ کہ انتہائی کڑے وقتوں میں وہ کہا کرتے تھے کہ

سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

فیض مارکس کے اس قول کے قائل تھے کہ "تمام فنون کا مقصد انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں ایک ایسے فن کی تخلیق ہے جو سب کیلئے انتہائی قابل فہم ہو۔ یعنی ایک انسان دوست معاشرہ اور انسان کیلئے اسکا شاہکار۔"

فیض کی تمام تر شاعری میں انسان کے المیوں کی غمگساری کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ساری عظیم ادبی تخلیقات کا طرہ امتیاز ہے۔

فیض جانتے تھے کہ ہمارے عہد میں انسان کا مقدر اپنا مفہوم سیاسی اصطلاحات میں بیان کرتا ہے اور یہ سچائی کو جھوٹ پر غالب کر دینے کی قوت کے رحم و کرم پر نہیں رہتا بلکہ سچائی کو جھوٹ کے خلاف کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے ناگزیر جدوجہد کرتا ہے۔

فیض کے نزدیک تخلیق کا عمل ایک عہد کی پاسداری ہے۔ ظالم اور مظلوم طبقات کے درمیان جاری زبردست کشمکش میں فیض آزادی، امن اور ترقی کی قوتوں کے ایک فعال کارکن کے طور پر شامل تھے لیکن اس کے ساتھ ایک فرانسیسی شاعر کے بقول "وہ اب بھی گل و ماہ اور رخ یار کے گن گاتے نہیں شرماتا۔"

دنیا کے عظیم شعراء کی مجلس میں فیض کا مقام عظیم جرمن غنائی شاعر Heinrich Heine کے انتہائی قریب ہے، جس نے کہا تھا کہ "شاعری جو مجھے میرے محبوب کی طرح عزیز ہے میرے لئے ایک الوہی تحفہ ہے۔ شہرت کبھی بھی میرے نزدیک اہم نہیں رہی اور میں نے شاذ و نادر ہی یہ پروا کی ہے کہ لوگ میرے اشعار کو سراہتے ہیں کہ نہیں بلکہ میں نے تو اپنے تابوت پر تلوار اس طرح رکھ دی ہے گویا میں نوع انسانی کی آزادی کی جنگ کا دلیر سپاہی تھا" ہمارے اس عہد میں اگر کوئی شاعر اس "تلوار" کا حقدار ہے تو وہ فیض ہے۔

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی

بیسویں صدی کا شمار دور جدید کے انتہائی تلاطم خیز ادوار میں ہوتا ہے اس میں وارفتگی کے ایسے عظیم لمحات بھی دیکھنے میں آئے کہ جب نوع انسانی نے اپنے گرد پھیلے ردعمل کے حصاروں کو توڑ پھینکا۔ ایسے دل گیر لمحات بھی آئے کہ جب فسطائیت نے قلم، کتاب اور بربط کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ جنگیں، انقلابات، رد انقلابات، نوع انسانی کی خاطر دلیری و جوانمردی کے کارہائے نمایاں، انسانیت کے خلاف لرزہ خیز جرائم، ایٹم بم، سپوتنک، انسان پس زنداں اور انسان خلاؤں میں، غرض فیض کے مستعد اعصاب نے ہر چیز کو محسوس کیا۔

انہوں نے تاریخی لمحات کو اپنی گرفت میں لے کر ان پر اپنی شاعری کا تانا بانا بنا جس سے ہمیشہ رجائیت پسندی اور امید جھلکتی دکھائی دیتی ہے جو کہ پابجولاں عوام کی آخری فتح پر ناقابل تسخیر اعتقاد کا اظہار ہے۔

Laocoon میں Lessing شعراء سے التجا کرتا ہے کہ "ہمارے لئے وہ انس، محبت اور مسرت تخلیق کرو جو حسن پیدا کرتا ہے کہ ہم خود حسن کے خالق ہیں۔" فیض کے سوا کون شاعر ہے جس نے ہمارے لئے وہ انس، محبت اور مسرت تخلیق کی ہے جو لافانی حسن کا کرشمہ ہے۔

جیمز جوائس نے شاعری کی تعریف اس طرح کی ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا اور حقیقت کی دنیا کے درمیان رابطے کا کام دیتا ہے۔ فیض نے نہ صرف خوابوں کی دنیا اور حقیقی دنیا کے درمیان وسیلے کا کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے ماضی کو حال کے ساتھ ملایا اور اس کے ساتھ ہمیں "گنگناتے ہوئے کل" کی جھلک بھی دکھائی۔

مایوسیوں اور تاریکیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں فیض کا وجود اور ان کی شاعری روشن مینار کی مانند ہے جو شکستہ دلوں کو نئے ولولے اور تازہ آدرشوں سے روشناس کراتا ہے۔ خیالات مرا نہیں کرتے۔ خواب مرجھایا نہیں کرتے اور آدرش کبھی نیست و نابود نہیں ہوتے۔

بائرن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس ایک کاغذ تھا جس میں اس نے ملٹن، ڈاکٹر جانسن، نپولین اور لکریزیا بورگیا کے بالوں کے گچھے تہہ کر رکھے تھے۔ فیض کی شخصیت میں کئی شخصیات ضم تھیں، اساتذہ انہیں اس لئے اپناتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز بطور معلم کیا۔ صحافی انہیں اپنی برادری کا فرد قرار دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی ادارت کے ذریعے اس شعبے کو ایک نئی جہت عطا کی۔ ٹریڈ یونینسٹ ان پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اس وقت پرچم بلند کیا جب کوئی اس میدان خارزار میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ فلمی فنکار انہیں اپنی دنیا کا باشندہ قرار دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اچھی فلمیں پروڈیوس کیں۔

فیض سے جب ان کے مذہب کے بارے میں پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ "میرا مذہب وہی ہے جو مولانا رومی کا ہے۔" جب ان سے مولانا رومی کے مذہب کی وضاحت کرنے کو کہا گیا تو بولے کہ "ان کا مذہب وہی تھا جو میرا ہے" پھر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح واعظان کرام مولانا رومی تک پہنچے اور ان سے ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا، ان میں سے ایک نے رومی سے پوچھا "آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے" تو رومی نے جواب دیا کہ "تمام 72 فرقوں سے" ان کے پلے کچھ نہ پڑا لیکن ان میں سے ایک نے کہا "پھر تو آپ مرتد اور کافر ٹھہرے۔" تو مولانا رومی نے برجستہ جواب دیا کہ "اگر آپ اسی پر خوش ہیں تو میں مان لیتا ہوں۔"

فیض رومی کے سچے پیروکار تھے۔ ان کی زندگی میں انہیں کمیونسٹ اور غدار قرار دے کر ان پر لعنت ملامت کی جاتی تھی لیکن آج سب ان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ انہوں نے کبھی اپنے ملک کے ساتھ دغا کی نہ اپنے دوستوں اور اصولوں کے ساتھ

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

☆☆☆

اشفاق احمد

خوش منزل لوگ

فیض صاحب کی بات کرتے ہوئے یا ان کا ذکر سنتے وقت یا ان کی اپنی باتیں پڑھتے وقت اس حقیقت کا اعتراف ضرور کرنا پڑتا ہے کہ فیض کا انجام بخیر ہوا اور ان کی عاقبت بہتر طے پا گئی اور وہ انعام یافتہ لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ حالانکہ حیران کن بات یہ ہے کہ فیصلے تو بعد میں ہونے ہیں اور حساب کتاب کے لئے تو روز جزا کا دن مقرر ہے اور اس کے لئے تو ابھی بڑی طویل مدت پڑی ہے لیکن! انسانوں کی دنیا میں کچھ خوش نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی عاقبت کے بارے میں لوگ پہلے ہی سے فیصلہ کر دیتے ہیں کہ اپنے مالک کی نگاہ میں یہ شخص مقبول ہوا اور اس کی عاقبت بہتر قرار دی گئی اور یہ خاصوں میں سے ٹھہرا۔ اس میں ایک آدھ ڈگری کی اونچ نیچ ہو سکتی ہے لیکن کیٹیگری میں فرق نہیں ہوتا۔

جن کی عاقبت کے بارے میں لوگوں نے ابھی سے فیصلہ دے دیا ان میں بلند ترین مقام ان عابدوں کا ہوتا ہے جن کی کائنات خدا شناسی سے لے کر مخلوق شناسی تک پھیلی ہوتی ہے اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن سے مخلوق خدا کسی وجہ سے خوش ہو جاتی ہے۔ خوش رہتی ہے اور پھر ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں خوش ہی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کی عاقبت زمین پر ہی طے ہو جاتی ہے اور متفقہ طور پر طے ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور لوگ متفقہ طور پر ایسا کیوں سمجھنے لگتے ہیں اس کا بھید مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا بس یہ ایک راز ہے جو ازل سے اسی طرح سے چلتا آیا ہے اور روز حساب تک اسی طرح چلتا جائے گا۔

فیض کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ وہ ایک عظیم شاعر تھا اور اس کی شاعری نے لوگوں کے دل موہ لئے تھے اور اس نے غزل کی روایت کو جدید ممبل عطا کئے تھے اور اس نے فارسی ترکیبوں کو بڑے سجاؤ کے ساتھ استعمال کیا تھا اور وہ عربی زبان کی باریکیوں سے خوب آشنا تھا تو یہ فیض کو ایک تنگنائے میں محدود کرنا ہوا۔ کیونکہ یہ بات بلکہ یہ ساری باتیں تو اور شاعروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہیں بلکہ ان شاعروں کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر کہی جا سکتی ہیں مگر وہ ان ساری خوبیوں اور اپنی ان جملہ صلاحیتوں کے باوجود فیض نہ بن سکے اور اس مقام کے قریب بھی نہ پہنچ سکے جہاں سے فیض نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔

پھر فیض کو ایک بہت ہی پیارا، متحمل، من موہنا، خوش ادا، متحمل اور صاحب برداشت شخص گردان کے اس کی سوبھا کرنا اور اس کی عظمت کو محض اس کی برداشت کے ساتھ وابستہ کرنا بھی کوئی وزنی دلیل نہیں۔ فیض کے اپنے شہر بلکہ اس کے اپنے گاؤں میں بے شمار لوگ اس کے مزاج اور اس کی طبیعت اور اس جیسی برداشت کے تھے۔ اس وقت بھی تھے اور اب بھی ہیں لیکن وہ فیض نہ ہو سکے نہ کبھی ہو سکیں گے۔ یا پھر یہ سمجھنا کہ وہ بہت کمال کے ایڈیٹوریل رائٹر تھے اس لئے صاحب کمال تھے۔ تو میں اسے فیض کی توہین سمجھوں گا کیونکہ ان جیسے بلکہ ان سے بہتر سینکڑوں ہزاروں ایڈیٹوریل رائٹر اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن ہم ان کو فیض جیسا مان نہیں دیتے۔ نہ ہی وہ اس کے مستحق ہیں۔

یا پھر یہ کہنا کہ فیض چونکہ ایک انقلابی تھے اور غریبوں اور کمپرسوں کے شاعر تھے اس لئے ایک بہت بڑے شاعر تھے اور لوگ اس وجہ سے ان سے محبت کرتے تھے کہ وہ محروموں کے ترجمان اور بے نواؤں کی نوا تھے تو یہ بات بھی نہیں ہے۔ ان سے بہت بڑے سوشلسٹ اور ان سے بہت زیادہ نامی گرامی انقلابی بھی اس صدی میں ان کے ارد گرد سے ہو گزرے لیکن ان کو فیض کا رتبہ نہ مل سکا۔

آپ فیض کی شاعری کا یا فیض کی شخصیت کا جتنا بھی تجزیہ کریں گے اور اپنی دانش کے زور پر اس کے فن کی جتنی بھی جزئیات بیان کریں گے وہ فیض کے فیض ہونے کی وجوہ نہیں ہوں گی کیونکہ فیض کوئی عام انسان یا معمولی چیز نہیں ہے اور خاص کو بلکہ خاص الخاص کو عام پیمانوں سے اور چالو معیاروں سے جانچا نہیں کرتے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جب کسی خاص معاشرے میں کسی خاص وقت کے اندر کچھ خاص تقاضوں کے تحت فیض جیسی توجہ طلب شخصیت اور فیض

جیسا شہیر انسان مر جائے اور لوگ اس کو ایک فنومنن (Phenomenon) سمجھنے لگیں تو پھر فیض کا تجزیہ چھوڑ کر خالق فیض کا مطالعہ کرنا چاہیے جو کچھ سے کچھ اور کیا سے کیا اور کس کو کون بنا دیتا ہے اور پھر اس کون کو بغیر کسی محنت یا کوشش کے لوگوں کے دلوں پر حکمران بنا دیتا ہے۔ اور دلوں کے سنگھاسن پر بیٹھنے والے کو خوب عطا کرتا ہے اور بغیر حساب عطا کرتا ہے۔ اور پھر جس کو وہ عزت عطا فرما دیتا ہے تو اس کے خلاف سینکڑوں ایڈیٹوریل۔ ہزاروں ایڈیٹوریل نوٹس۔ لاتعداد کالم۔ بے شمار تقریریں۔ چھوٹے بڑے بھونپو۔ پٹاخے۔ جلسہ النفیاں اور سٹیج پٹخنیاں اس کی عزت کے خزانوں میں سے ایک رائی کے دانے کے برابر کمی نہیں کر سکتیں۔

جس کی عاقبت ابھی سے اچھی کر دی گئی اور جس کی اچھی عاقبت کے لئے لوگوں کی محبت اور عقیدت کی نشانی فراہم کر دی گئی تو ہم ایسے کم مایہ لوگ اس کی شخصیت پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ اسے ایک فنکار سمجھ کر اس کے فن کے حواس خمسہ بیان کر سکتے ہیں یا اس کو ایک اچھا انسان ایک اچھا دوست ایک اچھا باپ یا ایک اچھا مرید کہہ کر اپنی ذمہ داری کا بوجھ "اچھائی" کے کندھے پر ڈال کر سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ ہلکے پھلکے محسوس کر سکتے ہیں...... لیکن فیض کوئی معمولی چیز تو نہیں یہ تو عطائے ربانی کا ایک جیتا جاگتا مظہر ہے۔ ایسے شخص کے سامنے خاموش اور ایسے شخص کے ساتھ مؤدب ہو جانا چاہیے۔ کچھ اس کی اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس عطائے خاص کی وجہ سے جو اس کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اس وقت فیض کی شاعری، اس کی شخصیت یا اس کی انسان دوستی کا تجزیہ کرنے کی کم از کم میری کوئی خواہش نہیں۔ میری آرزو تو اب اچھی عاقبت والوں کی اردل میں چلنے کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ فیض بھی اس عہد کی اچھی عاقبت پانے والوں میں سے ایک ہیں۔

☆☆☆

فیض احمد فیض دورہ چین کے بعد ادیبوں کے ہمراہ

ڈاکٹر شارب ردولوی

فیض کی شعری جہات' تعین قدر کا مسئلہ

فیض کی شاعری بظاہر کتنی ہی سادہ کیوں نہ ہو اس کے اندر اتنی زیریں لہریں اور اتنی جہتیں پوشیدہ ہیں کہ ان کے تعین قدر کا مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا وہ ظاہر میں نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ فیض کا کلام ایسے قاری کے ذہن میں کئی سوال چھوڑ جاتا ہے جو اپنی ذہنی تسکین کے لیے صوت و آہنگ کے علاوہ بھی کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے عہد کی تنقید کا یہ عام رویہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں رومانویت یا انقلاب پسندی' یا اس کی غزل گوئی اور نظم گوئی کی صفات اور خصوصیات کے پیش نظر یا پھر سماجی پس منظر اور لسانیات وصوتیات کے زیر اثر اس کے کلام کی اہمیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ فیض کے ناقدین نے بھی ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مطالعے کے یہ طریقے غلط ہیں۔ مطالعے کے ان پہلوؤں کی اپنی ایک افادیت ہے اور ان کے ذریعے شاعر کی شخصیت اور کلام کے بعض دلچسپ پہلو سامنے آئے ہیں لیکن ان سے مجموعی قدر اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔ اس کے علاوہ اس طرح کے تجزیے اوسط درجے کے شاعر کو سمجھنے کے لیے تو کافی ہو سکتے ہیں لیکن اگر کوئی عہد ساز شخصیت ہے تو یہ مطالعے تشنگی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔ فیض اسی طرح کی ایک عہد ساز شخصیت ہیں جن کے کلام کی قدروں کا تعین آسان نہیں۔ ان کی تہہ داری کی وجہ سے ہر بار یہی احساس ہوتا ہے کہ ابھی کہنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے۔

مطالعہ فیض کے سلسلے میں عام طور پر دو باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اول ان کی رومانویت' یعنی بنیادی طور پر وہ رومانی شاعر ہیں' ''لطف وصل''، ''درد فراق''، ''حسرت دید'' اور ''عشق شمشاد قداں'' کو اپنے نرم و مدھم لہجے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں اور اس طرح وہ ذہن و دل پر اپنا ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی انقلاب پسندی اور مقصدیت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جسے ان کی کامیابی اور شہرت کا بڑا عنصر قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں جنہیں مختلف انداز میں فیض کی سب سے بڑی مقبولیت اور شاعرانہ خصوصیت کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل اُس عہد کا مخصوص رجحان ہیں جس سے فیض کا تعلق ہے۔ فیض کی شاعری کے ابتدائی زمانے کو اگر دیکھیں تو اس پر رومانویت کا غلبہ نظر آئے گا۔ اس سے الگ کہ اردو کی غالب صنف شاعری غزل کا مزاج ہی رومانی ہے جس کے اثر سے نکل پانا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر شاعر خواہ وہ بعد میں کتنے ہی بڑے انقلابی شاعر کیوں نہ قرار پائے ہوں پہلے رومانی شاعر ہی کی حیثیت سے اُبھرے۔ اس بات کے تجزیے سے ایک اور دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس زمانے کے انقلابی اور باغی شاعروں کے لب ولہجے کے رومانی ہونے کا راز یہی ہے۔

اس دور میں کسی کے یہاں اگر شعری جمالیات کی ڈور ڈھیلی پڑ گئی تو اس کے نتیجے میں تخلیق صرف وقتی نعرہ بن کر رہ گئی' لیکن کسی نے تہذیب رسم عاشقی بدل جانے کے بعد صرف الفاظ بدل کر اشارات سے وہی کام لے لیا۔ مطالعہ فیض کے وقت پہلا سوالیہ نشان یہی سامنے آتا ہے کہ انسانیت اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے ترانے بہت سے شاعروں نے گائے ہیں' عشق و محبت کی خوبصورت زبان میں محبوب کے خدوخال کی تعریف اور ہجر و وصال کے قصے بہت سے لوگوں نے نظم کیے ہیں اور یہ باتیں اس عہد کے ذہنی و فکری مطالبات میں داخل تھیں اس لیے کچھ نہ کچھ اس کے اثرات اس وقت کے بیشتر شعراء کے یہاں مل جاتے ہیں پھر فیض ان میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ کیوں نظر آتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ فیض کی بڑائی اور خوبی اس میں ہے کہ انہوں نے رومانویت اور کلاسیکیت کو ایک کر دیا ہے۔ اس بات کو شاید کچھ زیادہ ہی اہمیت دی گئی ہے اس لیے اس پہلو پر توجہ کی ضرورت ہے۔ یعنی کیا اصطلاحی معنوں میں فیض کلاسیکی شاعر ہیں یا ان کے یہاں کلاسیکیت ہے؟ کیا روایت اور وراثت میں ملنے والے الفاظ کا استعمال کسی شاعری کو کلاسیکی بناتا ہے؟ کلاسیکیت ایک مزاج اور اس سے زیادہ ایک فنی ضابطہ ہے۔ یہ مزاج اور فنی ضابطہ کسی عہد یا دور کا ہوا کرتا ہے۔ کسی شخص کا محاورتاً

کلاسیکی حیثیت اختیار کر لینا اصطلاح کا استعاراتی استعمال ہے۔ اس پر اصطلاحی معانی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس روشنی میں اگر کلام فیضؔ کو دیکھیں تو ان کے یہاں کلاسیکیت تو نہیں کلاسیکی تہذیب کے اثرات لفظیات کی شکل میں ضرور نظر آئیں گے لیکن ان کا استعمال کلاسیکی معنی اور مفاہیم کے بجائے کچھ اور ہی معنی دیتا ہے۔ یہاں پر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فیضؔ کے یہاں اگر کلاسیکیت نہیں ہے تو ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی کے سرچشمے کیا ہیں اور ان کی وجہ امتیاز کیا ہے؟

یہ سوالات فیضؔ کے مطالعے اور تعین قدر کے موقع پر بھی کئی سوالات پیدا کرتے ہیں مثلاً بڑے شاعر کی خوبیوں کی بنیاد کیا ہے؟ کیا جمالیاتی قدریں، نفسیاتی دروں بینی، لاشعور اور تحت الشعور کی پیچیدگیاں، رومانیت یا رومانویت، جذباتیت، اظہار کی قوت، زندگی کے بارے میں ایک مخصوص رویہ یا commitment اسے بڑا شاعر بناتا ہے یا اسی طرح کچھ اور بھی چیزیں ہوسکتی ہیں۔ شاعر کی بڑائی کا تصور اس میں سے ایک یا کئی چیزوں سے وابستہ ہوسکتا ہے۔ دراصل کسی بڑے شاعر کے یہاں جتنی جہات ہوں گی مطالعے میں اتنے ہی گونا گوں پہلو سامنے آئیں گے۔ غالبؔ میرؔ اور اقبالؔ کی تفسیر و تعبیر سے آج تک نہ کوئی تھکا اور نہ کسی کو اکتاہٹ کا احساس ہوا اس لیے کہ ہر بار ان کے کلام نے ایک نیا انکشاف کیا اسی طرح فیضؔ کو بھی جتنی بار پڑھا جائے ان کی شاعری کا کوئی نہ کوئی پہلو سامنے آجاتا ہے۔

فیضؔ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے کلام میں لفظ کا تخلیقی استعمال ہے۔ الفاظ کو نظم کردینا، خیال، محسوسات، تجربات اور مشاہدات کو خوبصورت پیرائے یا مترنم انداز میں پیش کردینا الگ بات ہے۔ ہر عہد میں شعراء اپنے جذبات اور محسوسات کو پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک عام شاعر لفظ کو اس کے معنی اور لغت کی حدود میں نظم کرتا ہے۔ اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ بات، زبان اور محاورے کے خلاف نہ ہو لیکن ایک عہد ساز شاعر کے یہاں لفظ لغت کے دائرے سے نکل کر ایک وسیع دنیا بن جاتا ہے۔ اس کے یہاں الفاظ اور استعارات کے معنی اس کے تخلیقی استعمال سے متعین ہوتے ہیں مرزا بیدلؔ نے کہا ہے۔

زبان درد دل آسان نمی تواں فہمید
شکستہ اند بصد رنگ شیشہ مارا

درد کی زبان کو آسان نہ سمجھنا۔ میرے شیشے کے ٹوٹ جانے سے اس میں سینکڑوں رنگ پیدا ہوگئے ہیں۔ اردو میں میرؔ اور غالبؔ کے اشعار اپنے خیال کی وسعت اور لامحدود معنویت کی بہترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح فیضؔ کے یہاں لفظ کے تخلیقی استعمال نے شعر میں بیدلؔ کے شکستہ شیشے کی طرح انگنت رنگ بھر دیئے ہیں اور نہ جانے کتنی جہتیں پیدا کردی ہیں کہ عام الفاظ سے ترتیب پایا ہوا شعر اپنی معنوی تہہ داری کی وجہ سے نئے لطف کا حامل بن جاتا ہے۔

غمِ جہاں ہو رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

جیسے ہم بزم ہیں پھر یارِ طرح دار سے ہم
رات ملتے رہے اپنے در و دیوار سے ہم
سرخوشی میں یونہی دل شاد و غزل خواں گذرے
کوئے قاتل سے کبھی کوچہ دلدار سے ہم

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند، سرِ عرش خدا ہے

لفظ مختلف معنوی تہوں کے ساتھ نفسیاتی اور جذباتی تہیں بھی رکھتا ہے اس کے علاوہ الفاظ کا ڈھانچہ اس کے محل استعمال سے اس کی اثر آفرینی کا تعین کرتا ہے لیکن لفظ کے تخلیقی استعمال کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں میں ایک نئی چمک کے ساتھ زمانے، تاریخ اور جغرافیائی حدود سے نکل کر بھی اپنی **relevance** باقی رکھتا ہے اور یہی خوبی شاعر کو آفاقیت عطا کرتی ہے۔ فیضؔ نے جو سخن بھی رقم کیے اور ان کے لیے جن الفاظ کا استعمال کیا ان کی معنوی وسعت اور تہہ داری سے کوئی انکار نہیں کر سکتا خواہ وہ اس طرح کے سادہ شعر ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ سخن جو ہم نے رقم کیے یہ ہیں سب ورق تیری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا کئی شام ہجر کی مدتیں

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی وہ وقارِ دستِ دعا گیا

جس دھجی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علم ہے

فیضؔ نئی تراکیب و تشبیہات گھڑنے کے بجائے بالعموم عام روایتی اور مروجہ تراکیب و تشبیہات اور علامتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر وہ تراکیب و تشبیہات ہیں جو استعمال کی یکسانیت کی وجہ سے اپنا کیف، تاثر اور اہمیت کھو چکی تھیں اور جنہیں

پڑھ کر قدامت پسندی کا احساس ہوتا تھا لیکن فیضؔ نے ان تمام الفاظ و تراکیب اور تشبیہات کا منظر نامہ ہی بدل دیا یعنی الفاظ تو وہی رہے لیکن فیضؔ کے یہاں وہ ایک نئے معنی اور نئی حیثیت کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً ان کی دو غزلوں کے یہ چند اشعار پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِکوئے دل فگاراں شبِ آرزو کا عالم
یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہ گذر میں گذراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

اور دوسری غزل کے چند اشعار یہ ہیں ۔

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے
پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتہ کیوں نہیں دیتے
بربادیِ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

یہ دونوں غزلیں بظاہر عام عشقیہ غزلیں ہیں جس کا سارا لفظیاتی نظام اردو کی روایتی عشقیہ شاعری سے مستعار ہے۔ اس میں تقریباً ساری تراکیب وہی ہیں جو اردو شاعری میں برابر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ چارۂ غم' نجاتِ دل' دستِ عیسیٰ' قیامت' رہ گذر' مرمٹنا' شبِ آرزو' حشر' کوئے دلفگاراں' نغمہ گرو' پیمانِ جنوں' گریباں' بربادیِ دل' دشمنِ جاں وغیرہ وغیرہ۔ یہ اشعار اپنے محدود عشقیہ معنی میں بھی پُرتاثیر ہیں اور اچھے اشعار میں شمار کیے جائیں گے لیکن صرف یہ خوبی ان اشعار کی بڑائی یا دلکشی کا سبب نہیں ہے۔ یہ اشعار فیضؔ نے لاہور جیل میں لکھے تھے۔ اس حقیقت کے اظہار کے بعد اب ایک بار پھر ان اشعار کو پڑھیے اب وہی رومانوی ترکیبیں اور وہی تمام روایتی الفاظ ایک نئی معنویت کا انکشاف کرتے ہوئے محسوس ہوں گے یہ بات آسان نہیں یہ صرف الفاظ کا نبض شناس اور تراکیب کا مزاج داں ہی کر سکتا ہے۔ فیضؔ کی شعری جہتوں کے مطالعے اور اقدار کے تعین کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔

فیضؔ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کا استعارے کا استعمال ہے۔ فیضؔ نے عام طور پر تشبیہ سے کم اور استعارے سے زیادہ کام لیا ہے جو ان کی ذہانت اور شدتِ احساس کی نشاندہی کرتا ہے۔ تشبیہ خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو وہ اپنے معنی یا مفہوم میں مثال سے آگے نہیں بڑھتی لیکن استعارے میں معنوی تہہ داری اور اشاراتی پہلو پنہاں ہوتے ہیں۔ فیضؔ کی خوبی یہ ہے کہ وہ پرانے روایتی الفاظ سے نئے استعارے تخلیق کرتے ہیں اور ان استعارات سے دہرا تاثر پیدا کرتے ہیں یعنی ایک طرف وہ تلازمات ذہن کو اس قدیم عظمت کی طرف لے جاتے ہیں جو تقریباً فراموش ہو چکی تھی اور جو از کار رفتہ محسوس ہونے لگی تھی دوسری طرف وہ نئے ماحول' نئے مشاہدات اور زندگی کی نئی کشاکش سے اسے وابستہ کر دیتے ہیں۔

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

بہت ملا نہ ملا زندگی سے غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے
جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
دراز دستیِ پیرِ مغاں کی نذر ہوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے
خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اتر جائے

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

مطالعۂ فیضؔ کے سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ فیضؔ کو ادبی وراثت میں جو غزل ملی تھی اس میں ایک طرف دردؔ' داغؔ اور اقبالؔ تھے اور دوسری طرف غالبؔ' سوداؔ اور میرؔ۔ خود فیضؔ کے ابتدائی عہد میں جس طرح کی غزلیں لکھی جا رہی تھیں اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس میں کہیں کہیں تبدیلیوں کے آثار تو نظر آنے لگے تھے لیکن داغؔ کی زبان کے چٹخارے اور معاملہ بندی کی روش عام تھی۔ اقبالؔ نے اسے جلال آشنا ضرور کیا لیکن یہی سسکیاں لیتی ہوئی غزل ترقی پسندی کا ہدفِ ملامت بنی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ فراقؔ' جذبیؔ' مجازؔ اور مجروحؔ کے نام ضرور لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے غزل میں نئے لب و

لہجے اور نئی روش کی توسیع کی۔ اس سلسلے میں فیض کا سب سے بڑا contribution یہ ہے کہ انہوں نے غزل کی مروجہ شعریات کو توڑا اور اپنی نرم لے کے باوجود اسے روایات کی گھٹن سے نکال کر زندگی کی تازگی، فرحت اور دلکشی سے آشنا کیا لیکن ابھی ان کے اس contribution کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنا مشکل ہے اس لیے کہ جو فنکار اپنے عہد کے مروجہ اصولوں کو توڑتا یا اس سے بغاوت کرتا ہے اس کی صحیح قدر کا تعین خود اس کے عہد میں مشکل ہوتا ہے۔ اس پودے کی کونپلیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ خود نکلتی آتی ہیں اور نئے نئے گوشے روشنی آشنا ہوتے جاتے ہیں۔

فیض کی شاعری کی ایک مخصوص جہت زندگی کو زیادہ خوبصورت اور دلکش، دنیا کو پُر امن اور پُر مسرت، بنی نوع انسان کو خوف، جنگ اور ظلم سے بے نیاز دیکھنے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش فیض کے یہاں اس قدر شدید ہے کہ شاید ان کے تمام جذبوں پر حاوی ہے۔ یہی ان کی محبت ہے، یہی ان کا عشق ہے، یہی ان کی زندگی اور یہی ان کا درد ہے۔ فیض کی کوئی نظم ہو یا کوئی غزل انسانی جذبے اور انسانیت کا ایک وسیع تصور ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا نظریہ یا commitment ان کے انداز بیان اور ان کے جمالیاتی یا اشاراتی نظام میں حارج نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ خواہ وہ کتنا ہی تلخ، کتنا ہی بدمزہ، کتنا ہی دل ہلا دینے والا کیوں نہ ہو اسی طرح نرم اور اثر انگیز لفظوں میں نظم کر دیتے ہیں جو دلوں میں اتر جاتا ہے۔ ان کے یہاں ہر جگہ زندگی کی ایک نئی امنگ نئے جذبے اور امید کی نئی کرن نظر آتی ہے۔ یہاں پر ان کی بہت سی نظموں کے حوالے دیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ''ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لیے'' ''سر وادیِ سینا''، ''سوچنے دو''، ''دل من مسافر من''، ''تم ہی کہو کیا کرنا ہے''، ''لہو کا سراغ'' وغیرہ لیکن اس سلسلے میں ان کی ناقابل فراموش نظم ''فلسطینی بچے کی لوری'' ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے۔
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے...

اور اس طرح نظم کو ختم کیا ہے:

مت رو بچے
امی ابا باجی بھائی
چاند اور سورج
رو ئے گا تو اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے۔

فیض کی سیاسی یا موضوعاتی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی جگہ شعر کی جمالیاتی قدروں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہ نظریاتی نظمیں اور اشعار بھی اسی نرمی اور گھلاوٹ سے لکھتے ہیں کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ پاتے۔

فیض کی شعری جہات کا ذکر اس بات کے بغیر نامکمل ہے کہ انہوں نے نظم اور غزل کو کیفیت و اثر آفرینی اور زبان و استعارات کی حد تک قریب لانے کی کوشش کی یا نظم میں غزل کی رعنائی اور دلکشی پیدا کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے یہاں نظم اور غزل کا فرق نہیں ہے لیکن اس فرق کے باوجود ان کی بیشتر نظموں میں وہی جمال اور لطیف آہنگ ہے جو ان کی غزلوں کی خصوصیت ہے۔ یہ بات بعض حضرات کو شاید پسند نہ آئے یا وہ اس میں غزل کی کسی طرح کی برتری محسوس کریں اس لیے کہ بعض لوگوں کے خیال میں نظم پر غزل کے آہنگ کا اثر کوئی مستحسن بات نہیں ہے۔ میں بھی نظم اور غزل میں ایک حد فاصل کو ضروری سمجھتا ہوں اور یہ حد فاصل فیض کی نظموں میں موجود ہے لیکن فیض نے اسے دوسری طرح برتا ہے جس کی وضاحت میں دو طرح سے کرنا چاہتا ہوں۔

اوّل یہ کہ فیض نے غزل کی لفظیات اور رومانویت کو اثر آفرینی اور دلوں میں اتر جانے کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں رومانوی الفاظ و تراکیب کے استعمال کا مقصد بیان عشق و محبت نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک پردہ ہے جو شعری کیف و تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح وہ پُر شور الفاظ بھی استعمال کر سکتے تھے لیکن وقتی تاثر کی بجائے وہ دیرپا اثر پیدا کرنا چاہتے تھے اور کسی مخصوص واقعے، سانحے یا تجربے کو وقت اور مقام کی حدود سے بلند رکھنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے شمشیر و سناں کے بجائے برگ گل سے کام لیا اور یہ فیض کا بہت بڑا اجتہاد ہے۔

دوسرے فیض کے یہاں ایک مخصوص شعری تہذیب ہے یہ شعری تہذیب ہر عہد ساز شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ میر، غالب اور اقبال کی عظمت میں ان کے شعری کلچر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ فیض کی بھی اپنی شعری تہذیب ہے جو ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہی نہیں بلکہ لہو کی طرح موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کہیں کوئی کھردرا پن، کسی طرح کی تلخ نوائی یا جھنجھلاہٹ نظر نہیں آتی اور یہی وجہ ہے کہ بعض جگہوں پر ان کی نظم کی زبان اور غزل کی زبان میں فرق باقی نہیں رہا ہے مثلاً یہ بند ملاحظہ ہوں۔

چشم نم جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں

Phone : 225098

HAJI ABDULLAH HAROON COLLEGE

Shah Abdullah Road, Khadda, Karachi

(ماہنامہ "ماہ نو" کے فیض نمبر کیلئے)

آج بازار میں پابہ جولاں چلو
دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو خوں بہ داماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

نہ دست و ناخن قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لب خنجر نہ رنگ نوک سناں
نہ خاک پر کوئی دھبہ نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطف وصل و درد فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں

ان کے علاوہ ان کی نظم "درد آئے گا دبے پاؤں"، "دل من مسافر من"، "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" یا اور دوسری بہت سی نظمیں اس طرح کی مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں جہاں نظم اپنے آہنگ اور اثر انگیزی میں غزل سے آگے بڑھ گئی ہے۔

فیض کی مشہور نظم "یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر" کے سیاسی پس منظر سے سب ہی واقف ہیں جسے یہاں دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظم فیض کی حسن کاری اور اظہار پر قدرت کی بہت اچھی مثال ہے۔ جس میں ایک وقتی اور ہنگامی موضوع، تاثر یا جذبے کو اس طرح کے الفاظ اور استعارات میں پیش کیا گیا ہے کہ وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہو کر لازوال ہو گیا ہے۔ 38 سال بعد بھی یہ نظم اتنی ہی relevent اتنی ہی پُر تاثیر اور اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی اُن حالات میں تھی۔ اس لیے کہ فیض نے ایک وقتی موضوع کو زندگی کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے اور زندگی کا کارواں نت نئی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کے ساتھ اسی طرح چلتا رہے گا اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کی خواہش جنم لیتی رہے گی اور انسان صدیوں بعد بھی یہی سوچے گا کہ

کہاں سے آئی نگارِ سحر کدھر کو گئی
ابھی چراغ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو، کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

منزل کب آتی ہے۔ ہر منزل ایک اور منزل کا پتہ دیتی ہے اور یہی زندگی کی علامت ہے اور اسی زندگی کی علامت کے شاعر کا نام فیض ہے جو زندگی ہی کی طرح سادہ بھی ہے، طرح دار اور تہہ دار بھی، اسی لیے فیض کے تعین قدر کے موقع پر ان تمام تہہ داریوں، جہتوں اور ان کی شاعری میں پوشیدہ زیریں لہروں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے ورنہ جو نتیجہ نکالا جائے گا وہ تشنہ اور یک رُخا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

وزیر آغا

غالب اور فیض

بظاہر غالب اور فیض میں بعد القطبین ہے۔ اس بات کا اولین احساس دونوں کے تخلص کے فرق سے ہوتا ہے۔ شعروں کا انتخاب اگر شخصیت کی رسوائی کا موجب ہے تو تخلص کا چناؤ بھی شخصیت کی تشہیر ہی کا باعث ہے مثلاً غالب کا لفظ غالب کی انا یا کم سے کم شخصیت کے اثبات کی کوشش پر دال ہے چنانچہ غالب کی زندگی کے متعدد واقعات (خصوصاً ملازمت کے سلسلے میں واپس چلے جانے کا واقعہ) اس کی انا پسندی ہی کو سامنے لاتے ہیں۔ دوسری طرف فیض کی زندگی ایک ایسے شخص کی داستان ہے جو دوسروں سے متصادم ہونے یا مجہول انانیت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے ہمیشہ محبت اور خیر سگالی کے مسلک پر کاربند رہا۔ یوں لگتا ہے جیسے فیض پہنچانا فیض کی شخصیت کا ایک مستقل میلان تھا۔ مادی معاملات میں تو یہ رویہ بوجوہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا مگر شاعری کے میدان میں اس نے عوام کو استحصال اور ظلم کے پنجوں سے نجات پانے کی جو راہ بجھائی میں اسے فیض کے اسباب ہی میں شمار کرتا ہوں۔ اس نکتے کے ساتھ اگر یہ نکتہ بھی خسلک کر دیا جائے کہ غالب جاگیرداری نظام سے ہم آہنگ اور تصوف کی روایت کے تابع تھا جب کہ فیض اشتراکی نظام کے ہم نوا اور سماجی ہمہ اوست کے قائل تھے تو دونوں کا فرق نظروں کے سامنے مزید ابھر آتا ہے۔ مگر غالب اور فیض میں فراق کا معاملہ بس یہیں تک ہے۔ اس سے آگے دونوں کی مشترک صفات دریا کے کناروں کی طرح بہت دور تک ہم سفر دکھائی دیتی ہیں۔

مثلاً غالب کی زندگی میں نقل مکانی اور شاعری میں آوارہ خرامی کا فی الفور احساس ہوتا ہے اور یہی احساس فیض کی حیات اور کلام کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ غالب کا قصہ یہ ہے کہ اس کی آوارہ خرامی خود اس کی طبیعت کی بے قراری کا شاخسانہ تھی اور طبیعت کی بے قراری میں اس کے آبائی خون کی گرمی اور ابال کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل غالب کی طبیعت کسی پیانے میں سمانہیں سکتی تھی اور چھلک چھلک جاتی تھی۔ چھلک جانے کی یہ صورت ان کردہ گناہوں (یعنی سفروں) سے بھی ظاہر ہے جو غالب نے کلکتہ، رام پور اور میرٹھ کے سلسلے میں کئے اور ان ناکردہ گناہوں سے بھی جن کی حسرت اس کے دل میں دم آخر تک رہی۔ حج کے سلسلے میں بھی وہ ثواب کے حصول سے زیادہ سفر سے لطف کشید کرنے کی طرف مائل تھا:

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

حقیقت یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر ایک سیاح تھا اور ہمہ وقت حالت سفر میں رہنا اسے مرغوب تھا مگر ان دنوں نہ تو سفر کی وہ سہولتیں میسر تھیں جو آج کل حاصل ہیں اور نہ غالب مالی اعتبار سے اس قابل تھا کہ اپنے ذوق تماشا اور حسرت آوارگی کی تسکین کا اہتمام کر سکتا لہٰذا اس نے ایک تو آوارہ خرامی سے محروم ہونے کی تلافی نقل مکانی سے کی، دوسرے اپنی شاعری میں تخیل آفرینی کی مدد سے سفر کیا۔ نقل مکانی کی صورت یہ تھی کہ غالب کسی ایک جگہ ٹک کر نہ رہا۔ شعبان بیگ کی حویلی، کالے میاں کی حویلی، حکیم محمد حسن خان کی حویلی۔ غالب ایک خانہ بدوش کی طرح عمر بھر اپنا بوریا بستر اٹھائے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا رہا۔ محض اس لئے کہ بقول حالی وہ ایک جگہ رہتے ہوئے اس سے اکتا جاتا تھا۔ آخری مکان گلی قاسم جان کے موڑ پر تھا۔ غالب وہاں بھی نہ رہا موت کی پالکی میں بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔

غالب مکان ہی نہیں گھر کی تنگ دامانی سے بھی نالاں تھا۔ اس کے لئے گھر ایک بندی خانے سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ ذرا ملائم الفاظ میں سرائے کا کمرہ کہہ لیجئے۔ بیوی کو بیڑی اور عارف کے بچوں کو ہتھکڑیاں کہہ کر پکارنا غالب کی اس خاص روش ہی کا غماز ہے۔ سفر کرنے والا چاہے وہ جسمانی طور پر حالت سفر میں ہو یا تخیلی طور پر، تنہائی کو ہمیشہ عزیز جانتا ہے کیونکہ اسی ہالے میں وہ پوری طرح متحرک ہو سکتا ہے۔ غالب فطری طور پر متحرک تھا اس لئے شور و شغب سے اپنے ذہن کی رفتار کو مدھم پڑتے دیکھتا تو احتجاج کرتا۔ گھر بنیادی طور ایک آشیانے کی طرح ہے اور آشیانے میں چہکار نہ ہو تو وہ آباد نہیں کہلائے گا! مگر غالب گھر کی چہکار کو اپنے اعصاب پر ایک بوجھ گردانتا تھا۔ قدرت نے اس سے طبیعت کے اس

میلان کا انتقام یوں لیا کہ وہ بے اولاد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

یہی آوارہ خرامی' آزادہ روی کے ایک مسلک کی صورت اس کے کلام سے بھی مترشح ہے۔ غالب کے کلام کا مطالعہ کریں تو ایک بے قرار روح اپنے زندان کی سلاخوں سے سر پھوڑتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے تاکہ آزاد ہوسکے۔ چنانچہ غالب کے کلام میں تشبیہوں اور استعاروں یا تخیل کے لطیف ہیولوں کی موجودگی اس کی آوارہ خرامی ہی کی توسیع ہے۔ تشبیہ کسی شے یا کیفیت کو بعینہ پیش کرنے کی بجائے ہمیشہ اسے تقابل سے پیش کرتی اور یوں گویا ایک شے سے پھدک کر کسی دوسری شے پر بسیرا کرنے کے بعد واپس اپنی اصل جگہ پر آجاتی ہے۔ اس میں دو کناروں یعنی مشبہ اور مشبہ بہ (جنہیں جولین جینز نے metaphier اور metaphied کہا ہے) کے ملاپ کا منظر ابھرتا ہے جو اس بات پر دال ہے کہ قاری یا فنکار کسی ایک کنارے سے بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ دونوں کناروں کی درمیانی خلیج کو پھلانگ گیا ہے۔ مراد یہ کہ تشبیہ میں مشبہ ایک ایسی کھڑکی بن جاتا ہے جس میں باہر کی اشیاء منعکس ہونے لگتی ہیں اور مشبہ بہ' مشبہ کا جزو بدن بن کر لفظ کے بندی خانے سے نجات پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ غالب کے ہاں تشبیہ اور استعارہ دونوں کی فراوانی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ غالب لفظ کے بندی خانے سے آزاد ہونے پر قادر ہے' ویسے بھی شاعری میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال ایک متحرک انداز بیان کا غماز ہے جسے وہ طبائع زیادہ عزیز جانتی ہیں جو آزادہ روی کو پسند کرتی ہیں۔ غالب کے اپنے زمانے میں ذوق' ظفر اور دوسرے بلند پایہ شعراء بھی شعر کہہ رہے تھے۔ ان کے کلام کی سادگی صفائی اور سامنے کی بات کو سامنے کی زبان میں بیان کرنے کی روش اردو زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت کی غماز تو ہے لیکن اس میں تشبیہ اور استعارے کی وہ فراوانی نہیں جو غالب کے ہاں موجود ہے۔ وجہ یہ کہ بنیادی طور پر ان سب شعراء کے مقابلے میں غالب کہیں زیادہ متحرک اور بے قرار شخصیت کا مالک تھا۔

غالب کے اشعار کی بنت میں تشبیہ اور استعارے کے علاوہ تخیلی ہیولوں نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بعض اوقات تو غالب آب و گل کی دنیا سے اوپر اٹھ کر ایک ایسا خیالی جہان تعمیر کر لیتا ہے جو شاید قدموں کی ہلکی سے ہلکی چاپ کا بھی متحمل نہ ہو سکے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں signifier اپنا رشتہ signified سے توڑ لیتا ہے یعنی لفظ اپنے کویے کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور ریشم کے کیڑے کی طرح رینگنے کے عمل کو تج کر اڑنے کا ڈھب سیکھ لیتا ہے اور پھر پوری کائنات سے ہم رشتہ ہو جاتا ہے۔

بہر کیف یہ وہ متبرک اور مقدس مقام ہے جہاں شاعر ارتکاز کی اس فضا میں سانس لے رہا ہوتا ہے جو معمولی سے شور کو بھی برداشت نہیں کرتی اس سے یہ بات بھی کھلی کہ غالب' عارف کے بچوں کے پھیلائے ہوئے شور و شغب سے کیوں نالاں تھا کیونکہ ہر بار جب کوئی ننھا منا ہاتھ اسے چھوتا تھا اس کے خوابوں کے آبگینے چور چور ہو جاتے تھے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ غالب کی آوارہ خرامی یا آزادہ روی باہر کی کسی منزل کے لئے نہیں تھی۔ منزل تو اس کے اعماق میں پوشیدہ تھی اسے ایک یوٹوپیا یا عظیم تجرید کا عالم کہہ لیجیے جس کا حصول اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اس تک رسائی پانے کی وہ کوشش جسے سلسلہ شوق کا نام دینا چاہیے۔

آوارہ خرامی کا جذبہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے راستے میں کوئی بند نہ باندھا جائے کیونکہ بقول غالب جب طبع رکتی ہے تو اور بھی رواں ہوتی ہے۔ روانی سے تو انکار نہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ غالب رکاوٹ کے عمل کا شکوہ سنج ہمیشہ رہا اور اسے ہر وہ شے یا عمل ناگوار محسوس ہوا جس نے اس پر کسی قسم کی بندش عائد کی یا کم سے کم جس پر اسے بندش یا بھیڑ چال کا گمان ہوا۔ غالب کے نزدیک روانی طبع یا آوارہ خرامی کناروں میں بند ہو کر بہنے کا نام نہیں تھا بلکہ کناروں سے چھلک جانے کا عمل تھا چنانچہ وہ سماجی کھائیوں یعنی social grooves سے ہمیشہ متنفر اور لفظی کھائیوں یعنی cliches سے ہمیشہ نالاں رہا۔ یہ بات اس کے اشعار کے مخصوص مزاج سے لے کر اس کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات تک پھیلی ہوئی ہے مثلاً اس نے پیروی کو چاہے وہ خضر کی پیروی کیوں ہی نہ ہو لازمی قرار نہیں دیا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

وہاں عام لوگوں کے ساتھ مرنا بھی اسے پسند نہیں تھا۔ جب دہلی میں مارشل لاء لگا تو غالب کو دوسروں کے مقابلے میں گھٹن کا کہیں زیادہ احساس ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیاوی معاملات کے علاوہ اس نے مذہبی اعتقادات کے سلسلے میں بھی آزادہ روی کا مسلک اختیار کئے رکھا مثلاً یہ اشعار:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ان اشعار سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب کے ہاں آزادی کا تصور کس قدر کشادہ تھا۔ اتنا کشادہ کہ بڑی آزادی بھی اسے قید و بند کے روح

فرسا احساس سے رہائی دلا نہیں سکتی تھی۔ آسمان کو بیضہ مور صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ایک بلند مقام سے وجود اور موجود کی تمثیل کو دیکھ رہا ہو۔ دوسرا شعر غالب کے ہاں کائناتی شعور کا بھی غماز ہے۔ بنیادی طور پر کائناتی شعور بیسویں صدی میں ابھرنے والے وژن کا دوسرا نام ہے۔ حیرت ہے کہ انیسویں صدی کا باسی ہونے کے باوجود غالب کے ہاں ایک ایسا زاویہ نگاہ ابھر آیا تھا جسے اس وژن کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے چنانچہ جب غالب تمنا کے دوسرے قدم کا ذکر کرتا ہے تو قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دیوتا نے تو اڑھائی قدموں میں پوری کائنات کا احاطہ کر لیا تھا مگر غالب کیسا ذی روح ہے کہ اس نے ایک قدم تو دشت امکان پر رکھا ہے اور دوسرے قدم کے لئے اسے کوئی جگہ ہی نہیں مل رہی۔

غالب کے تتبع میں تو نہیں البتہ غالب ایسی بے قرار طبیعت کا مالک ہونے کے باعث فیض بھی ایک مستقل نوعیت کی آوارہ خرامی کی زد میں رہے۔ ان کی داستان حیات کے اس پہلو کا بطور خاص ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں کہ یہ ایک بالکل سامنے کی بات ہے کہ کیسے ان کا ایک قدم لندن میں' دوسرا ماسکو میں' تیسرا بیروت اور چوتھا ہندوستان میں ہوتا تھا۔ درمیان میں وہ اپنے ملک میں بھی ایک معطر جھونکے کی طرح گھوم جاتے تھے۔ آخر میں تو زیادہ عرصہ دیار غیر میں رہنے لگے۔ چنانچہ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ انہیں ملک بدر کر دیا گیا ہے لیکن جب انہوں نے دوبارہ پاکستان یاترا کا سلسلہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا بن باس باہر کی کسی مجبوری کے کارن نہیں تھا بلکہ اندر کی بے قراری کا نتیجہ تھا۔ یوں دیکھیں تو غالب اور فیض کے ہاں ایک گہری مماثلت کا فی الفور احساس ہوتا ہے۔ رہا گھر کا معاملہ تو یہ کام فیض کے سوانح نگار کا ہے کہ وہ گھر کے در و دیوار نیز گھر کی بیزیوں اور جھگڑیوں کے بارے میں فیض کے رد عمل پر روشنی ڈالے مگر میرا اندازہ ہے کہ فیض صاحب ایسی ذہنی اور احساسی سطح پر متحرک شخصیت گھر کے معاملات میں پوری طرح شاید "مبتلا" نہیں رہ سکتی لہٰذا ان کے گھر کی سلامتی اگر نظر آتی رہی ہے تو اس میں یقیناً ان کی نصف بہتر کا زیادہ ہاتھ رہا ہوگا۔

آوارہ خرامی اور آزادہ روی کی یہ روش فیض کے کلام میں آزادی کے حصول کی بے پایاں آرزو پر منتج ہوئی تو "صبح آزادی" ایسی نظم تخلیق ہوئی جس میں ان کا یہ موقف تھا کہ آزادی کی سحر ابھی نمودار نہیں ہوئی اصلاً فیض کے لئے آزادی کی یہ سحر ایک بے چہرہ ہیولیٰ تھا جو ان کے اندر کہیں موجود تھا۔ ہم فیض کے سیاسی اور سماجی مسلک کی روشنی میں اسے خدوخال تو عطا کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں مگر حقیقتاً اس کی شناخت کر نہیں پاتے۔ غالب کی آزادی کی طرح فیض کی آزادی بھی ایک تجرید یا یوٹوپیا ہے جس کا حصول اتنا اہم نہیں جتنا کہ حصول کے لئے شاعر کی تگ و دو! فیض جب لکھتے ہیں کہ۔

اس طرح ہے کہ پس پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامن وقت سے پیوست ہے یوں دامن شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا
آسماں آس لئے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

تو دراصل اندھیرے اجالے کے اس پراسرار عالم ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے ان کے ہاں آزادی کا ہیولیٰ مرتب ہوا تھا مگر جس کے کوئی واضح خدوخال نہیں تھے گویا فیض کا اندھیرے اجالے کا دیار "غالب" کے "گلشن ناآفریدہ" ہی سے مشابہ ہے۔

غالب اور فیض کے ہاں ایک اور قدر مشترک ان کا سیاسی شعور ہے۔ غالب کے زمانے میں ابھی جمہوریت نے پر پرزے نہیں نکالے تھے اور اخبارات کی بھی محض ابتدا تھی' ان سب کے باوجود غالب اپنے معاصرین کی بہ نسبت ماحول کی کروٹوں کے بہتر نباض تھے۔ ان کے خطوط میں دہلی کے اجڑنے کی جو داستان بیان ہوئی ہے وہ ایک پورے عہد کے اجڑنے کی کہانی ہے۔ دہلی اپنے زمانے کی طوائف الملوکی' شکست و ریخت' اپنوں اور غیروں کے جبر و استبداد نیز دباؤں اور خشک سالیوں کے لئے ایک علامت کی صورت اختیار کر گئی تھی اور غالب کی حیثیت اس کھلی آنکھ کی سی تھی جو اس کے لمحہ بہ لمحہ اجڑنے اور متغیر ہونے کے مناظر کو ایک تار دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ دہلی میں لگائے گئے مارشل لاء کے دوران جو پابندیاں عائد ہوئیں (بالخصوص دہلی کے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا) زبان بندی ہوئی بلکہ ٹکٹ کے بغیر شہر سے نکلنا یا شہر میں داخل ہونا ناممکن ہوا اور بے گناہ افراد کو جس بے دردی سے گوروں اور کالوں نے قتل کیا اور آخر میں جس طرح پرانی حویلیاں اور مدرسے اور مکان توڑے تاکہ نئی اور کشادہ سڑکیں بن سکیں۔ یہ سب کچھ غالب کے لئے سوہان روح سے کم نہ تھا۔ غالب اس سب کا ایک بے بس ناظر تھا۔ اس کے دل میں اس سب کے خلاف ایک طوفان برپا تھا مگر وہ ایک حرف بھی زبان پر نہ لا سکتا تھا پھر بھی اپنے خطوط میں اور اپنے کلام کے ذریعے اس نے اشاروں کنایوں میں اس صورت حال کے خلاف اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ آج کے سیاسی شعور کے حوالے سے تو ہم اس رد عمل کو سیاسی ہرگز نہیں کہہ سکتے مگر اس طور یہ سیاسی ضرور ہے جیسے ٹی ایس ایلیٹ کی "ویسٹ لینڈ" جو شکست و ریخت کی اس فضا کی عکاس ہے جس کے محرکات میں سیاسی مد و جزر

نے بھی ایک اہم حصہ لیا تھا۔ بہر حال غالبؔ کا ردعمل اس کے کلام میں ابھرنے والے ان الفاظ اور تراکیب سے بطور خاص مترشح ہے جو بعد ازاں ہر قسم کے سیاسی مد و جزر کو گرفت میں لینے کے لئے بروئے کار لائی گئیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے ساری جدید غزل غالبؔ کے لہجے، جہت اور مزاج سے متاثر ہے اور اس میں رہبر، رہزن، سایا، جنوں، قلم، خنجر اور خوں وغیرہ الفاظ کے نئے علامتی مفاہیم براہ راست غالبؔ سے آئے ہیں مثلاً فیضؔ کا وہ کلام لے لیجئے جو گہرے سیاسی شعور کے لئے بہت مشہور ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فیضؔ غالبؔ سے کس قدر متاثر تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے دو مجموعوں یعنی "نقش فریادی" اور "دست تہ سنگ" کے نام تک غالبؔ سے مستعار ہیں، اپنے متعدد اشعار میں بھی فیضؔ نے غالبؔ سے استفادہ کیا ہے مثلاً فیضؔ صاحب کا ایک مصرعہ ہے:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور غالبؔ کا مصرعہ ہے:

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

اسی طرح فیضؔ کہتے ہیں:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اور غالبؔ کا شعر ہے:

درد دل لکھوں کب تک جاؤں اس کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے کلام میں ایک ایسا ذہن کارفرما نظر آتا ہے جو بیسویں صدی کے متحرک ذہن کا پیش رو ہے۔ غالبؔ سیاسی مد و جزر ہی کے ناظر نہیں تھے بلکہ سماجی معاملات کے سلسلے میں بھی خاصے باشعور تھے اور فکری اعتبار سے تو وہ بیسویں صدی سے ایک بڑی حد تک ہم آہنگ بھی تھے۔ گویا جس فکری اور سیاسی موسم میں فیضؔ نے ساری عمر بسر کی اسی سے ملتے جلتے فکری اور سیاسی موسم سے غالبؔ بھی اپنے زمانے میں متعارف ہوئے تھے۔

کچھ یہی صورت حال ان دونوں کے شعری اسلوب کے سلسلے میں بھی نظر آتی ہے۔ دونوں کے ابتدائی کلام میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی فراوانی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ کے ہاں فارسی پیرایہ اظہار نے پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا جس سے بعض اوقات شعری لطافت، گنجلک اسلوب کے بارگراں تلے دب گئی جب کہ فیضؔ نے فارسی الفاظ کو بالعموم بڑی نفاست سے اس طور پر استعمال کیا کہ وہ دل کی آواز بن گئے۔ بعد کے کلام میں دونوں نے فارسی آمیز پیرایہ اظہار کو ایک بڑی حد تک ترک کر کے سہل ممتنع کو اپنایا۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ کے ہاں سادہ گوئی میں معانی کے نئے افق ابھرتے چلے آئے اور ان کا کلام شعریت اور لطافت کی آخری حدوں کو چھونے میں کامیاب ہوا جب کہ فیضؔ کے ہاں تخلیقی کرب کے منہا ہو جانے کے باعث سادہ گوئی کے عمل نے شعر کو نثر کی سطح تفویض کر دی اور فیضؔ صاحب شعری اخفا سے محروم ہو کر نعرہ بازی کی سطح پر اترتے چلے آئے۔ تاہم دونوں کے ہاں اسلوب شعر کے سلسلے میں جس طرح کی تبدیلی آئی وہ ان کے شعری مزاج کی مماثلت ہی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں میرؔ کی سادہ گوئی شروع سے آخر تک قائم رہی اور راشدؔ کے ہاں فارسی سے شغف کا جو انداز ابتدا میں ابھرا تھا وہ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دم آخر تک موجود رہا۔

خاتمہ کلام سے پہلے میں ایک اور دلچسپ مماثلت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ غالبؔ اور فیضؔ دونوں قید و بند کے تجربے سے گذرے اور دونوں کو قمار بازی کے الزام میں سزا ملی۔ اس فرق کے ساتھ کہ غالبؔ پر تو عام سی جوا بازی کا الزام تھا جب کہ فیضؔ سیاسی نوعیت کی قمار بازی کے مرتکب ہوئے۔ جوا بازی کی نوعیت کے فرق کے باعث ان دونوں کے ہاں نتائج کا فرق بھی مرتب ہوا۔ وہ یوں کہ غالبؔ کو تو بدنامی اور بے عزتی کے احساس نے کچل ڈالا اور اس میں زمانے کا سامنا کرنے کی سکت نہ رہی مگر فیضؔ کو قید و بند کے واقعہ نے پر پرواز عطا کر دیئے اور وہ ہر دلعزیزی کی ایک گرم و گداز فضا میں شہرت کے ساتوں افلاک کو پار کر گئے مگر پھر اس کے کچھ دیگر اثرات بھی مرتب ہوئے بالخصوص تخلیق کاری کے سلسلے میں! غالبؔ جس کے دل میں پہلے ہی بہت سی خراشیں اور دراڑیں پڑ چکی تھیں اس حادثے کی تاب نہ لا کر ایک تمثال دار آئینے کی طرح کرچ کرچ ہو گیا مگر پھر شکستہ ہو کر نگاہ آئینہ ساز میں عزیز تر ہو گیا اور یوں تخلیقی اعتبار سے آخری دم تک فعال رہا جب کہ فیضؔ کا آئینہ دل جو ذاتی سطح کے واقعات اور حادثات سے متاثر ہو چکا تھا قید و بند کے واقعہ سے کچھ مزید متاثر تو ہوا مگر پھر اس کے بعد زمانے کی طرف سے ملنے والی محبت اور عقیدت نے ان کے آئینہ دل کی کرچیوں کو اس خوبصورتی سے جوڑ دیا کہ فیضؔ اس داخلی شکست و ریخت ہی سے محروم ہو گئے جو تخلیق فن کے لئے بہت ضروری ہے۔ قید و بند کے واقعہ کے بعد غالبؔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور اس کی روح کا زخم ناسور بن گیا تھا مگر فیضؔ قید و بند کے واقعہ کے بعد اندر سے جڑ گئے اور ان کا زخم مندمل ہو گیا لہٰذا زندگی کے آخری بیس سال میں ان کے ہاں تخلیق کاری کا گراف بتدریج زمیں بوس ہوتا چلا گیا جب کہ غالبؔ تخلیقی اعتبار سے دم واپسیں تک پوری طرح زندہ رہا۔

☆☆☆

آغا بابر

دیکھے ہیں ہم نے حوصلے

اس سرزمین امریکہ (جس میں ہم بس رہے ہیں) کے رہنے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ غزل کا ایک شعر اپنے اندر کتنی تاثیر رکھتا ہے اور پھر یہ کہ ہم ایک شعر سے کتنی آسودگی پاتے ہیں۔ شعر تو خود کشی سے بچا لیتا ہے۔ شعر ہمارا عمر بھر کا ساتھی بنا رہتا ہے جس سے ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو شعر کا ذوق رکھتے ہیں اور اس ساتھی کی صحبت میں رہ کر ہمت اور حوصلہ پاتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک عمدہ شعر سے طبیعت کی کدورت دور ہو جاتی ہے۔

شعر ہماری frustration اور catharsis کی نیوننگ کر دیتا ہے۔

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعہ تر کی صورت

تخلیق کرنا خداوندی صفت ہے۔ یہ خلاقانہ صفت جب شاعر یا ادیب کو ارزاں ہوتی ہے تو اسے کئی متضاد طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اہرمن و یزداں کے درمیان انسان کو تخلیق کرتے ہی ٹھن گئی تھی۔ اسی طرح تخلیقی عمل کے دوران شاعر بھی مخالف طاقتوں سے برسر پیکار رہتا ہے اور یہ جنگ ہماری عمر جاری رہتی ہے۔ عجب ستم یہ ہے کہ شاعر جس رمزیت جس سوچ اور جن ترجیحات کا ذکر کرتا ہے وہ اور جتنی کم جتنی زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ تخلیقی عملی کے بھی تقاضے ہیں۔

فیض کا شعر ہے۔

اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

میر درد کہتا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

جوشؔ کا شعر ہے۔

جوشؔ کی بحث صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

غالب کہتا ہے۔

ہر گنا ہے کہ کنی در شب آدینہ ولکن
ان کہ تو صدر نشینانِ جہنم باشی

بات یہ ہے کہ شاعر عیب و ثواب سے ماورا ہو کر سوچتا ہے۔ اُس کی ذہنی نشو و نما اور اس کے احساس کی رہنمائی اس کی فنکارانہ فکر کرتی ہے۔ اُس کی خلاقانہ طبیعت بندشوں کو قبول نہیں کرتی۔ وہ واعظ و محتسب کی سخت گیری کا قائل نہیں۔

فرانس کے مشہور ادیب پیئر لوئی کی طرح فیض کو ہم جنگاور شعر کا ایک ذہین و فطین جنگجوں شاعر کہہ سکتے ہیں جو اپنے معتقدات کے حوالے سے ایک جنگجو ں کی طرح عمر بھر ڈٹا رہا۔ اُس نے انسانیت کی ان اقدار کے لیے نہایت اعلیٰ بصیرت پائی تھی اور اس بصیرت کو عام کرنے کے لیے اُس نے جو الفاظ اور تراکیب استعمال کیں وہ ساری کی ساری غزل کی

تھیں۔ اپنی بات کہی تو شعر کے وسیلے سے اور شعر ایسا کہ ترازو میں تلا ہوا۔ الفاظ دمکتے موتی۔ تراکیب چمکتا سونا۔ جرأت بے مثال۔ سادگی میں ایک بات کہہ جاتے اور اس ڈھنگ سے کہ غزل حاصل مشاعرہ بن جاتی

"مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے"

کوئے یار ہو یا شہر محبوب۔ دونوں کا دستور صرف چاہنا اور چاہے جانا تک محدود ہوتا ہے۔ کوئے یار سے نکالا کھاتا ہوا دوسرا مقام کونسا ہو سکتا ہے۔ ایسا مقام جو ارفع و اعلیٰ ہو جائے اور شاعر کی نگاہ میں جچ جائے۔ کوئے یار اور سوئے دار معمولی تراکیب ہیں مگر آپ نے جرأت دیکھی؟ اور مضمون کیا بندھا! یہ فیض کی

شاعری کی ایک معمولی سی مثال ہے۔ اُن کی شاعری ایک سیدھی سادی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز ہے جو دل میں اُترتی اور کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ظاہر ہے ایسا شعر وہی کہہ سکے گا جس کو قربت داری اور شناسائی بوئے رسن ہوگی۔

اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ شاعر کے پیچھے کچھ رسوائیاں، کچھ تہمتیں اور کچھ دشنام طرازیاں بھی ہوتی ہیں جو اُس کی شاعری کو ابھارتی ہیں۔ کمال یہ کہ فیض ان دشنام طرازیوں اور رسوائیوں سے بہت فیض یاب رہے۔ اُن کے معتقدات کی وجہ سے انہیں جتنا سرخا کہا گیا وہ اتنا ہی ابھرے۔ گویا ان کے خلاف جتنے نقارے نقار خانے میں بجے اتنا ہی اُن کا طوطی بولتا رہا۔ ان کی عزت اور ان کی شان دوگنی ہوتی رہی اور مزید کمال یہ کہ ان دشنام طرازیوں سے وہ کبھی بدمزہ نہ ہوتے اور کبھی react نہ کرتے۔ ماتھے پر تیوری نہ آتی۔ ایک تبسم مدام سے سب کچھ رد کر دیتے۔ یہ ان کے اونچے کردار کی مثال ہے۔

ہمارے آپ کے مزاج میں کچھ idiocyncracies بھی ہوتی ہیں معمولی معمولی بھی، بڑی بڑی بھی، جو اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ شاعر کو شاعر نے داد دینا ہو تو ایک شاعر دوسرے کا مصرعہ اٹھاتا ہے مگر فیض نے طالب علمی سے لے کر آخر تک کبھی مصرعہ نہ اٹھایا۔ انہیں مصرعہ اٹھانا آتا ہی نہ تھا۔ ان کی داد بس زیر لب مسکراہٹ تھی۔

مجھے پچھلے دنوں پاکستان سے ایک ادبی رسالہ موصول ہوا جس کے اداریے میں ایڈیٹر لکھتا ہے کہ پاکستان میں ادب پیدا نہیں ہو رہا۔ میں نے یہ ذکر اپنے دوست سے کیا۔ انہوں نے کہا ادب بے ادبیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ بے ادبی ہوگی تو ادب پیدا ہوگا۔ اُن کے یہ کہنے سے مجھے راولپنڈی کی انجمن تطہیر معاشرہ یاد آ گئی۔ اس انجمن کے بانی مبانی لوگوں کو بلا کر چائے شربت سے تواضع کرتے، تطہیر معاشرہ پر، مضمون پڑھے جاتے۔ اخبار میں خبر چھپتی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ انجمن مشاعرے منعقد کرنے لگی۔ شاعروں کو شعر پڑھنے کے لیے دیوار کا سایہ مل گیا۔ افسانہ نگار افسانہ پڑھنے پہنچ جاتے۔ ان صاحب نے پہلے احباب سے کہلوایا پھر مجھ سے خود ملنے کو آئے۔ میں نے عرض کیا۔ آپ لوگ افسانے کے پیٹ پر لات مار رہے ہیں۔ غزل کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ اگر آپ نے معاشرے کی تطہیر کر دی تو افسانہ کیسے لکھا جائے گا، غزل کیونکر ہوگی۔ اگر اقبال نمازی ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ کہہ پاتا۔

کبھی نماز جو پڑھتے ہیں بے نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

اور فیض نے یہ شعر نہ کہا ہوتا۔

جو تمہاری مان لیں ناصحا تو رہے گا دامن دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں نہ کسی صنم کی مروتیں

خواتین و حضرات! امر واقعہ یوں ہے کہ لفظ پر پہرے بٹھانے سے سانس تو گھٹ جائے گا مگر کمال یہ کہ لفظ کا سانس گھٹتا ہے۔ جان سے نہیں جاتا۔ دنیا میں زندہ رہتا ہے تو وہ لفظ ہے۔ ہم فیض کو آج یاد کر رہے ہیں، ان لفظوں کے وسیلے سے جو فیض کے ذہن رسا سے کشید ہوئے اور شعر کے قالب میں ڈھلے۔

لفظوں کو قید کرنے اور زبان و بیان پر قدغن لگانے کے بارے میں فیض کہتا ہے۔

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے
بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

کیا سنسر اور زبان بندی پر اس سے بہتر شعر ہو سکتا ہے؟

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازار سخن
ہم گئے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

یہاں ایک سیاسی واقعہ کا ذکر کر دینا از بس ضروری معلوم ہوتا ہے۔ 1949ء کی بات ہے کشمیر میں پاکستان کی فوج بھارت کی فوج سے برسر پیکار تھی۔ سری نگر کا ہوائی اڈہ محاصرے میں آیا ہی چاہتا تھا کہ سیز فائر کا اعلان ہو گیا۔ چند اونچے اعلیٰ فوجی افسر جو کشمیر کی جنگ میں شریک تھے حکومت سے بڑے بد دل اور افسردہ ہو گئے۔ یہ کوئی چھپانے کی بات نہیں۔ یہ سیاسی تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ اس عمل کا ردعمل یہ ہوا کہ انہوں نے فوجی انقلاب کے ذریعہ اُس وقت کی حکومت سے چھٹکارہ پانا چاہا۔ حکومت کے خلاف اس سازش میں جس کا نام راولپنڈی سازش کیس تھا، جو گرفتاریاں ہوئیں اُن میں فیض بھی شامل تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ ان ملزموں کو سزائے موت سنائی جائے گی۔

انگلستان کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ نے اپنے ایام اسیری میں ایک کتاب DEPROFENDI کے نام سے لکھی تھی۔ جس کو انگریزی ادب میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ فیض نے بھی اپنے ایام اسیری میں جو اشعار کہے وہ ''زنداں نامہ'' اور ''دست صبا'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئے۔ یہ سچ ہے۔ بے ادبیاں نہ ہوں تو ادب پیدا نہیں ہوتا۔ ادب میں جمود کے متعلق ایک مرتبہ فیض نے کہا تھا۔ یہ جمود کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ادیبوں کا ایمان کمزور ہو گیا ہے۔ اب فیض کے ایام اسیری کے پس منظر میں ان اشعار کو پڑھئے تو لطف دوچند ہو جاتا ہے۔

ہاں جرم وفا دیکھئے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطا کار سر دار کھڑے ہیں

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سر رہ گزار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

فیض کا کمال یہ تھا کہ وہ غزل کے پردے میں سیاسی بات کہہ جاتے مگر غزل کے الفاظ' تراکیب' معاملہ بندی اور سارے کے سارے تیور کہیں بھی نہیں بدلتے تھے۔

کہا جاتا ہے ملک میں جمہوریت نہ ہو تو نثر لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ جمہوریت کی موجودگی میں البتہ شاعر تو بات کہہ لیتا ہے کہ اُسے روزِ اوّل سے بہت سارے لائسنس حاصل ہیں جس طور کی بھی سخت گیری ہو وہ رخسار کے خم اور کاکل کی شکن کے پردے میں واعظ و محتسب کو سناتا ہوا مشکل راہوں سے گزر جاتا ہے۔ مگر ان راہوں میں سے نثار نہیں نکل پاتا۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ان کا مکمل شعر ہے۔ مگر گلشن سے مراد اپنا ملک ہے جس کا کاروبار شاعر کے حسابوں کئی خرابیوں کے سبب نہیں چل رہا۔ کمیونزم کو بلا کر کہتا ہے۔ اب چلے بھی آؤ کہ ہمارا کاروبار چلے۔ بادِ نو بہار سے مراد بادِ شمال ہے۔

جگہ جگہ یہ غزل گائی گئی مگر کسی نے بین السطور نہ جھانکا۔ بہر کیف شاعر اپنا عندیہ بیان تو کر سکا۔ شعر میں بات جس آنے بہانے کہی جا سکتی ہے۔ وہ آنے بہانے' حیلے حوالے نثار نہیں برت سکتا۔

الزام لگانے والوں کے ہاتھوں فیض پر بارہا یہ الزام بھی لگا کہ وہ وطن پرست نہیں' اُسے وطن سے محبت نہیں۔ اس نے 1965ء کی جنگ میں کچھ نہیں لکھا۔ INSPIRE نہیں ہوا' نہ ہی کچھ لکھا۔ کوئی پابندی تو نہیں۔ یہ کہتے ہوئے یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ شاعر پابندیوں میں نہیں جکڑے جا سکتے۔ مگر حد ہے کہ فیض کے بیشتر اشعار نکہتِ وطن سے مشکبار ہیں۔

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

چاہا ہے اُسی رنگ سے لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اُسی طور سے دل اُس کی لگن میں

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا ان اشعار میں فیض کا اپنا تجربہ نہیں بول رہا۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا

یہ شعر جس کی مثال اب دینا چاہتا ہوں یقیناً اُسی وقت کہا جا سکتا ہے جب ملک میں جمہوریت ناپید ہو گئی ہو۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

داغ کا شعر ہے۔

ہم نکمّے ہوئے زمانے کے
کام ایسا سکھا دیا تُو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
اے خدا جو دیا دیا تُو نے

اسی مضمون میں فیض نے جو شعر کہا اُس میں مخاطب کئی ہیں۔ حاکمِ وقت بھی' خدا بھی' وطن بھی اور محبوب بھی۔

کبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا
کبھی راحتیں کبھی کلفتیں

کبھی صحبتیں کبھی فرقتیں
کبھی دوریاں کبھی قربتیں

آپ نے دیکھا۔ دنیا میں کئی حقیقتیں اور کئی صداقتیں ہیں شاعر جن کو دریافت کرنے کی آزادی چاہتا ہے اور وہ اُس جستجو میں اپنی لگن اور تڑپ کا اظہار ندرت کے ساتھ کرتا ہے جو ہمارے خیال کو جگاتی اور فکر کو عطائے معنویت سے سرشار کرتی ہے۔ اُن کے کلام میں جو احساساتی تصویریں ابھرتی ہیں وہ اپنا وجود لفظوں کے حسنِ انتخاب سے پاتی ہیں۔ اُن کی شاعری ان کی زندگی کی آئینہ دار رہی۔

وہ سوچنے والا اداس اداس شاعر جس کا نام فیض تھا۔ ذکرِ یار سے بہت نشاط اور بہت سرخوشی پاتا ہے اور ذکرِ یار ہی کے حیلے بہانے اور بہت سی بامعنی' پہلودار باتیں ہمیں بتا جاتا ہے۔ اُس کی غزل کی شیرینی اور لطافت اور کسک ہمیں یوں گرفتار کیے ہوئے ہے کہ جیسے یہ اُس کا حق تھا اور ہماری پرانی تمنا۔ شعر کے دام میں گرفتار ہو جانے سے بھی تو ہمیں ایک لطف بالیدگی حاصل ہوتا ہے۔ انہوں نے جو محسوس کیا'

کہا:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس نظم کو بہت اچھالا گیا' بہت شور مچا مگر اس کے ہونٹوں پر وہی ایک تبسم عام۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اپنے شعروں میں فیض یوں خطاب کرتے:

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

کبھی کبھی شاعر پر ایسی مجذوبانہ کیفیت بھی تو طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے پندار کے ایوان اور تعلی کے تمام صنم خانے منہدم کر دینے پر تل جاتا ہے۔ اس کیفیت میں شاعر کسی مسلک کا ہو' رومانی ہو' یا صوفی' شمس تبریزی ہو یا رومی۔ ایک ایسا جگر تاب شعلہ لے کر سامنے آتا ہے کہ اس کی تابانی دل و جان کو گرمانے لگتی ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

کوئے نیک نامی اور ملامت کا مضمون شیخ سعدی نے یوں باندھا۔

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغیر کن قضارا

فیض ہمارے عہد کا شاعر' دیکھئے' کوئے ملامت کی طرف کس انداز سے جاتا ہے۔ مگر کوئے ملامت کو تو فیض اپنی شان کے شایان ہی نہیں سمجھتا۔ اُس کی جوشش جنوں تو بازارِ ملامت کی قائل ہے۔ اُس کا ایمان' "تو سرِ بازاری رقصم" والا ہے۔ کہتا ہے:

چشم نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ، کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے، سب شہر جاناں چلو
حاکم شہر بھی، مجمع عام بھی

میں فیض کے اس قدر ذاتی اور اس قدر آفاقی شعر پر جس میں ایک عالمگیر حقیقت پنہاں ہے' حالی کا مقدمہ شعر و شاعری قربان کر دینا چاہوں گا۔

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

اس مقام پر یہ بات کبھی بڑی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ پاکستان کی بیوروکریسی فیض کی بڑی مداح رہی۔ کچھ لوگ اس وجہ سے کہ وہ بھی INTELLECTUAL کہلا سکیں۔ خون لگا کر شہیدوں والی بات۔ گویا ایک طرح سے INDIRECT خاموش اظہار کہ اس نوکری نے ہمیں غارت کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔ ڈنر پر بلائے گئے مہمانوں کو فیض کے مشاعروں کے ٹیپ سنانا کئی بیوروکریٹس کے لیے ہمیشہ باعث مسرت رہا۔ بعض افسر اس طرح کے بھی ہوئے جو دوسرے افسر کے لیے اس کی کانفی ڈنشل رپورٹ میں یہاں تک لکھ دیتے کہ اس افسر کا فیض سے ملنا جلنا بہت ہے اور اس طرح ماتحت افسر کی رپورٹ خراب ہو جاتی۔ گویا اپنے اعتقادات کی وجہ سے فیض ہر طبقہ میں متنازعہ فیہ مسئلہ بنے رہے۔ ماسکو یوں جاتے جیسے لاہور سے کراچی جانا ہو اور روسی سفیران سے یوں ملتا جیسے ایک ساتھ پلے بڑھے ہوں۔ دل کا پہلا دورہ پڑا تو روسی سفیر نے علاج کے لیے ماسکو بھیج دیا۔ اُن کی تمام کتابوں کے روسی زبان میں ترجمے ہوئے۔ کئی ایڈیشن چھپے۔ ہر ایڈیشن پر رائلٹی ملتی۔

لامحالہ ادب کے مورخ کو یہ لکھنا پڑے گا کہ فیض نے عملی اور نظریاتی اعتبار سے ہوا کے رخ بادبان کھولنے کی رسم کبھی قبول کی اور نہ اس کو رواج دیا۔

جوش ملیح آبادی ایک جگہ لکھتے ہیں "میرا ساحل اب سامنے آ چکا ہے۔ میری کشتی کے بادبان لپیٹے جا رہے ہیں لیکن ڈوب جانے سے پیشتر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اطمینان سے مروں گا اور محض اس بنا پر کہ اردو ادب کے ایک ملاح کو اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں اور اُس ملاح کا نام ہے فیض۔"

جوش صاحب! اپنی قوم کی مسخرہ گیری پر آپ بہت ہنسا کرتے تھے۔ خبر گلی ہے کہ فیض کے مرنے کے بعد اب پاکستان میں لوگ کہہ رہے ہیں۔ فیض کو تو وطن سے بہت محبت تھی۔ فیض تو وطن کا پجاری اور دل پُر خوں کا ہنر سکھانے والا' صداقتوں اور حقیقتوں کا شاعر تھا۔ وہ تو بہت اونچا انسان تھا۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

(یہ مضمون اُس ادبی تقریب میں پڑھا گیا جو "بزم علم و فن" نیویارک نے فیض کی یاد میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں منعقد کی تھی۔)

☆☆☆

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال و منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

جیلانی کامران

ذکر فیض احمد فیض

فیض احمد فیض کا زمانہ اردو شاعری کے موضوعاتی دور کا زمانہ تھا۔ اور اس میں نظم کا اسلوب براہ راست طرز کلام کا تھا۔ موضوع کے اعتبار سے نظم کے قافیہ پر کوئی تغیر رونما نہ ہوا تھا۔ تاہم 1930 کے بعد نظم اسلوبیاتی طور پر تجرباتی طرز اظہار سے متاثر ہوئی۔ موضوع کا مظہر معاشرہ' طرز حکومت' نوآبادیاتی نظام' اور انسان کا وجود اور صورتحال تھی۔ تاہم اسلوب کے طور پر نظم نے الگ الگ پیکر اختیار کئے جن کو تصدق حسین خالد' راشد' میراجی اور دیگر شعرا کی نظموں میں پہچانا جاسکتا ہے۔

یہ ایک عجیب زمانہ تھا جس کی پہچان اردو ادب کے اہل فکر کے لئے ضروری ہو چکی ہے کیونکہ جب تک عالمی سیاست سپر پاورز کے دوگونہ تصور سے دو چار رہی' حالات کا جائزہ زیادہ تر جذباتی اور منقسم رہا اور ادب و شاعری کو سیاست کے حوالے سے دیکھنے کی روش زیادہ نمایاں رہی۔ 1930ء کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے عبداللہ ملک نے تھرڈ انٹرنیشنل کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس عشرے کے دوران مغربی یورپ کے ادیبوں نے آندرے ژید کی صدارت میں پیرس میں منعقدہ ایک ادبی کانفرنس میں ان ریاستوں کے خلاف محاذ آرائی کے لئے رائے عامہ کو دعوت دی تھی جہاں فسطائیت کا رجحان ابھر رہا تھا' اسپین میں جنرل فرانکو کے خلاف سول وار شدت سے جاری تھی' جرمنی میں ہنڈن برگ کے بعد ہٹلر اور نازی عروج پر تھے' اٹلی میں مسولینی فیوچرازم کے پردے میں قدیم رومن جاہ و جلال کو ایک عصری صورت دینے کا خواہشمند تھا' صرف روس واحد ملک تھا جہاں انسان آزاد تھا اور مستقبل کے اچھے دنوں کی صورت گری کا منتظر تھا۔

اس زمانے میں مشرقی یورپ کا ایک نیا نقشہ بھی معرض وجود میں آ رہا تھا۔ آسٹرو ہنگرین ایمپائر اور سلطنت عثمانیہ کے ٹوٹنے سے نئے ممالک ظاہر ہونے کو تھے۔ آئرلینڈ کو مذہبی بنیاد پر محض لکیر کے ذریعے آئرش فری ریپبلک اور شمالی آئرلینڈ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ غرضیکہ سیاسی اور تمدنی خوابوں کا ایک سلسلہ تھا جو ادیبوں کی سرخوشی کا سبب بن رہا تھا۔ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد بھی اسی سرخوشی کا ایک اسلامی تہذیبی مظہر تھا۔ جس کی چاپ برصغیر میں سنائی دی تھی۔ یہ زمانہ فیض احمد فیض کے لڑکپن اور نوجوانی کا زمانہ بھی تھا اور ایم اے او کالج امرتسر کے رفقائے کار کا زمانہ بھی جن سے فیض فکری طور پر متاثر ہوئے تھے ایک بات جو قابل ذکر ہے کہ جو ادیب اس عالمی منظرنامے میں گزر کرتا تھا اس کی شخصیت بدل جاتی تھی۔ وہ دانشور کا رول اختیار کر جاتا تھا اور ادب و شاعری اس کے نزدیک کارآمد آلے کے طور پر بروئے کار آتے تھے۔ خواب کی اولیت نمبر ایک تھی اور شاعری (ادب) کی اہمیت ثانوی ہوتی تھی۔ شاید اسی لئے میں نے اپنی کسی تحریر میں فیض کو شاعر کے بجائے دانشور کہا ہے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ صدیوں کے قائم کردہ ماضی سے (سلطنت عثمانیہ/ آسٹروی ایمپائر) جہاں عالمی منظرنامے میں سیاست رونما ہوئی وہیں ادیبوں کے ذہن خواب سے آباد ہوئے اور وہ خواب کے مسافر بن گئے۔ فیض بھی خواب ہی کا ایک مسافر تھا۔ اور یہ بات اہم ہے کہ اسے غلط طور پر زیر بحث لاتے ہوئے کبھی اسے کیمونسٹ' بورژوا اور کبھی مڈل کلاس کا لبرل فرد کہا گیا ہے۔ اور اس کی سے کشی کو نمایاں کیا گیا ہے کیونکہ جو کیفیت اس زمانے میں رونما ہوئی تھی اسے قبل ازیں بہت کم دیکھا گیا تھا۔ بہت کم ادیب خواب کے مسافر بنتے ہیں۔ عموماً واقعات کے وقائع نگار بن کر ہی ادیب بننا پسند کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے فیض اپنے معاصرین سے الگ اور مختلف ہے۔

اس عالمی دنیائے سرخوشی کے زیر اثر موضوعاتی نظم نے واقعاتی صورت اختیار کی' میراجی کا رویہ زمانی اعتبار سے انحرافیہ ہوا' تصدق حسین خالد نے رد فطرت خارجیہ کی روش اختیار کی۔ راشد نے فکری دوراہے کو میٹا فزکس میں بدلا۔ تاہم موضوعاتی نظم مشاہدے کی واقعاتی صورت ہی میں گزر کرتی رہی۔ اردو شاعروں نے واقعے کے تسلسل ہی کو مدنظر رکھا اور وہ نظم تحریر کرتے رہے جس کو ہم سب جانتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم مرکزی دھارے کو قلمبند کرتی رہی اور نئے طرز احساس کے تحت اس کے تمدنی اور روحانی ورثے

کی نگہداشت کا مظہر بنی۔ یہ صورت فیض اور ندیم قاسمی کو الگ الگ دنیاؤں میں متیم کرتی ہے۔ میں نے اپنی طویل نظم "باغ دنیا" میں اسی لئے فیض کو اہل عجم کے بزرگوں کی محفل میں شامل کیا ہے کیونکہ اس کا شمار خواب کے مسافروں میں تھا اور وہ مشینی زمانے میں انسانی دل کی سلامتی کا خواہشمند تھا۔ دل اور محبت کی سلامتی فیض کا عالمی انسانی استعارہ ہے۔ وہ محبت کی نفی نہیں کرتا' محبت کی حفاظت کرتا ہے۔

مغربی یورپ کے ادیبوں پر کیمونسٹ ریاستی تجربے کا عجیب وغریب اثر ہوا تھا اس تجربے نے آندرے ژید' رسل اور آرتھر کوسلر کو اس تجربے کی تعبیر خواب میں سرخوش و بے حال کر دیا تھا۔ اس کیفیت کو اس زمانے میں صرف فیض نے قبول کرتے ہوئے (ایک شاعر کے طور پر) اپنا اثاثہ بنایا۔ دنیا کے دیگر ادیبوں نے زمانے کی آب وہوا کے مطابق اپنی آراء بدلیں' مگر فیض نے خواب کو اپنے تمدنی ورثے کے طور پر اپنائے رکھا۔ یہ رویہ فیض کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اور پھر فیض کی نوجوانی ہی میں ماضی کی ایک قدیم دنیا نے اپنا بند دروازہ کھولا اور نئے ممالک ظہور میں آئے۔ افریقہ' مشرق وسطی اور برصغیر اور جنوبی ایشیا کے ممالک نقشے کا عنوان بنے۔ فیض نے اس دنیا کے لئے خواب کو سلامت رکھا اور خواب کے مسافر کے طور پر ان میں گزر کیا' ان کے آشوب کو نظم کیا' اور ان کے دلوں کے لئے خواب کی پاکیزگی کو قائم رکھنے کی سعی کی اس موقعہ پر ایک سنجیدہ سوال بھی ہے!

آپ پوچھیں گے کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں کیا فیض نے ان کا کہیں ذکر کیا ہے؟

میرا جواب یہ ہے کہ آپ دیکھیں کیا یہ باتیں اس کے مقام اور کلام کی وضاحت کرتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان باتوں کو فیض کے حوالے سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ فیض اپنے عہد کی کلچرل سائیکالوجی کا پاسدار ہے!

فیض نے اپنے بارے میں ہمیشہ یہ کہا کہ وہ شاعر ہے۔ اور شاعر کون ہے اس کا اس نے بہت کم جواب دیا ہے۔ شاید اس لئے کہ شاعر افراد' اقوام اور ملکوں کے خواب کو فراموش ہونے نہیں دیتا۔ خوابوں کا سلامت رکھنا شاعر کا فرض ہے۔ ان کی تعبیر کے راستے میں حائل دشواریوں کو دور کرنا اہل سیاست کا کام ہے۔ ہمارے اہل ادب سے یہی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ خواب دیکھے بغیر اہل سیاست کا رول اختیار کرتے رہے ہیں۔ اس لئے فیض ان سب سے الگ رہا۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آ سکا اور مغالطوں کا شکار رہا۔

فیض کی شاعری کا ایک نمایاں استعارہ "رقیب" کا ہے۔ 1945ء میں علی گڑھ ایم اے اردو کے طلباء اس بات پر خوش تھے کہ فیض نے رقیب کو ایک نیا مفہوم دیا ہے۔ اور وہ اس استعارے کو عشقیہ شاعری سے منسوب کرتے تھے۔ بعد ازاں اس کو سیاسی رقیب کا مفہوم بھی دیا گیا۔ غلط فہمی کا آغاز یہیں سے ہوا تھا۔

فیض کو اگر اس کی نسل کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نسل آزادی کی اور ایک نئی دنیا کے ظہور کی مشعل بردار تھی۔ اس نسل کا ایک ہی قبلہ تھا۔ تاہم آزادی کے بعد ظاہر ہونے والی دنیا میں جو لوگ اقتدار کے ذمہ دار ہوئے وہ رقیب کہلائے اور فیض نے ان کی یاد دہانی کے لئے کہا۔

"ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے"

ایسی یاد دہانی اس لئے بھی ضروری تھی کہ وہ نسل جس سے ان کا بھی تعلق تھا' خواب ہی کی مسافر تھی۔ اور خواب کی تعبیر چاہتی تھی۔ تاہم فیض کا ایسا استعارہ جنوبی ایشیاء کے لئے مخصوص تھا۔ فیض نے غزل کے باہر شعری دنیا میں اس استعارے کو نمایاں نہیں کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فیض کی شاعری میں گہرائی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ فیض نے گہرائی سے کیوں گریز پائی کی ہے؟ اور یہ امر کتنا مشکل تھا۔ خواب کے مسافروں کی دشواریوں سے شاعری کس نوع کی گہرائی حاصل کرتی ہے؟ اس پر غور نہیں کیا گیا۔ خواب کو سلامت رکھنے والے دشواریوں سے ادبی اور شعری گہرائی حاصل نہیں کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خوابوں سے بے وفائی کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے فیض نے برصغیر کی سیاست کو اپنا موضوع نہیں بنایا اس نے خواب کی سلامتی ہی کو قائم رکھتے ہوئے دل کو زندہ رکھنے کی سعی کی کہ نئے انداز فکر سے کہیں دل ہی باقی نہ رہے۔

ہر وہ شاعر جو خواب کا مسافر ہے' نئی دنیا کے استعارے کو قبول کرتا ہے اور نئی دنیا ایک نسل کے زمانے میں بہت کم ظہور میں آتی ہے۔ اس ضمن میں ایک دفعہ میں نے فیض سے پوچھا کہ انقلاب کب آتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ انقلاب آتے نہیں ہیں' ان کی آرزو کی جاتی ہے اور خواب کے بغیر کوئی بھی آرزو نشوونما نہیں پاتی۔ اس مقام پر میں اپنی ایک کہی ہوئی بات دہرانا ضروری سمجھتا ہوں جب میں نے ان سے پوچھا کہ 1789ء کے بعد دنیا کا سب سے بڑا واقعہ کون سا ہے؟ ان کا جواب تھا' انقلاب ایران۔ فیض کی رائے تھی کہ جب خواب کسی قوم کی سوچ کا جزو بنتا ہے تو اس سے انقلاب کے اجزائے ترکیبی پیدا ہوتے ہیں۔ اور نئی دنیا کے ظہور کی امید پیدا ہوتی ہے۔ انقلاب' تہذیبی ہوتے ہیں سیاسی نہیں ہوتے۔ اس لیے انقلاب فرانس کے بعد ایک ہی واقعہ اہم ہے جو امام خمینی کے انقلاب ایران کا ہے۔ کیونکہ اس کے پیچھے خواب ہے' لوگوں کی سوچ ہے' تاریخ ہے اور ایک مستقبل ہے جسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فیض کی یہ رائے اس لئے خیال انگیز ہے کہ انقلاب فرانس نے یورپ کے نئے زمانے کو نئی دنیا کا ترجمان بنایا ہے۔ اور جو خواب امام خمینی اور ان کے

فیض احمد فیض، اشفاق احمد اور قتیل شفائی

فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی

سلمان تاثیر، امین مغل، فیض احمد فیض، ایلس فیض اور کشور ناہید

منو بھائی اور فیض احمد فیضؔ

حمید اختر اور فیض احمد فیضؔ

صادقین
آغا ناصر اور
فیض احمد فیضؔ

عوام نے دیکھا ہے وہ بھی نئی دنیا میں اپنی تعبیر پا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ جب امام خمینی کی رحلت کے بعد تہذیبوں کے تصادم کا ذکر ہوا تو صدر خامنہ ای نے کہا کہ تصادم کے بجائے تہذیبوں کے درمیان مکالمہ ہی انسانیت کو بچا سکتا ہے۔

فیض کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ایک عہد آفریں شاعر اپنے باطن کو افشا نہیں کرتا تاہم اس کی زندگی میں جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے وہ صرف سطحی ارتعاش کے حوالے سے ہے۔ کیونکہ فیض نے ہر جگہ یہی کہا ہے کہ وہ شاعر ہے۔ اسے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے سمجھنا اس لئے غلط فہمی بھی پیدا کرتا ہے کہ وہ درمیانے طبقے کی تعلیم یافتہ نسل سے تعلق رکھتا تھا اور ماحول میں حسن کی تلاش اس کا موضوع تھا۔ حسن اس کے نزدیک آزادی اور حقوق انسانی کے تقدس سے آشکار ہوتا ہے۔ فیض کا نظریہ حسن' دراصل جان رسکن سے ماخوذ تھا جو کہتا ہے کہ بدنمائی کا ماحول انسان کو بدنما بنا دیتا ہے اور ہر نوع کی بدصورتی انسان کی انسانیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ فیض کے زمانہ طالب علمی میں رسکن کا فلسفہ حسن بہت معروف تھا۔ فیض کے ضمن میں یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ علمی تصورات سے متاثر ہوا اور سیاسیات نے اس کے شعور کو ملوث نہ کیا۔ حسن کو معاشرے' سیاسیات اور انسانی حقائق میں رائج کرنے سے قادر مطلق کے وصف جمال کی تائید ہوتی ہے۔ فیض کو اس زاویے سے پہچاننے کی ضرورت ہے۔ تاہم اگر بیسویں صدی کی موضوعاتی نظم کی تاریخ کا ذکر ملحوظ ہو تو مرکزی دھارے میں احمد ندیم قاسمی کی نظم نظر آتی رہے گی اور خواب کے مسافروں میں فیض نمایاں دکھائی دے گا اس ضمن میں فیض نے حافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذیل کے شعر کو اپنا نشان راہ بھی گردانا ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

☆☆☆

ادارہ یادگار غالب کے صدر فیض احمد فیض، عباس احمد عباسی، محسن بھوپالی، صہبا لکھنوی، شبنم رومانی (غالب لائبریری کراچی 21 جولائی 1970ء)

جمیل جالبی

نئے شاعر......فیض احمد فیض

ویسے تو فیض کا شعری سرمایہ بہت تھوڑا ہے لیکن جتنا کچھ ہے وہ اپنی جگہ اس قدر ٹھوس اور وزنی ہے کہ بہت سے ہم عصر شعراء کا ضخیم شعری سرمایہ اس کے سامنے سبک اور کم تر معلوم ہونے لگتا ہے۔ فیض کی اس چھوٹی سی وسیع دنیا میں وہ سب کچھ ہے جو دوسروں کے یہاں ملتا ہے اور وہ سب کچھ بھی ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں ملتا۔

فیض کی شاعری کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جس میں اس نے رُومانی نظمیں اور عشقیہ اشعار کہے۔ اس دور کو ہم "رومانی دور" کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں فیض نے زیادہ تر تخیلی دنیا میں دن گذارے۔ عشق کی تلخ جامی' غموں کی زہرہ گدازی' لبریز آہوں کی سیہ پوشی اور ناکام نگاہوں سے دوچار ہوا اور حسینہ کے رسیلے ہونٹ' معصومانہ پیشانی اور حسین آنکھوں کے سہارے' زندگی کے دن گذارے۔ اس دور کی شاعری میں بورژوائی' یاس و قنوطیت زیادہ جھلکتی ہے' وہ اب غم اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔ دعوائے صبر و شکیب غلط ثابت ہوتا ہے' خاطر بے تاب کا قرار قبضہ سے باہر ہو جاتا ہے' خمار خواب سے لبریز احمریں آنکھیں' سفید رُخ پر پریشاں عنبریں زلفیں' دراز قد اور لچکیلا گداز جسم' سُرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیائیں' حسن محبوب میں پنہاں جنتیں' خمار شباب' بیاض رُخ پر سحر کی سی صباحت اور مخملیں بانہیں اس کے لئے مادی دُنیا سے زیادہ قابل التفات اور بیش بہا ہیں۔ اس دور میں وہ زندگی سے گریزاں نظر آتا ہے۔ وہ دنیا کے ہر ذرے اور ہر چیز کو محبت کے نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور دنیا کی ہر چیز پر عشق و محبت کے حسین افسانوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس دور میں اس کی محبوبہ محض خیالی ہے جس کا تصور اس کے لئے جاں آفریں اور رُوح فزا ہے۔ اس دور میں اس کی شاعری زیادہ تر روایتی شاعری ہے۔ لیکن اس روایتی شاعری میں بھی اس کی انفرادیت الگ جھلکتی ہے۔ وہ بہت سے گذشتہ شعراء کا تاثر قبول کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام تاثرات و احساسات پر اس کا اپنا انفرادی تاثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اور لاشعوری طور پر ایک جدا و منفرد راستہ خود بخود نکل آتا ہے۔ اسی دور میں وہ کہنہ پیکر میں نئی روح آباد کرتا ہے۔ اور اس نئی روح کو عشقیہ روایات میں تحلیل کر دیتا ہے۔ پہلے دور میں آخری خط' حسینہ خیال سے' مری جان اب بھی...... سرود شبانہ' انجام کار' آج کی رات' اور ایک رہگذر پر اچھی نظمیں ہیں۔

فیض کی شاعری کا دوسرا دور' وہ دور ہے' جس میں وہ زندگی کا کافی مشاہدہ و تجربہ کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ فراریت جو پہلے دور میں نمایاں طور پر مترشح ہوتی ہے۔ دوسرے دور میں تقرب اور وابستگی میں بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ عشق اس دور میں بھی اس کی رُوح اور جان ہے۔ لیکن محبوب کے گداز سینے پر سر رکھے ہوئے اس کی نظر ان گنت صدیوں کے بہیمانہ طلسم' بہتی ہوئی پیپ' اور گلتے ہوئے ناسوروں پر بھی جا پڑتی ہے' اور وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ محبت کا شدید جذبہ ایک دم گم ہو جاتا ہے اور خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسموں کے خیال سے وہ کانپ جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ حسن کی دلکشی بالکل بھول جاتا ہے' اور زمانے کے دکھ اور درد کو محبت پر ترجیح دینے لگتا ہے اور زمانے کی راحتوں کو وصل کی راحتوں سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔ پاپ کے پھندے اور ظلم کے بندھن' دنیا کے غم' ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب کہ جو پر تولے ہوئے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں' اس کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ شاہراہوں پر غریبوں کا بہتا ہوا لہو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ جسم کی مایوس پکار' دل کی بے سود تڑپ' عرصہ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی' سفاک مسیحا اور مدقوق جوانی دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے اور ہر تباہی و بربادی کو نظر انداز کرتے ہوئے مظلوم غریبوں کو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

اور اس ذلیل و خوار زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ موت غم سے نجات کا سہل ذریعہ ہے۔

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا

یہ دور اس کی شاعری کا بہترین دور ہے۔ تمام مشہور نظمیں جن پر اس کی شہرت کا زیادہ دارومدار ہے' اسی دور کی پیداوار ہیں۔ مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ' سوچ' رقیب سے' چند روز اور میری جان' کتے اور موضوع سخن وغیرہ' اسی دور کی بہترین نظمیں ہیں۔

فیض کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیات' اس کے خیالات کی سنجیدگی' شخصیت کا متوازن پن' ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے۔ وہ واقعہ سے شدت کے ساتھ ضرور متاثر ہوتا ہے اور اسے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا ضرور محسوس کرتا ہے۔ اس واقعہ سے اس کے شاعرانہ سرود کے تار بھی مرتعش ہوتے ہیں لیکن جب وہ اسے شعر کا جامہ پہناتا ہے تو اس شدید جذبے میں ہلکی سی نرماہٹ اور لہجے میں دبا دبا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جھنجھلاہٹ اور غصہ جس سے دامن اور گریبان کے تار میں فصل باقی نہیں رہتا' اس کی شاعری میں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ ہر حقیقت کو باریک پردوں سے جھانکتا ہے اس وقت اس کی تیوری پر بل ضرور ہوتے ہیں لیکن ہونٹوں پر معصوم سی نرمی بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر شاعری کا ایسا رنگین پردہ ڈالتا ہے جس سے واقعہ کی شدت ایک حد تک کم ہو جاتی ہے۔ لیکن شعریت' کشش اور جاذبیت میں بلا کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے اشعار رنگین تتلیوں کی طرح دل و دماغ کے سبزہ زار میں ادھر سے ادھر اڑنے پھرنے لگتے ہیں۔ فیض اپنے شدید احساسات کو مدھم اور ہلکا کر کے شعر کا لطیف جامہ پہناتا ہے اسی لئے اس کی شاعری کی آواز مدھم سریلی اور دبی دبی سی ہوتی ہے۔ وہ قاری کے ذہن کو بچوں کی طرح تھپکتا ہے لیکن سونے نہیں دیتا۔ پڑھنے والے پر ایک قسم کی بیدار نیم خوابی طاری رہتی ہے۔ وہ قاری کو شاعرانہ رنگینی اور حقیقت کی شگفتہ بھول بھلیوں میں گم کر کے کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی شاعری براہ راست جذبات سے اپیل نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ دل و دماغ میں اپنا گھر کرتی ہے اور قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خاموش رکھنے پر زور دیتی ہے۔ اس کی شاعری ایک ایسے چور کی طرح ہے جو رات کی ہمت افزا تاریکی میں دروازہ پر بیٹھے ہوئے خوفناک کتے کو ایک گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی روح' اس کی شاعری میں تحلیل ہو کر قاری کی روح میں سرایت کر جاتی ہے یہی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اسی نقطہ نظر سے کہتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اسی نقطہ نظر پر مبنی ہوتا ہے۔ خود ضبطی' فیض کی وہ خصوصیت ہے کہ جو اسے ترقی پسند شاعری میں ایک ممتاز درجہ دلاتی ہے۔ انتہا پسندی کے باعث بہت سے ترقی پسند شعراء اچھا شعری سرمایہ تخلیق نہ کر سکے جبکہ فیض انتہا پسندی سے گریز کر کے ہر چیز کو اعتدال میں سمو دینے کا عادی ہے۔

فیض کسی خاص مرکزی خیال کا شاعر نہیں۔ وہ کسی پیغام یا فلسفہ کو اپنے کلام میں بار بار نہیں دہراتا۔ اس کا اجتماعی احساس' انفرادی احساس میں شیر و شکر ہو کر شعری صفات کا جامہ پہنتا ہے۔ اس کی شخصیت سوسائٹی کے خاکے میں مدغم نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت ہے اور اس کی شخصیت معاشرے کا خاکہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے زندگی کا شاعر کہنے پر مجبور ہیں' اور اس فراریت کو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول جاتے ہیں جو اس کے دور اول کی نظموں میں خصوصاً اور دور دوم کی نظموں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ جس خیال اور احساس کو وہ ایک مرتبہ شعر کے لطیف پردوں سے دکھاتا ہے' اسی خیال کے بالکل متضاد پہلو کو دوسری جگہ نظم کر کے اپنے گذشتہ خیال کی تردید کر دیتا ہے۔ فیض محض وقت کا شاعر نہیں' وہ سماج کو انسانیت کی حقیقی اور جائز بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے۔ ان تمام ظلم کے بندھنوں اور رسم و رواج کی قیدوں اور بہیمانہ طلسمات سے انسان کو نجات دلانا چاہتا ہے کہ جن کی وجہ سے سماج میں برسوں سے ناسور بھر رہے ہیں۔

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھتا ہے اور اس انقلاب کے ذریعہ دل کی بے سود تڑپ اور جسم کی مایوس پکار کو دور کرنا چاہتا ہے کیونکہ

اپنے اجداد کی میراث ہیں معذور ہیں ہم
مگر
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

جن خیالات کی تشریح فیض نے اپنی مشہور نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' میں کی ہے اور محبوب کے حسن کی دلکشی اور وصل کی راحت پر زمانے کے دکھ درد کو ترجیح دیتے ہوئے منفی پس و پیش ظاہر کیا ہے۔

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ

اور چند لمحات کے لئے محبوب کے رسیلے ہونٹوں' دلکش حسن اور گداز لچکیلے جسم کو بالکل بھول گیا ہے۔

انہی خیالات کی تردید ''موضوع سخن'' میں صاف طور سے کردی ہے' وہ جانتا ہے کہ 'سرخ وسیاہ صدیوں کے سایہ تلے آدم و حوا کی اولاد پر کیا کیا گذری' ہے۔ جہاں ہر سمت پُر اسرار کڑی دیواریں' ہیں اور جہاں ہزاروں کی جوانی کے چراغ جل بجھے ہیں اور جہاں ہر گام پر قتل گاہیں موجود ہیں۔ لیکن ۔

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت و دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے!

اور اسی لئے۔

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

فیض اپنی ساری شاعری میں ایک غیر ذمہ دار ثالث کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ غیر ذمہ داری عشق اور تغزل کی شدید تحلیل کا نتیجہ ہے۔ ایک بات کہہ کر کر جانا فیض کا خاص حصہ ہے۔

فیض کی شاعری میں تصور پرستی اور حقیقت نگاری کا ایسا امتزاج ہے کہ جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک۔ اس کی شاعری ایک ایسی دلپذیر قوس قزح کی طرح ہے کہ جس میں بارش کے بعد ساتوں رنگ ایسے نکھر آتے ہیں کہ ہر شخص اس کی طرف دیکھنے اور انگلی اٹھا کر دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک خاموش تچھتپاہٹ' ایک ہلکی بیداری' مدہم جذبات کی شدید فراوانی اور انقلاب کی خفیف لیک رواں دواں نظر آتی ہے۔ تسلسل' ربط' احساسات کی نزاکت اور سویا ہوا حزن اس کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔

فیض نفسیات کا شاعر ہے' نفسیات اور فیض کی شاعری دو جدا چیزیں نہیں ہیں بلکہ شاعری کا تار و پود اور نظم کے تانے بانے سب اسی سے بنے گئے ہیں۔ انگریزی ادب کے شعرائے نفسیات ہوپکنس' ایلیٹ' اوڈن اور سپنڈر وغیرہ کا تاثر اس کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گیا ہے کہ جس کی وجہ سے اردو ادب میں اس کے لئے خود ایک الگ راستہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے سماجی ناسوروں کو ضرور کریدتی ہے لیکن تیزی اور سختی سے نہیں' بلکہ نرمی اور مانوسیت سے۔ ''مانوسیت'' فیض کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ 'مرے ہمدم! مرے دوست!' اسی مانوسیت کی بہترین مثال ہے۔

ہم بار بار کہتے چلے آئے ہیں کہ فیض لطیف پردوں کا شاعر ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ بہت کچھ اپنے موضوع اور مسالے کے لئے فراہم کرتا ہے۔ اجتماعیت' معاشرت' اقتصادیت اور سیاست' غرضیکہ سب سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ ان سب چیزوں کو شعر کے لطیف پردوں میں ایسا ملبوس کر دیتا ہے کہ اس کی نظم یا شعر' سیاست یا مقصد کے ماسوا' سب سے پہلے شعر رہتا ہے۔ فیض شعوری طور پر ان سے گریز نہیں کرنا چاہتا کیونکہ سیاست اور ملکی زبوں حالی' خستگی' ذہنی پس ماندگی اور گراوٹ' ملک و قوم دونوں کی ترقی کے راستہ میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے وہ ان تمام واقعات اور گرد و پیش کے زبوں ماحول سے فرار چاہتا ہو' لیکن شاعر ہونے سے پہلے وہ انسان ہے۔ اس لئے اگر شعری عناصر اسے گریز کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو انسانیت آڑے آجاتی ہے اور اس طرح سیاسی' ملکی اور قومی کیفیات اس کی شاعری میں از خود اثر انداز ہو کر خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر ایک بہت باریک فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ شاعر کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ سیاسی' ملکی اور قومی حالات کو ایک انسان کی حیثیت سے سمجھے۔ لیکن شعری جامہ پہناتے وقت اسے چاہیے کہ وہ یہ بات ضرور ذہن نشین رکھے کہ جہاں وہ انسان ہے' وہاں وہ شاعر بھی ہے۔ اس لئے اپنے جذبات میں سیاسی' ملکی و قومی تاثرات کو شاعرانہ لہجہ میں الاپے۔ تا کہ بیک وقت شعر و سیاست کا بہترین امتزاج اور کامل اختلاط کا رابطہ استوار رہ سکے۔ یہ خصوصیت فیض کی شاعری میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ ویسے تو قدما و متاخرین میں سے ہر ایک نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر شعر کہے لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں کہ جن کی سیاسی تشریح کرنا شعر و شعریت کا خون کرنے کے مترادف ہوگا۔ حسرت موہانی' جوش' مجاز' جواد' علی سردار' ن م راشد' احمد ندیم' ساحر اور مخدوم نے بھی اپنی شاعری میں سیاسی عناصر کو گھلایا اور ان میں کامیاب اشعار کہے' فیض اسی دبستان کا ایک فرد ہے۔ فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت' شاعرانہ بہاؤ' رنگین لہجہ' لطیف و خوشگوار احساسات' دائمی ارتسامیت' مدہم جذبات کی روانی اور منطقی سلجھاؤ' کامیاب امتزاج کے ساتھ' ایک دوسرے میں ملے جلے ہیں۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' میں شعریت و سیاست کا شیریں امتزاج قابل غور ہے۔

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

موضوع وہی ہے جس پر متعدد شعراء نے طبع آزمائی کی اور اپنی نظموں کا مرکزی خیال بنایا مگر جو پیرایہ بیان فیض نے اختیار کیا' وہ دوسروں کے یہاں مشکل سے ملتا ہے' واقعات کی شدت کو کس طریقہ سے شعریت کے لطیف پردوں میں جا بٹھایا ہے کہ

شعریت اور سیاست دونوں ایک دوسرے میں بالکل شیر وشکر ہوگئے ہیں۔ اس سلسلہ میں "سوچ"، "رقیب سے"، "چند روز اور مری جان!"، "کتے"، "ہم لوگ"، "سیاسی لیڈر کے نام"، "اے دل بے تاب ٹھہر"، "میرے ہمدم' مرے دوست" قابل قدر نظمیں ہیں۔ وہ عشق سے بھی ایک نیا سیاسی سبق سیکھتا ہے' اور اپنے تمام گذشتہ اسباق بھول جاتا ہے ۔ ہم نے عشق میں کیا سیکھا ہے کیا کھویا ہے؟

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے، معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے

وہ سماج کی اس غلط تقسیم' ظلم و تشدد اور ناجائز دباؤ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ شعری بلبلے اس کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اور وہ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پکار اٹھتا ہے ۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں!

یا

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

قید و بند' پر اسرار کڑی دیواروں' بندشوں' پابندیوں' پھندوں اور بندھنوں سے وہ بہت گھبراتا ہے اور ان سب کو توڑ تاڑ کر چاہتا ہے کہ اپنے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دے۔ 'عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی' 'اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم جن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد' 'دل کی بے سود تڑپ' جسم کی مایوس پکار' یہ سب پیچیدگیاں اور الجھنیں اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں اور وہ ان سب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ضرور اس مسئلہ کے حل میں کامیاب

فیض احمد فیض ایک مشاعرہ میں کلام سناتے ہوئے

ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اس کا لہجہ رجائی ہوتا ہے ۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
ایک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

فیض کی یہ پیشین گوئی ایک حد تک پوری ہوتی جا رہی ہے' ہندوستان غلامی کے چنگلوں سے نجات پا چکا ہے اور یقیناً کچھ عرصہ بعد وہ مطلوبہ سماج کہ جس کی تلاش فیض اور اس کے رفقائے کار کو ہے' مل جائے گی۔

فی زمانہ اشتراکی شاعر ایک عام لفظ ہوگیا ہے۔ اشتراکی شاعر ہم اس شاعر کو کہتے ہیں کہ جو غریبوں کی حمایت کرتا ہے' مزدوروں کو سراہتا ہے' سرمایہ داروں کی مخالفت کرتا ہے' شہنشاہیت اور استبدادیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے' لیکن اس موجودہ دور میں یہ باتیں اس قدر ضروری ہوگئی ہیں کہ کوئی شاعر براہ راست یا بالواسطہ روس کے نظریات سے متاثر ہو یا نہ ہو' یہ خیالات جزو شاعری بنتا ہے کیونکہ یہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت' وقت کی سب سے بڑی پکار

اور تاریخی تقاضہ ہے۔ اس طرح فیض بھی اشتراکی شاعر ہے۔ یہ رجحان ترقی پسند شاعری میں بالخصوص بہت عام ہے۔ علی جواد زیدی کی شاعری کا مجموعی دارو مدار اسی نوع کی شاعری پر ہے۔

ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا
مفقود و فنا ہو جائیں گے جو ظلم و ستم کے خوگر ہیں
افلاس نچائے گا ان کو جو زرداروں کے یاور ہیں
مزدوروں نے کی ہے صدیوں سے دنیا بھر میں تیاری
ہٹ جائے گی یہ فسطائیت، شاہنشہی، سرمایہ داری
ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا

اور فیض مزدوروں کی حمایت یوں کرتا ہے۔

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے۔
آگ سی سینہ میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

دونوں شاعر سرمایہ داری کی مخالفت اور مزدوروں کی موافقت کے لئے آواز بلند کرتے ہیں' مگر دونوں کا لہجہ' دونوں کا اسلوب' دونوں کا طریقہ اظہار کس قدر مختلف ہے۔ آج کل انقلاب کے اصل معنی یہی ہیں کہ مزدوروں کی موافقت کی جائے' ان کے لئے اپنی تمام شاعری کو وقف کر دیا جائے۔ ضروری نہیں کہ وہ خیالات عملی جامہ بھی پہنیں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری میں بھی بہت پرخلوص قسم کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جس سے اس کی شاعری میں وزن اور انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ بہت مضبوط قسم کا اشتراکی شاعر ہے اور اس لئے انقلابی بھی۔ علی سردار جعفری کی شاعری تو محض اشتراکیت ہے۔ وہ تو اشتراکیت کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر سوچنا اچھا اور مصلحت وقت کے مطابق تصور ہی نہیں کرتا۔ اب کچھ اس کی شاعری کا دھارا عشق اور رومان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھئے اس کے بعد وہ کدھر رجوع ہوتا ہے۔ اس کی نظم "مزدور لڑکیاں" کا مقابلہ ہم فیض کی نظم "کتے" سے کر سکتے ہیں۔ چونکہ بغاوت پر آمادہ ہونے کے بعد انسان اچھا برا سوچنے پر مائل نہیں ہوتا' اس لئے انتہا پسندی اور تغزل و شعریت کی کمی کا احساس ہمیں علی سردار جعفری کی شاعری میں اکثر ہونے لگتا ہے۔

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

بہر حال وہ اشتراکی شاعری میں ایک کامیاب شاعر ہے۔ اس کی شاعری اکثر ہنگامی اور وقتی ہے۔ فیض مزدوروں کی ضرور حمایت کرتا ہے' یہ موضوع وقت کی تبدیلی سے ضرور بدل جائے گا' مگر فیض کی شاعری میں وہ دوامی جھلکیاں ہیں جو اسے اور اس کی شاعری کو ہمیشہ برقرار رکھیں گی۔ وہ اشتراکی شاعری کو بھی ایسے عالمگیر لہجہ میں بیان کرتا ہے کہ اس کی شاعری اشتراکی و انقلابی ہوتے ہوئے بھی بڑی موثر و دلپذیر ہوتی ہے۔ ساحر لدھیانوی بھی کامیاب انقلابی و اشتراکی شاعر ہے لیکن اس کے بیان میں بھی بعض ایسی کرنیں موجود ہیں جو اس کی شاعری میں جان ڈال کر اس کو چکا دیتی ہیں۔ وہ "تاج محل" کو بزم شاہی تصور کر کے اپنی محبوب کو اس سے گریز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس لئے "تاج محل" جو اصل میں "مظہر الفت" خیال کیا جاتا ہے اور جہاں محبت کی تجدید ہو سکتی ہے وہ عشق کو فراموش کر کے اس منظر سے کانپ جاتا ہے اور اپنی محبوبہ سے کہیں اور ملنے کی التجا کرتا ہے۔

میری محبوب! پس پردۂ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون
سینہ دہر کے ناسور ہیں' کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون
میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے انہیں شکل جمیل
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارا، یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

اس نظم میں ساحر' فیض سے بہت نزدیک ہو گیا ہے اور اس وقتی موضوع میں اس نے وہ دوامی جھلکیاں اور عالمگیر شاعری سموئی ہے کہ یہ نظم نئی شاعری پر ایک زندۂ جاوید نقش بن گئی ہے۔ فیض کی مجموعی شاعری کو ہم ان لوگوں کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں کہ جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ شاعری مقصدی رہنے کے بعد شاعری نہیں رہ سکتی۔ اصل میں شاعر وہی باعظمت ہے جو وقتی اقدار کو دائمی اقدار بنا دے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا ایک حصہ اشتراکی و انقلابی کے ذیل میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری کی عظمت کا راز اس کا تغزل اور شعریت ہے۔ تغزل اور شعریت ہی ہے کہ جو وقتی ہنگاموں میں جادو بھر کر انہیں دائمی بنا دیتی ہے۔ مجاز سماج میں اصلاح کے لئے اندر سبھا کا ساز و سامان اور

گلشن و شبستان پھونکنے اور جلانے کا ضرور متمنی ہے مگر اس تیزی میں وہ دھیما پن اور وہ ٹھہراؤ ہے کہ اس کی شاعری بجائے دل پر اثر کرنے کے دماغ پر اثر کرتی ہے۔ مجاز انقلابی شاعری میں جوشؔ سے قریب ہوتے ہوئے بھی قریب نہیں۔ اس کی شاعری میں جذبات کا زیریں دھارا' ہر ہر مصرعے میں رواں نظر آتا ہے۔ مجازؔ اپنے دور کی شاعری کا صحیح نمائندہ ہے۔ اختر الایمان تو ایک حد تک فیضؔ ہی کے سکول کا شاعر ہے۔ وہ براہِ راست اور بالواسطہ فیضؔ کی شاعری سے متاثر ہے لیکن اس تاثیر پر اس کی اپنی صلاحیت و انفرادیت حاوی ہو جانے کے باعث نئی شاعری میں اس کے لئے ایک واضح جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ جوشؔ نے خونی ہولی والا انقلاب لانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی انقلابی شاعری تخیلی انتہا پسندی ہے جس میں خلوص کا فقدان اکثر محسوس ہونے لگتا ہے وہ بورژوا طبقہ کے ادب وفنون کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ سب سے ضروری وہ یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو بورژوا طبقہ سے متنفر کر کے انہیں پرولتاری طبقہ کی طرف رجوع کرے۔ جوشؔ عملی شاعر نہیں۔ وہ اشتراکی ضرور ہے۔ اس کے خیالات بھی انقلابی ہیں مگر جہاں تک صحیح معنی میں انقلابی شاعری کا تعلق ہے وہ جوشؔ نہ پیدا کر سکا۔ جوشؔ ان معنی میں تو قابلِ قدر ہے کہ اس نے اپنی "فنی انقلابی شاعری" سے ایک بہت بڑا گروہ انقلاب پسند نوجوان شعراء کا پیدا کرایا' مگر بذاتِ خود کوئی زبردست انقلابی کارنامہ پیدا نہ کر سکا۔ اور اب تو اس کی شاعری میں واضح قسم کا زوال آ چلا ہے جو ورڈز ورتھ کی شاعری میں اس کے شباب کے بعد آ گیا تھا۔ انقلابی شاعری پیدا کرنے سے قبل' انقلاب کے معنی سمجھنا ضروری ہیں۔ ورنہ انقلاب بے مقصد ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی جوشؔ اپنے فن کی وجہ سے بہت زیادہ قابلِ قدر ہے اور ہم اس کی کئی برسوں پہلی شاعری کو نہیں بھلا سکتے۔ وہ اردو ادب اور شاعری کا ایک ناقابلِ فراموش موڑ ہے۔

ہاں! تو اگر ہم اس بات پر ذرا تامل سے غور کریں کہ کسی بڑے شاعر کی کامیابی کا سب سے بڑا راز کیا ہے؟ تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ فنکار اور شاعر کے لئے جہاں تخلیقی صلاحیتیں اور فطری قوتیں درکار ہیں وہاں تنقیدی بالغ نظری بھی لازمی ہے تاکہ وہ اپنے دماغ میں متوازن پن' سنجیدگی اور اعتدال کو ناپ تول کر برقرار رکھ سکے۔ فیضؔ جہاں تخلیقی صلاحیتوں کا حامل ہے وہاں وہ خود کو تنقیدی نظر سے تولنے کا بھی عادی ہے وہ تخلیق کو تنقید کی صحیح کسوٹی پر پرکھ کر وجود میں لاتا ہے' اور اسی میں اس کی شاعری کی زبردست کامیابی کا راز مضمر ہے۔

جدید شاعری کا تار و پود' انفرادی اور اجتماعی زندگی سے مل جل کر بنا گیا ہے۔ ایک طرف تو جدید شاعر خود سے گفتگو کرتا ہے اور دوسری طرف بیسویں صدی کے سیاسی ماحول' نفسیاتی کیفیت' سائنس کی اختراعات اور نئی نئی مشینوں کی ایجادات سے متاثر ہوتا ہے اور اس طرح دونوں عناصر کے باہم ربط و ضبط سے اس کی اندرونی اور بیرونی۔ خارجی اور داخلی' دونوں دنیائیں واضح ہو جاتی ہیں۔ فیضؔ کی شاعری ایسے ہی بیرونی و داخلی ماحول کے امتزاج سے بنی ہے۔ فیضؔ نام نہاد ترقی پسند شعراء کے برعکس شاعری کو وکالت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کے کلام میں وکالت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔

فیضؔ کی اکثر نظمیں خود کلامی کی مثالیں ہیں۔ اس صنف میں شاعر خود سے باتیں کرتا ہے۔ طرح طرح کے تصورات و خیالات اس کے ذہن میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ بیچ میں کوئی دوسرا شخص مداخلت نہیں کرتا۔ اس کا واحد حاضر یا جمع حاضر کوئی نہ کوئی مخاطب ضرور ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ وہاں موجود ہو۔ اس کا موجود ہونا یا نہ ہونا کچھ زیادہ اہم نہیں ہوتا۔ یہ صنف شاعری انگریزی میں بہت مقبول ہے اور اردو ادب میں نیا اضافہ۔ اس میں ترقی اور اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ فیضؔ کی چند نظمیں اس سلسلے میں قابلِ توجہ ہیں۔ کچھ اور جدید شعراء نے اس میں طبع آزمائی کی ہے لیکن فیضؔ زیادہ کامیاب اور قابلِ تحسین ہے۔

فیضؔ کی اکثر نظمیں صاف اور واضح ہیں۔ اس کی شاعری میں ہر قسم کے لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے ان لوگوں کے لئے بھی جو شعر کو محض شعریت کے لئے پڑھتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو محض تفریحی شغل سمجھ کر مطالعہ کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو شاعری میں' شعریت کے علاوہ انقلابی عنصر' ترقی پسند تفسیر اور فلسفیانہ گہرائی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ فیضؔ ایک ایسا شاعر ہے کہ جو ہر طبقہ کے معیار کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور رکھتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ ہر شخص اپنے معیارِ ذہن کے مطابق' اس کی شاعری میں سے اپنے لئے کچھ نہ کچھ تلاش کر لیتا ہے۔

جنسی خواہش نئے ادب میں اس قدر عام ہو گئی ہے کہ کوئی شاعر یا کوئی افسانہ نگار اس سے محفوظ نہیں۔ فیضؔ کے ہاں جنسی خواہش بھی ملتی ہے مگر یہ سب کچھ اعتدال اور شعریت کے لطیف پردوں میں ایسے ملبوس ہوتا ہے کہ رجعت پسند تک اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جنسی خواہش اور عشقیہ شعور نسلِ انسانی کی بقا کے لئے بہت ضروری ہیں۔ فیضؔ کی جنسی شاعری میں ایک ایسی گدگدی اور سرسراہٹ سی پوشیدہ ہے کہ پڑھنے والا ایک گونہ فطری ہلکی سی کسک ضرور محسوس کرتا ہے۔ موضوعِ سخن کے یہ چند مصرعے پڑھیے

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے

رات

اور..... مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی۔

اور..... ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات۔

آج پھر حسن دل آراء کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں' وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تصویر
اپنے افکار کی ' اشعار کی دنیا ہے یہی
جان مضموں ہے یہی شاہد معنی ہے یہی

فیض بھی راشد کی طرح وصل کے لحہ کو فضول کی باتوں اور ادھر ادھر کے شکوے شکایتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا' بلکہ محبوبہ اگر اس قسم کا ذکر چھیڑتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے۔

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

کیونکہ ''آج کی رات'' ساز درد کے لئے نہیں ہے۔

فیض کی جنسی شاعری' فطری بھی ہے اور تعمیری بھی۔ مگر فیض کی جنسی شاعری سے زیادہ' نوجوانوں پر میراجی اور راشد کی شاعری کا اثر پڑا ہے۔

فیض نے فکر واحساس کی ایک نئی تکنیک اس میں دی جو اس دور کی ترجمانی کے لئے موزوں ہے۔ ان کے مصرعوں کی لے میں جو کھنک یا زمزمہ (Tilt) ہے اور ان کی فقرہ سازی (Phrasing) میں جو تازگی اور موزونیت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک خلاقانہ انفرادی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کر دیا انہوں نے جس بصیرت افروز اور حساس خلوص اور فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے تعلق کر کے پیش کیا' یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک الکل نئی چیز تھی۔ نئی اور قابل قدر۔ عشقیہ شاعری میں جنسی رجحان کو ایک لاینفک طریقہ سے ملانا فیض کا خاص حصہ ہے' جسے اردو شاعری تمام عمر نہیں بھلا سکتی۔

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھنے کا عادی ہے۔ دور اول میں' جس کو ہم نے رومانی دور کے نام سے موسوم کیا ہے' تمام نظمیں عشقیہ و رومانی ہیں۔ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز وہ محبوب کے سینے پر سر رکھ کر اس کے دل کی خاموش و شیریں دھڑکنوں کے سننے کا متمنی نظر آتا ہے۔ یہ جذبہ اس کے اس دور کی نظموں کے ہر ہر مصرعہ سے مترشح ہے۔ دوسرے دور میں انقلاب اور حسن وعشق' ایک دوسرے میں نفسیاتی طریقہ پر ایسے شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار اور ناممکن نظر آتا ہے۔ فیض نے حسن وانقلاب کو ایک دوسرے میں ایسا سمو دیا ہے کہ انقلاب میں حسن اور حسن میں انقلاب کا پہلو نظر آنے لگا ہے۔ اور یہ تحلیل اردو شاعری میں بالکل نئی ہے۔

عشق کی اندوہ گیں فضا سے تنگ آ کر وہ ''آخری خط'' لکھتا ہے جس میں وہ موت کی تمنا کرتا ہے۔ یاس وحرماں' اندوہ وغم سے تنگ آ کر عاشق ہمیشہ آخری خط لکھا کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ خط' آخری خط ہو' لیکن عشق کی اصطلاح میں آخری خط وہ خط ہوتا ہے جس میں شاعر' اپنی محبوب سے تنگ آ کر موت کی خواہش ظاہر کرتا ہے اور فیض کا ''آخری خط'' شاید کچھ ایسا ہی آخری معلوم ہوتا ہے۔

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں!
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی
(آخری خط)

فیض اپنی رومانی نظموں میں ماحول بھی رومانی رکھتا ہے' جس سے تاثیر وتاثر' اخلاص و جذبہ میں بلا کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''سرود شبانہ'' رومانی ماحول کے لحاظ سے ایک قابل قدر نظم ہے۔ اس نظم کو گنگنا کر پڑھنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفل ہست و بود ویراں ہے
پیکر التجا ہے خاموشی
بزم انجم فسردہ ساماں ہے
آبشار سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزو خواب ہے گویا!
ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں!

اس نظم کی شعریت ملاحظہ ہو' تمام منظر نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے' یہی اس کی رومانی شاعری کی جان ہے۔ اس کی رومانی شاعری کا ایک ایک مصرعہ مانوس نشتر معلوم ہوتا ہے جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس کی شاعری کے مدھم جذبات کی سطح کے نیچے متلاطم لہریں رواں دواں نظر آتی ہیں۔ اس کی رومانی شاعری کے لہجہ میں وہ گھلاوٹ ہے کہ قاری اور شاعر کے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہو جاتی ہیں۔ عشق دائمی قدر ہے اور ہر شخص کو عشق کے کسی نہ کسی پہلو اور کسی نہ کسی منزل سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لئے فیض کی عشقیہ نظمیں' دل کے نیم جامد تاروں میں ارتعاش

پیدا کر دیتی ہیں۔

جو حسرتیں تیرے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
گذر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آئیں
(انتظار)

''ایک رہگذار پر'' اور ''یہ نجوم'' اس کی عشقیہ نظموں میں غیر معمولی توجہ کے قابل ہیں۔ ان نظموں میں فیض نے اپنی محبوب کی مشک وعنبر کے موقلم سے ایسی دلکش تصویریں بنائی ہیں کہ قاری کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور ایک تخیلی محبوب اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے کاش مجھے بھی ایسی ہی محبوب نصیب ہوتی کہ جو ''یہ نجوم'' کہیں چاندنی کے دامن میں ایک ایسے گل کی طرح جو واقف بہار نہیں ہے' مصروف انتظار ہوتی۔

فیض کی شعری محبوبہ کی چند ادائیں اور حسین نقش ونگار ملاحظہ ہوں۔

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمار شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار جس کی رفاقت میں شوخیاں ترسیں
ادائے لغزش پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبان شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ، فیض سے جن کے، بہار، لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے
غرض وہ حسن، محتاج وصف و نام نہیں
وہ حسن، جس کا تصور بشر کا کام نہیں

یہ رنگ جوش ملیح آبادی کے لئے مختص سا ہو گیا ہے اور اسی رنگ میں جوش نے متعدد کامیاب نظمیں اور اشعار کہے۔ لیکن فیض چونکہ (شاید) لاشعوری طور پر جوش سے بھی متاثر ہے اس لئے اس رنگ کا اس کے کلام میں آجانا ناگزیر ہے۔ مختصراً یہ کہ فیض کی عشقیہ شاعری کامیاب شاعری ہے۔ اور اس کامیابی کا راز نفسیاتی طریق پر شعر کے لطیف جامہ میں پرخلوص جذبات کی تحلیل کہی جاسکتی ہے۔

''میرے ندیم'' رومانی دور کی آخری نظم میں فیض کے تیور بدلتے جارہے ہیں اور اس کے خیالات نئے سانچوں میں ڈھلتے اور نئے انداز بیان میں بدلتے معلوم ہوتے ہیں جو دوسرے دور کی شاعری میں نمایاں ہو گئے ہیں۔

فیض کی عشقیہ شاعری کے متعلق آخر میں ایک بات اور کہنی ہے کہ وہ اکثر ماضی و مستقبل سے بے خبر صرف حال کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز کو فانی سمجھتا ہے اس لئے جو لمحہ عیش میں گذر جائے اچھا ہے۔ وہ عارضی لمحہ کو دائمی بنانا چاہتا ہے' وہ گذشتہ حسرتوں کے داغ دل سے دھونے اور فکر فردا سے آزاد ہونے کے لئے رسیلے ہونٹ' معصومانہ پیشانی اور حسین آنکھوں کا متلاشی نظر آتا ہے تاکہ

مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں

تاکہ ضیاء حسن سے وہ ظلمات دنیا میں پھر نہ آئے اور دائمی طور پر اس دام میں محفوظ ہو سکے اور ان تمام دنیاوی معاملات سے جن میں تکالیف ومصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کنارہ کشی اختیار کر کے

کہیں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں

وہ جانتا ہے کہ پھول لاکھوں برس نہیں رہتے۔ بہار شباب صرف دو گھڑی ہے' اس لئے ضروری ہے۔

آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

نہ معلوم پھر کبھی دل کی صدا سن سکیں یا پھر کبھی محبت کے گیت گاسکیں۔ اس لئے تنہائیوں کی شام کو دور کرنے اور صدائے حیات کو سکون دینے کے لئے ضروری ہے کہ

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

اور قبل اس کے کہ اجنبی دنیا کا اندھیرا اور ظلمت گھیر سکے' ایک مرتبہ بس ایک مرتبہ

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

اور پھر ایسے موقعہ پر

اب نہ دُہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکر فردا اتار دے دل سے
عمر رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں، مت پوچھ
آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

وہ ذرا سے وقت کو جو سینکڑوں حسرتوں اور بیشمار آرزوؤں کے بعد میسر آیا ہے شکوہ وشکایت میں ضائع کرنا نہیں چاہتا' بلکہ اس کو دوسرے کاموں کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے۔ اس موقعہ پر فیض اور راشد' ایک واضح فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

جدید شاعری کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ صنائع وبدائع و دیگر صناعی خوبیوں کا کم لحاظ رکھتی ہے۔ وہ شعر کو جمہور و ماحول کا ترجمان سمجھتی ہے اس لئے اس کی زبان سادہ اور لفاظی ومبالغہ سے مبرّا ہوتی ہے۔ اکثر اشعار سہل ممتنع کی روش کے ہوتے ہیں۔

فیض کی شاعری کی یہ اہم خصوصیت ہے جو

اسے دوسرے ترقی پسند شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔
ن م راشد بلاتکلف فارسی وعربی کے الفاظ کا سہارا لیتا چلا جاتا ہے۔ جوش و مجاز بھی عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں' لیکن فیض جو بات کہتا ہے سیدھے سادھے الفاظ میں کہتا ہے اور اس سادگی میں اس بلا کا درد' تاثیر' تاثر' متوازن تشریت اور سنجیدہ جذبات سمو دیتا ہے کہ وہ شان وشوکت جو فارسی الفاظ کا حصہ ہے' اس کی شاعری میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز فیض کے جوہر قابل اور فنکارانہ قوتوں کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے۔ کوئی نظم' کوئی شعر لے لیجئے سب میں یہ سادگی و پرکاری ملے گی۔ اس کی زبان جمہور کی زبان ہے لیکن اس میں شعری چٹخارہ اور لذت بدرجہ اتم موجود ہے۔

فیض کی تشبیہات' راشد کی طرح غیر مانوس نہیں ہوتیں کہ جن پر ہم چونک پڑتے ہیں بلکہ ایسے مواقع پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوران شعر میں تشبیہ از خود قلم سے نکل گئی ہے۔ جس کا احساس شاعر کو خود بعد میں ہوا۔ اس کی تمام تشبیہات' نفسیاتی تحلیل سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ اس کی تشبیہات کو ہم ''زیریں تشبیہ'' کا نام دے سکتے ہیں۔

مکمل سکوت' چاندنی رات' نیم وا کہکشاں اور بزم انجم کی فسردہ سامانی کو دیکھ کر یہ کہہ دینا کس قدر نادر ہے کہ۔

زندگی جزو خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

رات کے وقت کھوئی ہوئی یاد کے آجانے کو یوں کہنا کہ۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

کس قدر اچھوتا اور نرالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشعار و تشبیہات' دونوں ایک دوسرے کے ممنون احسان ہیں۔

ایک تشبیہ ہے۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں!

فیض نے زندگی کو مفلس کی قبا سے تشبیہ دی ہے۔ مفلس کی قبا کا نام سنتے ہی مختلف پیوند ہمارے ذہن میں پھرنے لگتے ہیں اور پھر دوسرے مصرعہ میں پیوندوں کا ذکر کر کے درد کے ساتھ مخصوص کر دینے سے نفس مضمون میں گہرائی اور تاثر غیر معمولی بڑھ گیا ہے۔ فیض کی شاعری میں تشبیہات' داخلی و خارجی' نفسیاتی ماحول کے بہترین نمونے ہیں جو لاشعوری طور پر اس کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔

''ہم لوگ'' کی تشبیہ داخلی کیفیت کی مکمل ترجمان ہے۔

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

تاریکی کو دل کے ایوان کی گل شدہ شمعوں کی قطار میں حسن محبوب کے ''سیال تصور'' کی طرح بھینچے ہوئے' لپٹائے ہوئے کہنا' کس قدر نادر اور انوکھا ہے' اہل ذوق اس سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

''سیاسی لیڈر کے نام'' نظم میں' ہندوستانی سیاسی لیڈروں کی کم مائیگی و بیچارگی کا اظہار طریقہ' تشبیہ کے باعث کس قدر موثر ہو گیا ہے۔

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

تشبیہ سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر کا تصور ہمارے ذہن میں رقص کرنے لگتا ہے اور تھکا ہوا' سالہا سال سے بے آسرا بیچارہ لیڈر اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے ساتھ ہمارے ذہن کے صفحہ قرطاس پر نقش ہو جاتا ہے۔

فیض کی ایک نظم ہے'' شاہراہ''۔

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محو خیال
وصل محبوب کے تصور میں
موبمو چور، عضو، عضو نڈھال

ایک افسردہ شاہراہ کو ایک ایسی غمزدہ عورت سے تشبیہ دینا' جو وصل محبوب کے تصور میں محو خیال ہے اور جس کے عضو نڈھال اور تمام جسم چور چور ہے' کس قدر نادر ہے۔ اس کی تعریف حیطہ تحریر سے باہر ہے۔ یہ ''تشبیہ مرکب'' کی بہترین مثال ہے۔ فیض تشبیہات کو مانوس لہجہ میں سمو کر اثر و تاثر کے لال' پیلے اور ہرے غبارے اڑاتا اور گوناگوں قلمی مرقعے بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ فیض کا منفرد اسلوب ہے۔

ایک اور خصوصیت فیض کی شاعری میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ جو دیگر ہم عصر ترقی پسند شعراء میں کم ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ فیض کے بہت سے مصرعے اور اشعار اپنے اندر ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہت سے تو ضرب المثل بن چکے ہیں اور بہت سے امتداد زمانہ سے جب وقت اپنی تیز درانتی سے سینکڑوں شعراء کی شہرت کے سرسبز و شاداب درخت کاٹ ڈالے گا لوگوں کی زبانوں پر چڑھ کر اردو ادب میں نئے اضافوں اور ترمیم کا سبب ہوں گے۔ اردو شاعری میں میر' درد' آتش' غالب اور اقبال کو یہ شرف حاصل ہے۔ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر کے اشعار اور مصرعوں میں ضرب المثل ہونے کی

صلاحیت اور پھیلاؤ ہے تو وہ جوش اور فیض ہیں۔ فیض کے چند مصرعے اور اشعار سنیے:

محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
آج کی رات سازِ دردِ نہ چھیڑ
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
لوٹ جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

پنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
.ندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں!
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
بھی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر

اردو ادب میں غالبؔ، مومنؔ اور اقبالؔ کی تراکیب، واستعارات خاص طور سے انوکھے اور نئے ہونے کے باعث، قابل ذکر ہیں جو بالکل نئی وضع ہونے کی وجہ سے اردو ادب میں گراں بہا اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں جذبات کی گہرائی، شعری دلپذیری، شاعرانہ نکتہ رسی، نفسیاتی تحلیل، تخیل، تفکر، ذہنی وضاحت، تخلیقی صلاحیت، تصویریں (images) اور لسانی کنایات صاف طور سے پائے جاتے ہیں۔ فیضؔ کے یہاں بھی بہت سی تراکیب و استعارات اور تصویریں ایسی ہی پائی جاتی ہیں کہ جو بالکل نئی اور جدید ہیں۔ اس قسم کی تراکیب اور تصویروں میں شعریت اپنے سولہ سنگھار کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''خزاں رسیدہ تمنا۔ جنس عجز و عقیدت۔ بے رنگ ساعت۔ آبشار سکوت۔ نگاہ دیدۂ سرشار۔ فضائے فکر و عمل، تاریک بیہمانہ طلسم۔ افسردہ مہک، اجنبی خاک۔ بے خواب کواڑ۔ جھلتی ہوئی ویرانی۔ بے نام گراں بار ستم۔ چشم تن آسان۔ سلگتی ہوئی شام۔ پراسرار کڑی دیواریں۔ آزمائش صبر گریز پا۔''

فیض کی دو نظمیں ہیں: ''تنہائی'' اور ''کتے''۔ فیض کی نظم ''تنہائی'' میں جس قدر شاندار الفاظ اور عمدہ اسلوب ہے۔ یہ نظم اسی قدر مبہم اور بے معنی ہے۔ یہ رجحان بھی انگریزی سے اردو میں آیا۔ کچھ دنوں سے انگریزی شاعری میں یہ رجحان بہت عام ہے۔ اس میں اس قسم کی نظمیں لکھی جارہی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ہم یہ تو ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ کوئی افسردگی اور یاس کی سی بات بیان کی جارہی ہے لیکن وہ یاس و افسردگی کس لئے ہے اور کیوں ہے؟ یہ نہ شاعر سمجھتا ہے اور نہ پڑھنے والا۔ اس لئے اس قسم کی نظموں کی ہم اپنی حسب منشا تفسیر و تاویل کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک مصرعہ کا تعلق، دوسرے مصرعہ سے بہت کم ہوتا ہے۔ ایک تصویر کے بعد، دوسری تصویر بہت تیزی سے آتی چلی جاتی ہے، اور پھر ایک دم نظم ختم ہو جاتی ہے۔ فیض کی نظم ''تنہائی'' بھی اسی نوع کی مثال ہے۔ پڑھتے وقت ہم افسردگی اور یاس ضرور محسوس کرتے ہیں اور راشد کے الفاظ میں مجرد تاثیر بھی کسی حد تک محسوس کرتے ہیں۔ لیکن شاعر کا بے پایاں ''ذہنی تجزیہ'' (جس سے راشد صاحب کا مطلب شاید زندگی کا مسلسل افسردگی سے گذرنے سے ہے) ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر میں یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا کہ یہ راشد صاحب کی محض خوش فہمی ہے، جدید انگریزی شاعری کے اس رجحان کو اردو شاعری میں عام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر محض افسردگی یا یاس طاری کرنے کے لئے اتنے سارے مصرعے لکھے گئے تو ''کوہ کندن وکاہ برآوردن'' کے مترادف ہوگا۔ میر کا ایک شعر بھی اتنی یاس یا اس سے زیادہ افسردگی کا شدید احساس دلا سکتا ہے۔ اگر اس نظم کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے تو چارہ جوئی لاحاصل ہوگی۔ نہ تو یہ نظم سیاسیات میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہے اور نہ تہذیب و مذہب کے شیرازہ بکھرنے سے کوئی واسطہ رکھتی ہے اور ظاہری طور پر اس نظم کے مصرعوں میں بھی کوئی ربط اور وابستگی نہیں ہے۔ محض یاس کے ڈورے سے ہر ایک مصرعہ دوسرے سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کے ذہن لاشعور سے ایک وقت میں متعدد و متضاد خیالات ابھرے، جس کو اس نے بلا امتیاز تسلسل و ربط، شعر کا لطیف جامہ پہنا دیا جو اس کا خاص حصہ ہے۔

شاندار الفاظ، موسیقیت اور روانی، غرضیکہ بہت کچھ ہے، اور ہاں یاس بھی۔ مگر معنی......؟ یہ سوال ذرا وقت طلب ہے۔ جذباتی ترتیب نے اس نظم کو مبہم بنا دیا ہے۔ جدید اردو شاعری کا یہ بھی ایک تجربہ ہے۔ تجربہ کامیاب بھی ہوتا ہے یا نہیں، یہ شاید آنے والی نسلیں فیصلہ کر سکیں گی۔

ایک بات اور۔ نظم کا پہلا مصرعہ ہے

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں

لفظ ''پھر'' قابل غور ہے۔ لفظ ''پھر'' سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی کے بار بار آنے سے اکتا سا گیا ہے اور اب بجائے چونکنا ہونے کے وہ ایک قسم کی بیزاری سی محسوس کر رہا ہے۔ تنہائی میں قدم کی آواز سے چونکنا ہو کر منتظر لفظ ''پھر'' استعمال نہیں کرتا۔ اس سے نظم کی مجرد تاثیر مجروح ہو رہی ہے نظم یہ ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راہ تک تک کے ہر ایک راہ گذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فیض کی نظم ''کتے'' اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہے۔ اردو میں بہت کم نظمیں ایسی ہیں جو اس نوعیت اور صنف میں ملتی ہیں اور جو ہیں وہ اتنی خوش اسلوبی سے نہیں لکھی گئیں۔ ''کتے'' نیم سیاسی تمثیلچہ کی مثال ہے۔ جس میں مضمون و معانی کے خزانے بکھرے پڑے ہیں۔ سو برس کی ہندوستانی زندگی کے اخلاق وکردار، تہذیب و تمدن، ذہنی رجحان، پستی و ذلت اور احساس کمتری کو اس نظم میں اتنے مختصر اور اس قدر جامع الفاظ میں سمو دیا ہے کہ نظم ایک معجزہ سی معلوم ہونے لگی ہے۔ شدتِ تاثیر، سادگی، وضاحت وصفائی اس نظم کے پہلے مصرعہ سے آخری مصرعہ تک ملتے ہیں۔ اس نظم کو دیکھ کر ہمیں فیض کی فنکاری کی داد دینی پڑتی ہے اور اسے صحیح معنوں میں جمہور کا شاعر کہنا پڑتا ہے۔ جمہوری شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اس میں الفاظ سادہ اور ان کا انتخاب فن کارانہ ہو۔ خیالات میں ابہام اور پیچیدگی نہ ہو۔ جو کچھ کہا جائے اس میں تاثیر و تاثر ہو اور جس وقت وہ پڑھی جائے تو قاری کا ذہن، دل و دماغ اس کی طرف متوجہ اور خاموش ہو جائے۔ اس قسم کی شاعری جادو کا اثر رکھتی ہے۔

اس قسم کی دو چار نظمیں اگر ترقی پسند ادب میں اور لکھی جائیں تو اردو ادب میں جمہوری شاعری مکمل کہی جاسکتی ہے۔ یہ نظم ایک نئی منزل کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اس نظم میں ذہنی دیانتداری اور لہجہ کی معصومیت خاص طور سے ذکر کے قابل ہے۔ فیض رٹی باتیں نہیں دہراتا، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ اپنی شاعری میں سموتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاص اور تاثیر اس کی شاعری میں ہر جگہ مترشح اور ظاہر ہوتی ہے۔

فیض کے فن کی نمایاں خصوصیت اس کا خلوص ہے اور یہی چیز اس کو اکثر ترقی پسند شعراء میں ایک ممتاز درجہ دلانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر کے اور سمو کر کہتا ہے۔ اگر شاعری میں خلوص اور آرٹ نہ ہو تو وہ محض پروپیگنڈا ہو کر رہ جاتی ہے۔ مشہور چینی فلسفی لن یانگ کا یہ کہنا کہ ''جو چیز ادب کو پروپیگنڈہ سے ممتاز کرتی ہے وہ مصنف کا آرٹ اور اس کا خلوص ہے۔'' فیض کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے۔ ''نقش فریادی'' میں اکثر نظمیں اسی نوعیت کی ہیں جن سے خلوص، شیریں چشمہ کی طرح ابلتا محسوس ہوتا ہے، اور یہی چیز اسے ترقی پسند شاعری کے آسمان پر ایک بلند ستارے کی تیز اور خوشگوار درخشانی عطا کرتی ہے۔

فیض کا اسلوب بیان پسندیدہ ہے۔ اس کا طرزِ گفتار اور طریقہ بیان بالکل منفرد ہے اس کا طرز، قدیم وجدید رنگ کے تصادم سے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک باغی شاعر ہے لیکن باغی شاعر ان معنوں میں نہیں کہ وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہے۔ باغی ان معنی میں نہیں کہ اس نے اشتراکیوں کی فہرست میں اپنا نام دے دیا ہے۔ باغی ان معنی میں نہیں کہ اس نے جا و بیجا ترقی پسند تحریک کو سراہا ہے، بلکہ وہ باغی ان معنی میں ہے کہ اس نے ہیئت کو جوں کا توں برقرار رکھ کر موضوع و مواد میں بغاوت کی۔ اس کی شاعری تنگنائے ردیف و قافیہ میں مقید نظر آتی ہے لیکن اس تنگنائے میں اس قدر وسعت اور پھیلاؤ ہے کہ بڑی بڑی پہنائیاں اس کے مقابلہ پر نہیں آتیں۔ وہ کہیں کہیں ہیئت میں بھی تبدیلی کرتا ہے لیکن صوتی تغیر کو کافی سمجھتا ہے البتہ کہیں مصرعوں میں تھوڑا بہت ردو بدل جائز سمجھتا ہے۔ جو یقیناً درست ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ تمدن اور تہذیب کافی سے زیادہ ترقی کر چکی ہے۔ گوناگوں اختراعات اور مختلف قسم کی ایجادات و تحقیقات معرض ظہور میں آرہی ہیں۔ اب سے پہلے شاعروں کے لئے مواد کی کمی تھی جس کی وجہ سے تقلید، فرسودگی اور بدمزگی پیدا ہو چکی تھی لیکن وہ فرسودگی اب نئے نئے خیالات و مواد سے بدلتی جا رہی ہے۔ جدھر دیکھئے، شاعری کے لئے مواد مل جاتا ہے۔ شعراء کے لئے مواد کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ وہ انتخاب مواد کا فیصلہ کرنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں اور اس طرح ردیف و قافیہ سے گریز از خود ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر انتخاب مواد پر کچھ ذہنی سکون اور ٹھہراؤ قائم رکھا جائے تو مواد، ردیف و قافیہ کے ساتھ اشعار میں ڈھلنے لگتا ہے۔ فیض کی شاعری اسی ذہنی سکون اور ٹھہراؤ کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ردیف و قافیہ کی پابندی اور التزام اس کے یہاں شروع سے آخر تک قائم ہے۔ وہ ردیف و قافیہ کی اہمیت سے واقف ہے۔ ان کے تاثر و جادو سے آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں موسیقیت بلا کی ہوتی ہے اور اسی موسیقیت کے سبب، اس کی شاعری، ساحری کے مترادف ہو جاتی ہے۔ اس کے اشعار نرم نرم بحروں، رسیلے الفاظ اور مترنم تراکیب سے عبارت ہوتے ہیں۔

ترقی پسند شعراء کا ایک رجحان یہ ہے کہ وہ الفاظ کے معنی بدل کر ان کو دوسرے معنی میں بلا تکلف استعمال کر لیتے ہیں اور اس طرح اکثر مصرعے، مبہم اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ قواعد کی پابندی زبان کے ابتدائی دور میں مشکل ہو سکتی ہے۔ لیکن جب وہ کئی سو برس بعد دھل منجھ کر صاف ستھری ہو جاتی ہے تو پھر یہ اغلاط، ناگوار، بھدی اور بری معلوم ہوتی ہیں اور کانوں پر بار گذرتی ہیں۔ ترقی پسند شعراء قواعد کی پابندیوں کا التزام کئے بغیر، الفاظ مختلف معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اس طرح ایک بار پھر زبان کے ابتدائی دور میں جا داخل ہوتے ہیں۔ میری رائے میں یہ اختراع فائقہ، کسی صورت سے جائز نہیں۔ اگر الفاظ اپنے معنی روز بدلتے رہے تو لسانیات کی رو سے یہ رجحان اور طریقہ بہت مضر ثابت ہوگا اور وہ لچک اور وسعت، جو

اس وقت ہماری زبان میں موجود ہے' رفتہ رفتہ زائل ہو جائیگی۔ نہ قواعد مکمل ہو سکینگے اور نہ زبان پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گی۔ ترقی پسند ادب کا یہ رجحان' زبان اور مقبولیت' دونوں کے لئے خطرناک ہے۔

نئے شعراء' ردیف و قافیہ کا التزام کریں یا نہ کریں لیکن ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے معنی کے باریک فرق کو سمجھ کر استعمال کریں تاکہ لغت میں وسعت قائم رہے' لسانیات میں ترقی ہو' زبان مکمل ہو اور قواعد پایہ تکمیل کو پہنچ کر آفاقی اصول پیش کر سکیں اور یہ کچھ ایسا مشکل کام بھی نہیں کہ جس کیلئے کچھ وقت درکار ہو' بلکہ ذرا سا ٹھہراؤ کافی ہو سکتا ہے۔ فیض کی شاعری بھی ان اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ زبان و محاورہ کی غلطیاں۔ الفاظ و تراکیب کا نیا استعمال اس کے یہاں اکثر ملتا ہے۔ ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

"خوابیدہ چراغ کا لڑکھڑانا" خوابیدہ کے ساتھ "لڑکھڑانا" کا استعمال بالکل مبہم اور بے معنی ہے۔ اگر چراغ کو شخص سمجھ لیا جائے تو بھی خوابیدہ کے ساتھ لڑکھڑانا کا استعمال درست نہیں۔

"واپس پھیر دے مجھ کو" واپس پھیرنا پنجابی لہجہ ہے۔ اردو میں واپس کرنا یا واپس دینا مستعمل ہے۔ واپس پھیرنا جائز نہیں۔

فیض کا ایک مصرعہ ہے۔ "یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں" "مقتل" لکھنا چاہیے تھا یا پھر قتل گاہیں۔ مقتل گاہیں بالکل غلط ہے۔

"باز و تولنا" فصاحت و محاورہ کے عین مطابق نہیں ہے۔ "پر تولنا" زیادہ آتا ہے۔

"فراواں مخلوق" مخلوق کے ساتھ' صفت "فراواں" کا استعمال فصاحت کے خلاف ہے۔

ایک جگہ فیض نے "موہوم سی درماں" استعمال کیا ہے جبکہ "موہوم سے درماں" درست ہے۔

رہیں فیض کی غزلیں۔ تو وہ بھی سہل' سادہ اور پُرکار ہیں۔ ان میں گہرے سے گہرے خیال کو سادہ الفاظ میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ یہ رچاوٹ کچھ غیر معمولی تاثر کا محرک بن گئی ہے۔ صفائی اور گہرائی اس کی غزلوں کا عام جوہر ہے۔ میر کی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھے سادھے الفاظ اور چھوٹی بحروں میں نشتر چبھو جاتا ہے فیض اس خصوصیت میں میر سے قریب ہے۔ میر نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

بات میری ہے گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

فیض کی غزلیں بھی اسی نوعیت کی آئینہ دار ہیں' اس کے خیالات میں نہ پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ الجھاؤ۔ زیریں تیز لیکن مدہم سوز اس کے اشعار میں ہر جگہ سلگتا نظر آتا ہے۔

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے
تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے

کہیں کہیں سوز میں ناامیدی بھی جھلکتی ہے۔

فیض تکمیلِ آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

انجیل مقدس کی اس عالمگیر صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زیر آفتاب کوئی بات نئی نہیں ہے۔ غزل اردو کی نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس قدر متنوع جذبات و واردات اس میں بندھ چکے ہیں کہ اب کوئی نیا خیال ہی باقی نہیں رہا۔ غزل چونکہ واردات قلبیہ کے اظہار کا نام ہے' اس لئے انسان ایک بات یا ایک پہلو کسی نہ کسی صورت سے ضرور محسوس کرتا ہے۔

فیض کی غزلوں میں بھی ناز و نیاز۔ ہجر و فراق۔ بے رخی۔ آرزو۔ بہار۔ خزاں۔ دست و گریباں۔ دیدۂ تر۔ دیوار قفس۔ بادل۔ گھٹا۔ دل کی خانہ ویرانی۔ عشق و ہوس۔ جور و لطف۔ چشم میگوں جیسے الفاظ ملتے ہیں۔ اور خیالات بھی قریب قریب وہی ہیں۔ لیکن فیض کے اسلوب بیان نے ان میں ایک تازگی اور شگفتگی پیدا کر کے تاثر میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔ فیض کے اسلوب بیان میں ایک والہانہ پن ہے جس سے اس کی انفرادیت نمایاں طور پر جھلکنے لگتی ہے۔ فیض کا ایک شعر ہے۔

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

شعریت اور مناسب الفاظ کی نرم و شیریں ہم آہنگی قابل تعریف ہے۔ مسلسل نالوں کے بعد ایک ایسے دور کا گذرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ خاموشی تمام وجود پر طاری ہو جاتی ہے۔ خاموشی اس بات کی دلیل نہیں ہوتی کہ صبر و شکیب ہو گیا ہے یا تسلی و تشفی ہو کر دل کی بھڑاس نکل چکی ہے بلکہ یہ خاموشی اندرونی گھٹن اور اضطراب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جگر مراد آبادی کا مشہور شعر ہے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

آنسوؤں کی خشکی یا نالوں کی خاموشی' اسی نہ جانے والی طغیانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "گمشدہ آواز کی یاسیت" اور "خاموشیوں میں لرزاں" کی شعریت قابل تعریف ہے۔

حسرتوں کی بے شماری پر فیض کا شعر ہے۔

تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

حسرتوں کا شمار ہو سکتا ہے لیکن رنجش کی انتہا معلوم ہونا بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے برعکس نظریہ

کی لطافت دیکھئے یہ فیض کا خاص اسلوب ہے۔

چارہ ساز کے منت کش نہ ہونے پر غالب کا مشہور شعر ہے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

فیض کہتا ہے۔

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

گو غالب و فیض کے اشعار ردیف وقافیہ میں مختلف ہیں لیکن مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ غالب اپنے اچھا نہ ہونے پر خوش ہے اس لئے کہ اسے دوا اور چارہ ساز کا منت کش نہ ہونا پڑا۔ فیض درد کی جاں نوازی پر خوش ہے کیونکہ درد کا پیہم ہونا ہی جاں نوازی کا باعث ہوتا ہے۔ غالب کا شعر ایک ایسی ہی خودداری کی مثال ہے جو مایوسی اور مجبوری کے بعد پیدا ہوتی ہے اور فیض کا شعر زندگی سے بے نیاز ہو کر ہر قسم کی تسلی و تشفی سے بے خبر ہو جانے کا آئینہ دار ہے۔ درد کی انتہا ہی جاں نوازی بن جاتی ہے اور اس کے بعد ایک والہانہ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس شعر کے معصوم تیور قابل غور ہیں۔

ایک شعر ہے۔

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

محبوب کی آمد کا انتظار ہے۔ دنیا اور گردوپیش کی ہر شے فراموش ہو چکی ہے۔ صرف اسی راہگذر پر نظر ہے جس سے محبوب کے آنے کی توقع ہے' طرح طرح کے فریب خوردہ خیالات آرہے ہیں۔ تھوڑی سی دیر کے لئے دل بہل جاتا ہے' لیکن جب ناکامی مسلسل برقرار رہتی ہے تو اضطراب اور زیادہ ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیز سے تیز تر۔ دھڑکن کے تیز تر ہونے کا سبب تو محبوب کے نہ آنے کا خیال تھا لیکن فریب آرزو دیکھئے کہ اس تیز دھڑکن کو محبوب کی آواز پا سمجھا گیا۔ لفظ سہل انگاری نے شعر میں اور جان ڈال دی ہے۔ والہانہ پن اور خود فراموشی کی اس سے بہتر مثال فیض کے کلام میں نایاب ہے۔ یہ شعر نئی غزلوں کا بہترین شعر شمار کیا جاسکتا ہے۔

عاشق کو محبوب سے گلا نہیں رہتا۔ کچھ تو اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا اور کچھ اس کے تغافل پیہم کی وجہ سے گلا نہیں کرتے۔ مگر فیض کا انداز بیان دیکھئے۔

تیری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلا نہیں باقی

چشم الم نواز کی ترکیب قابل غور ہے۔ اس کی ندرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کا گلا نہ کرنے میں بھی شکایت کا پہلو مترشح ہوتا ہے۔ نفی میں اثبات کا پہلو نکلنا شعری خصوصیات میں بہت بلند چیز ہے۔

اس کا ایک شعر ہے۔

ایک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

فرصت گناہ دنیا میں مل سکتی ہے۔ دوسری دنیا میں اس کا وجود تو وجود ذکر تک نہیں ہوتا۔ اس لئے گناہ کے واسطے کچھ زیادہ وقت درکار تھا تاکہ خوب دل کھول کر گناہ کئے جاسکتے اور حوصلہ پروردگار کی فراخدلی کی داد دی جاسکتی۔ چار دن کہنا کس قدر فصیح ہے۔ اور "دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے"..... کہنا جس میں نفی اور طنز کا پہلو ہے' بلاغت کے عین مطابق ہے۔ اگر اس کو دوسرے طریقہ سے کہا جاتا تو شعر سننے والے کو انتہا پسندی کا احساس ہونے لگتا۔ مگر فیض اس نرم لہجہ ہی کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی دوسرا پہلو اختیار نہیں کرتا۔

فیض کا ایک شعر ہے جس میں اس نے "رہگذر" قافیہ اور "میں ہے" ردیف باندھی ہے۔

کبھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی
رب کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے

دل کافر' جو پہلے بندگی کے نام تک سے گریزاں تھا اسے تیری رہگذر کے پیہم سجود سے بندگی کا احساس ہوا اور وہیں سے بندگی کا پہلا اور آخری سبق سیکھا۔ اگر تیری رہگذر میں نہ جایا جاتا تو دل کافر' کافر ہی رہتا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ رب کریم تیری رہگذر میں رہتا ہے۔ کیونکہ بندگی کا شدید احساس ہو جانا اس بات کی دلیل ہے۔ شعر کی باریکی اور ندرت قابل غور ہے۔ شاعرانہ پیرایہ بیان' بے تکلفی اور شگفتگی انوکھی ہے۔ اسی ردیف وقافیہ میں جگر مرادآبادی کا شعر سنئے

سمجھا تھا میں کہ دور نکل جاؤں گا کہیں
دیکھا تو ہر مقام تیری رہگذر میں ہے

فیض کا شعر' مجازی پہلو (جو ترقی پسند ادب کا خصوصی نقطہ نظر ہے) اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور رب کریم کو اس شعر میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ برخلاف اس کے جگر کے شعر میں حقیقی پہلو ہے اور اسی وجہ سے دونوں کے اشعار میں معنوی فصل ہو گیا ہے۔ جگر کا شعر اپنی جگہ پر ہے لیکن شاعرانہ لطافت اور حلاوت جو فیض کے شعر میں ہے وہ جگر کے شعر میں کمیاب ہے کیونکہ مجاز' حقیقت سے زیادہ لطف انگیز ہوتا ہے۔ فیض خود کہتا ہے۔

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

داغ کا شعر ہے۔

لامکاں میں بھی تو جلوہ نظر آتا ہے
بے کسی میں تو ادھر ہوں جدھر کچھ بھی نہیں

فیض کا شعر سنئے:

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

داغ کا شعر معنوی اور حقیقی حیثیت سے تو بہت بلند ہے مگر ''تیری رہگذر بھی نہیں'' کے ساتھ تجاہل برتنا۔ ''نہ جانے کس لئے'' شاعرانہ لطافتوں اور احساس کی رنگینیوں میں بلا کا اضافہ کر رہا ہے اور فیض کے شعر پر بے اختیار داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔

غزل کے اشعار کی ایک ضروری خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصرعوں میں استعمال شدہ الفاظ میں زیادہ بعد نہ ہو۔ اس سے شعر میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اور شعر عمدگی اور شیرینی کے درجہ سے گر جاتا ہے۔ اس لئے سہل ممتنع کا شعر قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن بجنوری نے کانٹ کی کتاب **(Critique of Practila Reason)** سے حوالہ دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں آزاد حسن ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور ان کے مطالب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کر دے۔ فیض کے اشعار اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں!
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں!

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے!

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیض
کاش افشائے راز ہو جائے!

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

چشم میگوں ذرا ادھر کر دے
دست قدرت کو بے اثر کر دے

یہ وہ خصوصیت ہے جو اسے ترقی پسند غزل گو شعرا میں سب سے نمایاں و ممتاز درجہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

فیض کی غزلیں ہوتی تو ہیں دو اور دو چار قسم کی۔ اور وہ بات بھی ایسی ہی کہتا ہے کہ ایک مثلث کے تین زاویے برابر دو زاویہ قائمہ کے ہوتے ہیں مگر اس کی ان سیدھی سادھی باتوں میں وہ عالمگیر حقیقت اور وسعتیں پنہاں ہوتی ہیں کہ بے اختیار سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی!
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

ایک خاص بات اور..... فیض کی دوسرے دور کی غزلوں میں زندگی سے قربت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ بہمانہ طلسم کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے۔ یاد محبوب پر غم روزگار حاوی آجاتے ہیں اور اس کو محبوب اور محبوب کی یاد سے زیادہ زمانے کے دکھ میں دلفریبی نظر آتی ہے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا!
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض کی غزلیں دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی غزل میں زندہ رہنے کی سکت اور صلاحیت موجود ہے۔

مختصراً فیض کی شاعری نے جہاں نئی شاعری میں ایک نئے سکول کی بنیاد رکھ کر ہمیں دعوت فکر دی ہے۔ وہاں ہمیں خارجی منفرد زاویہ ہائے نگاہ سے بھی مانوس کیا ہے۔ وہ قدیم وجدید شاعری کے سنگم پر کھڑا ہے۔ فیض جانتا ہے کہ شاعر نہ ایک سائنس دان ہوتا ہے اور نہ فلسفی۔ مگر شاعر بھی زندگی کے تضاد کو محسوس ضرور کرتا ہے لیکن بجائے اس کے کہ وہ لاحق تضاد کو منطق کے استقراری استدلال سے حل کرے وہ اسے قوت متخیلہ اور شعریت کے ذریعہ طے کرتا ہے۔ چونکہ یہی ایک ذریعہ ہے کہ جس کے واسطے سے شاعر زندگی کے تضاد حل سوچتا اور طے کرتا ہے۔ فیض اسی قسم کا شاعر ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز سے قطع نظر' شاعری کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ کاش فیض اس بات کی صداقت کو پھر محسوس کر سکے۔

فیض ہوتا رہے جو ہوتا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے!

☆☆☆

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمہ چشم خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگ گل طناز کیا

منو بھائی

زیتون اور سنگِ مرمر

میں یہ تو نہیں جانتا کہ انقلابی شاعری کیا ہوتی ہے۔ مزاحمتی شاعری کے کیا تقاضے ہیں' علامتی شاعری کے کیا لوازمات اور فلسفیانہ شاعری کی کیا ضروریات ہیں، رومانوی شاعری کو پرکھنے کی کونسی کسوٹی ہے اور آفاقی شاعری کو ناپنے کے کون سے پیمانے ہیں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شاعری کو شاعری ہونا چاہئے۔ وہ شاعری ہوگی تو پسند کی جائے گی اور پھر اقسام کے خانوں میں بانٹی جائے گی یا قدر و منزلت کی الماری میں جگہ اور مقام حاصل کرے گی، چنانچہ کسی شاعر کی بنیادی اور اصل پہچان اُس کی شاعری ہوتی ہے۔ فیضؔ' ندیمؔ' مختارؔ' انشاؔ' باقیؔ' منیرؔ نیازی' ناصرؔ' مشتاقؔ' جاوید شاہینؔ اور کشور ناہید ان سب لوگوں سے میرے ذاتی تعلقات بعد میں قائم ہوئے، اُن کے اشعار اُن سے پہلے مجھ تک پہنچے اور مجھے اُن تک لے گئے۔ صرف ایک شریف کنجاہی ہیں کہ جو میرے ماموں ہونے کی وجہ سے اپنی شاعری سے پہلے میرے رشتے میں آئے یا میرے دادا میاں غلام حیدر تھے کہ جن کی گود سے باہر نکل کر پتہ چلا کہ وہ شاعر ہیں اور یہ اب واضح ہو رہا ہے کہ کوئی شاعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ ایک نظم لکھ کر بھی شاعر بن سکتا ہے اور درجنوں مجموعے شائع کروا کے بھی شاعر نہیں بن پاتا اور اپنی دوسری برسی تک بھی زندگی نہیں پاتا۔

میں فیض احمد فیضؔ سے دوستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اُن سے میرا عقیدت اور پیار کا رشتہ تھا اور ابھی تک ہے۔ مجھے ان کے قدموں میں بیٹھنے میں لطف آتا تھا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کے سکھانے اور سمجھانے کے انداز کو بھی بہت پسند کیا ہے۔ بہت عرصے کی بات ہے کہ مجھ پر اچانک اردو میں شاعری کرنے کا بھوت سوار ہوا۔ بہت کوشش کی' بہت زور لگایا مگر ایک کے بعد دوسرا مصرع نہ لکھ سکا۔ فیض صاحب کے پاس گیا اور اپنی تکلیف بیان کی۔ انہوں نے پوچھا ''تم خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟'' میں نے بتایا کہ ''پنجابی میں'' انہوں نے کہا شاعری بھی اسی زبان میں ہوتی ہے جس میں خواب دیکھے جائیں، بچے کو لوری دی جائے اور مرنے والوں کے لئے بین ڈالے جائیں۔''

اس کے بعد میں نے اردو میں شاعری کرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور یہ شوق غیر زبانوں کے شاعروں کے کلام کو اردو کے نثری ترجمے کے ذریعے پورا کرنا شروع کیا جس سلسلے میں فیض احمد فیضؔ نے مجھے محمود درویش' نزار قبانی' ناظم حکمت' فروغ فرخ زاد اور یانس رتساس کی بہت سی نظمیں اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے دیں اور بہت سی ایسی نظمیں بیروت سے بھی بھیجیں اور خاص طور پر بتایا کہ اگر میں عربی زبان کی نظموں کا ترجمہ کروں تو ان کے اُس انگریزی ترجمے پر انحصار کروں جو کہ عرب مترجموں نے کیا ہوا ہو کیونکہ انگریزوں اور امریکیوں کے لئے عربی شاعری کا ترجمہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ انگریزی میں عربی شاعری ترجمہ نہیں ہو سکتی ماخوذ کی جا سکتی ہے۔

یونان کے یانس رتساس کی ایک نظم ترجمہ کرتے وقت مجھے مشکل پیش آئی کیونکہ انہوں نے زیتون اور سنگ مرمر کا کوئی رشتہ بیان کیا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں فیض صاحب کے پاس گیا کہ وہ یہ رشتہ سمجھائیں۔ فیض صاحب نے بتایا کہ سنگ مرمر چونے کا پتھر ہوتا ہے اور چونا نباتات کا دشمن ہے چنانچہ مرمر کے پہاڑوں پر سبزہ نہیں اُگتا صرف ایک زیتون ہے جو مرمر کے پہاڑوں پر اُگتا اور پھل دیتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیسے؟ فیض صاحب نے بتایا کہ سنگ مرمر کو زندہ پتھر کہا جاتا ہے۔ مرمر کا پتھر سانس بھی لیتا ہے بیمار بھی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ سنگ مرمر کو سرطان کی بیماری بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر فیض صاحب نے وضاحت کی، مرمر کے پتھر کے اندر باریک رگیں ہوتی ہیں۔ نہایت باریک مسام ہوتے ہیں جو گرمی کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اسی لئے سنگ مرمر کی ٹائیل کالے پتھر کی اینٹ کے مقابلے میں بہت کم گرم ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں پیرس شہر میں مرمر کے بعض مجسمے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے تھے، تحقیق پر پتہ چلا کہ اُن پر ایک خاص علاقے کے جنگلی کبوتروں نے' جو کہ کسی بیماری کا مرکز تھا' رفع حاجت کی ہے اور اُن کی بیٹ ان مجسموں کی رگوں، ریشوں اور مساموں میں داخل ہو گئی ہے جس سے وہ سرطان میں مبتلا ہو کر دوبارہ

بیگم یوسفی، مشتاق یوسفی، فیض احمد فیض، افتخار عارف،
ڈاکٹر آفتاب احمد، ہمایوں گوہر کے عشائیے میں

فیض احمد فیض، ڈاکٹر عصمت، این میری شمل اور افتخار عارف

فیض صاحب کی بیرون ملک سے واپسی پر ان
کے اعزاز میں دی گئی دعوت استقبالیہ میں ان کے ہمراہ محمد حنیف
معراج، خالد نصیر، اے شیخ اور دیگر شرکا کا گروپ فوٹو۔ اس موقع پر
فیض صاحب نے تازہ نظم "دل من مسافر من" سنائی تھی۔

افتخار عارف، این میری شمل، احمد فراز، فیض احمد فیض، ہمایوں گوہر، شہرت بخاری اور دیگر اہل قلم

ساقی فاروقی، فیض احمد فیض اور احمد فراز

فیض احمد فیض اُردو مرکز لندن میں
مداحوں کے درمیان

چونے میں تبدیل ہونے لگے ہیں۔ پیرس کی میونسپل کارپوریشن نے صحت مند مجسموں کے اوپر ایک خاص قسم کا مصالحہ پینٹ کر دیا جس سے مزید نقصان یہ ہوا کہ ان مجسموں کے پتھروں کا سانس لینا مشکل ہو گیا اور ٹوٹنے لگے، دم توڑنے لگے۔ چنانچہ یہ مصالحہ اُتار دیا گیا۔ اب اصل بات کی طرف آتے ہیں جو کہ یانس رتساس نے اپنی نظم میں کہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ زیتون کی جڑیں اتنی باریک اور نرم و نازک ہوتی ہیں کہ غیر محسوس طریقے سے سنگ مرمر کی رگوں میں اُتر جاتی ہیں اور وہاں سے اپنی خوراک بھی حاصل کر لیتی ہیں۔ نباتات کی کسی اور قسم کی جڑیں اتنی باریک اور نرم و نازک نہیں ہوتیں کہ چونے کے پتھر کا زہر چاٹ کر اپنی زندگی برقرار رکھ سکیں۔ یانس رتساس اپنی اس نظم میں یونان کے انقلابیوں کی بات کر رہا ہے کہ انقلابی نظریات کو عوام کے دل و دماغ میں ویسے ہی اُترنا چاہیے جیسے سنگ مرمر کی رگوں میں زیتون کی جڑیں اُترتی ہیں۔ یہی انقلابی تحریک کا تقاضا ہوتا ہے۔

میں نے کہا فیض صاحب یہ تو بڑی رومانٹک بات ہے۔ انقلابی کیسے ہو گئی؟ انہوں نے کہا، تمہیں کس نے بتایا کہ رومانس انقلاب نہیں ہوتا یا انقلاب کا رومانس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا! رومان دنیا کی ہر تحریک کی بنیاد ہے۔ عشق کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا محبت انسانی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے موثر حصہ ہے۔

میں نے کہا'' فیض صاحب! آپ مجھے اس وقت چاچا گھماں چھری مار لگتے ہیں'' فیض صاحب اکثر اوقات بلکہ بیشتر اوقات میری بدتمیزی کی ''بونگیاں'' برداشت کر لیا کرتے تھے، انہوں نے حیرت سے پوچھا ''یہ چاچا گھماں چھری مار کون صاحب ہیں؟'' میں نے بتایا کہ'' چاچا گھماں قیام پاکستان سے پہلے کسی سرکس میں کام کرتے تھے اور دیوار کے ساتھ مس بجلی عرف تھری ناٹ تھری کو کھڑا کر کے اُس کے چاروں طرف چھریوں کی ''آؤٹ لائن'' بنانے کا کمال دکھایا کرتے تھے مگر عشق کے ہاتھوں دونوں ٹانگوں سے محروم ہو گئے اور ہیرا منڈی میں ''نوگزے'' کی قبر کے قریب ایک جھگی میں رہنے لگے اور وہیں ایک روز اپنی خالی بوتل کی طرح لڑھک کر فوت ہو گئے''

فیض صاحب نے پوچھا'' مجھے اُس کے ساتھ کیوں ملا رہے ہو بھائی!'' میں نے بتایا کہ'' چاچا گھماں چھری مار کا یہ فلسفہ بلکہ زندگی کا منشور تھا کہ عشق اور محبت کے بغیر انسانی زندگی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر وہ اس ملک کے حکمران ہوں تو تمام سکول' کالج' یونیورسٹیاں اور میونسپل کارپوریشنیں بند کر دیں اور لوگوں سے کہیں کہ وہ آپس میں محبت کریں، لوگ آپس میں محبت کریں گے تو اپنے بال سنوار کے رکھیں گے' اجلے کپڑے پہنیں گے' گندگی نہیں پھیلائیں گے، محبت کے سبق حاصل کریں گے۔ پھل پہلے سے زیادہ میٹھے ہو جائیں گے، گائیں پہلے سے زیادہ دودھ دینے لگیں گی۔ گندم کے سٹے اور مکئی کی چھلیاں پہلے سے بڑی ہو جائیں گی۔ دھوپ ٹھنڈی اور چھاؤں گرم ہو جائے گی اور سارے اندھیرے روشن ہو جائیں گے۔''

فیض صاحب نے ہنستے ہوئے کہا'' میں چاچا گھماں چھری مار سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔''

فیض صاحب کی زندگی کی آخری تقریبات میں سے ایک تقریب پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہوئی تھی جہاں میں نے اُن کی صدارت میں شام کے شاعر نزار قبانی کی چند نظموں کے اردو ترجمے سنائے تھے۔ ان نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی صاحب نے کہا کہ معلوم نہیں کیوں منو بھائی نے نزار قبانی کی ایسی نظموں کا ترجمہ پیش کیا ہے جو اپنے اندر حزن و ملال لئے ہوئے ہیں جب کہ انقلابی شاعری میں آنسو نہیں بہائے جاتے ہمت اور جرأت بڑھانے والی باتیں کی جاتی ہیں۔ فیض صاحب نے اپنے صدارتی تاثرات میں اس خیال کی نفی کی کہ انقلابی شاعری میں آنسو نہیں بہائے جاتے انہوں نے کہا کہ'' آنسو بہانا اور حزن و ملال کی باتیں کرنا کوئی غیر انقلابی عمل نہیں ہے۔ جن لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں' ان کے سروں میں خیالات اور دلوں میں جذبات بھی ہوتے ہیں۔ انسانی خیالات اور جذبات کبھی غیر انسانی نہیں ہو سکتے اور جو غیر انسانی نہیں ہوتا وہ انقلابی ہوتا ہے۔''

اس تقریب کے آخر میں چائے پینے کے دوران تقریب میں شریک ہونے والے بعض نوجوانوں نے فیض صاحب کو گھیر لیا اور شکایت کی کہ ملک میں کوئی ایسی سیاسی تحریک نہیں ہے جو کہ ترقی پسند نظریات اور خیالات کو آگے بڑھائے۔ ہم نوجوانوں کو کوئی نہیں بتاتا کہ ہم کیا کریں؟ زندگی کی بے مقصدیت سے پیدا ہونے والے خلاؤں میں بھٹکنے والے ہم نوجوانوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ بتائیں ہم کیا کریں؟

فیض صاحب نے کہا'' محبت کرو!''

تمام نوجوان حیران ہوئے ''محبت کریں؟ محبت کرنے سے کیا ہوگا؟''

فیض صاحب نے کہا ''محبت کرنے سے تمہارے خیالوں اور تمہاری سوچوں میں سلیقہ آئے گا، تمہیں زندگی اچھی لگے گی، زندگی کی قدر ہوگی، بے مقصدیت کے خلاء دور ہو جائیں گے ان کی جگہ مقصدیت لے لے گی، زندگی کی بہت سی آلائشوں اور برائیوں سے بچ جاؤ گے، بہت سی خوبیوں اور اچھائیوں کو گلے لگاؤ گے۔ یاد رکھو کہ محبت کرنا بھی ایک انقلابی عمل ہے، انسانی زندگی کا بہترین عمل ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے زیتون کی جڑیں سنگ مرمر کی رگوں میں داخل ہو رہی ہیں۔

☆☆☆

امین مغل

فیضؔ کی شاعری' چند تاثرات

دو شعر ملاحظہ ہوں۔

فانی کہتے ہیں:

فصلِ گل آئی یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا۔

اور فیضؔ:

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

ان دو انتہائی خوبصورت شعروں کی قدر و منزلت متعین کرنا یہاں مقصود نہیں بلکہ ان کے تقابلی جائزے سے فیضؔ کی شاعری کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔ فانی کا شعر غزل سے ہے جب کہ فیضؔ کا شعر ان کی مشہور نظم "نثار میں تیری گلیوں کے"...... سے ہے۔ اس لحاظ سے ان کا تقابل کرنا شاید مناسب نہ ہو لیکن جن جہتوں میں تقابل کرنا مقصود ہے، وہاں شاید اس کی گنجائش ہے۔

فانی کے ہاں درِ زنداں کھلنے سے فصلِ گل اور اجل آنے کے امکانات یکساں طور پر پیدا ہوتے ہیں لیکن ان سے پیدا ہونے والے نتائج بالآخر ایک ہی سمت میں سفر کرتے نظر آتے ہیں۔

وحشت فرد کی شعوری ذمہ داری سے گذر جانے کی منزل ہے اور اس لحاظ سے شعور کی موت۔ قیدی چھوٹ جائے جب زنداں سے اور یہاں زنداں قفس کے معنی میں ہے تو وہ اجل کی نشانی ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔

فیضؔ کے ہاں درِ زنداں نہیں کھلتا۔ روزنِ زنداں کی بات ہے اور وہ بھی روزنِ زنداں کے بجھنے کی لیکن شاعر کو گمان ہوتا ہے کہ اس کے محبوب کی مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی۔ فانی اور فیضؔ دونوں آزرنی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا ذکر کر رہے ہیں' ایک درِ زنداں کے کھلنے سے منفی نتائج اخذ کر رہا ہے اور دوسرا روزنِ زنداں کے بجھنے سے مثبت نتائج۔

فیضؔ نے تو اپنے شعر میں سیدھے سیدھے وطن کو محبوب بنایا ہے، لیکن اس کے تلازمے اور اندازِ بیاں غزل کا ہے (یہ شعر غزل میں بھی ہو سکتا تھا) اس کے باوجود روزنِ زنداں کے بجھنے، محبوب کی مانگ اور پھر اس میں ستاروں کی افشاں کی بات غزل کے روایتی لہجے سے بالکل مختلف ہے۔

اور اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ پہلا شعر فیضؔ کا ہے اور دوسرا فانی کا تو آپ اس کو اردو شاعری کی روایت اور دونوں شاعروں کے مزاج سے ناواقف گردانیں گے۔

فیضؔ کے اوپر والے شعر میں تو محبوب وطن سے مخصوص کر دیا گیا ہے لیکن یہ شعر ملاحظہ ہو

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

یہ شعر خالصتاً غزل کا ہے لیکن اس کے مفہوم کی جہت بھی ستاروں سے بھری جانے والی مانگ والے شعر کی ہے۔

غزل کی رعایت سے ایما یئے ایک عمومیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے شعروں کو مفاہیم کی ایک سے زیادہ سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے غزل کی کمزوری بھی کہا جاتا ہے اور اس کی توانائی کی نشانی بھی۔

لیکن یہ کیا وجہ ہے کہ فیضؔ کے اس شعر سے ذہن قفس کے اس مفہوم کی طرف کم کم جاتا ہے جو ہماری روایتی غزل کا سکہ ہے؟ شاید اس لئے کہ فیضؔ کے ہاں قفس کے ذکر کے ساتھ ہی دل میں ستاروں کے ابھر آنے کا ذکر آجاتا ہے جو روایتی غزل سے پیدا ہونے والی توقعات سے بالکل مختلف ہے۔ فانی کے شعر میں روایت غزل کے تمام تلازمے ایک نامیاتی وحدت کو تشکیل دے رہے ہیں۔ وہ قفس کی دنیا ہے اور اس میں وحشی بھی ہیں اور قیدی بھی، فصلِ گل بھی ہے اور اجل بھی' اس لئے ذہن سب سے پہلے اسی دنیا کی طرف جاتا ہے اور پھر اس سے اس کے عمومی مفہوم کی طرف جہاں فانیؔ کا یہ شعر ان کے زندگی کی طرف منفی رویے کی ایک خوبصورت مثال بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس "درِ قفس" والے شعر میں ایک نئی کائنات پیدا ہوتی ہے جس میں قفس ہے، اندھیرا بھی ہے، لیکن اندھیرے کی مہر اسے روایتی لہجے سے مختلف کر دیتی ہے اور پھر دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں۔ یہ کائنات اور ہی کائنات ہے جو روایت اور

شاعر کے نئی دنیا کے تجربے کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

اس کے باوجود یہ شعر غزل کا شعر ہے اور غزل کی عمومیت والی خصوصیت سے آزاد نہیں۔ فیض کے اس شعر میں کلاسیکی روایت میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن اس کے بعد غزل کی روایت ہی بدل جاتی ہے اور یہ شعر غزل کی روایت میں آجاتا ہے۔

اس لئے غزل کی یہ خصوصیت کہ اس کے شعر مفاہیم کی کئی سطحوں پر سمجھے جا سکتے ہیں، اس شعر میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ فیض کے اس شعر کو پڑھتے وقت قفس سے ہمارا ذہن ایک اجتماعی صورتِ حال کی طرف جاتا ہے اور قفس کو اس مفہوم میں سمجھنے میں کوئی کشش نہیں محسوس ہوتی جس میں فانی زنداں کو استعمال کر رہے ہیں؟

یا پھر فیض کی مشہور غزل کے یہ شعر لیجئے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

روایت میں داخل یہ شعر صرف فیض (یا مکتبِ فیض) سے ہی مخصوص ہیں۔

ان کے عمومی اشارے اپنے اندر ایک تخصیص لیے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ وطن، گلشن اور قفس میں کیا تعلق ہے۔

یہ تخصیص اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ یہ شعر فیض کے ہیں۔

برٹرنڈ رسل کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے ایک نقاد نے کہا تھا کہ فلسفی دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک وہ جن کے فلسفہ کو ان کی ذات سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے اور ایک وہ جن کا فلسفہ ان کی زندگی سے معنی پاتا ہے جس کی صداقت اُن کی ذات کی صداقت پر منحصر ہوتی ہے۔ رسل کے فلسفیوں میں سے بیشتر کو وہ نقاد دوسرے زمرے میں شمار کرتا ہے۔

فیض غزل کہتے ہیں لیکن ان کے غزل کے ایمائیے ان کی زندگی، ان کے عمل سے معنی لیتے ہیں۔

رومانوی شاعروں کے ہاں وہ بات جو فیض کی آزمائش پر پوری نہ اترے، صداقت نہیں ہے۔

فیض کے ہاں جو شعر عمل کی بھٹی سے پیدا نہ ہو، صداقت سے عاری ہے۔ فیض کے قاری فیض کو پڑھتے وقت اس بات سے آشنا ہیں۔ فیض اپنے قارئین کی توقعات کو بڑھا کر ایک ایسی اونچی سطح پر لے گئے ہیں، جہاں ان کے شعر ان کی زندگی سے مفہوم پاتے ہیں اور ان کی زندگی اُن کے شعروں کی اصطلاح میں سمجھی جاتی ہے۔

فیض عالم باعمل کی طرح باعمل شاعر یا دانشور کی اس صف میں ہیں جس میں کرسٹوفر کاڈویل، ارنسٹ ہیمنگوے، پابلو نرودا، لورکا اور اگستینو نیتو آتے ہیں۔

دنیا کو ان فلسفیوں سے بھی دلچسپی رہی ہے جو دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان فلسفیوں کی انھوں نے پرستش کی ہے، جنھوں نے دنیا کو بدلنے کی کوشش کی ہے کہ اصل کام یہی ہے۔

چنانچہ فیض کی غزل ایک مسلسل نظم ہوتی ہے اور نظم غزل کی خصوصیتیں لئے ہوئے۔ فیض کی رومانویت ان کی زندگی کے حوالے سے، حقیقت نگاری بن جاتی ہے۔

فن پارہ فن کار کے کسی صورتِ حال کی طرف جذباتی رویہ کا اظہار کرتا ہے یہ سب جانتے ہیں۔ فن کار کی شخصیت (اس کا باطن) اپنے ماحول کے ساتھ ایک عمل میں داخل ہوتا ہے اور ان کے تعامل سے ایک جذباتی رویہ مرتب ہوتا ہے جو اس کے فن پارہ میں در آتا ہے۔ اب سوال یہی ہوتا ہے کہ فن کار اپنے ماحول سے کیا مراد لیتا ہے اسے کیا سمجھتا ہے، اور اس سے کس طریق سے معاملہ کرتا ہے۔

جبکہ فانی اپنے ماحول کے ساتھ تعامل میں اپنی ذات کے اتار چڑھاؤ سے باہر نہیں نکل پاتے۔ فیض کے ہاں ان کے ماحول کا وہ حصہ ان کی ذات کے ساتھ تعامل میں شریک ہوتا ہے جو سماج کی بنیادی حقیقت سے تعلق رکھتا ہے فیض بھی خارج کو داخلیا رہے ہیں، لیکن ان کا خارج سماج کے بنیادی مسائل اور اس کی روح سے تعبیر ہوتا ہے۔

فیض کا اپنے خارج کے ساتھ تعامل انفعالی نہیں ہے۔ وہ اس کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس طرح ان کے باطن اور ان کے خارج دونوں میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے ان کا خارج کے ساتھ تعلق حرکی نوعیت رکھے ہوئے ہے۔ وہ اور خارج ایک دوسرے کو بدل رہے ہیں۔

یہ وہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی صورتحال ہے جس کا مشاہدہ بلکہ تجربہ فیض کرتے ہیں اور اسے اپنی شاعری میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کا حوالوں کا نظام مستقل ہے جس کے CO-ORDINATES قائم ہیں۔ ان سے ان کی شاعری جہاں لحظہ لحظہ بدلتی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے وہاں وہ اس صورتِ حال کو دیکھنے کے لئے ایک تناظر بھی مہیا کرتی ہے۔

فیض وطن سماج اور دنیا بھر کی انسانیت کے روشن مستقبل کو بدلنے کی عالمگیر تحریک میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ تحریک ان کی شاعری کا تناظر بناتی ہے اور وہ اس تحریک کے قدم قدم کی گواہی دیتے ہیں۔

جز کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گذر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

فیض کے ہاں محبوب ایک تجسیم ہے، اپنے تمام انسانی تلازموں اور گوشت پوست کے ساتھ ان کے وطن کا' ان کے آدرش کا' جامع تاریخی عمل کا، استقبالی

حقیقت کا اُن کا محبوب فرد ہے جو ایک انجمن ہے جس کی تنہائی بھی محشرِ خیال ہے۔

فیض نظم "دو عشق" میں ارضی محبوب کے عشق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

اور پھر کہتے ہیں۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

اور پھر

اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

فیض کے یہ دونوں عشق الگ نوعیت کے ہیں، لیکن وطن سے عشق کے اظہار میں انھوں نے جو امیجری استعمال کی ہے' وہی ہے جو ان کے ارضی محبوب کے لئے وقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں محبوب کا تصور ایک اجتماعی شان لئے ہوئے ہوتا ہے اور فرد کی تجسیم بھی۔

فیض سے پہلے اقبال نے غزل میں فرد سے گذر کے اجتماع، بلکہ آفاق کی طرف رجوع کیا۔ فیض اقبال کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے تھے لیکن اقبال اور فیض کے لہجے مختلف ہیں۔ اقبال کے ہاں ایک پیغمبرانہ جلال ہے، ان کے ہاں گداز ہے لیکن ان کی جلالی طبیعت ان کے گداز پر حاوی نظر آتی ہے اور ان کے کائناتی وژن کے باعث ان کے ہاں غزل کے روایتی مضامین کم نظر آتے ہیں۔

فیض روایت کو لے کر چلتے ہیں، لیکن روایت کو اپنی فکری اُفتاد کے مطابق اپنے مطلب کے لئے ڈھال لیتے ہیں۔

اقبال اور فیض دونوں فارسی اور اردو میں فارسیت کی روایت کو استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں فارسیت کا جلال ظاہر ہوتا ہے فیض کے ہاں فارسیت سراپا جمال بن جاتی ہے۔ فیض کی شخصیت کی طرح' فیض کا لہجہ دھیما ہے، اس میں ٹھہراؤ ہے، رچاؤ ہے، ایک اطمینان ہے۔ فیض فرصت کے شاعر ہیں۔

فیض کی شاعری کا آہنگ مجموعی طور پر ایک خراماں ندی کی طرح ہے جو میدانوں سے گذر رہی ہے۔ گو ہر ندی پہاڑ سے آتی ہے اور فیض کی شاعری بھی طوفانوں کی قوت مخفی نغمہ کی صورت لئے ہوئے ہے لیکن ایسے کہ گلستان میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ فیض کو یقین ہے کہ اُن کا محبوب مل جائے گا، بلکہ سچ پوچھیے تو محبوب اُن سے جُدا ہوتا ہی نہیں۔

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یار خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں

رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

اور پھر

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

کہا گیا ہے کہ فیض کے ہاں جذبہ شہادت ایک غالب رویہ ہے۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے لیکن اس میں تھوڑی ترمیم کی ضرورت ہے۔ فیض کو شہید ہونے کا شوق نہیں لیکن ان کو شہادت سے گریز بھی نہیں ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ فیض اپنی تقدیر کو قبول کرتے ہیں لیکن کیسی تقدیر؟ وہی تقدیر جسے المیہ کی تنقیدی زبان میں اس مقولے کے ذریعے بیان کرتے ہیں کہ کردار مقدر ہے۔

فیض سمجھتے ہیں کہ تاریخی عمل کی اپنی منطق ہے، اور ایک حرکت ہے وہ کسی کے روکے تو رُکے گا نہیں لیکن یہ بھی نہیں کہ اس میں فرد کا کوئی کردار نہیں۔ فرد تو اس عمل کا ایک حصّہ ہے۔ اس کی اپنی قسمت تاریخی عمل کا حصہ ہے۔ فرد کی قسمت کو ماپنے، اس کی نوعیت، کامیابی، ناکامی کا مطلب تاریخی عمل سے متعین ہوگا۔

تاریخی عمل پر ایمان اور اس میں اپنی ذات کے مقام کا تعین کر لینے کے بعد فیض کے ہاں سب چیزیں

اپنی اپنی جگہ تلاش کر لیتی ہیں، اور ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے، ایک نظم آ جاتا ہے۔

فیض کو جس تقدیر سے پیار ہے، وہ تاریخی عمل سے متعلق ہے، اور تاریخی عمل کی سمت مثبت ہے اس لئے فیض آرام سے چلتے ہیں، دھیرے سے قدم رکھتے ہیں، لیکن آگے کی طرف۔ بات اُن کے لہجے کی، ان کے نمو کی ہو رہی تھی۔

فیض متوسط طبقے کے آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے' جسے کہتے ہیں ناز و نعم، اس میں پرورش پائی۔ آسودہ حال متوسط طبقے کے گھرانے میں انھوں نے اشرافیہ کی سی نفسی بلکی پائی۔ اشرافیہ کی بہتر روایات میں علم دوستی اور سب سے بڑھ کر استغنا کا مزاج ہوا کرتا ہے فیض بھی اشرافیہ کی ان دولتوں سے مالا مال ہوئے۔

فیض کی طبیعت کا یہ اشرافی استغنا ان کے تاریخی شعور سے پیدا شدہ ایمان سے ہم آہنگ ہے یہی ان کی شاعری کا بنیادی لہجہ، رنگ، آہنگ ہے۔

کہیں کہیں، خاص طور پر شروع شروع میں، فیض کے وہاں وہ رنگ نظر آیا جسے ساحر نے اپنا لیا، لیکن وہاں بھی فیض ساحر کی نسبت کم ناراض، کم غصے میں ہیں۔

ایرک فروم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں نازیوں نے جن لوگوں کو قیدی اور پھر گنی پگ بنایا ان میں بیشتر نازیوں کے انسانیت سوز رویے اور برتاؤ کے باعث انسان سے حیوان بن گئے۔ ماسوا تین قسم کے لوگوں کے' یہ لوگ تھے رومن کیتھولک، اشرافیہ اور کمیونسٹ، رومن کیتھولک اس لئے کہ ان کا اپنے مذہب پر ایمان پختہ تھا۔ اشرافیہ اس لئے کہ وہ قسمت کے اتار چڑھاؤ سے بے نیاز تھے اور کمیونسٹ تاریخی عمل کی ناگزیریت اور اس کے جبر پر ایمان رکھتے تھے۔

فیض کمیونسٹ ہیں یا نہیں، رومن کیتھولک بہرحال نہیں ہیں، لیکن اشرافی طبع ضرور رکھتے ہیں۔

ایک دوسرے اصطلاحی نظام میں یوں کہیے کہ فیض صوفی ہیں جیسا اشفاق احمد نے کہا اور ٹھیک کہا۔

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے۔

فیض اتار چڑھاؤ سے مستغنی ہیں تو ان کے ہاں سرشاری کا عالم بھی پایا جاتا ہے۔ ''تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر''

کہاں ہے منزل راہ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گذرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمال روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے۔

ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورش زنجیر بسم اللہ
سر مقتل چلو بے زحمت تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

چشم نم، جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

اور پھر فیض کہتے ہیں ۔

حاکم شہر بھی، مجمع عام بھی
تیر الزام بھی، سنگ دشنام بھی
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب با صفا کون ہے؟
دست قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رخت دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

اور سرمد نے بھی تو یہی کہا تھا کہ " قربانت شوم"

استغنا اور سرشاری اپنی جگہ، لیکن فیض کے ہاں سطحی قسم کی رجائیت نہیں، فن کار جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا ہی وہ حساس زیادہ ہوتا ہے، اتنا ہی وہ حالات کی پیشانی پر پڑنے والی شکنوں کے رنگ، ان کی تعداد میں کمی بیشی، چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ کے بیساختہ پن، اس کی پیلاہٹ، اس کی آوردہ، حالات کی سنگینی اور سازگاری، منزلوں کے سنگلاخ ہونے، لوگوں کے مزاجوں میں تبدیلوں کے سیز موگراف پڑھنے میں مشاق ہوتا ہے۔ اس کا دل سب کچھ دیکھتا ہے، اور وہ قلم بند ہوتا ہے۔

فیض کی شاعری میں یہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ اصطلاحی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی شاعری نفسیاتی حقیقت نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ فیض کے رویے سماجی عمل کی وسیع تر تحریک جسے وہ اپنا محبوب سمجھتے ہیں کے حوالے سے مرتب ہوتے ہیں۔

اور محبوب کے جتنے رویے ہوتے ہیں، اتنے ہی رویے فیض کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فیض کی شاعری میں وارداتوں کا جو تنوع پایا جاتا ہے اس کا حدود اربعہ بہت ہی وسیع ہے اور مضمون کے ایک نقشے کی بجائے اس کے لئے ایک اٹلس مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

تنوع کی ایک فہرست ان کے ایک گیت میں ہے:

منزلیں منزلیں
شوقِ دیدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں
زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوش پرواز کی منزلیں
اپنی دھرتی کی آباد بازار کی منزلیں
قول واقرار کی منزلیں
منزلیں منزلیں

قدرتی طور پر، ایک با شعور اور انتہائی SOPHISTICATED شاعر، جیسا کہ فیض ہیں، کا فن وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا کی منزلیں مارتا ہوا آگے بڑھتا گیا ہے۔ وہ کھر درے پن جو پہلے نظر آتے تھے اب غائب ہو گئے ہیں (میں تو یہی کہوں گا کہ غائب ہو گئے ہیں جب کہ فن ایسا دین ہے جو کبھی مکمل نہیں ہوتا)

کیٹس کی طرح فیض فنی سالمیت کے تحتی سے قائل ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایت کو وہاں پہنچا دیا ہے جہاں جا کر اب اُسے آگے بڑھنے کے لئے نئی زمینیں، نئے آسمان تلاش کرنا ہوں گے۔ اگر اس بات کو مبالغہ بھی سمجھ لیا جائے تو اس پر زور دینے کا مقصد سنگتراش کے پتھر کو مسلسل تراشنے خراشنے کے اس عمل کی طرف توجہ دلانا ہے جو فیض اپنے لئے فرض کئے ہوئے ہیں۔

فیض کی تکنیک ہند عجمی شعری روایت کا نقطہ عروج ہے جس کو فیض نے جدید مغربی شاعری کی تکنیکوں اور تجربوں کے ساتھ ملا کر اپنا خاص اسلوب پیدا کیا ہے۔

فیض کے ہاں وقت کے ساتھ ساتھ رجحان ایمائیت اور تاثریت کی طرف بڑھتا گیا ہے، غزل کی کلاسیکی روایت ان مغربی تکنیکوں سے مماثلت رکھتی ہے بلکہ ان کے مزاج بھی ایک جیسے ہیں۔ خاص طور پر فیض کی رواں دور کی نظم اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی رنگا رنگ تکنیکوں میں چند ایک کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

تجریدوں کو مجسم کرنا شاعری کی ایک خصوصیت ہے کسی شاعر میں یہ زیادہ پائی جاتی ہے، کسی میں کم فیض تجریدوں کو مجسم کرنے کے ماہر ہیں۔ شاعری اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی لیکن فیض کے ہاں یہ ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا تقابل شیلی سے کیا جاسکتا ہے۔ شیلی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تصورات کے ہیولے بناتا چلا جاتا ہے اور میتھیو آرنلڈ کے مشہور قول کے مطابق وہ ایک فرشتہ ہے جو اپنے بے بضاعت پر روشنی پھینکتے خلا میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ ایک اور نقاد کے مطابق شیلی کی شاعری میں اٹلی کے آسمانوں کے بدلتے رنگوں کی طرح رنگ بدلتے ہیولے اٹھتے ہیں اور بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے شیلی کے ہاں بعض اوقات ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

تجسیم کا عمل فیض کی نظموں میں بالخصوص ایک مسلسل عمل ہوتا ہے تجسیم در تجسیم کا۔ وہ تجریدوں کے ہیولے بناتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح نئے باسیوں، خیالی باسیوں کی ایک نئی دنیا بنا ڈالتے ہیں۔

جب تجسیموں کا نیا جہاں آباد وجود میں آ جائے تو وہ ایک متھ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ شیلی اور فیض دونوں کے ہاں متھ سازی کا عمل کمال پر پہنچا ہوا ہے

فیض کی نظم "ملاقات" لیجئے، اس کا پورا لسانی تجزیہ ممکن نہیں صرف اشارہ کرنا ہے اس نظم کے متھ سازی کے پہلو کی جانب:۔

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں۔
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

رات درد کا شجر اور پھر شجر کے استعارے کو آگے بڑھایا گیا ہے، ستارے، مہتاب، لمحوں کے زرد پتے گر رہے ہیں، "اور تیرے گیسوؤں میں اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں۔" "رات کی سیاہی میں نہر خوں، غم بانہوں کے گلستان میں سلگ رہا ہے۔

متھ سازی کا عمل ایک شعری صنعت نہیں، بلکہ علم کا ایک ذریعہ ہے، اپنے جذبہ، اپنی واردات کو محسوس کرنے کا۔ محسوس کرنے کے لئے بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی۔ شاعر کے تخیل۔ زیادہ صحیح یہ کہ شاعر کے پورے وجود میں واردات ایک ہلچل مچاتی ہے اور یہ واردات محسوس شکل میں آنے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔ احساسات محسوسات کا روپ دھارنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ غیر مادی دنیا ہے اس لحاظ سے کہ یہ نفسیاتی دنیا ہے۔

درد آئے گا دبے پاؤں، لئے سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں مہک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

متھ سازی کے ذکر میں "یار" کا حوالہ ضروری ہے۔

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب

اور جب یہ نظم اقبال بانو کی آواز میں ہو تو آسمان زمین پر اتر آتا ہے

شیلی کے اٹلی کے بدلتے رنگوں والے آسمانوں کے مقابلے میں فیض کو لیجئے۔ اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے

یکا یک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے' بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا، اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کی قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کیفیت کا بعد میں بھی کبھی کبھی احساس ہوا ہے مگر اب نہیں۔''

اسی طرح کی شہادت ورڈز ورتھ کے بارے میں ہے کہ ابتدائی دور میں چلتے چلتے اسے ہر چیز تحلیل ہوتی نظر آتی تھی، حتیٰ کہ اسے اشیا کی حقیقت کا یقین کرنے کے لئے دیوار کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

شاعر کے ہاں یہ کیفیت عام ہوتی ہے باوجودیکہ فیض کے کہنے کے مطابق اب اس کیفیت کا احساس انہیں نہیں ہوتا لیکن شاعری کی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ اس میں تخیل بھر دیتا ہے اور نئے مرکب اور آمیزے تشکیل دیتا ہے۔

رنگ اور اشیا، کی ماہیت بدلنے کی طرف فیض نے اشارہ کیا ہے اور اس میں قرار لانے کی خواہش فیض کے ہاں بالذات ایک مضمون بن گیا ہے۔ خاص طور پر جدید دور کی شاعری میں فیض کی طبیعت اب قرار چاہتی ہے۔

ایک پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب، ید بیضا لے کر
ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے
اور نیا دل میرا
زہر میں ڈھل کے، فنا ہو کے کسی گھاٹ لگے

درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اور "دست تہ سنگ" کی نظمیں "رنگ ہے دل کا مرے" "اور پاس رہو"
''تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے''
رنگ ہے دل کا مرے "خون جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحت دیدار کا رنگ

اور پھر فیض رنگوں کی ایک بساط بچھا دیتے ہیں کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے اور پھر:

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں، حد نظر، راہگزر، راہگزر، شیشہ مے، شیشہ مے

فیض کی یہ قرار کی خواہش والی نظمیں عام طور پر اس وقت کی ہیں جب وہ وطن سے باہر یا وطن ہی میں کسی پرسکون ماحول میں ہوتے ہیں' جب ہنگامے دور نظر آتے ہیں' اس وقت فیض اس روحانی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنا چاہتے ہیں، لیکن جسے وہ اس دنیا میں، اس ارضی مملکت میں قائم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان کا ایمان ہے کہ

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے

لیکن اپنی مثالی روحانی دنیا کا سکون جب وہ پا لیتے ہیں اسی دنیا کے کسی کونے میں تو انھیں علم ہوتا ہے کہ چند لمحوں میں یہ سکون درہم برہم ہو جائیگا۔ انھیں علم ہے کہ کیٹس بلبل کے نغمے کے ساتھ ایک الوہی دنیا میں چلا گیا تھا اور پھر اُسے واپس آنا پڑا تھا۔ ایسے موقع پر وہ چاہتے ہیں کہ اشیاء کو حالات کو قرار آ جائے۔

اس قسم کی شاعری میں شامل وہ نظمیں بھی ہیں جو منظر ہیں۔ سکون کا، شانتی اور آشتی کا "منظر" رہگزر، سائے، شجر، منزل دور، حلقۂ بام بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ

اور آخر میں
دل نے دہرایا کوئی حرف وفا، آہستہ
"تم نے کہا، آہستہ"
چاند نے جھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

اس طرح کی نظم ہے "اشک آباد کی شام" نظموں کا اس قسم کا مجموعہ یاد دلاتا ہے کہ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

فیض کے ہاں انداز بیان میں جو سلاست آ گئی ہے وہ تکلم کے ردم کے قریب آ گئی ہے۔ خاص طور پر بلینک ورس میں فیض یوں چلتے ہیں جیسے بول رہے ہوں' جیسے ایک پڑھا لکھا مہذب شخص کلام کر رہا ہو۔ بلینک ورس ان کے ہاں آ کر موم ہو گئی ہے۔

نظم میں فیض غزل کی ایک تکنیک کو خاص طور پر استعمال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ چھوٹے چھوٹے ہم قافیہ، ہم ردیف مصرعے بڑی نظم میں اپنے گچھے بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ نظم میں غزل کے اجزا شامل کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح فیض کے مصرعوں کے اندر بھی ردم کے پیٹرن (بحر یا وزن کی مناسبت سے علاوہ) پیدا ہوتے ہیں

مثلاً گیت "جب تیری سمندر آنکھوں میں" میں

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
اور پھر ہونٹوں کی لپک' باہوں کی چھنک

وغیرہ وغیرہ

یا "رنگ ہے دل کا مرے" میں

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے

آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر، شیشہ مے، شیشہ مے

اس نظم میں "رنگ" کی تکرار سے کام لیا گیا ہے

یہی خصوصیتیں "پاس رہو" میں دیکھی جاسکتی ہیں

یا پھر "زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے" میں۔

"دست تہِ سنگ" تک آتے آتے فیض کو شکایت ہونے لگی ہے کہ

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی

جس میں رکھا نہیں ہم نے قدم

ماضی کا صیغہ استعمال ہونے لگا ہے

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے

اور

کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم

دیکھئے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد

پھر "وادی سینا" میں

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ

نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں

"شام شہر یاراں" میں شاعر کو فرصت کے لمحے ملے ہیں تو وہ زندگی کی سٹاک ٹیکنگ کرنے لگا ہے۔ ماضی یاد آنے لگا ہے، حالات دہرانے کی بات ہوتی ہے، دعا ہوتی ہے موت کا کیسے استقبال ہوگا، یہ موضوعات عام ہیں۔

بہار آئی تو جیسے یکبار

لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے

وہ خواب سارے، شباب سارے

جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے

چلو پھر سے مسکرائیں

چلو پھر سے دل جلائیں

اے شام مہرباں ہو

اے شام شہر یاراں

ہم پہ مہرباں ہو

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے

نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے

ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے

جس راہ چلے، جس سمت گئے

یوں پاؤں لہولہان ہوئے

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے

ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

اور پھر یہ خوبصورت نظم "جس روز قضا آئے گی" اس نظم کا احاطہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ اس میں فیض کی وہ تمام شاعری اور فنی صلاحتیں بروئے کار ہیں جو ان کے شعر کو جمال کی بلندیوں پر پہنچاتی ہیں۔ شاعر قضا کو ایک قدرتی عمل کے طور پر ہی قبول نہیں کرتا بلکہ ایک کامیاب زندگی کے ایک مناسب فائنل کے طور پر لیتا ہے۔ موت ایسے آئے گی جیسے "اول شب، بے طلب، پہلے پہل، مرحمت بوسہ لب جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے" شاعر موت کو شکر گزاری کے ساتھ قبول کرے گا۔ زندگی کے اقرار کی اس سے عمدہ مثال کیا ہوگی کہ

دل سے بس ہوگی یہی حرف وداع کی صورت

للہ الحمد بانجام دلِ دل زدگاں

کلمہ شکر بنام لب شیریں دہناں

"تم اپنی کرنی کر گزرو" میں بھی عمر کے آگے بڑھنے کا ذکر ہے

اب کیوں اس دن کا ذکر کرو

جب دل ٹکڑے ہو جائے گا

پھر وہی یادِ ایامِ گذشتہ

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے

جو پہلا دن تھا چاہت کا

اسی لئے:

تم خوف و خطر سے در گزرو

جو ہونا ہے سو ہونا ہے

گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے

گر رونا ہے تو رونا ہے

تم اپنی کرنی کر گزرو

جو ہوگا دیکھا جائے گا

اور اب فیض کا نیا مجموعہ طباعت کی منزل سے گذر رہا ہے یا گذرنے والا ہے "شام شہر یاراں" کے بعد شاعر پر قیامت گذر گئی جس کا ذکر نثر میں فی الحال ممکن نہیں۔

سنا ہے کہ خوبصورت کھنڈروں کے شہر بیروت میں یاسر عرفات کے ہیڈ کوارٹرز میں جب شام کے سائے دراز ہونے لگتے ہیں تو فیض بے چینی میں ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہاں انھیں کسی کا انتظار نہیں کہ وہم ہو کہ "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا" بلکہ اس کے برعکس فیض نے ایک بار کہا تھا۔

ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھی ہے فریاد کناں

☆☆☆

طاہر محمد خان

"ہمارے افکار اور زبان پر فیض کا اثر"

فیض صاحب سے میرا محکم فکری رشتہ 1960ء کے ابتدائی دنوں میں بنا جب میں کراچی آیا۔ کراچی یونیورسٹی کیا سارے کالجوں میں این۔ ایس۔ ایف کی گرفت مضبوط تھی۔ جبکہ طالب علموں کے دل و دماغ پر فیض صاحب راج کیا کرتے۔ "لوح و قلم" این۔ ایس۔ ایف کے علمی پرچے کا نام تھا۔ این۔ ایس۔ ایف ترقی پسندانہ افکار سے وابستگی رکھتی تھی جبکہ فیض صاحب ترقی پسندی کی علامت مانے جاتے تھے۔ طالب علموں کی زبانوں پر فیض صاحب کے اشعار رواں رہتے۔ فیض صاحب کی بعض اصطلاحات تو روزمرہ کا درجہ اختیار کر گئی تھیں۔ عام بات چیت میں فیض صاحب کے مصرعے دہرائے جاتے "متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے۔" یا "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔" یا "جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے۔" یا "بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے۔" "صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک" یا "محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں" یا "اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" یا "زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں" "گرمیِ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو" یا "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا" یا "کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے" "ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت۔" غرض کہ اُن دنوں اہلِ ادب اور اہلِ سیاست کی گفتگو کا نمایاں حصہ فیض صاحب کا کلام تھا۔ ہر محفل میں کسی نہ کسی حوالے سے اُن کا نام اور اُن کا ذکر ہوا کرتا۔

ساٹھ کی دہائی سیاسی فکر و نظر کا وہ دور تھا جب لوگ تحریکِ پاکستان کے دور کے نعروں اور اُن سے پیدا ہونے والے سحر سے نکل رہے تھے۔ "یہ داغ داغ اجالا" کی معنویت ظاہر ہو رہی تھی۔ اب صرف نظریہ پاکستان کے نام پر رائے عامہ کو بہلایا پھسلایا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ شعور پیدا ہو گیا تھا کہ معاشرے کی نمو کیلئے جمہوریت کے نفاذ کی واقعی ضرورت ہے۔ ایسی جمہوریت جہاں امتیاز رنگ و نسل نہ ہو جہاں زبان و مذہب شہری حقوق کا پیمانہ نہ رہیں جہاں قانون کی نظر میں سب برابر ہوں۔ جہاں آزادی ہو اور عزتِ نفس کو تحفظ ملے۔ جہاں بھوک بیماری، ناداری اور جہالت کا کوئی مداوا ہو۔ ان سوچوں سے نئے سیاسی افکار جنم لے رہے تھے۔ اور یہ کہنا بے محل نہیں کہ ان افکار کی صورت گری میں فیض صاحب کا ایک نمایاں رول رہا ہے اُس دور کے ترقی پسند شاعروں۔ ادیبوں اور سیاست کاروں نے ان احساسات کو بیدار کیا لیکن ان کو زبان فیض صاحب نے عطا کی۔

الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح افلاک میں نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے

فیض صاحب معاشرے سے سیکھتے بھی رہے اور معاشرے کو درس بھی دیتے رہے

"ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں۔"
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

اُن کی زندگی کا محور وطن اور وہ فرزندانِ وطن رہے جن کو سماج نے تنگ اور آزردہ کر رکھا تھا۔ وہ ان طبقات کو محرومیوں کا احساس دلاتے رہے اور اُن کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ ان کی زندگی اور اُن کی شاعری میں ہر جگہ اسی نوع کے جذبات نظر آتے ہیں۔

دیارِ یار تری جوششِ جنوں کو سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر

یا

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

اُس دور کے ادب اور سیاست پر ان افکار کا نمایاں اثر رہا۔ نوجوان، طالب علم اور دانشوروں کی سوچ پر یہی خیالات چھائے رہے تب شہری حقوق کا کوئی تصور باقی نہیں تھا۔ اس وقت پاکستان بدترین آمریت کے دور سے گزر رہا تھا۔ آمریت کے سائے میں بائیس خاندان پھل پھول رہے تھے۔ ان لوگوں نے مزدوروں، محنت کشوں اور کارکنوں کو بے زبان غلام بنا لیا تھا۔ جبکہ ساری دنیا میں سیاسی اور اقتصادی آزادی کی تحریکیں صدیوں کے بہیمانہ طلسم کو توڑ رہی تھیں۔ ان تحریکوں سے یہاں بھی دبے ہوئے

طبقات میں جمہوریت اور سوشلزم کیلئے آشائیں بڑھ رہی تھیں۔ ان کی شناخت ایک ایسی صبح کے حوالے سے ہو رہی تھی جب انسان جبر، ظلم اور استحصال سے چھٹکارا پائے گا۔ وہ دوا کیلئے سسکتا ہوا دم نہیں توڑے گا نہ ہی اُسے اس بات کیلئے ظلم کا نشانہ بنایا جائے گا کہ اُس نے مقتدر سے حق کا مطالبہ کیا تھا۔ فیض صاحب لوگوں کی اپنی امنگوں کو زبان عطا کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستانی محض مفلس، نادار اور بے زبان مخلوق نہ رہیں بلکہ دوسری زندہ قوموں کی طرح آزاد، خوشحال اور روشن خیال قوم بن کر دھرتی پر ابھریں۔

دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

یا پھر اسی جذبے کو جگر کی آگ، نظر کی امنگ اور دل کی جلن کا نام دیا ہے۔ ایک ایسے سیمابی احساس کی نشان دہی کی جو بے وسیلہ اور محروم طبقات کے دلوں میں موجزن رہا، جس کی کسک وہ دلوں میں محسوس کرتے رہے۔

جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

فیض صاحب کے شعر نے ہمارے دور، اُس دور کے جوانوں اور اُس کے شعور کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ میری نسل کے لوگ اپنی سوچ کی ترکیب اور تشکیل میں آج تک اس تاثر کو محسوس کر رہے ہیں۔ 1958ء میں جب ملک میں پہلا مارشل لاء مسلط کیا گیا تو حکمرانوں نے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ساتھ فیض صاحب کو بھی گرفتار کیا۔ اگرچہ اُن کا مروج سیاسی پارٹیوں سے کوئی براہ راست واسطہ نہیں تھا لیکن بجا طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ "Opinion Maker" ہیں اور رائے عامہ کا رُخ متعین کرنے والوں میں سرفہرست ہیں۔ اہل کراچی میں ترقی پسند سوچ اور مزدور تحریک اُن سے انسپائیر ہو رہی تھی۔ اُس وقت کے سیاسی تجزیہ نگاروں نے مارشل لاء کے نفاذ کی بڑی وجہ کراچی میں سوشلسٹ خیالات کے عروج کو بتلایا اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔ یہ اثرات پوری آب و تاب کے ساتھ 1970ء تک جاری رہے اور باوجودیکہ 12 سال تک مسلسل دار و گیر، زبان بندی، تحریص، تشویق اور تخویف جاری رہی لیکن کراچی میں ترقی پسند جماعتوں کی حمایت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ پاکستان کے پہلے جمہوری انتخابات میں ترقی پسند جماعتوں کو بڑی تعداد میں ووٹ ملے۔ اگر باہمی چپقلش نہ ہوتی تو نمایاں کامیابی بھی ہو سکتی تھی تاہم اس سے سوچ کے دھاروں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سیاست کی تین جہتیں متعین کی جا سکتی ہیں۔ سوچ، نظریہ یا سمت جس کو "Ideology" کا نام دیا جاتا ہے۔ مقصد، منتہا یا منزل۔ جب مظلوم اور محکوم طبقات اقتدار میں شریک ہوں گے اسی کو انقلاب بھی کہا گیا ہے۔

یہ دہکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

فیض صاحب کی شاعری ان تینوں پہلوؤں کو محیط کرتی ہے۔ یہ مقالہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان پہلوؤں کے حوالے سے الگ الگ گفتگو کی جائے اور فیض صاحب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جائے۔ اس کیلئے وقت اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ جو ادب کے محقق احسن طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

شاعری تھیسس (Thesis) یا سنتھیسس (Synthesis) نہیں ہے۔ اس میں مفہوم کے ساتھ ساتھ نزاکت زبان و کلام کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ توقع درست نہیں کہ فیض صاحب کی شاعری کوئی سیاسی منشور ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ انسان کے دو ہاتھوں کو ایک پیداواری اکائی کہتے ہیں۔ مزدور، کسان اور محنت کش پیداواری اتحاد قائم

فیض اور تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی)

کرتے ہیں لیکن صدیوں کی مسلسل محکومی نے ان میں
بے عملی اور احساس کم مائیگی پیدا کر دیا ہے۔ عدو، مقتدر
طبقات ہیں جو اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم رکھنے
کیلئے جدال وقتال جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوب صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحن چمن میں دہکیں گے
بجائے سرو و سمن میری ہڈیوں کے ببول

محکوم طبقات میں ہم آہنگی اور اتحاد کی ضرورت
ہے تاکہ مل کر اس بہیمانہ طلسم کو توڑ دیں اور ایک ایسے
نظام کی بنیاد رکھیں جہاں اجالا ہی اجالا ہو۔

لیکن اس صبح، اس اجالے اور اس منزل کیلئے
مسلسل جہد کی ضرورت ہے۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

سلطانوں، جاگیرداروں اور نوآبادیت نے
ہمارے معاشرے کو اس قدر بے ثمر بنا دیا تھا کہ اس
میں محض غربت اور افلاس ہی نہیں بلکہ لاچاری، تیرگی،
ظلم، جبر، بھوک اور بیماری کے ساتھ صدیوں کا طلسم کہ
جس نے احساس بے بسی پیدا کر دیا تھا، چھایا ہوا تھا۔
فیض صاحب نے جابجا ان کمزور بنیادوں کی طرف
اشارہ کیا ہے۔

الم نصیبوں، جگر فگاروں کی صبح افلاک میں نہیں ہے

یہ احساس پیدا کیا کہ ان بے چارگیوں کا مداوا
دعاؤں میں نہیں بلکہ ایک مسلسل جدوجہد میں ہے۔
اسی لئے بار بار کہا کہ عالم نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اس سے لہو
میں گرمی پیدا ہو جائے گی۔

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر

پاک و ہند میں جمہوری قوتوں کی ایک مسلسل
جدوجہد کی تاریخ ہے۔ انہی نہتے لوگوں نے عظیم
برطانیہ کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا، عوامی جدوجہد جس میں
بے بسوں کی شرکت ہو ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ کوئی
انقلاب لوگوں کی حمایت کے بغیر دیرپا نہیں ہوگا۔ یہی
وجہ تھی کہ فیض صاحب انفرادی قوت کو بیدار کرنے کی
کوشش کرتے رہے۔

تیرا سرمایہ ترے پاس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں

جب بھی اُن کو احساس ہوتا کہ محفل میں چاک
گریباں کم ہوئے یا لوگوں میں احساس زیاں نہیں رہا
تو فوراً تازیانہ دیا

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھیں سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

"نقش فریادی" کی نظموں میں فیض صاحب کا
لہجہ براہ راست تھا۔ وہ صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم،
اطلس اور کمخواب میں بنوائے گئے جسموں کے تصورات
کے ساتھ گلی گلی کوچہ کوچہ انسان کی بے حرمتی اور ظلم و
زیادتی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ مفلس کی قبا اور درد
کے پیوندوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

لیکن بعد کی نظموں میں وہ ان اصطلاحات پر
ہی اکتفا کیا کرتے جو بالادست طبقات کی بے دردی
کا اشارہ دیتیں۔ جیسے "شرح بیدردی حالات نہ
ہونے پائی" "بچے تو کیسے بچے قتل عام کا میلہ" یا "میں
نے گرد آلود آنکھوں کو لہو سے دھو لیا" یا "کہیں تو
کاروان درد کی منزل ٹھہر جائے" یا "کوچہ و بازار سے
پھر چن کے ریزہ ریزہ خواب" یہ اصطلاحات زبان زد
عام ہوئیں۔ ہمارے دور میں ہم ان علامتوں کو پورے
سیاق و سباق کے ساتھ سمجھ رہے ہوتے تھے اس لئے
مفہوم کا ابلاغ بہ آسانی ہوتا تھا۔ محرومیاں سماجی، سیاسی
اور اقتصادی محرومیاں تھیں جو سیاسی بے اعتدالی سے
پیدا ہوئی تھیں، جبر بالادست طبقات کا جبر تھا۔
گلشن وطن، ایوان ہوس، محفل اور انجمن جیسی
باتیں سماج کی طرف اشارہ دیتی ہیں۔

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

میں قدرے تکرار اور اصرار سے یہ کہنا چاہتا
ہوں کہ ہمارے عصر کی بول چال پر فیض صاحب کی
زبان کا ملمع چڑھ گیا تھا۔ ہماری بات چیت اُن کی
شاعری سے مرکب تھی۔ ہم اپنی امیدوں، تمناؤں،
خوابوں اور آشاؤں میں فیض صاحب کے خیالات کی
چھاپ محسوس کرتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی وجہ
روح عصر تھی لیکن ہمارے عہد سے ہمارا تعارف اُن
کے اشعار کے حوالے سے ہوا۔ جمہوریت سوشلزم،
انسان کے بڑے پن اور ایک ایسی زندگی کی تمنا
کرتے۔ جس میں شانتی اور سکھ ہو آسودگی ہو، امتیاز نہ
ہو نفرت نہ ہو، تعصب نہ ہو اور جہاں انسان کو اس کے
فکر و عمل کی بنیاد پر، نہ کہ مقام پیدائش یا خاندانی سٹیٹس
کی بنیاد پر کھا جاتا ہو۔

دیس پردیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق جمال لب و رخسار کے نام

یا

جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظر

یا

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

☆☆☆

شاہین مفتی

فیضؔ کی کلر سکیم

انسانی زندگی میں فکر کی بنیاد مفروضے پر رکھی گئی ہے' فکر' جو تاثر اور اظہار کے پیرائے میں اپنا ابلاغ چاہتی ہے' یہ ابلاغ کبھی عمل ہے' کبھی ردِعمل' فکری جمالیاتی تربیت میں لفظ' رنگ اور صوت انسانی رابطہ ہے اور رابطہ تہذیب' تاریخ' مذہب' نظریے اور مکتب فکر کی بنیاد ہے۔ جب بھی کوئی لفظ یا رنگ کسی تحریر میں بار بار استعمال ہوگا اور ایک عام کیفیت کو مخصوص ذرائع سے بیان کرے گا قاری کے ذہن میں اس مسلسل عمل سے یہ خیال ابھرے گا کہ لکھنے والا ایسا کیوں کر رہا ہے۔

دراصل شاعری کے کینوس پر شاعر کے ذاتی منظرنامے میں کچھ الفاظ اس کے ''کلر باکس'' Colour Box ہیں' شاعر اپنے لفظی استعمال سے جب بھی کوئی تصویر بناتا ہے اس کا منشاء یہی ہوتا ہے کہ اس کے رنگوں کا ہو بہو ابلاغ ہو' خاص طور پر وہ رنگ جو اس کی مخصوص ذہنی تصویر سے ابھرے ہیں۔ شاعر کا میدان مصور کے فکری اور اظہاری میدان سے قدرے مختلف ہے۔ الفاظ کا مربوط مرکب استعمال رنگ کے متحرک تاثر کو تصویر کے ساکت تاثر سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کر سکتا ہے' مفرد' مجرد' بلاواسطہ اور مخلوط تمثال کے لاشعوری نظام سے Functional metapher جنم لیتا ہے جو بین السطور زندہ رہتا ہے اور شاعر کی فکری تصویروں کے رنگوں کا ابلاغ کرتا ہے۔ کئی مقامات پر یہ رنگ قاری کے ذاتی تجربے' مشاہدے اور ادراک میں ڈھل کر نئی صورتیں اختیار کر جاتے ہیں۔ بظاہر ''رنگ'' قوت بصارت سے تعلق رکھنے والا ایک حسی "Element" ہے لیکن انسانی وجود میں حواس و احساسات و افکار کی زنجیر اس طرح گوندھی گئی ہے کہ بصارت کو بصیرت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا' ہم اسی حیاتی تجربے سے اجتماعی لاشعور کے کئی مخفی نقطوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ شاعری میں کئی مقامات پر رنگ بجائے خود تمثال ہیں' محض تمثالوں کے نشان نہیں اس طرح شاعران رنگوں سے جو استعارے وضع کرتا ہے وہ انہی اقدار کے حامل ہوتے ہیں جو شاعر نے ان کو عطا کئے۔ کئی مقامات پر یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر نے کسی امدادی ترکیب' جملے' اشارے یا علامت کے بغیر ''رنگ'' کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ وہ محض ایک سطحی بیان معلوم ہو لیکن قاری اپنے ادراک کی مدد سے اس رنگ کے ذریعے کسی خارجی حقیقت یا شاعر کے ذاتی رویے کی جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔

اُردو لغت کی رو سے لفظ ''رنگ'' کو یہ معنی دیئے گئے ہیں۔

''رنگت' فام' روپ' ناچ' راگ' گانا' کھیل کود' طرز' روش' انداز' ڈھنگ' طور طریقہ' حال احوال' حالت' کیفیت' دستور' درجہ' بہار' جوبن' سماں' چرچا' گونج' مانند' مثل' نظر' روغن' خوشی' خوشحالی' قانون' قسم' نوع' رونق' چمک' خوبصورتی' تماشا' سیر' ہنسی' مذاق' چہل' گنجفے کی بازی' ہمسر' جوڑ' دھوم دھام' لطف' مزہ' شغل' مشغلہ' خمار' نشہ' خون' لہو' وغیرہ وغیرہ

اسی لحاظ سے اس ایک لفظ کو مختلف تراکیب اور محاوروں میں استعمال کیا گیا ہے رنگ آشنا' رنگ آمیزی' رنگ اڑ جانا' رنگ افشانی' رنگ اکھڑنا' رنگ باندھنا' رنگ بدلنا' رنگ برنگ' رنگ بھرنا' رنگ پر آنا' رنگ پکڑنا' رنگ پھیکا ہونا' رنگ پیدا کرنا' رنگ جل جانا' رنگ جمانا' رنگ دار' رنگ دیکھنا' رنگ دینا' رنگ رس' رنگ رلیاں' رنگیلا' رنگ روپ' رنگ ریز' رنگ کھیلنا' رنگ زرد ہونا' رنگ سفید ہونا' رنگ کاٹنا' رنگ لانا' رنگ محل' رنگین مزاج' رنگینی وغیرہ

مصوری کی زبان میں رنگوں کو ٹھنڈے اور گرم رنگوں میں تقسیم کیا گیا ہے' ماہر طبعیات روشنی کے انتشار اور طیف میں بنفشی' نیلا' سبز' پیلا' نارنجی اور لال رنگ یک جا دیکھتے ہیں۔ رواقیوں کے مکتب فکر کا ایک حکیم Chrysippus کہتا ہے فطرت نے جانوروں کو حسن کی خاطر پیدا کیا ہے اور وہ ان کے رنگوں سے لطف اٹھاتی ہے۔ ڈوگالڈ سٹورٹ کہتا ہے حسن کا اطلاق بنیادی طور پر مرئی اشیاء پر ہوتا ہے اور اس کے متعلق انسان کے ابتدائی تصورات رنگوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ آنکھ پہلے رنگوں کے محاسن کی ستائش سیکھتی ہے' اس کے بعد بتدریج صورت اور حرکت سے حسن کا اظہار ہوتا ہے' ہوگارتھ کہتا ہے رنگ بوقلمونی ہے۔

جس طرح تصویر کے رنگ' نقوش اور لکیروں کے زیر و بم دیکھنے کے عمل میں حسیات کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے باہمی آہنگ سے ذہن میں حسن کا ایک

معیار جنم لیتا ہے اسی طرح شاعر اپنی فنی ہیئت اور حسی تجربات سے شعری اوراک کو متحرک کرتا ہے۔ دراصل شاعری وہ توصیف الحال ہے جو مصورانہ جزئیات نگاری کے لفظی بیان سے ایک تصویر، ایک فضا بلکہ ایک عصری منظرنامہ تخلیق کرتی ہے۔

اُردو شاعری میں ہمیں غزل کے میدان میں ولی دکنی، حاتم، سودا، میر، مصحفی، آتش، غالب اور حسرت موہانی کے ہاں پیکر تراشی، منظر نگاری اور درد و الم کی ایسی تمثیل کاری کے نمونے ملتے ہیں جن کے مطالعے سے ان شعراء کے مخصوص استعمال شدہ استعارے شاعر کی ذاتی اور عصری زندگی پر گہری روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح نظم کے میدان میں اقبال کے مخصوص استعارے اور اختر شیرانی کے رومان پرور رنگ نظمیہ تاریخ میں اپنی انفرادیت اجاگر کرتے ہیں، فیض نے اس کلاسیکی روایت سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن ان کا لفظی انتخاب متذکرہ شعراء سے قدرے مختلف ہے۔ انہوں نے کوشش کی ہے کہ رنگ کا انتخاب ان کا تخلیقی استعارہ بنے اور وہ ذاتی یا عصری معاملات کو ان رنگوں میں اس طرح سمو دیں کہ ایک خاص منظرنامہ یا فضا تشکیل پا جائے۔ ان کی کتب کا تدریجی جائزہ لیجئے "نقش فریادی" میں آغازِ شباب کی واردات، محبت کے بے ضرر جذبات اور نسوانی تناسبات طرح طرح سے جلوہ نمائی کرتے ہیں، اختر شیرانی کی "سلمیٰ" کے رومان پرور اثرات "ترا جسم اک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ" کے پس منظر میں آسمان کی نیلاہٹوں، ڈوبتے ستاروں اور براؤننگ و شیلے کی ان تعلیمات حسن کو فراموش کرنا مناسب نہ ہوگا جن کا مطالعہ "ہوسٹل کی شام" میں اپنی جھلک دکھاتا ہے فیض نے لکھا ہے۔

"کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے یکایک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے، بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ حنائی ہو گیا ہے، دنیا ایک طرح کی پردہ تصویر قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی"۔ یہیں فیض کی ایک اور پرانی یاد کئی طرح کے رنگ منکشف کرتی ہے "ہم مستی دروازے کے اندر رہتے تھے ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا نیچے بدرو بہتی تھی، چھوٹا سا ایک چمن بھی تھا، چار طرف باغات تھے، ایک رات چاند نکلا تھا، چاندنی بدرو اور اردگرد کے کوڑا کرکٹ پر پڑ رہی تھی، چاندنی اور سائے یہ سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے" ایک اور مقام پر لکھا ہے "شہر کی گلیوں، محلوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت، کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آ جاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے" فیض نے جہاں عوام الناس کے بارے میں شدت سے سوچنا اور اظہار کرنا شروع کیا ہے وہیں بچپن کی یہ یادیں چشم خیال سے جھانکنے لگتی ہیں۔ نظم "انتساب" میں چاند اسی ناپاک خاشاک سے وضو کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح کچھ مقامات پر فیض کے مخصوص منظرنامے اور ان کے رنگ شاعری کا تخلیقی استعارہ ہیں اور کچھ مقامات پر شاعر کی ذاتی زندگی کے مخصوص واقعات کا اشارہ، کہیں عصری و سماجی و سیاسی مسائل کا حوالہ ہیں تو کہیں فیض کے خواب کے تکمیلی رجحانات کا حیرت کدہ۔ ان رنگوں سے فیض کی شاعری کی ایک مخصوص فضا ترتیب دی جا سکتی ہے اور انہی کے آئینے میں ان کی شاعری کا وہ کرداری ساختیہ اپنی جھلک دکھاتا ہے جس کے باعث فیض کا درجہ دیگر ہم عصر شعراء سے مختلف اور ممتاز ٹھہر سکتا ہے۔ اس طرح فیض کے استعمال شدہ رنگوں سے ایک مثبت اور معتبر قدر برآمد ہوتی ہے۔ "نقش فریادی" کے فکری آسمان پر ایک مایوس، مغموم، طویل، نیم آسودہ، اداس اور مجہول رات تیر رہی ہے جو سیاہ رنگ کی علامت ہے سرخ اور سنہری رنگ کے اشارے بھی موجود ہیں لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں، روشنی کا وجود مدہم اور خوابیدہ ہے۔ "دست صبا" میں شاعر کا عشق ذاتی، وطنی و قومی و عوامی سطح پر اتر آیا ہے چنانچہ اس کتاب میں سیاہ، سرخ، زرد، سبز اور نیلے رنگوں سے جو تصویریں بنائی گئی ہیں ان میں زندگی کی جھلک توانا اور زور آور ہے۔ فیض کے اسی ذہنی پس منظر میں دست صبا کی یہ نظم دیکھئے۔

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گذرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اسی کتاب میں سراپا نگاری کے متعلقات سے منسلک نظمیں بھی کافی کامیاب ہیں۔ دشت تنہائی، آواز کے سائے، ہونٹوں کے سراب، دوری کے خس و خاک، دل کا رخسار، صبح فراق، ہجر کا دن، یاد کا ہاتھ، وصل کی رات، نشاط انگیزی، حسن کی موجودگی اور جمالیاتی فشار کی وہ تصویر ابھارتی ہے جو ہمیں جان کیٹس کی نظموں میں ملتی ہے

"زنداں نامہ" میں جو رنگ کثرت سے استعمال ہوا ہے وہ سرخ رنگ ہے جس کی تمثیلات، اشارے، استعارے، تشبیہات اور مختلف نسبتیں کہیں

عارضِ محبوب ہیں، کہیں مشعل رخسار، کہیں لہو اور کہیں مقتل، یہ آتشیں تراکیب فیض کے فکری سفر کے وہ محرکات ہیں جنہوں نے جیل خانے کو عاشقی کا تجربہ بنا دیا ہے اور یہیں ہمیں شب سیہ سے حسن یار طلب کرتے ہوئے، حدیث شعلہ رخاں اور ضیائے بزم جہاں کی خواہش میں دل لہو کرتے ہوئے کالرج کی ایک نظم یاد آتی ہے۔

Is the night chilly anddark?
The night is chilly, but not dark
The thin grey cloud is spread on high,
It covers but not hide the sky,
The moon is behind, and at the full
And yet She looks both small and bull
The night is chill, the cloud is grey.

فیض کی شاعری کی محبوبہ دلنواز اس وادی تاریک میں یوں قدم رکھتی ہے

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تیری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں
بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

اسی کتاب میں "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "درد آئے گا دبے پاؤں" جیسی آتشیں نظمیں بھی موجود ہیں بلکہ "گرمئ شوق نظارہ" نے غزل کے دامن درد کو بھی گلزار بنانے کی کوشش کی ہے، فیض کی ان آتشیں تصویروں کے پس منظر میں "جارج فریزر" کی "شاخِ زریں" کے آتش تہوار چھپے بیٹھے ہیں مجموعی طور پر "زنداں نامہ" میں جس رنگ کی حکومت ہے وہ ہے رنگ سرخ، عشاق کے گروہ اور علم کو سنبھالا دینے والی یہ کتاب فیض کے فکری سفر کی سب سے بڑی امانت دار ہے۔ ایزرا پاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے:

"I believe that the proper and perfect symbol is the natural object, that if a man uses "Symbols" he must so use them that their Symbolic function does not obtrude, So that a sense and the poetic quality of the passage, is not lost to those who do not under stand the symbol as such, to whom, for instance, a hawk is a hawk"

فیض نے جیل یاترا کے انہی دنوں میں ایلس کو ایک خط میں لکھا "میں ایلیٹ کی نظم پڑھ رہا ہوں..... یہ عمدہ مصرعے سنو

Between midnight and dawn, when the past is all deception
The future, futureless, before the morning watch.
When the time stops, and time is never ending

رک جانے اور کبھی نہ رکنے والے اس وقت کی منطق کو سمجھتے ہوئے فیض زندگی کی جاودانی پر ایمان لاتے ہیں اور ٹینی سن کو یاد کرتے ہیں

Came into the garden, Maud
For the black bat night has flown.

"زنداں نامے" کے بعد کا زمانہ فیض کے لئے افراتفری کا زمانہ ہے، جس میں اخباری پیشہ چھنا، ایک بار پھر جیل گئے، مارشل لاء کا دور آیا، ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے انسداد راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس ہوا "دست تہ سنگ" میں ہمیں سرخ، سیاہ، زرد رنگوں کے علاوہ سرمئی، چمپئی، کاسنی، نیلے، سنہری اور آبی رنگوں کی مختلف تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ قید خانے سے باہر کی شاعری ہے اس میں تازگی ہے، تجسیم کاری ہے، خود کلامی اور سرگوشی ہے، رات سیاہ اور ماتمی سہی اک طرح دار قاتل اور دلدار بھی کہیں آس پاس ہے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حد نظر، راہ گزر، راہ گزر، شیشہ مے، شیشہ مے
اور اب شیشہ مے، راہ گزر، رنگ فلک

رنگ ہے دل کا مرے "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بے زار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

"دست تہِ سنگ" کی آخری نظم میں چاندنی کی ایک سرگوشی چھپی ہے۔

"سروادیِ سینا" میں سرخ رنگ کی فراوانی فیض کے موضوعات کو تحریک اور جاں سپاری کے اوصاف عطا کرتی ہے' اس رنگ کی جس علامت کو سب سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے وہ ہے لہو' جیتا جاگتا لہو' یم بہ یم' کو بہ کو بہتا گرم طاقتور لہو' جو ایماندار ہے' بے آسرا ہے' یتیم ہے لیکن اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے دیر تک بہنا چاہتا ہے اور جسے شہادت کے ابدی سمندر سے ہمکنار ہونے کا شوق ہے۔

1960 میں فیض نے بلینک ورس میں ایک سکرپٹ لکھا تھا' جو کبھی مشتہر نہ ہو سکا' یہاں اس کی کچھ لائنیں دیکھیے۔

"Time present is still time past
in faces
In places
In custom and ritual and the
grave of nameless saint
In hunger and want and pain
and the withering of
The Birth of time out of
timlessness
Is best like all birth
With travail, and hope and Joy
and apprehension
And its birth in Pakistan as
elsewhere in the newly liberated
countries of Asia and Africa
Is as yet only a small flag of
freedom, raised against
The bannered and embattled
host of Fear and Want and
Hunger and Pain
And the death of human hearts"

"سروادیِ سینا" میں لکھا
عالمِ موجود کی ہر ایک شے
میری آنکھوں کے لہو سے اس طرح ہم رنگ ہے
خورشید کا کندن' لہو
مہتاب کی چاندی' لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو
ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
اور
جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا سرخ رنگ

"شامِ شہریاراں" میں شعری تصاویر کا پس منظر زیادہ تر سیاہ ہے، لیکن سرخ رنگ کی آمیزش سے یہ سیاہی قابلِ قبول لگتی ہے۔ فیض اس مجموعے میں سرخ رنگ کی تماثیل' تراکیب' علامتی تناسبات اور شاعری کی فکر کے ان پہلوؤں کو سامنے لائے ہیں جو زیادہ تر کلاسیکی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ سیاست دوراں سے مفاہمت عشق تک گردن مخلوق جھکی ہے اور بازوئے قاتل خوں ریزی پر آمادہ ہے۔

اگر جراحت قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاست چارہ گراں کی نذر ہوا

"مرے دل مرے مسافر" کا مجموعہ غریب الوطنی' تنہائی اور فکر شکست و ریخت کی تصویر ہے۔ یہاں مفارقت کی رات کا اندھیرا ہے اور شاعر لکھتا ہے

دور اس رات کا دلارا
درد کا ستارا
ٹمٹما رہا ہے

اور شاعر نے یہ بھی لکھا ہے

بس وہی سرخ رو ہوا جس نے
بحرِ خوں میں شناوری کی ہے

"غبارِ ایام" فیض کی زندگی اور فکری سفر کی آخری کڑی ہے جس کا مجموعی تاثر سیاہ' تنہا' غمزدہ اور مجروح سا ہے البتہ شاعر امید کی روشنی سے دست بردار نہیں۔ فیض کی شاعری میں سیاہ رنگ کی کم و بیش 196' سرخ رنگ کی 445 اور زرد رنگ کی 76 تراکیب استعمال ہوئی ہیں۔

سیاہ رنگ کا استعمال زیادہ تر مجرد ہے' رات' زلف' شام' داغ' سایہ اس رنگ کی بنیادی علامتیں ہیں' باقی سیاہ تراکیب اپنے الفاظ ہی کے گرد گھومتی ہیں تراکیب عام طور پر مرکب ہیں' ان میں ابہام نہیں' ایک طرح سے رات کی سیاہی فیض کے شعری کینوس کا پس منظر ہے۔

سرخ رنگ سے جنم لینے والی تراکیب' اشارے اور منظر نامے عام طور پر مجرد نہیں' ان میں تحریک ہے اور ان کا صفاتی پہلو بھی نمایاں ہے' کئی مقامات پر یہ رنگ لمس کا وسیع تر استعارہ ہے' مجرد و مرکب تصاویر میں دل' ہونٹ' رخسار' پیراہن' چراغ' شمع' روشنی' سورج' آگ' نشتر' شوقِ شہادت' سرخ رنگ کا تصور ابھارتے ہیں۔ دل شاعر کا استفہامیہ کردار ہے جو

دریچہ، محبت بھی ہے تختہ، ستم بھی' شہر آرزو بھی' رفیق تنہائی بھی' شاعر کا دوست بھی دشمن بھی۔ ہونٹ رخسار اوران کا رنگ نسوانی اشارے ہیں جن سے حسیاتی پیکر تراشی میں مدد لی گئی ہے۔ چراغ' شمع' روشنی' آگ' مسرت اور آگہی کی تصویریں ہیں جو سیاسی و نظریاتی اشارے بھی ہیں اور انقلابی جذبات کے استعارے بھی' لعل کا رنگ اور گراں یابی نوجوان نسل کے لئے مستعار لی گئی ہے۔ پھول' گلاب' لالہ بہار کے پیامی بھی ہیں اور مسرت و شادمانی کے قاصد بھی' کلاسیکی شاعری کے تتبع میں محبوب کی علامتی صورت بھی' اختیاری معنوں میں شاعر کے دل کے زخم' سیاسی معنوں میں ایوب خان کی الیکشن مہم کا انتخابی نشان اور آخر میں نظریاتی سطح پر شاعر کی بنائی ہوئی خیالی دنیا کے عوام اور اس کی خوشحالی کے خواب' سے اور سے خانہ مسرت' شادمانی' آسودگی اور سرشاری کی علامت ہیں اور کہیں کہیں حسرت و نا تمامی کا اشاریہ بھی' اس طرح شاعر کے فکری ارتقاء میں ان الفاظ کے اصطلاحی معنی وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ حنا نسوانی اشارہ بھی ہے اور لہو کا مترادف بھی' شفق کچھ مقامات پر لغوی معنوں میں اور کچھ جگہوں پر اصطلاحی معنوں میں جلوہ گر ہے۔ پیراہن اور رنگ پیراہن کا بیان سراپائے محبوب کی خوبصورتی اور نرم گرم لمسیت کا لطیف استعارہ ہے۔ زخم مقتل' قاتل' عشاق' علم' صلیب' نشتر' "شہر جاناں' شوق شہادت' شہید' لہو کے تناسبات ہیں لہو اور خون سے بنائی گئی تراکیب مرکب بھی ہیں اور مسلسل بھی' اس رنگ سے شاعر اپنے وجود کا اثبات چاہتا ہے۔ سرخ رنگ حسن محبوب کا سیال تصور ہے اور شاعر کے عشاق کی رگوں میں دوڑتا گرم لہو بھی' اس سے فیض کے شعری منظرنامے پر شاعر کا وہ ذاتی کردار اور احساس ترفع ابھرا ہے جو فکری سطح پر بطور شخص شاعر کو متعارف کراتا ہے۔

فیض کی شاعری میں منظرنامے کی خوابناکی کو مزید روح پرور بنانے کے لئے حکایت عیسیٰؑ و منصور و حسینؑ ایک ایسا فکری اعادہ ہے جو انقلاب اور سچائی کے روشن راستے کا زریں باب ہے۔

ان رنگوں اور تمثیلوں سے فیض نے حسی وادراکی سطح پر جو فضا قائم کی ہے اس کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ نیکی کی روشنی اور لہو کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی یہی دو رنگ انسانی ارادے کی پختگی میں مزید استحکام پیدا کرتے ہیں اور انہی سے زندگی اور شاعری میں ایک نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔

☆☆☆

عبداللہ حسین، افتخار عارف، فیض احمد فیض اور دیگر اہلِ قلم

سرفروشی کے انداز بدلے گئے دعوتِ قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق رسن لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

عمل: اسلم کمال

عمل : اسلم کمال

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو فریاد کچھ تو ہو

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

آسماں پہ اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے

ربیعہ فخری

فیض احمد فیض

''نقشِ فریادی'' سے ''دستِ تہِ سنگ'' تک

کہتے ہیں کہ آزادی کی فضا روح کو بالیدگی اور گلستانِ شعر و ادب کو روئیدگی بخشتی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب اظہار و بیان پر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں اور فکر و نظر پر پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں اور اس حد تک بٹھا دیے جاتے ہیں کہ دیکھنے اور سوچنے کے سب صدر دروازے مسدود ہو جائیں تو لامحالہ فکر انسانی محسوسات کے اظہار کے چور دروازے تلاش کر لیتی ہے۔ یعنی جب متاعِ لوح و قلم چھین لی جاتی ہے اور زبان پر مہریں ثبت کر دی جاتی ہیں تو ایک باتدبیر فنکار خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر اور ہر حلقۂ زنجیر میں زبان رکھ کر ان پابندیوں سے راہِ فرار تلاش کر لیتا ہے۔

''نقشِ فریادی'' سے لے کر ''دستِ تہِ سنگ'' تک جناب فیض احمد فیض نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ اسی فرار کی ارتقائی منازل کی حیثیت رکھتا ہے۔

''دستِ تہِ سنگ'' میں جناب فیض احمد فیض جس مقام بلند پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس مقام تک وہ تین مدارج میں پہنچتے ہیں۔ اس ارتقا کی پہلی کڑی ''نقشِ فریادی'' کے دوسرے حصے میں شامل منظومات و غزلیات ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' ہیں اور تیسری کڑی ''دستِ تہِ سنگ'' ہے۔

''نقشِ فریادی'' کے پہلے حصے کی منظومات کو اس سلسلے کی کڑی اس لئے نہیں قرار دیا جا سکتا کہ خود بقول فیض کے اس حصے کی نظمیں اس حادثے کی مرہونِ منت ہیں جو عمر کے اس دور میں اکثر نوجوانوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ ہر چند کہ اس حادثے کے زیر اثر کہی گئی نظموں کو بھی بعض سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کہا جا سکتا ہے لیکن اس طرح موضوع اس قدر وسیع ہو جائے گا کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کے ساتھ انصاف کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لہٰذا ہم ''دستِ تہِ سنگ'' کی پہلی منزل ''نقشِ فریادی'' کے دوسرے حصے ہی کو کہیں گے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ ''نقشِ فریادی'' کے پہلے حصے میں فیض صاحب طلسم حسن سے مسحور نظر آتے ہیں اور دوسرے حصے میں وہ اس طلسم سے آزاد ہونے کی شعوری کوشش میں مصروف ہیں۔ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ہر طرف غیر ملکی اقتدار کے خلاف بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے اور جوشؔ، احسان دانشؔ اور چند دیگر آتش نوا شاعروں کا طوطی بولتا تھا لیکن چونکہ ان شاعروں نے غیر ملکی حکمرانوں پر براہِ راست تنقید کو اس بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا کہ اس دشت میں مزید سیاحی کی گنجائش بہت کم باقی رہ گئی تھی لہٰذا نئے لکھنے والے اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث اسی جستجو کا نتیجہ تھی۔ اسی طرح جگر مراد آبادی، فانی بدایونی اور دیگر غزل گو شعراء کے بعد کلاسیکی غزل میں کوئی نئی بات پیدا کر کے اپنا مقام پیدا کرنا کارے دارد تھا۔ اسی لئے جدید لکھنے والے کلاسیکی رنگ سے ہٹ کر تجربے کرنے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ فیض احمد فیض ان دنوں کالج سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے اور تلاشِ معاش میں سرگرداں تھے۔ اور بقول خود ان کے ''اپنے کالج کے بڑے بڑے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔'' لہٰذا وہ بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے اور اس طرح کوئے جاناں میں فرصت کے چار دن گزار کے وہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' کہتے ہوئے وادیٔ غمِ جہاں کی طرف چل پڑے۔

جناب فیض احمد فیض کی اس دور کی نظموں میں دوسروں کے غموں کو اپنانے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں نہ تو جذبہ کی شدت ہے اور نہ فنکارانہ رچاؤ۔ اس دور کی نظموں میں ایک نظم جس کا عنوان ''کتا'' ہے اس میں جناب فیض احمد فیض کتے کی ذلت و خواری کا نقشہ کھینچنے کے بعد لکھتے ہیں:

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

اس نظم میں شعوری کوشش تو عیاں ہے۔ لیکن جذبات کی اس شدت اور فن کے اس رچاؤ کا فقدان ہے جو دوسروں کے دلوں کو تڑپانے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

جناب فیض کے شعور اور فن میں پختگی کا آغاز ان کی سرکاری ملازمت کے دور سے ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ جو کہنا چاہتے ہیں وہ لب پر نہیں آسکتا اور جو کہتے ہیں وہ ان کے دل کی آواز نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کی نظم "بول کے لب آزاد ہیں تیرے" خواہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر کیوں نہ کہی گئی ہو، درحقیقت ان کی اسی ذہنی اور جذباتی کش مکش کی غمازی کرتی ہے مگر جلد ہی جناب فیض کے ذہن رسا نے اس کش مکش سے نجات حاصل کرنے کی راہ تلاش کرلی اور وہ تھی حدیث دیگراں کے پردے میں سرِ دلبراں کہنے کی راہ۔

میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو سر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

جناب فیض کی ذہنی اور جذباتی گھٹن کا زمانہ اسی دور تک محدود نہ رہ سکا۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی اور حصول آزادی کے باوجود انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے جو انہوں نے آزادی سے وابستہ کر رکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس منزل کو محض نشانِ منزل سمجھ کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ۔

کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل

جناب فیض احمد فیض کی یہی مایوسی ان کی آئندہ مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ایک ایسی منزل کو جسے بالعموم قوم کی تمناؤں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ محض نشانِ منزل کہہ کر انہوں نے تمام ملک کو چونکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ ان چہ میگوئیوں نے فیض احمد فیض کے اس احساس کو اور مہمیز کیا اور اس طرح لیلائے وطن کی زلفوں کو نکھارنے، سنوارنے کی آرزو والہانہ لگن کی صورت اختیار کرگئی۔ سرِ دلبراں کو حدیث دیگراں کی صورت میں کہنے کا گر تو انہوں نے پہلے ہی سیکھ لیا تھا۔ اب انہوں نے فکر و نظر اور اظہار و بیان کے وہ چور دروازے بھی ڈھونڈ نکالے جن کے ذریعے وہ نہ صرف عام اشیاء کے نئے اور انوکھے پہلو دیکھ لیتے تھے بلکہ اہل بینش کو بھی ان کا نظارہ کرادیتے تھے۔ اب وہ اپنے قارئین کو یہ کہہ کر تسلی نہیں دیتے کہ۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

بلکہ رمز و کنایہ کی زبان میں انہیں ظلمت و اجالے کا فلسفہ سمجھاتے اور کہتے ہیں۔

یہی کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

اب نہ وہ مزدور سے ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں اور نہ زردار کے خلاف نفرت کا زہر اُگلتے ہیں جیسے پہلے کرتے تھے:

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

بلکہ نہایت دھیمے اور بیانِ حدیث دیگراں کے رنگ میں کہتے ہیں:

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

ان اشعار میں وہی تڑپ ہے۔ وہی لگن۔ لیکن نہ مزدور کا ذکر ہے اور نہ دل کے بے قابو ہونے کا شکوہ۔ لہجے کا یہی دھیما پن اور فکر و نظر کا یہی عمق ہے جو جناب فیض نے کوئے ملامت سے حاصل کیا۔

اس انداز نظر اور طرز گفتگو کو نکھارنے، سنوارنے کے لئے قدرت نے جناب فیض کو ایک اور موقع عطا کیا۔ یعنی ان کو سازش کیس میں ملوث کرکے جیل بھجوا دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو کوئی بھی ردعمل پیدا کرسکتا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوسکتا تھا کہ شاعر گریباں چاک کرکے بے محابا کوچہ جاناں میں نکل آتا اور دوسرا یہ کہ وہ جنوں سے دستکش ہو کر اقلیم خرد کا تاجدار بن جاتا لیکن جناب فیض کی طبع نازک نے ان کو یہ دونوں راستے اختیار کرنے سے باز رکھا۔ قدرت نے ان کو ایک ایسا ذہن دیا تھا جو میجک لینٹرن کی مانند اندھیرے میں اور بھی زیادہ چمکتا تھا اور ایسی تیز حس عطا کی تھی جس پر تعزیریں تازیانے کا کام کرتی تھیں، ملاحظہ ہو:

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

قید و بند نے فیض احمد فیض کو یہ نکھرا ہوا انداز بیان ہی نہیں دیا بلکہ فکر و نظر کا ایک نیا پہلو بھی عطا کیا۔ جناب فیض ایک مقام پر خود لکھتے ہیں کہ "عاشقی کی طرح جیل خانہ بھی ایک بنیادی تجربہ ہے۔ جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے چنانچہ اول تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات پھر سے تیز ہوجاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے آسمان کی نیلاہٹ۔ ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہوجاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی دور ہوجاتی ہیں اور نزدیک

کی دوری۔ اور فرداودی کا تفرقہ کچھ اس طور مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔''

اس دور میں جناب فیضؔ نے جو کچھ کہا وہ ان ہی تجربات کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے کلام میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ افکار و جذبات کی گونا گونی بھی نظر آتی ہے اور حسیات کے تیز ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو

بجھا ہے روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

دوسری چیز جو ان تجربات تلخ نے فیض احمد فیضؔ کو دی۔ وہ لب و لہجے کا تیکھا پن ہے۔ اب ان کے لہجے میں ابتدائے عشق کی سی بے چینی اور بے قراری نظر نہیں آتی بلکہ ایک پختہ کار شخص کا سا وقار اور ٹھہراؤ دکھائی دیتا ہے۔ اب وہ زرداروں کو ان عقابوں سے تشبیہ نہیں دیتے جو ناداروں کے منہ سے نوالے جھپٹ لیتے ہیں بلکہ اب تو وہ الٹا زرداروں اور ظالموں کی کسمپرسی پر تاسف کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ جناب فیضؔ کی شاعری کے لئے کڑی آزمائش کا دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب فکر شاعر پر احساسات کے نئے دریچے کھل رہے تھے۔ اور ان کے تجربات میں نئے نئے ابواب کا اضافہ ہو رہا تھا۔ تجربات و احساسات کے ان زاویوں نے ان کے جذبات میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ مگر زبان پر پہرے اور قلم پر تعزیریں عائد تھیں۔ یہ پابندیاں دو قسم کی تھیں۔ ایک تو حکمرانوں کی عائد کردہ اور ایک خود ان کی طبیعت کی مقرر کردہ۔ حکمرانوں کی پابندیوں کو تو توڑا جا سکتا تھا مگر فن کی عظمت کے تقاضوں سے فرار ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسی راہ ڈھونڈ نکالی۔ جس کے ذریعے وہ حکمرانوں کی عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی بھی کر سکتے تھے اور عظمت فن کی پاسداری بھی۔ ہر چند کہ یہ راہ نہایت پُرپیچ اور خطرات سے پُر تھی۔ لیکن جناب فیض احمد فیضؔ اس سے جس جی داری اور جس رکھ رکھاؤ سے گذرے ہیں وہ ہمارے ادب کا ایک ایسا تجربہ ہے جس نے آئندہ لکھنے والوں کے لئے فکر و نظر کے سینکڑوں دریچے وا کر دیے ہیں۔

''دستِ صبا'' کی وادی سے گزر کر فیضؔ ''دستِ تہِ سنگ'' کی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

اس مجموعے میں چند نظمیں تو ایسی ہیں جو جذباتی اور فنی اعتبار سے ''دستِ صبا'' کے ہم رنگ معلوم ہوتی ہیں لیکن زیادہ منظومات کا ایک منفرد رنگ ہے جو فیض احمد فیضؔ کا مخصوص رنگ ہوتے ہوئے بھی ان نظموں کو ''دستِ صبا'' اور ''زنداں نامہ'' کی نظموں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ اس دور کی تخلیقات میں لب و لہجے کے ساتھ ساتھ جذبات میں بھی ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جناب فیضؔ کو مصائب زمانہ برداشت کرنے کے لئے جذباتی تسلیوں اور دلاسوں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اب یہ زمانہ ہے کہ راستے کی دشوار گذاری اور منزل کی دوری کا احساس بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگا سکتا۔ اب ان میں اس قدر خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ تصویر کے تاریک رخ کا بھی نہایت غیر جانبدارانہ انداز سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

مجبوری و دعویٰ، گرفتاری، الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

یہی نہیں وہ اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں کو بھی راستے کے خطرات سے باخبر کرتے جاتے ہیں تاکہ صرف وہ لوگ اس جہاد حیات میں آگے بڑھیں جو ان کو جھیلنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے:

آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
اس گھڑی کوئی ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

ایک وقت وہ تھا کہ جناب فیضؔ نہایت طمطراق سے اعلان کرتے تھے کہ جب تک ان کے خون میں حرارت اور ان کے نطق میں طاقت ہے۔ وہ طوق و سلاسل کو نغمہ دنے سکھاتے رہیں گے لیکن اب ان کے لب و لہجے میں وہ گرمی نہیں رہی' اب وہ جذبات کے تلاطم میں غوطے نہیں کھاتے بلکہ ایک تجربہ کار ملاح کی طرح ان کے سکوت و تموج اور پس منظر و پیش منظر کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کے نتائج کا اندازہ لگاتے ہیں۔

اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا
آسماں آس لئے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پائل بولے
کوئی بت جاگے کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

''دستِ صبا'' میں ابتدائے شباب کا سا تحیر ہے۔ اضطراب ہے، بے چینی ہے۔ ''دستِ تہِ سنگ'' میں عشق حقیقی کا سا عمق ہے' گہرائی ہے' ٹھہراؤ ہے۔ وہ اب خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر داستانِ دل رقم نہیں کرتے بلکہ خونِ دل میں طنز کے نشتر بھگو کے حکایت

دل بیان کرتے ہیں مگر ان کے طنز میں نہ تو اوچھے پن کا شائبہ ہوتا ہے اور نہ جھنجلاہٹ کا عنصر۔ برخلاف اس کے اس میں دلسوزی بھی ہوتی ہے اور وقار بھی۔ اب وہ چوٹ کھا کر بلبلاتے نہیں، مسکراتے ہیں۔ وہ مصائب سے بددل ہو کر چلاتے نہیں بلکہ جوں جوں مصائب کی شدت بڑھتی جاتی ہے توں توں ان کی خاموشی میں یک گونہ گھمبیرتا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ وہ عالم ہے کہ جب ان کے دل پر کوئی ضرب لگتی ہے تو وہ اس کو دور آلام کہنے کی بجائے فصل سکوں سے تعبیر کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بزم سجانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

آ گئی فصل سکوں چاک گریباں والو
سل گئے چاک کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

یہی حقیقت پسندی' جذبات کا یہی ٹھہراؤ' طنز کی یہی نشتریت اور لہجے کا یہی دھیما پن جناب فیض احمد فیض کی خصوصیات کلام ہیں۔ لیکن جناب فیض کی حقیقت پسندی میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی خواہش نہیں بلکہ حالات کا ان کے صحیح سیاق وسباق میں تجزیہ کرنے اور ان پر قدرت حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی طرح لہجہ کا دھیما پن اور جذبات کا ٹھہراؤ ان کے عزم کی صلاحیت کو کم نہیں کرتے بلکہ ان میں مزید استحکام اور قوت کا باعث بنتے ہیں۔ جذبات کا ابال تو ختم ہو سکتا ہے۔ مگر رچاؤ کم نہیں ہو سکتا۔ جناب فیض کے یہاں جذبات کی وہی شدت اب بھی موجود ہے جو "نقش فریادی" میں پائی جاتی ہے مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ جھیل کی سی گہرائی اور ٹھہراؤ۔

جناب فیض نے اپنی زندگی میں بے شمار نشیب و فراز دیکھے۔ فوج میں رہ کر انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی ہی نہیں پیا بلکہ خون انسان کی ارزانی کا نظارہ بھی کیا۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا تو سیاست کی نیرنگیاں آئینہ ہو کر ان کے سامنے آ گئیں۔ وہاں سے نکلے تو ناکردہ گناہی کے جرم میں دھر لئے گئے۔ جب ان سب چکروں سے نکل چکے تو لینن پرائز کے مستحق قرار دیئے گئے مگر یہ جناب فیض کی وسعت نظر ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک دور حیات سے خوش یا دوسرے سے کبیدہ خاطر نظر نہیں آتے بلکہ ان سب کو کتاب زندگی کے مختلف ابواب تصور کرتے ہیں اور اس کا ماحصل اس زاویۂ نگاہ کو قرار دیتے ہیں جو ان کی بدولت ان کو حاصل ہوا۔ اپنی ایک نظم "حمد" میں کہتے ہیں۔

ملکہ شہر زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولت دل کا کچھ شمار نہیں
تنگدستی کا کیا گلہ کیجے
جام چھلکا تو جم گئی محفل
منت لطف غمگسار کیے
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن
رنج کم ظرفیٔ بہار کیے

مختصر یہ کہ جناب فیض کے یہاں جذباتی اور فنی ارتقا ایک جاری وساری عمل کی صورت میں ملتا ہے۔ یوں تو ان کی ہر نظم ہی اس ارتقا کی نشاندہی کرتی ہے لیکن اس کی واضح ترین مثال جناب فیض کی وہ نظمیں ہیں جو انہوں نے تنہائی کے موضوع پر کہی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے۔ جس کا ان کی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے' اس لئے شاید ان کے جذباتی ارتقا کا بھرپور اظہار ان ہی نظموں میں ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کی پہلی نظم "نقش فریادی" میں ملتی ہے مگر وہاں شاعر اپنی تنہائی سے اکتا جاتا ہے اور محبوب سے مایوس ہو کر نہایت جھنجلاہٹ کے انداز میں کہتا ہے۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

اس کے بعد دست صبا میں "یاد" کے عنوان سے انہوں نے تقریباً اسی جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ مگر یہاں وہ جھنجلاتے نہیں بلکہ اپنی تنہائیوں کو یاد یار سے رنگین بنا لیتے ہیں اور اس کے مزے لوٹتے ہیں۔

اس قدر پیار سے اے جان جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

تیسرے دور میں ان کی نظم "قید تنہائی" ہے۔ اس کا انداز ان دونوں سے اچھوتا ہے۔ اس میں نہ تو شاعر اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرتا ہے اور نہ یاد محبوب کے سائے میں استراحت کناں ہے بلکہ تلخی دیروز میں امروز کا زہر گھول کر محض حسرت روز ملاقات رقم کرتا ہے:

گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر
حسرت روز ملاقات رقم کی میں نے

ہر چند کہ موضوع کی یہ تکرار جناب فیض پر اس الزام کا باعث بھی بنی ہے کہ اب ان کے پاس مزید کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا اور وہ اپنی پرانی باتیں دہرا رہے ہیں لیکن یہی تکرار ان کی خوب سے خوب تر کی جستجو کی غمازی بھی کرتی ہے اور یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ حالات کے ساتھ ساتھ ان کا زاویہ نظر اور لب ولہجہ بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ اس سے یہ توقع یقین میں بدل جاتی ہے کہ ان کے کلام میں یہ ارتقا ایک جاری وساری عمل کی صورت میں جاری رہے گا۔

جناب فیض احمد فیض کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جاتا رہے گا لیکن ایک بات بہر حال مسلم ہے کہ "نقش فریادی" سے "دست تہ سنگ" تک جناب فیض نے جو منزلیں طے کی ہیں اس نے ہمارے ادب کو نئے نئے تجربات اور اچھوتے نقطہ ہائے نگاہ سے روشناس کرایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

☆☆☆

اخلاق احمد شاہد بخاری

ابھی چمن سے نسیم بہار گزری ہے
بہت اُداس بہت سوگوار گزری ہے
کسی کو قصۂ رنج و الم سنانا کیا
اگرچہ زیست مری اشکبار گزری ہے
یہ وصلِ یار کی خواہش ہے یا جنوں میرا
ہر ایک رات سرِ کوئے یار گزری ہے
وہی خیال، وہی غم، وہی ستارے ہیں
''تم آئے ہو، نہ شب انتظار گزری ہے''
کسی کے حُسنِ فروزاں سے آگ بھڑکی ہے
چمن سے بادِ صبا بے قرار گزری ہے
ابھی تو ڈوبے ستارے نہ چاندنی ہی ڈھلی
ابھی کہاں یہ شب انتظار گزری ہے
انہیں جو پیار سے شاہدؔ بلا لیا تو نے
تری یہ بات انہیں ناگوار گزری ہے

☆☆☆

اخلاق عاطف

ہزار پھول کھلے، کھل کے، سوگوار چلے
کسی کی دید کے ارمان، جان ہار چلے
نہیں ہے زخمِ تمنا کو اندمال، روا
ہوائے درد سے کہہ دو کہ بار بار چلے
یہ راہِ شوق ہے، اس کے عجب تقاضے ہیں
یہاں پہ کون بھلا، باندھ کر قطار چلے
محبتوں کو موافق نہیں رسومِ جہاں
یہاں بھی کاش، کوئی رسم سازگار چلے
پرندے گائیں، کھلیں پھول، تتلیاں جھومیں
''چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے''
ادائے فرض ہے یا قرضِ یار، کچھ بھی سہی
سو ایک ہدیۂ جاں، چاہتوں پہ وار چلے
میں کس گمان پہ روکوں انہیں بتا تو ہی
دلِ حزیں سے، ترے سارے اعتبار چلے
شب وصال میں سب کچھ ہے، پر وہ بات کہاں
شب فراق میں جب لطف انتظار چلے

☆☆☆

امیر حمزہ جسرا

ظلم حد سے بھی سوا ہم پہ کیے جاتے ہیں
پھر بھی ہم شوق سے یہ زہر پیئے جاتے ہیں
اس قدر ظلم پہ بھی ہونٹ سیئے جاتے ہیں؟
ایسے جیون کبھی دنیا میں جیئے جاتے ہیں؟
''اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیئے جاتے ہیں''

☆☆☆

شفیق انور

اعتبارِ وفا بھی کھو بیٹھے
ہائے کس بے وفا کے ہو بیٹھے

اک جہاں اپنے حال پہ رویا
آج ہم اک جہاں کو رو بیٹھے

جانے کیسی یہ بے قراری ہے
جانے کیا چیز ہے جو کھو بیٹھے

تیری یادوں کو حرزِ جاں کر کے
دل میں کانٹے کئی چبھو بیٹھے

ہم تری بے رخی کے طوفاں میں
کشتیِ آرزو ڈبو بیٹھے

تیری چاہت میں کیا ملا ہم کو
دل سی نایاب چیز کھو بیٹھے

غم کی یورش کوئی نئی تو نہیں
ہم تو کب سے غموں کے ہو بیٹھے

☆☆☆

بیدل حیدری

یہ جو چہروں پہ لئے گردِ الم آتے ہیں
یہ تمہارے ہی پشیمانِ کرم آتے ہیں

اتنا کھل کر بھی نہ رو، جسم کی بستی کو بچا
بارشیں کم ہوں تو سیلاب بھی کم آتے ہیں

تُو سُنا! تیری مسافت کی کہانی کیا ہے
میری راہوں میں تو ہر گام پہ خم آتے ہیں

ظلمتِ شب کے مکیں اپنے دریچے کھولیں
ہم اُٹھائے ہوئے سورج کا علم آتے ہیں

خول چہروں پہ چڑھانے نہیں آتے ہم کو
گاؤں کے لوگ ہیں ہم، شہر میں کم آتے ہیں

وہ تو بیدلؔ کوئی سوکھا ہوا پتا ہو گا
تیرے آنگن میں کہاں اُن کے قدم آتے ہیں

☆☆☆

حاصلؔ مرادآبادی

تمہارے عشق میں جو زندگی گزار چلے
یہ ایک قرض تھا ہم پہ جو ہم اتار چلے

بجز تمہارے کوئی حکمراں نہیں ایسا
جس حکمراں کا دلوں پہ بھی اختیار چلے

اس اک عمل سے عبارت ہے آدمی کا وقار
جہاں میں کاش محبت کا کاروبار چلے

عجیب بزم ہے بزمِ جہاں بھی اے حاصلؔ
خوشی خوشی یہاں آئے تھے سوگوار چلے

☆☆☆

خالد عظیم

کوئی سبب تو ہے کہ ہیں ناکام و نامراد
ہم ہی بھٹک گئے ہیں کہ منزل سفر میں ہے

انساں تو کیا طیور بھی ہیں فکرِ کوچ میں
ایسی فضائے خوف و خطر کیوں نگر میں ہے

بچنے کی راہ پھر بھی کوئی سوچتا نہیں
طوفاں کی پیش گوئی اگرچہ خبر میں ہے

دیکھا کبھی نہ ہم نے گریباں میں جھانک کر
دعویٰ اگرچہ ہے کہ سبھی کچھ نظر میں ہے

اول ہے بے قرار تو ثانی ہے پُرسکوں
رشتہ عجیب منتظر و منتظر میں ہے

خالدؔ عظیم فیض جہاں میں نہیں رہا
مقبول پھر بھی محفلِ اہلِ ہنر میں ہے

☆☆☆

دانیال طریرؔ

باغ میں مہکے ہوئے ہر گل طناز کا رنگ
مجھ کو لگتا ہے اُسی غمزۂ غماز کا رنگ

چاند نے اُس رُخِ رعنا سے سنورنا سیکھا
سُرخ سورج کو ملا دیدۂ ناراض کا رنگ

پھول سے خوشبو اُڑی اور مجھے یاد آیا
تیرے ہونٹوں سے چھلکتی ہوئی آواز کا رنگ

شام کے آخری لمحے نے ڈرایا اتنا
مجھ سے دیکھا نہ گیا رات کے آغاز کا رنگ

زُلف لہرانے سے گھنگھور گھٹا چھانے لگی
سارے ماحول میں پھیلا ترے انداز کا رنگ

بال بھی رات کا احوال بتاتے ہیں طریرؔ
راز بھی کھول رہا ہے مرے ہمراز کا رنگ

☆☆☆

دلشاد احمد

قرار ڈھونڈنے نکلے تھے، بے قرار چلے
ترے دیار کی یہ شب بھی ہم گزار چلے

سنا ہے عقل کی دنیا پہ حکمرانی ہے
مگر نہ دل پہ کبھی اس کا اختیار چلے

یہ اور بات وہ اشکوں کی بات نہ سمجھے
وگرنہ دل کے پیامبر تو بار بار چلے

ہوس نے جب سے محبت کا رُوپ دھار لیا
تو سلسلے بھی عداوت کے بے شمار چلے

گلوئے عشق تو دار و رسن تک آپہنچا
کہاں تلک تیرے وعدوں کا اعتبار چلے

ترے دیار کی گلیوں میں آج بھی دلشادؔ
قدم قدم پہ رکے رک کے بار بار چلے

☆☆☆

رانا عابد جاوید

موسم بہت طویل ہوئے انتظار کے
یونہی گذر نہ جائیں کہیں دن بہار کے
دل پر گذر رہی ہیں اگرچہ قیامتیں
ہم منتظر ہیں آج بھی اُس نگہِ یار کے
لکھتے رہیں گے ہم بھی جنوں کی حکایتیں
ہم کو ذرا نہ موت، مسافر ہیں دار کے
پھر ڈھونڈتی پھرے گی صبائے وطن ہمیں
ہم رونقِ چمن ہی تو مہماں ہیں دار کے
عابد کبھی تو دیکھ دلِ ناتواں کے دکھ
ہم بھی ڈسے ہوئے ہیں غمِ روزگار کے

☆☆☆

رائے امتیاز فاروق

جب سے اس دل میں وہ تصویرِ بتاں ٹھہری ہے
میرے ہونٹوں پہ اسی دن سے مری جاں ٹھہری ہے
جو شب و روز مچلتی تھی میرے پہلو میں
ہائے وہ سوزشِ دل جا کے کہاں ٹھہری ہے
وصل کی شب بھی گریزاں ہی رہے ہیں مجھ سے
ساتھ پھولوں کے مرے گھر میں خزاں ٹھہری ہے
اور وہ دل کی خلش یاد رہے گی مجھ کو
جو مرے دردِ محبت کی زباں ٹھہری ہے
درد ہو دل میں تو پھر دل سے دھواں اٹھتا ہے
آتشِ عشق کبھی دل میں نہاں ٹھہری ہے؟
چھوڑ کر اپنا نشیمن میں قفس میں پہنچا
جب سے شاخوں میں نہاں برقِ تپاں ٹھہری ہے
ذکر ہے جس کا مرے دل کی عبادت یارو
اس کی ہی یاد اس کی ہی سدا آفتِ جاں ٹھہری ہے
ظلمت درد ہے، تنہائی ہے، سناٹا ہے
''ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے''
زندگی درد کی تفسیر بنی ہے فاروق
ہر گھڑی زخمِ محبت کا بیاں ٹھہری ہے

☆☆☆

رحیم احسن

بجھتے بجھتے مجھے شمع نے کہا آخرِ شب
''کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب''
جو دیا شام جلا تھا وہ بجھا آخرِ شب
دل سرِ شام بجھا تھا جو جلا، آخرِ شب
کچھ تو بیتاب صبا ہو گی سحر سے پہلے
پھول تنہا جو سرِ شاخ کھلا آخرِ شب
پوچھنے کیلئے آئی ہے مجھے بادِ نسیم
کون پہلو سے میرے اٹھ کے گیا آخرِ شب
قلزمِ شب میں مہِ ست کہیں ڈوب گیا
ست رو قافلہ تاروں کا رکا آخرِ شب
پھر دعاؤں کو بھی حاجت نہ رہی دستک کی
بابِ ایجاب کہ جس وقت کھلا آخرِ شب
صبحِ کاذب کے سحر سے وہ بنی بادِ صبا
بادِ صرصر کی طرح تھی جو ہوا آخرِ شب
کھول کر خواب دریچہ تیری جانب میں نے
درِ تیری یاد کا زنجیر کیا، آخرِ شب
یاد احسن ہے مجھے ٹوٹتے تاروں کا شمار
کوئی احساس نہیں کیا ہے بجا آخرِ شب

☆☆☆

رئیس باغی

بہت ملول بہت سوگوار گزری ہے
ترے بغیر حیات اشکبار گزری ہے
ابھی سے شعلے اگلنے لگی چمن کی زمیں!
ابھی تو خیر سے فصلِ بہار گزری ہے
اک ایسا وقت بھی آیا ہے اس کی چاہت میں
جفا کی طرح وفا ناگوار گزری ہے
یہ زہر ناکیِ موسم کہ سایۂ گل میں!
حیات صورتِ برق و شرار گزری ہے
قفس میں بوئے چمن کیسے آگئی شاید
اِدھر سے آج نسیمِ بہار گزری ہے
چمن میں لالہ و گل کو خبر ہے اے باغیؔ
جو طائروں پہ سرِ شاخسار گزری ہے

☆☆☆

سُرور انبالوی

کام کوئی بھی نہ کر پائے ہیں دانائی کا
دم بھرا ہم نے ہمیشہ اُسی ہرجائی کا
غنچے غنچے میں صباحت ہے ترے عارض کی
تذکرہ پھولوں کے لب پر تری رعنائی کا
انگلیاں اُٹھتی ہیں جب اُس کے نگر سے گزریں
یہ صلہ ہم کو ملا اُس سے شناسائی کا
ڈھل گئے ہم تو چراغوں کی لووں میں خود بھی
صبح تک ساتھ دیا ہے شبِ تنہائی کا
زخم ہم نے نہ عیاں ہونے دئے ہیں دل کے
کچھ تو رکھنا تھا بھرم اس کی مسیحائی کا
گھر سے پتھر لئے ہر شخص نکل آیا ہے
اک شناسا بھی نہیں شہر میں سودائی کا
چاک کر ڈالی ہیں پھولوں نے قبائیں یکسر
شہرہ پہنچا جو چمن تک تری زیبائی کا
جان باقی ہے چلو اُس کی بھی نذر کریں
کچھ تو ساماں ہو سرورؔ اُس کی پذیرائی کا

☆☆☆

محمد سعداللہ عاکف

ہم پر نمایاں فیضؔ کے نقشِ قدم ہوئے

یومِ ظہورِ فیضؔ پہ شعراء بہم ہوئے
اُن پر مقالے دیکھئے کیسے رقم ہوئے
حسنِ بیاں کو جوہرِ آئینہ کر دیا
جذباتِ قلب فیضؔ کے دیواں میں ضم ہوئے
کیوں کر ملے نہ فیضؔ کو شہرت کلام کی
دستِ صبا سے شعر سپردِ قلم ہوئے
دیکھا سلف کو جادۂ شانِ سخن پہ جب
ہم پر نمایاں فیضؔ کے نقشِ قدم ہوئے
جس جا کہ جا کے بیٹھے ہیں اقبالؔ نامدار
تم بھی شریکِ مجلسِ اہلِ ارم ہوئے
چمکا لگا کلام کا ایسا کہ ایک دن
پڑھ کر کلامِ فیضؔ پرستار ہم ہوئے
جادو ترے کلام کا خلقت پہ چل گیا
جاں پر مری بھی فیضؔ کے اشعار دم ہوئے
جس دن سے فیضؔ راہیِ ملکِ عدم ہوئے
اہلِ ادب کے قلب پہ کیا کیا ستم ہوئے
اشکِ رواں کو روکنا ممکن نہ تھا مجھے
پلکوں سے اشک ٹوٹ کے دامن پہ نم ہوئے
فانی جہاں سے فیضؔ کا رشتہ جہاں کٹا
عاکفؔ تمہاری عمر کے لمحے بھی کم ہوئے

☆☆☆

سعید گوہر

ہر چند کہ خاموش و کم آمیز بہت ہے
گوہر مگر انسان دل آویز بہت ہے

رکتے ہیں مرے پاؤں نہ چلنے کی سکت ہے
کیا ساتھ دوں اے وقت! کہ تو تیز بہت ہے

امکان ہے، اندیشہ ہے، ڈر ہے، نہ چھلک جائے
پیمانۂ ہستی مرا لبریز بہت ہے

موسم ہو کوئی، تازہ رہیں گے یہ گلِ زخم
اے کشتِ غم! اشکوں کی یہ کاریز بہت ہے

☆☆☆

سمیع جمال

لمحہ لمحہ شمار کرتے رہے
ہم ترا انتظار کرتے رہے

جب بھی آیا تصورِ رُخِ دوست
ذکرِ پروردگار کرتے رہے

تیرے وعدے کبھی وفا نہ ہوئے
ہم یقیں بار بار کرتے رہے

☆☆☆

صالحہ کوثر

مجھے ہے یاد وہ سرو و چنار کا موسم
پلٹ کے آیا نہیں پھر بہار کا موسم

ہمارے شام و سحر بے قرار گزرے ہیں
نصیب ہی میں نہیں ہے قرار کا موسم

ذرا سی ملتی جو فرصت تو دیکھ لیتے ہم
سنا ہے آیا ہے حسنِ نگار کا موسم

ہر ایک سمت میں خوشبو بکھیر دی اس نے
گو چند روزہ ہے گل پہ نکھار کا موسم

یہ کل کی بات ہے تم نے کہا تھا یہ مجھ سے
بدل نہ جائے کہیں اپنے پیار کا موسم

ہم اپنی مرضی سے جیتے یہ کیسے ممکن تھا
کسی کو بھی نہ ملا اختیار کا موسم

کواڑ بجتے ہیں کوثر کہ کوئی آیا ہے
خوشا کہ ختم ہوا انتظار کا موسم

☆☆☆

طاہر نظامی

محروم تجلی کو ضیا کیوں نہیں دیتے
تم زلف سیہ رُخ سے ہٹا کیوں نہیں دیتے
شہرہ ہے مسیحائی کا آفاق میں ساقی
رندوں کو پلا آبِ بقا کیوں نہیں دیتے
الزام عبث لیتے ہو بیداد گری کا
منصف ہو تو پھر دادِ وفا کیوں نہیں دیتے
اغیار پہ اٹھتی ہیں جو دزدیدہ نگاہیں
یہ فتنے قیامت کے سلا کیوں نہیں دیتے
دم عشق و محبت کا بھریں اہلِ ہوس، حیف!
خس خانہ میں تم آگ لگا کیوں نہیں دیتے
دعویٰ ہے تقابل کا انہیں جلوہ دکھا کر
رنگِ گل و گلزار اڑا کیوں نہیں دیتے
ساقی یہ تری کم نظری یاد رہے گی
تلچھٹ ہی سہی آگ بجھا کیوں نہیں دیتے
مرغوب نظر گر تری تاریکیٔ شب ہے
عارض پہ کوئی زلف گرا کیوں نہیں دیتے
طاہر یہ تذبذب تو نہیں خوب ہے ناداں
تم حالِ دلِ زار سنا کیوں نہیں دیتے

☆☆☆

ظفر عباس

قربتوں کی تلاش

تیرے کدے میں اے جانِ جاں ے عشق نے وہ نشہ دیا
رہا یاد تیرا کرم ہمیں تیرے ہر ستم کو بھلا دیا
تیری کج ادائی نے اے صنم ہمیں خاک میں ہی ملا دیا
''نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا''
ذرا نکلو جاں کے حصار سے میرے حال پر بھی نظر کرو
انہیں آج رخصتِ عام دو ذرا میرے ساتھ سفر کرو
میرا ساتھ دو میرا ساتھ دو کہ صراطِ جاں سے گزر کرو
''میرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا''
کرو ضبط گریۂ بے محل، کوئی شور و شیون و فغاں نہ ہو
میری لاش زیرِ زمیں کرو کوئی سنگ نام و نشاں نہ ہو
کسی قلب پر، کسی دوش پر میرا بار، بارِ گراں نہ ہو
''کرو کج جبیں پہ سرِ کفن میرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا''
تیرا ذکر تھا کہ شنیدنی، میرا حال تھا کہ تھا دیدنی
وہی شب تھی تیرے جہان کی میرے دل میں تھی وہی روشنی
تیرے دل کی مجھ کو خبر نہ تھی تیرے رُخ پہ چھائی تھی چاندنی
''اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا''
تیرے غم میں اشک رواں ہوئے تیرے سوگوار نکھر گئے
تیری قربتوں کی تلاش میں تیرے جاں نثار کدھر گئے
وہ جو چاہتوں کے گلاب تھے وہ روش روش پہ بکھر گئے
''جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا''

☆☆☆

عاصی رضوی

فیض کی یاد میں

فیض تھا شمعِ سخن کے ایک پروانے کا نام
ہوش مندوں کے جہاں میں ایک دیوانے کا نام
وہ گیا تو لُٹ گئی حُسنِ تخیل کی بساط
کون دے گا شام کو اب زُلف بکھرانے کا نام
ملکۂ شہرِ فنا! تیرے کرم کا شکریہ
آگیا اپنوں کے لب پر ایک بیگانے کا نام
میکدہ اس سے عبارت، اس کے دم سے تھی بہار
اب کھلیں گے گُل نہ لے گا کوئی پیمانے کا نام
وہ یہاں تھا تو اسے ہی ہم چمن سمجھا کیے
وہ نہیں تو کون بدلے آج ویرانے کا نام
شاعری الفاظ کی بندش کا جادو تو نہیں!
یہ ہے اپنی آگ میں چپ چاپ جل جانے کا نام
تم تو ہو گمنام، عاصی! لیکن اس کے فیض سے
لوگ شاید جان جائیں ایک انجانے کا نام

☆☆☆

علی کمیل قزلباش

اب یہاں کوئی نہیں آئے گا

''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا''
کوئی آئے گا بھی تو اور پریشاں ہو گا
مہرباں آنکھ نہ کوئی، نہ شناسا چہرہ
ایک بے نور سی لو رات کی ہمدم ہو گی
اور دن خاک بہ سر، بے سروساماں ہو گا
راستہ نور کی جانب نہ ملے گا کوئی
نہ کوئی نامِ مسیحا سے شناسا ہو گا
نہ کہیں حرفِ مسیحائی سنے گا کوئی
ایک بے حس سی فضا اس کو ملے گی ایسے
جیسے ہو شہرِ خموشاں کا مسافر کوئی
اپنی سانسوں کے تسلسل پہ پریشان ہو گا
اور یہ حرف یہاں لکھ کے چلا جائے گا
''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا''

☆☆☆

عمران ظفر

پھر آمدِ بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
پھر مرحلے حیات کے آساں ہوئے تو ہیں
منزل تلک چلیں کہ رکیں رہ میں ہمسفر
پیہم رفاقتوں کے یہ پیماں ہوئے تو ہیں
دینا پڑا جو دل کا لہو رات بھر تو کیا
''محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں''
پیتے رہے شرابِ غمِ تلخی، جہاں
یوں بھی نشاطِ زیست کے عنواں ہوئے تو ہیں
گزرے ہیں ریگ زارِ الم سے ظفر تو کیا
اب کے وصالِ یار کے امکاں ہوئے تو ہیں

☆☆☆

قاسم جلالؔ

رکھ لیا سب نے حقیقت اپنے افسانے کا نام
جب یہ جانا جگ میں فرزانہ ہے دیوانے کا نام
محوِ حیرت ہو گئے سب، شمع نے جب پیشِ بزم
ہاتھ کانوں کو لگایا، سُن کے پروانے کا نام
دل کسے کہتے ہیں؟ سب کچھ پا کے کھو دینے کا عزم!
آگہی کیا شے ہے؟ سب کھویا ہوا پانے کا نام!
اک طلسمی داستاں کا تذکرہ ہے آج، فکر
فن ہے اب روتے ہوئے جذبوں کو بہلانے کا نام
نوۂ غفلت سے کر بیدار ملت کو جلالؔ
ذکرِ بدمستی نہ کر اور لے نہ میخانے کا نام

☆☆☆

قیصر نجفی

ہم بھی دیکھیں گے

دیارِ شوق میں صبحِ درخشاں ہم بھی دیکھیں گے
نگارِ آرزو کا روئے تاباں ہم بھی دیکھیں گے
نہ گھبرا اے دلِ وحشی کہ وہ دن آنے والا ہے
سرِ دشتِ وفا رقصِ غزالاں ہم بھی دیکھیں گے
الجھتے ہیں جو اہلِ جاہ و ثروت کی قباؤں سے
کبھی راہوں میں وہ خارِ مغیلاں ہم بھی دیکھیں گے
خجالت کے عرق میں تر کسی دن پیشِ درویشاں
نگوں ہوتی جبینِ کج کلاہاں ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر ہمدم کہ پو پھٹنے میں تھوڑا وقت باقی ہے
پسِ دیوارِ شب، روئے حریفاں ہم بھی دیکھیں گے
وہ آخر تا بہ کے یارو سرِ مقتل پسِ زنداں
ہمارے آزمائیں گے دل و جاں ہم بھی دیکھیں گے

☆☆☆

گفتار خیالی

وقفِ جمال دیدۂ یاراں ہوئے تو ہیں
ہم آبروئے بادہ گساراں ہوئے تو ہیں
گلشن میں اہتمامِ بہاراں ہوئے تو ہیں
ساغر بجامِ بادہ گساراں ہوئے تو ہیں
ہے انتظار دیکھئے کب ہو شبِ وصال
آثارِ ابرِ موسمِ باراں ہوئے تو ہیں
آنکھیں ہیں اشک بار کسی کے فراق میں
ہم رُوشناسِ موسمِ باراں ہوئے تو ہیں
گفتار ہم بھی آج سرِ محفلِ سخن!
مدحت سرائے رُوئے نگاراں ہوئے تو ہیں

☆☆☆

محسن احسان

کیا حال بیاں کرتے پریشانی دل کا
داناؤں کو سب علم تھا نادانی، دل کا
خورشید کی لو کے لئے دیوار گرا دی
دیکھا ہے بہت حوصلہ زندانی، دل کا
باہر بھی ہے صحرا مرے اندر بھی ہے صحرا
آنکھوں سے عیاں حال ہے ویرانی، دل کا
دو یار ہیں، دو جام ہیں اک شام خنک ہے
ساماں ہے بہم بے سرو سامانی، دل کا
جب آنکھ کھلی کشتی، جاں ڈوب رہی تھی
اندازہ نہ تھا کچھ ہمیں طغیانی، دل کا
لکھا نہ کوئی حرفِ دل آزار کہ اُس پر
کھل جائے نہ سب حال پریشانی، دل کا
سب شہر برہنہ نظر آنے لگا محسن
اک طرفہ تماشا ہے یہ عریانی، دل کا

☆☆☆

محسن بھوپالی

وہ ساتھ لے گیا قول و قرار کا موسم
تمام عمر ہے اب انتظار کا موسم

حیات اب بھی کھڑی ہے اسی دوراہے پر
وہی ہے جبر، وہی اختیار کا موسم

ابھی تو خود سے ہی فارغ نہیں ہیں اہلِ جمال
ابھی کہاں دلِ امید وار کا موسم

اسے بھی وعدہ فراموشی زیب دیتی ہے
ہمیں بھی راس نہیں اعتبار کا موسم

جہاں گرے گا لہو، پھول بھی کھلیں گے وہیں
کسی کے بس میں نہیں ہے بہار کا موسم

کبھی تو لوٹ کے دلداریوں کی رُت آئے
سدابہار ہے مدت سے دار کا موسم

ہم اپنے آپ کو محسنؔ بدل کے دیکھیں گے
بدل سکے نہ اگر کوئے یار کا موسم

☆☆☆

منظر مفتی

رشکِ یوسف میرے عیسیٰ تیرے اعجاز کا رنگ
سر بہ سر مہر بلب ہے مرے دمساز کا رنگ

صورتِ سنگِ سرِراہ، نگاہِ یاراں
صورتِ شمعِ فروزاں، تیری آواز کا رنگ

دل کی بستی میں کئی چاند ستارے اُترے
کیا کہوں، کیا تھا ترے درد کے آغاز کا رنگ

زاویے رقص کے ازخود ہی بدل جائیں گے
شرط یہ ہے کہ بدل دے کوئی اس ساز کا رنگ

چاند سے پوچھ ستاروں کے اترتے چہرے
سنگ میں ڈھونڈ تڑپتے ہوئے ہم راز کا رنگ

شہرِ قاتل میں سجائے گئے پھر سے مقتل
شامِ زنداں میں ڈھلا پھر اُسی انداز کا رنگ

کیسے بھولے کوئی منظرؔ دمِ رخصت کا سماں
اُف وہ لہجے کی تھکن، ہائے وہ آواز کا رنگ

☆☆☆

منظور بلوچ

وہ وقت قریب آپہنچا اب
ایوان کھنگالے جائیں گے
دربان ہٹائے جائیں گے
فرعون نکالے جائیں گے
مزدور کسانوں کے تیور
اس بات کے شاہد ہیں یارو
"اب تخت گرائے جائیں گے
اب تاج اچھالے جائیں گے"
ایامِ گذشتہ کی باتیں
سب طاق پہ رکھی جائیں گی
اب عہدِ کہن کے چور بھی
زنداں میں ڈالے جائیں گے
جب بھوک کے مارے سر بہ کفن
چڑھ دوڑیں گے زرداروں پر
پھر تم ہی بتاؤ اہلِ ہنر
کس طور وہ ٹالے جائیں گے
منظورؔ خدا کی دھرتی پر
اِک حشر بپا ہو جائے گا
جب عرش پہ فاقہ مستوں کے
پُردرد یہ نالے جائیں گے

☆☆☆

میر اسلم حسین سحر

ہم ان کے نام پہ سب کچھ نثار کرتے رہے
وہ گاہے گاہے مگر ہم پہ وار کرتے رہے

کسی نے نیند سے کرلی تھی دوستی شب بھر
کوئی تو رات گئے انتظار کرتے رہے

تمہاری تیر سی پلکوں کی زد میں جو آئے
وہ اپنے زخمِ جگر کو شمار کرتے رہے

ہمیں خبر تھی کہ انجام عاشقی کیا ہے
تری خوشی کے لئے اعتبار کرتے رہے

کسی کو دے دیا دل اور کسی کو اپنی زباں
کبھی کبھار وہ یہ کاروبار کرتے رہے

ہم اتنے سادہ تھے دیکھو سحرؔ زمانے میں
''رہ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے''

☆☆☆

ناصر زیدی

لوگ اس ڈھنگ سے کسی بزم میں کم آتے ہیں
سامنے سے ذرا ہٹ جاؤ کہ ہم آتے ہیں

اور تو کچھ نہیں ملتا تری محفل سے ہمیں
لے کے ہمراہ فقط قول و قسم آتے ہیں

ہم جو کرتے ہیں ارادہ، نہ ملیں گے اُس سے
خیر مقدم کے لئے رنج و الم آتے ہیں

رہروِ راہِ محبت ذرا آہستہ چل
یہ ہے وہ راہ کہ جس میں کئی خم آتے ہیں

کوئی فرعون ہی اب مدِّ مقابل ٹھہرے
ہم اُٹھائے ہوئے الفت کا علم آتے ہیں

گل بکف پھرتے ہیں اَوروں کے لئے جو، اُن سے
میری جانب تو فقط تیرِ ستم آتے ہیں

ہم فقیر سراہے تجھے مل کر ناصرؔ!
جب بھی آتے ہیں بصد جاہ و حشم آتے ہیں

☆☆☆

یعقوب خاورؔ

ترے فراق میں شب ناتمام ہوتی رہی
''یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی''

ترے حضور رہے کم کہ مثلِ سیارہ
ترے طواف میں گردش مدام ہوتی رہی

شفق کھلی نہ کبھی پھر سے دیدہ و دل میں
یہ اور بات کہ ہر روز شام ہوتی رہی

فراقِ یار کے قصوں کو نظم کرتے رہے
متاعِ درد کی تشہیر عام ہوتی رہی

اُلجھ کے بندِ قبا سے جو رہ گئے سرِ شام
تو صرف یوں، شبِ ماہ تمام ہوتی رہی

دیارِ درد میں کس ہم سفر کے دھوکے میں
''ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی''

☆☆☆
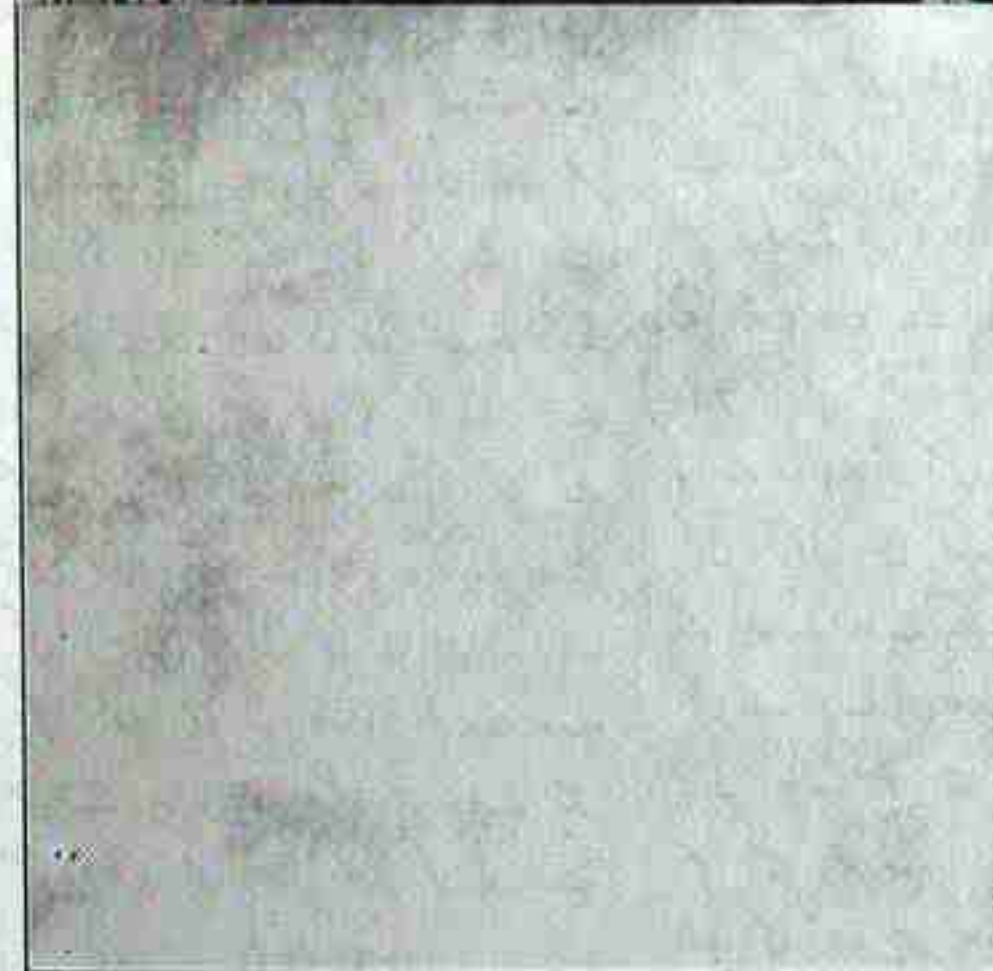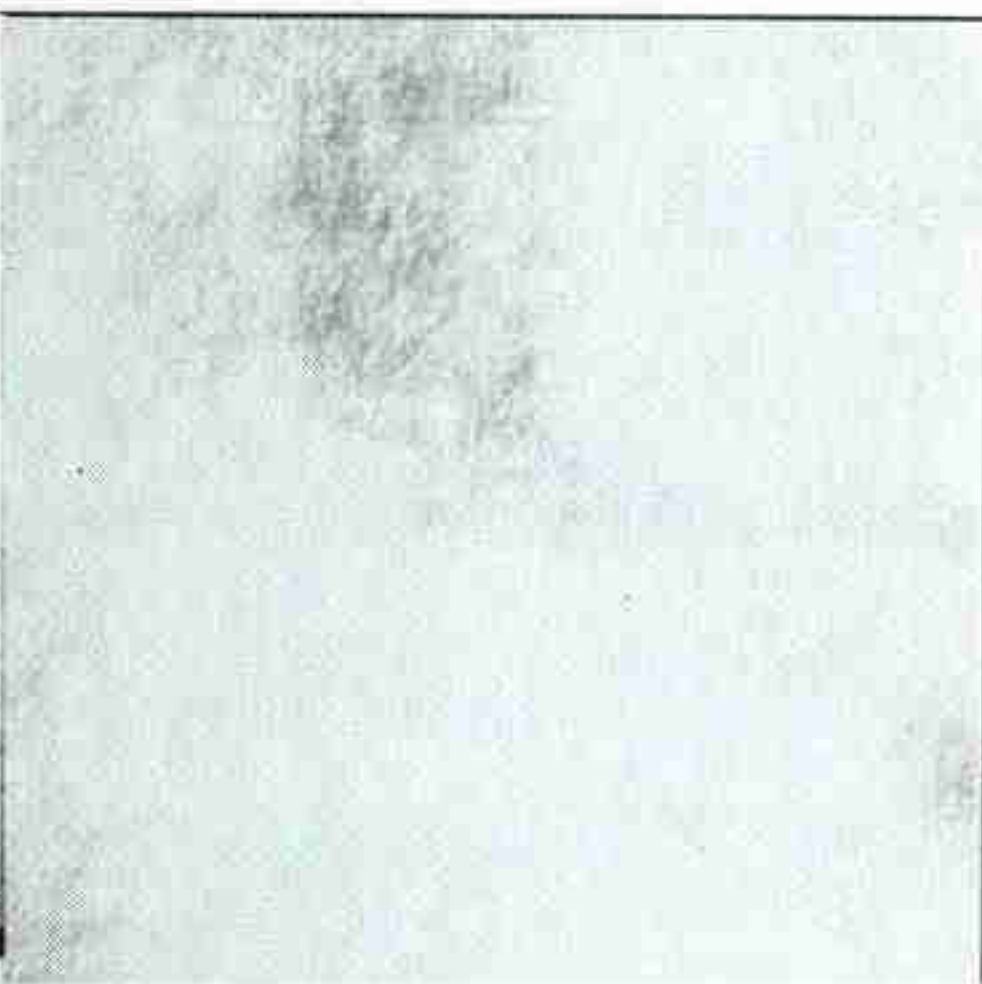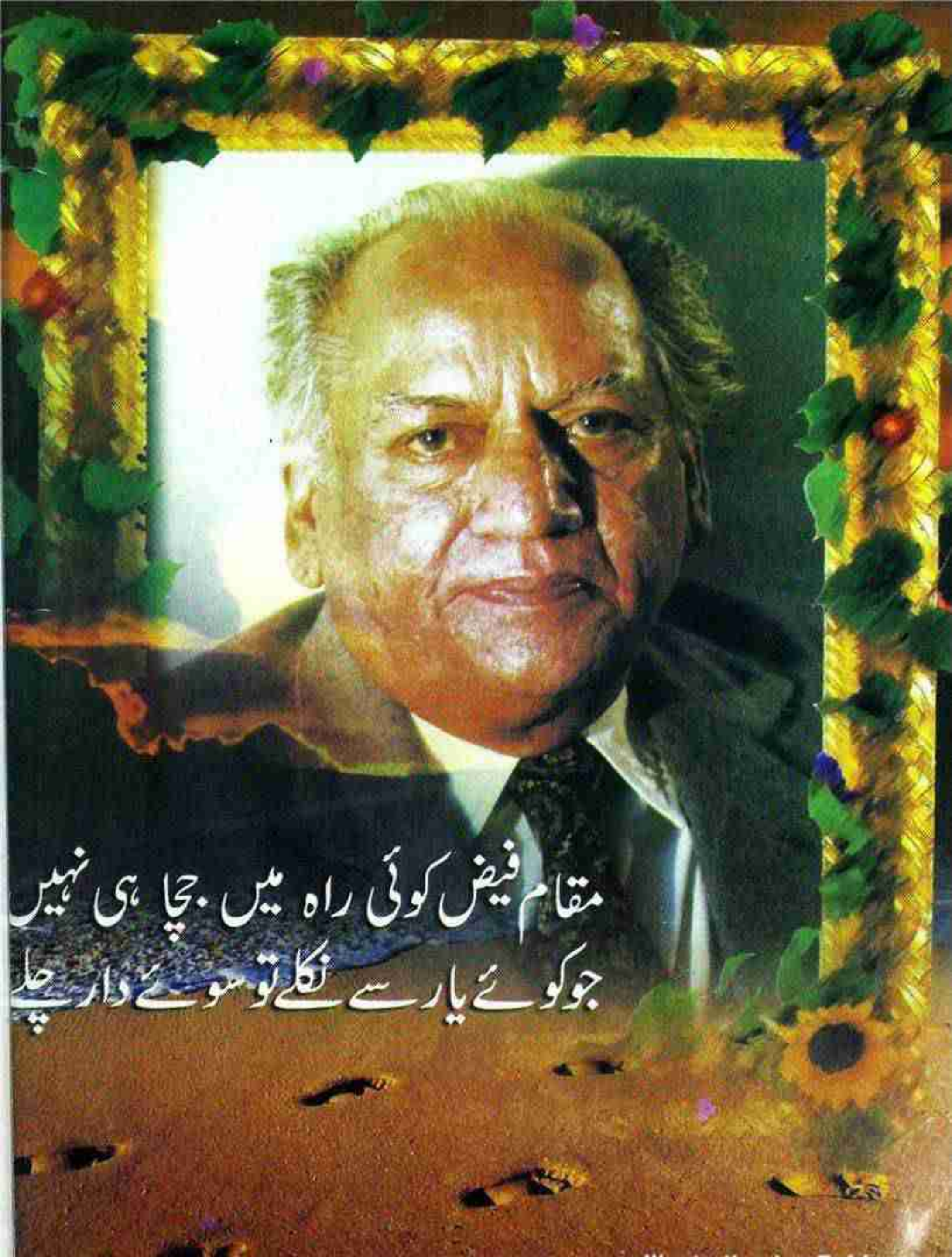
مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

"فیض میرے دوست اور جنگ بیروت کے رفیق تھے"

جب شاعر انقلاب اور "لوٹس" کے ڈپٹی ایڈیٹر انچیف معین بسیسو نے پہلے پہل مجھے ان سے متعارف کروایا تو میرے سامنے ایک مسکراتا چہرہ اور آنکھیں تھیں جو گرمجوشی، اولوالعزمی اور پختہ پن کے جذبہ سے تمتمارہی تھیں۔

قبل ازیں معین، فیض احمد فیض کو مجاہدین کے ٹھکانوں پر لے گئے تھے تاہم جب ہم نے بیٹھ کر گفتگو شروع کی اور تفصیل سے تبادلہ خیال کیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے فیض ساری زندگی ہمارے درمیان رہے ہوں اور انہوں نے ہماری تمام صعوبتیں برداشت کی ہوں اور جدوجہد کے ان طویل سالوں میں ہماری تمام امیدوں میں شریک رہے ہوں۔

فیض اس وقت 70 برس کے ہو رہے تھے۔ یہ ان کے لیے ایک فقید المثال بات تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی کے تمام تکلیف دہ سالوں کے بعد محسوس کیا کہ ان کی جگہ ہمارے درمیان، فلسطینی مجاہدین آزادی کے درمیان، تھی۔ انہوں نے ہمیں اپنی محبت دی۔ فلسطین کو اپنی محبت دی۔ بیروت کو اپنی محبت دی۔

کیا جس چیز کے لئے انہوں نے عمر بھر جدوجہد کی تھی انقلاب فلسطین یا بیروت اس کی نمائندگی کرتا تھا؟

یقیناً ایسا ہی تھا۔ تبھی تو فیض احمد فیض جیسا اردو کا سب سے بڑا اور عظیم شاعر، بین الاقوامی شہرت کا پاکستانی انقلابی اور عالم اپنے ابدی خواب کی تکمیل کے لئے ہمارے درمیان آپہنچا تھا۔

وہ متین و سنجیدہ ہونے کے ساتھ پرجوش اور پرامید شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ان تمام مرحلوں سے ایک لگن اور جذبے کے ساتھ گزرے۔ یہ لگن اور جذبہ محض گہرا انقلابی احساس رکھنے والے شاعر اور انسان کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔

فیض احمد فیض صرف "لوٹس" کے ایڈیٹر انچیف نہیں تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ اور ہمارے درمیان رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس رسالے کا صدر دفتر بیروت میں تھا بلکہ اس لئے کہ اس عظیم انقلابی شاعر کا جذبہ اسے انقلابیوں کے پاس لے جاتا تھا خواہ وہ کہیں ہوتے اور اس وقت، اس روز یہ جذبہ انہیں انقلاب فلسطین کے پاس لے گیا تھا۔

محاصرہ بیروت کے دوران اس جنگ کے دوران، جو اسرائیل نے امریکہ کی مجرمانہ اعانت، اس کی امداد اور اسلحہ کے زور پر شروع کی تھی، اور اس ساری تباہی و بربادی کے دوران فیض احمد فیض نے بیروت چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس زبردست جارحیت کے خلاف سینہ سپری کے دوران میں اپنے ابدی خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔ یہ تجربہ قوت برداشت سے بڑھ کر اور میرے خوابوں سے زیادہ شاندار ہے، اس لئے میں اس کے ایک ایک لمحہ سے مسحور ہونا چاہتا ہوں۔ میں اسے کیوں کر چھوڑ کے جا سکتا ہوں؟

فیض اور یاسر عرفات

فیض احمد فیض میرے دوست تھے اور جنگ بیروت میں میرے رفیق تھے۔ اس دہکتے جہنم میں بھی ان کے چہرے کی لازوال مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور ان کی آنکھیں ناقابل شکست عزم و یقین سے دمکتی رہیں۔

فیض احمد فیض ہمیں چھوڑ گئے لیکن ہمارے دلوں میں محبت کا انمٹ نقش چھوڑ گئے۔ انہوں نے انقلابیوں' دانشوروں اور فنکاروں کی آنے والی نسلوں کے لئے بے نظیر اثاثہ چھوڑا ہے۔ اب جب کہ وہ دل جو حصول آزادی کے بے مثال جذبے کے ساتھ

فیض احمد فیض اور معین بسیسو

پابلو نرودا - فیض احمد فیض

دھڑکتا تھا' دنیا کے عوام کے مستقبل کی بہبود اور انصاف کے لئے دھڑکتا تھا' دھڑکنا بند کر چکا ہے...... فیض کی انقلابی تخلیقات آنے والی نسلوں کی یادداشت میں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک آزاد و خود مختار فلسطین کے حصول کے لئے ان کا عظیم خواب پورا نہیں ہوتا اور ایک ایسی دنیا کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا جہاں ترقی ہو' بہبود ہو' انصاف ہو اور محبت کا بول بالا ہو۔

☆☆☆

کرشن چندر

فیض سے ملاقات

مئی 1967ء میں مجھے پہلی بار سوویت ادیبوں کی کانگریس میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ چینی ادیبوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر ملک کے مندوبین آئے تھے۔ ان مندوبین کی حیثیت سوویت ادیبوں سے مختلف تھی۔ ہم لوگ نہ ووٹ دے سکتے تھے اور نہ الیکشن میں حصہ لے سکتے تھے۔ سوویت ادیبوں کی کانگریس میں یہ حق بجا طور پر صرف سوویت ادیبوں کو حاصل تھا مگر دوسری تمام کارروائیوں میں ہم لوگ حصہ لے سکتے تھے۔ پاکستان سے فیض احمد فیض اور ہندوستان سے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔

فیدن کانگریس کی صدارت کر رہے تھے۔ یہ سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگریس تھی۔ اراکین صدارت میں شولوخوف' بورس پولیوائی' رسول گم زادے' میرزا ابراہیم' کربابایئف' دیگر یورپی اور ایشیائی سوویت ریاستوں کے مندوبین کو جگہ دی گئی تھی۔ کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں روسی حکومت کے صدر اور روسی حکومت کی کابینہ وزیراعظم سمیت شامل تھے۔ جو بات مجھے اچھی لگی وہ صرف یہی نہ تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ اس کانگریس میں شروع سے آخر تک ادیبوں کو اہمیت حاصل تھی۔ روسی کابینہ کے اراکین کو وزیراعظم سمیت ادیبوں کے پریذیڈیم کے پیچھے جگہ دی گئی تھی' اولین اہمیت ادیبوں کو حاصل تھی۔ ہمارے ملک میں اول تو حکومت کی طرف سے ادیبوں کی کوئی کانفرنس ہی منعقد نہیں کی جاتی اور اگر کسی ادبی اجتماع میں وزراء شریک بھی ہوتے ہیں تو ڈائس پر انہیں سب سے آگے جگہ دی جاتی ہے اور ادیبوں کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ اخباروں میں صرف وزیروں کی تقریریں شائع ہوتی ہیں اور ادب اور کلچر کے متعلق کسی ادبی اجتماع میں کسی ادیب نے کیا کہا اسے سرے سے گول ہی کر دیا جاتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ہمارے وزیر قابل احترام نہیں ہیں لیکن ادیبوں کی محفل اور ان کے ادبی اجتماع میں ادیبوں کی بحث و تمحیص کو زیادہ اہمیت حاصل ہو تو بہتر ہے۔ سوویت ادیبوں کی یہ کانگریس چار دن تک جاری رہی اور ہر روز بیشتر سوویت اخبار اس کی کارروائیوں سے بھرے ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں کے اخبار اول تو ادبی خبروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اگر کسی ادبی اجتماع کی خبر چھاپتے بھی ہیں تو کسی غیر اہم صفحے پر ایک کالمی سرخی کے ساتھ۔ یوں کہنے کو تو ہم پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب اور کلچر کے وارث ہیں لیکن اس ملک میں کلچر اور تہذیب کے وارثین کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب شولوخوف تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو سارے ہال میں بیٹھے ہوئے مندوب مع روسی کابینہ اور وزیراعظم ان کی عزت افزائی کے لئے کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے وہ لوگ اپنے ادیب کا منصب اور اس کی اہمیت پہچانتے ہیں اور اسے اپنے سماج میں قابل عزت مقام دیتے ہیں۔ شولوخوف کو تعظیم دے کر وہ لوگ دراصل اپنے ملک کے ادب اور کلچر کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے۔

لامیلا واسی لیوا اور فیض احمد فیض

یہ کانگریس 1965ء کی ہند پاک جنگ کے بعد منعقد ہوئی تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے' حالانکہ میرے وہم وگمان میں یہ بات نہ تھی مگر ممکن ہے کہ منتظمین کے ذہن میں یہ بات رہی ہو۔ میں اور فیض دونوں ہوٹل مسکووا میں ٹھہرے ہوئے تھے مگر ایک دوسرے سے ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی پہلی شام جب میں مسکووا ہوٹل کے وسیع وعریض ڈائنگ ہال میں کھانے کے لئے گیا تو دیکھا کہ ہر ملک کے مندوبین کے لئے ایک میز الگ لگی ہوئی ہے اور اسی میز پر اس ملک کا ایک چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا ہے۔ میں نے دیکھا تو پاکستان کی میز اور ہندوستان کی میز میں کم سے کم تیس اور میزوں کا فاصلہ تھا میں مسکرا کر چپ رہا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا فیض ابھی تک میز پر نہ آئے تھے۔

پہلے پندرہ بیس منٹ مشروب پینے میں گذرے اتنے میں میں نے دیکھا کہ فیض کسی دوسرے دروازے سے داخل ہو کر اپنی میز کی طرف بڑھ رہے ہیں کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے میری طرح چاروں طرف نگاہ دوڑائی غالباً انہیں بھی کسی دوسری میز کی تلاش تھی۔ یکایک میری اور فیض کی آنکھیں چار ہوئیں وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میں اپنی کرسی سے۔ اس وقت سارا ہال ہم دونوں کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں اپنی میز سے ہندوستان کا فلیگ لئے اٹھا اور فیض اپنی میز سے پاکستان کا فلیگ لئے اٹھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہوئے میز پار کرتے ہوئے بیچ کسی میز پر آ کر رک گئے اس میز پر ہم دونوں نے ہندوستان اور پاکستان کا جھنڈا ساتھ ساتھ لہرا دیا اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

سارا ہال تالی پیٹنے لگا۔

یہ تالی اس وقت تک بجتی رہی جب تک فیض اور اس کی ترجمان' میں اور سلمیٰ اور ہماری ترجمان ارینا اس میز کے چاروں طرف بیٹھ نہ گئے۔

''کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ؟ ہم لوگ بھی کیا متعصب سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن ہیں؟ ادب میں یہ دشمنی نہیں چلتی اور کاش کہیں بھی نہ چلے۔''

میں نے کہا ''مگر اس بدقسمتی کو کیا کہئے کہ تمہاری میری ملاقات اب نہ ہندوستان میں ہوتی ہے نہ پاکستان میں اور ہوتی ہے تو صرف ماسکو میں۔''

''ان لوگوں کو چاہیے'' فیض نے ہنس کر کہا۔ ''اپنے روسی ادیبوں کی کانگریس ہر سال منعقد کیا کریں اسی بہانے مل لیا کریں گے'' میری طرف جھک کر پوچھا ''تمہاری ترجمان تو بڑی خوبصورت ہے کہاں سے اینٹھی؟''

میں نے کہا ''بدل لو مگر یاد رکھنا یہ یہودن ہے۔''

ہم سب ہنسنے لگے۔ پھر جام سے جام ٹکرانے لگے' دو جھنڈے ساتھ لہرانے لگے اتنے میں جنوبی افریقہ کے مشہور ناول نگار الیکس لاگوما ہاتھ میں کونیاک کا ایک جام اٹھائے ٹوسٹ پیش کرنے کے لئے ہماری میز پر آ گئے پھر کہیں سے رسول گم زادے کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ رسول گم زادے کا شمار سوویت شاعروں کی پہلی صف میں ہوتا ہے' ہندوستان آ چکے ہیں اور اردو کے صرف دو لفظ جانتے ہیں ''مشہور شاعر'' چنانچہ ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے اور منہ چومتے ہوئے بولے ''مشہور شاعر فیض احمد فیض'' ''مشہور شاعر کرشن چندر'' ''مشہور شاعر سلمیٰ صدیقی'' پھر ہماری ترجمان کی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے ہوئے پوچھنے لگے' ''مشہور شاعر؟''

میں نے کہا ''ارینا!''

''ایری نچکا'' رسول گم زادے نے اس نام کو اور بھی پیار سے لیا اور اس کے قریب کرسی گھسیٹ لی۔

پھر اور لوگ بھی آتے گئے تھوڑی دیر بعد ہمارے میز پر پانچ سات جھنڈے جمع ہو گئے تھے۔

اس کے بعد جتنے بھی دن ہم ہوٹل ''مسکووا'' میں رہے میری اور فیض کی میز ایک ہی رہی ہندوستان اور پاکستان ایک ہی میز پر کھانا کھاتے رہے۔

کانگریس میں اتنے ملکوں کے اتنے ادیبوں سے ملاقات ہوئی' نہ اب ان کے نام یاد ہیں نہ چہرے صرف چند چہرے یاد ہیں ان میں آنا سیگھرز کا چہرہ بہت نمایاں ہے۔ حلاوت میں ڈوبا ہوا ممتا بھرا چہرہ' سفید بالوں میں سیدھی مانگ اور بے ترتیب بال' بالکل ہندوستانی خاندان کی بڑھیا لگتی تھیں اور شولوخوف مجھ سے بھی پستہ قد مگر فراخ ماتھا آئن سٹائن سے ملتا جلتا فلیکسن بال' چہرے پر گہری گھمبیرتا اور پابلو نرودا کا نیم ایشیائی نیم یورپی چہرہ' آنکھوں میں گہرا کرب لئے۔ ایلیا ایرن برگ سے ملاقات نہ ہو سکی' وہ ان دنوں اٹلی گئے ہوئے تھے دوبارہ جب میں روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں گیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ تیکھے اور نزاعیہ لہجے میں اپنی بات کہتے تھے۔ اس لئے بہت سے لوگ ان سے خفا رہتے تھے روسی ادیبوں میں وہ سب سے زیادہ کانٹی نینٹل تھے اور خاصے خودسر۔ ان سے بات کرنے میں مزہ آتا تھا کیونکہ برسوں پیرس میں رہ کر فرانسیسی مزاج کا رنگ بھی ان کے سٹائل میں داخل ہو چکا تھا جیسے محض بات کرنے کی خاطر بات کرنا پسند ہو۔

روسی کانگریس میں روس کی تمام اہم زبانوں کے ادب پر سیر حاصل تبصرے تو ہوئے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ غیر ملکی نمائندوں کو بھی ان کے اپنے ملک کے ادب پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ وقت کم

تھا اور تقریباً تمام ملکوں کے نمائندے حاضر تھے اس لئے انتخاب کرنا پڑا۔ ایشیاء سے آرٹش منگولیا' جاپان' شمالی کوریا' ویت نام' ہندوستان اور پاکستان کو چنا گیا۔ صرف میں نے تقریر کی بعد میں میری تقریر ایک پمفلٹ کی صورت میں شولوخوف اور دوسرے دو روسی ادیبوں کے ساتھ شائع کی گئی اور یوں مجھے شولوخوف کے ساتھ چھپنے کا فخر حاصل ہوا۔

کانگریس کی آخری کارروائی الوداعی ڈنر پر ختم ہوئی' یہ ڈنر کریملن کے ایک بہت بڑے ہال میں رکھا گیا تھا۔ دو ہزار سے زیادہ مہمان جمع تھے' شمپین اور کیوی آر' قہقہے اور لباس فاخرہ' دنیا بھر کے دانشور ایک ہال میں جمع تھے' فیدن مرکزی میز پر کھڑے مہمان خصوصی کے نام پکار رہے تھے' کانگریس بخیر و خوبی سر انجام پا چکی تھی اس لئے دل بالیدہ تھے اور ہونٹوں پر تبسم۔ فیدن نے سب سے پہلے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مرکزی میز پر آنے کی دعوت دی۔ فیض' سلمیٰ اور میں ایرینا اور مریم سلگانیک کو لئے وہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں گہما گہمی اتنی بڑھ گئی کہ مرکزی اور دوسری میزوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہا ادیب اور دانشور ایک میز سے دوسری میز پر آ جا رہے تھے' شمپین پانی کی طرح بہہ رہی تھی' زبانیں کھل گئی تھیں' سلمیٰ اور ایرینا کو لوگوں نے گھیر لیا تھا اور ٹوسٹ پر ٹوسٹ پروپوز کئے جا رہے تھے' شاعرانہ انداز میں مہکتے ہوئے جملوں میں مختلف ملکوں کی شاعری جارجیائی شراب کی طرح امڈ آئی تھی۔

جدائی کی گھڑی آ پہنچی دوسرے دن فیض کو دیانا جانا تھا' مجھے اور سلمیٰ کو آذربائیجان۔ ہم دونوں یوکرائنا ہوٹل کے وسیع و عریض لاؤنج میں ایک دوسرے سے اس شدت سے بغلگیر ہوئے اور اتنی دیر تلک بغلگیر رہے کہ جب صدیوں کی طرح کبھی ختم نہ ہونے والے عرصے کے بعد ایک دوسرے سے بادل نخواستہ جدا ہوئے تو ہمارے اردگرد دوسرے ملکوں کے کوئی ساٹھ ستر ادیبوں کا گروہ اکٹھا ہو چکا تھا۔ گو میری اور فیض کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے لیکن ہمارے اردگرد ہر آنکھ پُرنم تھی شاید اس وقت بہت سے ملکوں کے دانشوروں کو احساس ہوا تھا کہ گو ہم ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں لیکن اندر سے ہمارا جو تانا پرانا رشتہ ہے وہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ فیض نے اپنی جیب سے کاغذ کے دو پرزے نکال کے مجھے دیئے اور کہا ''یہ دونوں نظمیں کہیں نہیں چھپی ہیں پاکستان میں بھی نہیں میں نے ماسکو میں کہی ہیں'' پھر آخری بار زور سے مصافحہ کیا اور بڑے مضبوط لہجہ میں بولے ''یہ جدائی عارضی ہے دوست ہم پھر ملیں گے۔''

1971ء کی روسی ادیبوں کی پانچویں کانگریس میں فیض نہیں آئے' ہم نے ان کا بہت انتظار کیا' ایک تار بھی آیا کہ وہ آ رہے ہیں مگر فیض نہیں آئے۔ اس دن یوکرائنا کی آخری ملاقات کے بعد میں ان سے کبھی نہیں ملا۔ مگر اب لگتا ہے وہ جدائی عارضی تھی ملن کی گھڑی آن پہنچی ہے کیونکہ گذشتہ چوبیس برس نفرت اور جنگ و جدل کے باوجود کوئی ایک تار ہے دلوں کے اندر جو نہیں ٹوٹا ہے اور ٹوٹ بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان اور پاکستان میں محبت پھر ابھرے گی کوئی مانے نہ مانے مگر یہ وقت کا تقاضا ہے اس لئے لوح تقدیر ہے۔

☆☆☆

افرو ایشائی ادیبوں کی انجمن کے ارکان کے ساتھ تاشقند میں

قرۃ العین حیدر

سرودِ شبانہ

ابھی چند روز قبل علی گڑھ میں میں نے نواب حبیب اللہ خان شیروانی کے صاحبزادے کی ذاتی لائبریری میں ایک نادرو بے بہا کتاب دیکھی جس کے سرورق پر شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے چند سطور میں اپنے ہاتھ سے سقوط بغداد کا احوال قلمبند کیا ہے۔ کس طرح منگول نے دجلہ عبور کیا وغیرہ' جلدی میں پوری عبارت نہ پڑھی جو کھجور سے بنی ہوئی روشنائی میں لکھی گئی تھی۔ آخر میں دستخط ''مصلح الدین المشتہر بہ سعدی۔''

شیخ سعدیؒ نے بغداد کی تباہی دیکھی' تاتاریوں سے بچ کر نکلے تو فلسطین میں صلیبی جنگ جاری تھی وہاں ان کو یوروپین فوجیوں نے پکڑ کر قید میں ڈال دیا دس دینار دے کر حلب کے ایک تاجر نے چھڑایا۔ سعدی کی قیمت دس دینار لگی تھی۔

معاملہ سارا یہی ہے کہ ہر زمانے میں یورش تاتار کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے اور آج ان شہروں پر صلیبی سرداروں کی اولاد اور ان کے ساتھی گولہ باری میں مصروف ہیں۔

کن کن شاعروں نے دنیا کو کیا کیا دیا اور دنیا نے ان پر کیا ستم ڈھائے' ان کی فہرست بنانا چاہئے' اس میں بھی آفت رسیدہ جہان سوئم کے شعرا ہی بازی لے جائیں گے۔

ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ فیض صاحب کا دور ہے اور یہ ''دور نقش فریادی'' کی اشاعت کے وقت سے چلا آرہا ہے۔ فیض صاحب کی کیمونزم' روس دوستی' بھارت نوازی' پنجابیت' بے پناہ مقبولیت' یہ تمام چیزیں آپ کو کتنی ہی کھلتی ہوں آپ ان کے متعلق کچھ نہیں کر سکتے۔ اب یہ نوبت آچکی ہے کہ مغرب کے pop stars کی groupies کی طرح خواتین' شہروں شہروں فیض صاحب کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔

حال ہی میں جب فیض صاحب لکھنؤ گئے تھے ایک اردو روزنامے نے لکھا کہ فیض احمد فیض پنجابی زبان کے علمبردار اور اردو کے مخالف ہیں۔ لہٰذا ان کی یہاں پذیرائی نہ کی جائے اور بقول ڈاکٹر ایوب مرزا پاکستان کے چند اخبار ان کو بھارت نواز کہتے ہیں' رہی ان کی کیمونزم تو وہ الم نشرح ہے۔ فیض صاحب اب ایک super star ہیں۔ اردو افسانہ و ناول نگار کے برعکس اردو شاعر ایک پرفورمنگ آرٹسٹ بھی ہوتا ہے مشاعروں کے ذریعے اس کا گہرا رابطہ عوام سے قائم رہتا ہے اور وہ براہ راست لوگوں کے دلوں سے بات کرتا ہے۔ فیض صاحب ان خوش قسمت شعرا میں سے ہیں جو خواص و عوام دونوں کو خوش آتے ہیں۔ حالانکہ موصوف بہت قابل ذکر پرفورمنگ آرٹسٹ نہیں ہیں۔ نہ ترنم سے پڑھتے ہیں نہ ان کا تحت اللفظ تہلکہ خیز ہے مگر ان کا کلام اتنا سحر انگیز اور دلپذیر ہے اور وہ شخصیت کا ایسا charisma رکھتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے۔ دوسرے بہت اہم شاعر ن م راشد نے آزاد شاعری کا پودا لگایا لیکن ان کے Intellectual Content' مشکل پسندی نے ان کو خواص تک محدود رکھا' یوں بھی ان کے اور فیض صاحب کے رویوں میں بہت فرق تھا۔

ایک بات قابل غور ہے۔ اقبال' فیض اور راشد تینوں پنجابی' تینوں اس علاقے کے باشندے جس کو ہم تک چڑھے یوپی والے ''ایک صوبہ پنجاب ہے'' معلوم نہیں کیوں الاپ کر اپنی دانست میں گویا بڑا تیر مارا کرتے تھے اور سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ اہل پنجاب جن کی مادری زبان اردو نہیں' اردو محاورے اور روزمرہ سے انہیں کوئی سروکار نہیں' لب ولہجہ ان کا اتنا مختلف ہے' انہیں اردو سے ایسا قلبی لگاؤ کیوں ہوا؟ مثال کے طور پر پشتو اور بلوچی اور سندھی علاقوں نے اردو کے جید شاعر اور ادیب کیوں نہ پیدا کئے یا لکھنؤ اور دلی کے بجائے لاہور اردو ادب و صحافت کی راجدھانی کیسے بنا؟ اس کی ایک وجہ میری سمجھ میں آتی ہے انتہائی شائستہ اور نستعلیق لیکن شکست خوردہ دلی' یوپی' بہار 1857ء کے بعد بھی باقی دنیا کو (یعنی ان لوگوں کو جو وادی گنگ و جمن میں جنم لینے کا شرف نہ رکھتے تھے) barbarians سمجھا کئے ان کے برعکس میڈیول (Medieval) پنجاب برطانوی فتح کے بعد اچانک دور جدید میں داخل ہو گیا (پنجابی' تاریخی وجوہ کی بنا پر ہمیشہ سے سخت جان اور مہم جو رہا ہے) اور نئے برطانوی دور میں اس کے اندر وہی امریکیوں والی فرنٹیئر سپرٹ پیدا ہوئی ایک لحاظ سے پنجابیوں کو اس برصغیر کا امریکن کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ہم اہل زبان لوگ پنجاب کو ''وائیلڈ ویسٹ'' ہی سمجھا کئے۔ ہم پنجاب کی اس توانا کلرفل robust کلچر سے ناواقف تھے جو غزنوی عہد سے لے کر سکھوں کے زمانے تک وہاں پھلی پھولی اور جسے میں پنجابی پرشین سکھ کلچر کا نام دے سکتی ہوں اور اس کے پس منظر میں وہ سدھوں' جوگیوں اور راجاؤں کا پنجاب تھا اور عہد مغلیہ میں اس نے وہ بڑے صوفی

شعرا پیدا کئے جن کی تخلیقات عالمی ادب کے بہترین سرمائے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ پنجاب کے رومان' دہاں کے لوک سنگیت' اور ناچ اور وہاں کی صوفیانہ داستانیں' صوفیانہ موسیقی یہ ایک علیحدہ دنیا تھی جس پر خود تعلیم یافتہ پنجابیوں نے فخر کرنا کافی عرصے بعد سیکھا۔ چنانچہ ہندوستانی اور پاکستانی پنجاب میں پنجابی نیشنلزم کے فروغ پر ہم کو متعجب نہ ہونا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر فیض احمد فیض کی مادری زبان پنجابی ہے تو وہ اس زبان میں بھی شعر کیوں نہ کہیں۔ میں نے لاہور میں فیض صاحب سمیت پنجابی دانشوروں کے عوامی شاعر استاد امام دین اور استاد دامن پر بے انتہا فخر کرتے پایا ہے۔ یہ لسانی سوشلزم بھی ہمارے معاشرے کی ایک خصوصیت ہے۔ اقبال جب اپنے آپ کو اکبال کہتے تھے تو اہل زبان ان پر ہنستے تھے۔ خود میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے کہا تھا کہ" خیر ہو تیری لیلاؤں کی" میں پنجابیت بہت ہے!

1874ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کے ایما پر لاہور میں ایک مشاعرے کی بنا ڈالی' انگریز کی لسانی حکمت عملی ہر صوبے کے لئے مختلف تھی وادی گنگ وجمن میں انہوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ غدر کے بعد مسلم معاشرے کو برباد اور تہ وبالا کر دیا تھا۔ یہاں مسلمان تہذیبی طور پر حاوی رہے تھے لہٰذا ان کو مزید کچلنے کے لئے سرانٹنی میکڈانل نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کروایا۔ پنجاب میں حکومت سکھوں سے چھینی تھی' وہاں ہندو' مسلم' سکھ تینوں کا طرز زندگی بہت حد تک یکساں تھا پنجابی مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فوج میں بھرتی کرنے کے لئے ان کی دلجوئی اور ہمت افزائی بھی منظور تھی وہاں اردو' روزی روٹی کی زبان بنائی جس طرح یوپی ممالک اور متحدہ آگرہ واودھ سے انہوں نے تجربہ کار دیسی افسر پنجاب کے انتظام اور آبپاشی کی نہریں کھدوانے کے لئے بھیجے اسی طرح اردو پڑھانے والے یوپی سے گئے اور پنجاب نے آناً فاناً ایک عدد علامہ اقبال پروڈیوس کر دیئے اور ان کے بعد ایک سے ایک اچھے مسلمان ہندو سکھ شاعر اور ادیب۔

لیکن اہل لکھنؤ اقبال کی زبان پر معترض رہے۔

جس زمانے میں یوپی کے اردو والوں کو غم روزگار لاحق نہ تھا وہ اور نیاز مند ان لاہور ایک دوسرے سے بکثرت چونچیں لڑا کرتے تھے۔ اب یوپی میں خود اردو کی جان کے لالے پڑے ہیں وہ بادہ وشبانہ کی سرمستیاں کہاں' پنجاب میں زبان اور فوک اور قبائلی کلچر تقریباً یکساں تھی۔ پنجابی ہندو اور سکھ آج تک خدا کو رب اور ربا کہتا ہے۔ یوپی کا عام ہندو رب کہتا ہوا نہیں پایا جائے گا۔ 1857ء کے بعد اردو نے ان تینوں فرقوں کو مزید ایک لڑی میں پرو دیا۔ صورت حال کا ایک بنیادی تضاد یہ تھا کہ کٹر فرقہ وارانہ رجحانات آریہ سماج اور مسلم فرقہ پرستی نے بھی پنجاب ہی میں زور پکڑا گو سارا آریہ سماجی پریس اردو میں تھا۔ آریہ سماجی اور سناتن دھرم دونوں لٹریچر اردو میں شائع ہوتے تھے۔ آج تک ہر دوار کی دوکانوں میں پنجابی زائرین کے لئے زیادہ تر دھارمک کتابیں اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔

ایک اردو داں پنجابی ہندو اور سکھ جس طرح اقبال اور فیض پر سر دھنتا ہے اس میں لاشعوری طور پر قبائلی تھرو بیک بھی کارفرما ہے۔ جس طرح اہل پنجاب ہندو' مسلمان اور سکھ فیض صاحب کے شیدائی ہیں یوپی اور بہار اور دلی کے مسلمان اور ہندو اکٹھے ہو کر کسی واحد ادبی شخصیت کے لئے اس طرح کی والہانہ عقیدت کا اظہار نہ کریں گے کیونکہ وادی گنگ وجمن کی لسانی اور تہذیبی ورثے میں اس قسم کی مشترکہ پرستش کی گنجائش نہیں۔ اس کی ایک مثال پریم چند کا معاملہ ہے جس کے متعلق ہندو اور اردو والے مستقل ایک دوسرے سے رسہ کشی میں مصروف ہیں۔

لاہور میں محمد حسین آزاد اور کرنل ہالرائیڈ کے بعد" مخزن" کا دور آیا۔ اس کے بعد کے دور کے متعلق فیض نے "دست تہ سنگ" کے دیباچے میں لکھا ہے "20ء۔30ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے فکری آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی سیاسی تحریکوں

قراۃ العین حیدر اور فیض احمد فیض

کے ساتھ نثر ونظم میں بیشتر سنجیدہ فکر ومشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اولاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش' حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی۔ افسانہ میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔

''نقش فریادی'' کی ابتدائی نظمیں ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو''؛ ''میری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو''؛ ''یہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں'' وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا۔ لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہیں دیکھ پائے تھے کہ محبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خان تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے...... اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے...... گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا کہ یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل ودماغ پر بھی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

1935ء میں فیض صاحب امرتسر کے ایک کالج میں لیکچرر ہو گئے یہاں ان کی ملاقات دہرہ دون کے صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیوی یعنی رشید آپا سے ہوئی رشید نے فیض صاحب کو کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھنے کو دیا جس کو پڑھ کر موصوف پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔

گیان حاصل ہونے کے بعد فیض صاحب نے اپنی مشہور نظم لکھی' مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''

اسی زمانے میں 36ء میں ترقی پسند تحریک باضابطہ شروع ہوئی' 38ء میں علامہ اقبال نے رحلت فرمائی' محمد حسین آزاد کے بعد سے لے کر ن م راشد اور فیض احمد فیض کی آمد کے وقت تک اردو ادب پر اقبال کی چھتر چھایا موجود تھی۔ اقبال غالب کی طرح timeless اور بہت اونچے تھے' ان سے مفر نہ تھی ترقی پسندوں نے ان کو رجعت پسند کہا لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ آل انڈیا ریڈیو کا نیٹ ورک پھیلایا جا رہا تھا پطرس بخاری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل طلبا جو پنجاب کے دانشوروں کی cream سمجھے جاتے تھے' بہت سے آل انڈیا ریڈیو میں شامل ہو چکے تھے۔ جنگ چھڑی' لاہور کے ان ہی دانشوروں میں سے ایک' کرنل مجید ملک' فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں چنے گئے تھے جن کے اصرار پر فیض صاحب نے بھی کنگز کمیشن لے لیا۔ اس وقت حفیظ جالندھری (مصنف شاہنامہ اسلام) بھی سرکاری سونگ پبلسٹی میں شامل ''یہ اڑوس پڑوس کہے جو کہے میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' لکھ رہے تھے۔

اب آزاد ایک اور فوٹو گراف کھینچتا ہے۔

''دوسری جنگ عظیم کے آخری سال قحط بنگال کے متعلق اخبارات میں زین العابدین کی تصویریں چھپ رہی ہیں، وامق جونپوری کا ''بھوکا ہے بنگال رے ساتھی'' مجاز کا ''راج سنگھاسن ڈانواڈول'' اور فیض احمد فیض کی مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' نوجوانوں کے قومی ترانے بن چکے ہیں۔ کنہیا لال کپور کی ''غالب' ترقی پسند شعرا کی محفل میں'' نے آفت جوت رکھی ہے۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ کی نظم' کون آیا دل زار' بھی سب کو یاد ہو گئی ہے۔''

پارک سا ہیڈ نارتھ قرولباغ دہلی میں چچا مشتاق احمد زاہدی کے مکان کے برابر والے گھر میں لیفٹیننٹ کرنل فیض معہ اپنی ولایتی بیوی کے مقیم ہیں۔ چچا زاہدی کے ہاں ضعیف العمر نواب سائل دہلوی آ کر تخت پر چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں گویا ایک طرف عہد رفتہ کی آخری یادگار اور دوسری طرف عہد نو کے نقیب۔

پارک کی دوسری طرف ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور قریب چند قدم کے فاصلے پر ریلوے کے ظہیر شمسی' دونوں کی بیگمات جرمن، اتوار کے روز چچا زاہدی کے فرزند اکبر نور الدین احمد بیرسٹر مع اپنی انگریز بیگم نہر سعادت خان سے آ جاتے۔ ان تینوں ولایتی بیگمات کا آپس میں میل جول تھا خصوصاً مسز سلیم الزماں اور مسز نور الدین احمد کا لیکن ایک روز پارک میں ٹہلتے ہوئے مارگریٹ شمسی نے چپکے سے کہا'' یہ انگریز لوگ ہمارا دشمن ہے ہمارے ملک کو برباد کر رہا ہے۔'' اس زمانہ میں یورپ میں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا ہلاکو خان اب ہٹلر کے روپ میں ظاہر ہوا تھا اور کرنل فیض احمد فیض اپنے اینٹی برٹش رویے کے باوجود برطانوی وردی پہنے فسطائیت کے خلاف انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔ یہ اس وقت کی پارٹی لائن تھی اور یہ کانگریسی قوم پرستوں کی لائن سے مختلف تھی۔ چچا زاہدی اور نور الدین احمد دونوں قوم پرست تھے اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے بھائی چودھری خلیق الزماں مسلم لیگی لیڈر۔

یہ منظر نامہ بالکل تلپٹ ہونے والا تھا۔ مسز ظہیر شمسی اور مارگریٹ شمسی کی بڑی لڑکی آمنہ نے رائل انڈین ائرفورس کے ایک نوعمر انگریز نما پٹھان افسر اصغر خان سے شادی کر لی۔ یہ چودھری خلیق الزماں کی نئی مملکت پاکستان کی ائرفورس میں ائر مارشل تک ترقی کرنے والے تھے لیکن اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس قدر کم گو اور صاحب آدمی ایک روز پاکستان کی حزب مخالف کا ایک کھدر پوش لیڈر بن جائے گا نہ لیفٹننٹ کرنل فیض کو مستقبل کے بلوریں پیالے میں شہر بیروت اور لوٹس رسالے کی ایڈیٹری نظر آئی تھی۔

پنڈت نہرو آدمی پہچانتے تھے۔ 46ء میں انہوں نے فیض صاحب سے فرمائش کی کہ وہ ''انٹرنیشنل'' کا منظوم ترجمہ کریں۔ پروفیسر غیظ احمد غیظ نے اپنے دور کی ترجمانی اس طرح شروع کی کہ لوگ چونک اٹھے فیض کا اسلوب ایک پورے عہد کا شعری مزاج اور شناخت بن گیا اور بہت سوں نے کہا موصوف اقبال کے بعد اہم ترین شاعر ہیں۔

ہمارے ہاں ادب میں ایک مشغلہ عرصے سے چلا آتا ہے جس کے ڈانڈے ہمارے سابقہ مشغلے یعنی مذہبی مناظرے سے جا کر ملتے ہیں یعنی ہمعصر اہل قلم کا ایک دوسرے سے موازنہ اور مقابلہ' شاگردوں یا حمائتیوں (اب ناقدین) کی فوجیں دونوں طرف صف آرا ہوتی ہیں۔ ایک ہنگامہ رہتا ہے ایک زمانہ تھا کہ یوپی میں کچھ لوگ کہتے تھے کہ جگر اقبال سے بڑا شاعر ہے یا فلاں فلاں سے بڑا یا چھوٹا ہے وہی فلم انڈسٹری کی star rating والا معاملہ ہے۔ اسی طرح پاکستان میں ایک حلقہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا مرشد مانتا ہے لیکن مریدینِ فیض کی تعداد بہر حال بہت زیادہ ہے۔

فلم انڈسٹری میں عوام کی پسند ناپسند کے علاوہ ذاتی پبلسٹی اور پبلک ریلیشنز پر بھی لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ادب میں یہ پرسنل پبلسٹی ترقی پسند تحریک کے زمانے سے شروع ہوئی اس سے قبل لکھنے والے زیادہ تر شوقیہ ادیب تھے' اور تعاون کی ایک باقاعدہ جماعت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں۔ منشی پریم چند کے علاوہ کوئی بھی پروفیشنل ادیب نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی ادبی تنقید سنجیدہ ہوئی اور طرف دار بھی' حلقہ ارباب ذوق پیدا ہوا۔ گھمسان کے رن پڑے' ترقی پسندوں نے ایک دوسرے کے متعلق توصیفی کتابچے لکھے ادھر میراجی کا cult تیار ہوا۔

ہم غریبوں کے مفلس ادب میں تو اس طرح کی پبلسٹی کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا جو مغرب میں ناشرین ایک کتاب لانچ کرنے سے پہلے کرتے ہیں ساٹھ کروڑ آبادی کا ہندوستان دس کروڑ پاکستان کی رکھ لیجئے اس میں ایک ہزار کا ایڈیشن ایک کتاب کا چھپتا ہے! اس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے طرم خان ہو گئے ایک ہزار کے ایڈیشن کے لئے کون ڈھول بجائے گا۔ جو کچھ موافقت یا مخالفت یا چرچا ہوتا ہے' وہ ناقدین ہی کر لیتے ہیں قبول عام کی سند محض چند ہزار پڑھنے والوں سے ملتی ہے۔ شاعروں کا آڈینس البتہ وسیع تر ہے گو ہمارے ہاں بھی' خصوصاً جب سے ادبی انعامات کا سلسلہ شروع ہوا ہے' پبلسٹی اینڈ پبلک ریلیشنز کا کام شروع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم جیسے باکمال استاد کے ذکر پر جن کو وہ مقام نہ مل سکا' جس کے وہ مستحق تھے۔ فیض صاحب نے کہا ہے کہ صوفی صاحب سے کم درجے کے شاعر اور رائٹر نے وہ شہرت حاصل کر لی۔ شہرت حاصل کرنے کی کوالٹی ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی بعض حضرات خود اس بات کا حساب رکھتے ہیں کہ وہ کتنے مشہور ہیں اور مزید شہرت کے لئے کیا کیا بندوبست کرنا ہے۔ اس کے لئے وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن کا علم و ادب سے تعلق نہیں یہ ایک الگ فن ہے اور صوفی صاحب اس فن سے واقف نہیں۔

غالباً 47ء کے لگ بھگ فیض صاحب فوج چھوڑ کر پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ سبط حسن اور بنے بھائی بھی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے پاکستان بھیج دیئے گئے تھے۔ اب لاہور میں ایک بے عد سرخا سرخ فرخ آبادی گروپ جمع ہو گیا۔ نظریاتی کٹر پن اس گروہ کا ایک وصف تھا اس قسم کا کٹر گروہ اس وقت بمبئی میں بھی جمع تھا۔ ان حضرات میں سے اب کافی عرصے سے کوئی بھی کٹر نہیں رہا لیکن فیض صاحب کی ذہنی پختگی اس چیز سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن دنوں یہ سارے ترقی پسند حضرات اقبال کو فسطائی پکارتے تھے محض فیض صاحب اس انتہا پسندی کے مخالف تھے اور اس زمانے میں انہوں نے اقبال ہی کے رنگ میں وہ خوبصورت چیز لکھی تھی۔

آیا ہمارے دیس میں ایک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلہء جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر، گداز
جیسے چراغ وحشت صرصر سے بے خطر
یہ شمع بزم صبح کی آمد سے بے خطر

انہی دنوں پہلی مرتبہ فیض صاحب سے ملاقات ہوئی وہ کراچی میں میرے چچازاد بھائی اور بہن سید سعید حیدر اور بیگم عذرا حیدر کے ہاں آئے ہوئے تھے میں نے چھوٹتے ہی ان سے نہایت بے وقوفی کا سوال کیا فیض صاحب سنا ہے بنے بھائی آج کل پاکستان میں انڈر گراؤنڈ ہیں کس جگہ انڈر گراؤنڈ ہیں؟''

آپا عذرا ایک نہایت دانشور خاتون ہیں گو میری طرح ان کو بھی شعر یاد نہیں رہتے۔ انہوں نے فیض

صاحب سے کہا۔

فیض صاحب وہ کیا عمدہ شعر ہے کہ۔

جنے کیا جنے کیا جنے کیا،
اور جنے کیا جنے کیا جنے کیا

فیض صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سر ہلایا۔

کراچی میں ہمارے ہاں اور لاہور میں میرے cousins لقمان حیدر اور بیگم لقمان حیدر اور جری احمد سید اور حمیرا سید کے ہاں فیض صاحب کی بڑی دلچسپ محفلیں رہتیں پھر اچانک وہ غائب ہو جاتے یعنی جیل چلے جاتے' اسی درویشانہ انداز سے واپس آ کر ان محفلوں میں شامل ہو جاتے۔ فیض صاحب کو کسی نے برافروختہ یا جھلایا ہوا نہیں دیکھا۔ بسلسلہ پنڈی سازش کیس فیض صاحب چار سال قید میں رہے۔ اسی زمانے میں لندن میں ایک بار میں نے ڈان اخبار کی شاہ سرخی دیکھی۔ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو پھانسی کی سزا (بڑی خیریت ہوئی کہ بچ گئے) تو سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ وہ شاعر جس کے لئے سچ مچ سزائے موت کی خبریں چھپ رہی ہوں وہ۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

محض رسماً نہیں لکھے گا۔

فیض صاحب کے منفرد اسلوب نے ان کو ڈبلیو ایچ آڈن کی طرح Poets poet بنایا اور اقبال کے مانند انہوں نے ملکی سیاست میں نمایاں رول ادا کیا۔ بحیثیت انگریزی جرنلسٹ وہ پاکستان کے اہم ترین روزنامے کے ایڈیٹر رہے (پاکستان ٹائمز ہندوستان کے بہترین انگریزی اخباروں کا مقابلہ کر سکتا تھا) مزید براں پاکستان کی کوئی حکومت فیض صاحب کو نظر انداز نہ کر سکتی تھی۔ ایک لطیفہ مشہور تھا کہ ہر نئی گورنمنٹ فیض احمد فیض کو inherit کرتی ہے میں نے کراچی اور لاہور میں اعلیٰ حکمرانوں کو فیض صاحب کی دربار داری کرتے دیکھا۔ ان لوگوں نے بھی فیض صاحب کو سراہا جو ان کی بائیں بازو کی سیاست کے مخالف یا خائف تھے۔ ذہن پرست' دانش جو' درسگاہوں کے اساتذہ' سرکاری حکام' سوسائٹی کی فیشن ایبل بیگمات ان سب کی فیض صاحب سے ملاقات ایک status symbol قرار پائی۔

مجھے یاد ہے 1956 میں جب دہلی میں ایشین رائٹرز کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں لاہور سے فیض صاحب اور اعجاز حسین بٹالوی شرکت کے لئے گئے تھے واپس آ کر اعجاز نے کہا فیض صاحب تو کانفرنس میں اشوک کمار بنے ہوئے تھے فیض صاحب کو جو مقبولیت ہندوستان میں حاصل ہے اس سے سب واقف ہیں' سوویت یونین میں ان کی جو آؤ بھگت کی جاتی ہے وہ میں بچشم خود ملاحظہ کر چکی ہوں' ادھر مغرب میں کینیڈا' انگلستان' امریکہ جہاں جہاں اردو داں اور بالخصوص اہل پنجاب آباد ہیں وہ فیض صاحب کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔

تو کیا فیض احمد فیض کی اس ہر دلعزیزی میں ان کا کچھ put on بھی شامل ہے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے میں ایک بہت طویل عرصے سے فیض صاحب سے واقف ہوں اور اس دوران میں وہ اہم سے اہم تر اور مقبول سے مقبول تر ہوتے گئے مگر ان کے بدحانذ والے انداز میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

موصوف رفتہ رفتہ ایک cult figure میں تبدیل ہوتے گئے اور اب ایک نوع کے sage بن چکے ہیں۔ 77ء میں ایک کتاب لاہور سے چھپی "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" جس کا عنوان دراصل "ملفوظات حضرت فیض شاہ جہاں دوست" ہونا چاہئے اس میں موصوف کے ایک عقیدت مند نے جو ان کے ذاتی معالج بھی ہیں (نام ان کا ڈاکٹر ایوب مرزا ہے) ان سے مختلف ملاقاتوں میں سوالات کئے ہیں اور ان کا تشفی بخش جواب پایا ہے۔ ان مکالموں سے فیض صاحب کی دھیمی پرسکون شخصیت' منکسر المزاجی' حق گوئی' خلوص نیت' شائستگی' شدید حب الوطنی' غم خواری اور دردمندی' شرافت نفس' حسن مزاج' بخوبی آشکار ہوتی ہیں دنیا کے اہم ترین مسائل کو فیض صاحب (جن کو bombast سے ہمیشہ للہی بغض ہے) نہایت سلاست اور نرمی سے حل کر دیتے ہیں

"ملفوظات حضرت فیض شاہ جہاں دوست"

پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو وہ سب زمانے یاد آئے جب حضرت کی اچانک گرفتاری کی خبر سن کر ہم سب اداس ہو جاتے تھے اور بے حد تعجب ہوتا تھا۔ آخر فیض صاحب اس قدر مرنجان مرنج شرمیلے قسم کے انسان جو اونچی آواز میں بات تک نہیں کرتے اتنے خطرناک انقلابی کس طرح ہیں کہ ان کو آئے دن پکڑ کر بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک نوعمر بوجھ بجھکو کزن نے سر ہلا کر کہا آپا اب سمجھ میں آیا۔ یہ فیض صاحب جو ہیں یہ پولیس والوں سے ملے ہوئے ہیں ان سے کہہ رکھا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً جیل بھیج دیا کرو تاکہ وہاں کی صعوبتیں اٹھا کر بڑھیا شاعری کروں آپ ہی سوچئے۔

سرفروشی کے انداز بدلے گئے دعویٰ قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فراز دار و رسن سے پہلے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

رفیق راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو راہ کی تلاش بھی نہ رہی

ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی

جیسی خوبصورت شاعری فیض صاحب کے علاوہ اور کون کرسکتا تھا۔؟

تو کیا ہر سعدیؔ کیلئے یورش تا تار ضروری ہے؟

فیض صاحب کا اثر ان کے متعدد معاصر شعرا پر بہت گہرا اور واضح ہے علاوہ از یں شیشوں کا مسیحا' درد کا رشتہ۔ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ میرے ہمدم میرے دوست' یہ داغ داغ اجالا' نثار میں تری گلیوں پہ' متاع لوح وقلم' چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے' بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام' خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو' درد بیچیں گے گیت گائیں گے' ترے عہد میں دل زار کے بھی اختیار چلے گئے' نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوادیا' جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے' چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز' گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام' وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا' دشت تنہائی میں اے جان جہاں لرزاں ہیں' درد آئے گا دبے پاؤں لئے سرخ چراغ' پرورش لوح وقلم' مجھ سے پہلی سی محبت' آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ' آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم۔ وغیرہ وغیرہ اب تک ادبی کلیشے بن چکے ہیں خود میں نے سب سے پہلے یہ داغ داغ اجالا کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جو امروز میں چھپا پھر جب بھی فیض صاحب لاہور سے تشریف لاتے میں کہتی آپ نے اپنا ہوم ورک کیا؟ کوئی ایسا شعر کہا ہے جسے میں ناول کا عنوان بنالوں؟ پھر میں نے' سفینۂ غم دل اڑایا' چند سال بعد' آخر شب کے ہمسفر' اپنی گھریلو میوزک پارٹیوں میں' ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار' کیدارا میں الاپ کر ہم محفل ختم کرتے۔ یہ باقاعدہ ایک ritual تھا اس پر یاد آیا کہ فیض صاحب اس لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت ہیں ان کے کلام کو سروں میں ڈھالنے کے لئے مہدی حسن' نور جہاں' فریدہ خانم ملکہ پکھراج نیرہ نور جیسی آوازیں ملیں

فیض صاحب کے ہاں شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارہ شام' یہاں سے شہر کو دیکھو اور زرد پتوں کا بن جو میرا دیس ہے' سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر' کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی کمی نہیں۔

راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیران حرم آتے ہیں

ایک ایک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہو گا

فیض صاحب زبان کے معاملے میں اس سٹیج پر پہنچ چکے ہیں کہ اطمینان سے خوشبوئے خوش کناراں اور بادبان کشتی صہبا کے ساتھ ساتھ پوسٹ مینوں کے نام بھی لکھتے چلے جاتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ فیض صاحب نے ایک فلم' جاگو ہوا سویرا' بھی بنائی تھی جس نے ایوارڈ حاصل کئے اور باکس آفس پر فیل ہوئی۔

پاکستان کے مشہور صحافی ایوب احمد کرمانی (کرمانی مرحوم راقم الحروف کی بھابھی بیگم مصطفیٰ حیدر صاحبہ کے برادر معظم تھے) کی ٹریجک موت پر فیض صاحب نے ایک انتہائی خوبصورت مرثیہ لکھا۔

بجے گی کیسے بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

محض یہ ایک غزل فیض صاحب کے سٹائل اور ڈکشن کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ فیض کی شاعری کی مخصوص فضا اور ڈیکور کو انگریزی میں منتقل کرنا بہت مشکل ہے' وکٹر کیرنن کلام فیض کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں اس سے قبل راقم الحروف نے کیمرج کی ایک poetry reading کی محفل میں پڑھنے کے لئے ''دست صبا'' کی متعدد نظموں کا ترجمہ کیا تھا جو افسوس کہ لندن واپس آتے ہوئے ٹرین میں رہ گیا لیکن میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اردو شاعری کا انگریزی میں کامیاب ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔

فیض صاحب آرام چیئر سوشلسٹ کبھی نہیں رہے اور وہ اپنے بے حد متمول والد کی خریدی ہوئی زمینیں اپنے غریب رشتہ داروں کو بانٹ چکے ہیں اور بسلسلہ ولیش بھگتی انہوں نے جو کچھ جھیلا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ لیلائے وطن کی چاہت میں اب پھر دشت نوردی کر رہے ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

فیض صاحب آج بھی ایسی چیزیں لکھ رہے ہیں جیسے بے بھائی کا مرثیہ

خلا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسند پیر مغاں ہے

اور ''فلسطینی بچے کی لوری''

مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں

فیض صاحب کی شاعری کبھی کملا نہیں سکتی' یہ ایسی شاعری ہے جسے آج کے فلسطین اور ایران والجیریا کا شاعر پہچان سکتا ہے۔ میرؔ غالبؔ اور اقبالؔ بھی اس کو پسند کرتے اور پنجاب کے بلھے شاہ اور وارث شاہ اور بابا فرید بھی۔

☆☆☆

ایلس فیض سے امرتا پریتم کی باتیں

امرتا...... ایلس! کیا فیض صاحب سے تمہاری پہلی ملاقات تمہارے ہی دیس انگلستان میں ہوئی تھی؟

ایلس...... نہیں' میری بہن ہندوستان بیاہی تھی ڈاکٹر تاثیر کے ساتھ' وہ دونوں لندن میں ملے تھے البتہ 1938ء میں میں اپنی بہن کو ملنے ہندوستان آئی تھی۔

امرتا...... تو ہندوستان کو تم نے فیض کے روپ میں دیکھا۔

ایلس...... ہاں' امرتسر میں ملی تھی' امرتسر ہندوستان بن گیا اور ہندوستان فیض۔

امرتا...... تم اردو زبان نہیں جانتی تھیں پھر فیض کی شاعری سے عشق کیونکر ہوا؟

ایلس...... امرتا! سچی بات تو ہے کہ میں آج تک فیض کی شاعری کی گہرائی کو نہیں جان سکی' ذرا سا زبان کو سمجھ لینا اور بات ہے' لیکن پوری تہذیب کو جاننا اور بات ہے۔

امرتا...... تب فیض شاعر کو نہیں' فیض ایک شخصیت سے پیار کیا تھا؟

ایلس...... ہاں' لیکن ویسے تو شاعری شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے کیونکہ ایک شاعر کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہوتی ہے اس لئے بھی اس کا بہت کچھ جاننا ہوتا ہے اور میں نے جانا۔

امرتا...... ملنے سے کتنا عرصہ بعد شادی کی منزل آئی؟

ایلس...... تقریباً دو سال بعد اور یہ انتظار اس لئے تھا کہ فیض کے والدین سے منظوری چاہیے تھی کیونکہ ایک خوشگوار ماحول کے بغیر ہم شادی نہیں کر سکتے تھے۔

امرتا...... شادی کی رسم کہاں ادا کی گئی؟

ایلس...... کشمیر میں' مہاراجہ کشمیر نے اپنا گرمیوں کا محل ہمیں نکاح کی رسم کے لئے دیا تھا اور شیخ عبداللہ نے نکاح کی رسم ادا کی تھی۔

امرتا...... کیا بارات لاہور سے آئی تھی؟

ایلس...... ہاں تین آدمیوں کی بارات تھی ایک فیض دوسرے ان کے بڑے بھائی اور تیسرے ان کے دوست نعیم...... جب تینوں آگئے تو میں نے فیض صاحب سے پہلی بات پوچھی۔

''بیاہ کی انگوٹھی لے کر آئے ہو کہ نہیں؟'' فیض نے کہا۔'' انگوٹھی بھی لایا ہوں' ساڑھی بھی۔''

میں حیران ہوگئی کہ انگوٹھی کا سائز فیض نے کہاں سے لیا ہے پوچھنے پر کہنے لگے۔

''میں اپنے سائز پر لے آیا تھا۔''

امرتا...... فیض جان گئے ہوں گے کہ دل مل جائیں تو انگلیاں بھی ضرور مل جاتی ہیں۔ اچھا ایلس! یہ بتاؤ نکاح کے وقت مشاعرہ بھی ہوا تھا؟

ایلس...... ہاں ہوا تھا پہلے کھانا شیخ عبداللہ اور ان کی بیوی کے ساتھ کھایا پھر مشاعرہ ہوا۔ مجاز اور جوش ملیح آبادی بھی تھے۔

امرتا...... فیض کے رشتہ داروں سے کب ملاقات ہوئی؟

ایلس...... کشمیر میں تین دن ٹھہر کر ہم لاہور آگئے وہاں دعوت ولیمہ کی گئی۔

امرتا...... ساس کی بزرگانہ دعائیں کیسے لیں؟

ایلس...... سر جھکا کر' گھونگھٹ نکال کر۔

امرتا...... ایمان سے! سچ! گھونگھٹ اٹھانے کی رسم بھی ہوئی تھی؟

ایلس...... ہاں امرتا! چاندی کے روپوں کی سلامی ملی تھی۔

امرتا...... ساس صاحبہ نے تمہارا نام نہیں تبدیل کیا؟

ایلس...... کیا تھا اور انہوں نے میرا نام کلثوم رکھا تھا لیکن مجھے پسند نہیں آیا۔

امرتا...... اردو زبان کب سیکھی؟

ایلس...... گھر میں فیض کے بھتیجے سے' ان کو انگریزی سکھائی اور ان سے اردو سیکھی۔

امرتا...... اس وقت تک فیض کا پہلا مجموعہ ''نقش فریادی'' چھپ چکا تھا؟

ایلس...... ہاں' شاید ایک سال پہلے چھپا تھا۔

امرتا...... فیض نے اپنے پہلے عشق کی داستان سنائی تھی جس کے متعلق ''نقش فریادی'' کی نظمیں لکھی تھیں؟

ایلس...... ہاں امرتا' وہ بھی' اوراس کے بعد کی دوستیاں بھی' لیکن کچھ بھی میری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ فیض ایک چٹان ہے اپنے آپ میں' فیض کی وفا اپنے ساتھ ہے' کاغذ اور قلم کے ساتھ۔

امرتا...... یہ سچ ہے' جس کی وفا اپنے ساتھ ہو' اپنے کردار کے ساتھ' اپنی تخلیق کے ساتھ اس جیسا وفادار کون ہو سکتا ہے۔!

ایلس...... سینتیس برس گزر گئے ہماری شادی کو۔

امرتا...... پورب اور پچھم کا یہ ملاپ کیسا رہا؟

ایلس...... یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ دو مختلف' علیحدہ علیحدہ سرزمینوں کے مردوزن جب شادی کرتے ہیں تو میرا خیال ہے مرد کیلئے عورت کے دیس میں رہنا آسان نہیں لیکن عورت اپنے مرد کے دیس میں رہ سکتی ہے۔ نئی دھرتی' نئے ماحول کو اپنانے کی اس میں توانائی ہوتی ہے۔ مختلف تہذیب کے لوگوں کی شادی آسان بات نہیں۔

امرتا...... تمہارے دو بچے ہیں؟

ایلس...... دو بیٹیاں' سلیمہ اور منیزہ۔ سلیمہ مصورہ ہے اور منیزہ ٹی وی پروڈیوسر۔ دونوں نے دو پنجابی بھائیوں کے ساتھ شادی کی ہے اس لئے اکٹھی رہتی ہیں اپنی ساس کے ساتھ۔

امرتا...... ایلس! تم نے فیض کی نظموں کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہوگا؟

ایلس...... نہیں' اور لوگوں نے کئے ہیں۔ تقریباً پانچ سال پہلے یونیسکو کی طرف سے ایک ترجمہ چھپا تھا۔

امرتا...... فیض صاحب کو لینن پرائز کب ملا تھا؟

ایلس...... 1962ء میں فیض کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا وہ کچھ سنبھل چکے تھے لیکن ابھی بستر پر تھے جب پاکستان ٹائمز سے فون آیا تھا۔

امرتا...... یہ خبر سن کر فیض صاحب کے پہلے الفاظ کیا تھے۔؟

ایلس...... وہ چپ ہو گئے تھے شاید دل بھر آیا تھا۔

امرتا...... لوگوں کا کیا رویہ تھا۔؟

ایلس...... یہ کہ فیض کو یہ پرائز نہیں لینا چاہیے لیکن ایوب خان کا تار آیا کہ وہ پرائز لے سکتے ہیں۔ اسی طرح کے اور تار بھی موصول ہوئے پھر دوست مبارکباد دینے آگئے' پھر سوال آیا کہ اس حالت میں فیض ماسکو کا سفر کیسے کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ہوائی جہاز کے سفر سے منع کیا ہوا تھا اس لئے بیٹی کو ساتھ لے کر فیض نے گاڑی سے لاہور سے کراچی تک کا سفر کیا۔ پھر سمندری جہاز سے نیپلز تک اور پھر نیپلز سے گاڑی کے ذریعے ماسکو تک!

امرتا...... ایلس! آپ نے بھی فیض کی بائیو گرافی لکھنے کا سوچا ہے۔؟

ایلس...... میں تو نہیں البتہ کراچی میں ظفر الحسن لکھ رہے ہیں لیکن سوچتی ہوں فیض کو خود لکھنا چاہیے۔ ایک اور کام ادھورا پڑا ہے' فیض اور صوفی تبسم مل کر پرشین شاعری کا اردو ترجمہ کر رہے تھے۔ صوفی تبسم کا انتقال ہو گیا تو فیض بہت اداس ہو گئے...... وہ کام بھی کرنے والا ہے اور یہ کام بھی۔ دونوں کام ضروری ہیں۔

امرتا...... ہاں ایلس! اور ان دونوں سے بڑا ضروری کام فیض کی زندگی کو بچانے کا ہے۔

ایلس...... ہاں اللہ ان کی حفاظت کرے!

☆☆☆

فیض احمد فیض، ستیہ جیت رے اور صابر دست (کلکتہ ۱۹۸۰ء)

رام لعل

فیض کی مقبولیت اور جیل

اصولاً یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ قومی یا بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے کے لئے جیل جانا ضروری ہوتا ہے لیکن کئی بڑی شخصیتوں کی عوامی مقبولیت کا سلسلہ ان کے سلاخوں کے پیچھے چلے جانے کے بعد ہی شروع ہوا ہے۔ سیاسی لوگوں کے بارے میں تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ انگریزی راج کے خلاف آزادی کی جدوجہد کرنے ہی کے نتیجے میں مہاتما گاندھی' جواہر لال نہرو اور مولانا ابو الکلام آزاد کے علاوہ کئی دوسرے رہنماؤں کو شہرت ملی جبکہ محمد علی جناح یا ڈاکٹر محمد اقبال کو ایک بار بھی جیل کا منہ نہیں دیکھنا پڑا اور وہ دونوں بین الاقوامی سیاست میں ایک خاص ردعمل کی بدولت اور انگریز کی سازش کی وجہ سے قدم بہ قدم اس مقام کو پا گئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنی شعری فکریات اور تصور پاکستان کا خاکہ پیش کرنے کے سبب سے اپنی شناخت پا گئے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ انہی اقبال نے سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' لکھ کر آزادی کی جدوجہد میں ایک دبی دبی سی لیکن کبھی نہ بجھنے والی آگ پھونک دی تھی اور اس نظم کو آج ہمارے ملک میں ایک قومی ترانہ کا سا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ بہر حال اس منطق کی حمایت اور مخالفت میں کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور اس وقت ہمارا کام فیض احمد فیض کے عوامی سطح پر مقبول ہو جانے کے بنیادی اسباب کا پتہ لگانا ہے۔

مجھے یہ بات تو ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم کہ فیض نے پہلی نظم یا غزل کب لکھی تھی لیکن یہ پتہ ہے کہ وہ کالج کے زمانے سے شاعری کر رہے تھے یعنی جب وہ بی۔ اے میں زیر تعلیم تھے۔ اور اسی زمانے میں انہوں نے اشتراکی نظریات قبول کر لیے تھے۔ کالج ہی کے زمانے میں انہوں نے ایک بار ڈاکٹر محمد اقبال کے سامنے اپنا کلام سنایا تھا اور ڈاکٹر اقبال نے انہیں بہت داد دی تھی۔ پھر برسوں بعد اقبال کی شاعری کے بارے میں اپنی یہ رائے دی تھی..... ''جہاں تک شاعری میں سنسی بلٹی (Sensibility)' زبان اور اس کی موسیقیت کا تعلق ہے ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہیں۔ علامہ (اقبال) بہت بڑے شاعر ہیں۔ اگر وہ اشتراکیت کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہو جاتے تو ہمارا کہیں ٹھکانہ نہ ہوتا۔''

دوسری جنگ عظیم 1939ء میں شروع ہوئی تھی جو 1945ء میں جا کر ختم ہو گئی۔ یونیورسٹی کی تعلیم پوری کر کے فیض امرتسر کے ایک کالج کے مدرس بن گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ لاہور چلے گئے۔ وہاں بھی ایک کالج میں پڑھا رہے تھے کہ ایک روز اپنے ایک دوست میجر مجید ملک کے کہنے پر وہ فوج میں ملازمت پانے کے لیے ایک کرنل بیرڈ کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہوئے۔ کرنل بیرڈ کے دل میں ان کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ انہوں نے فیض احمد فیض کے سامنے ایک سرکاری فائل کا راز بتاتے ہوئے کہا.....

''اس میں درج ہے کہ تم کمیونسٹ ہو'' جب فیض نے کہا۔ ''میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوں'' تو کرنل نے یہ کہہ کر کہ ذرا خیال رکھنا' انہیں ملازمت میں لے لیا۔ اس بات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ فیض کے خیالات کالج کے زمانے سے ہی اشتراکی نظریات کے حامل ہو چکے تھے۔

1941ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام نقش فریادی' لاہور سے شائع ہوا تھا۔ باقر مہدی نے لکھا ہے.....

''یہ مجموعہ کلام ایک آندھی کی طرح چھا جانے کے بجائے آگ کی طرح رفتہ رفتہ شاعری کے حلقوں میں مقبول ہوا۔ اتنا کہ اس زمانے کے ہر نئے شاعر پر فیض کی آواز کا دھوکا ہوتا تھا'' باقر کی اس بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کیونکہ فیض کے پہلے مجموعہ کلام کے آ جانے کے بعد اس کے کئی آف شوٹس (off shoots) علی سردار جعفری' کیفی اعظمی' ساحر لدھیانوی اور بہت بعد میں ظہیر کاشمیری' کرشن ادیب' تیغ اللہ آبادی (مصطفیٰ زیدی) وغیرہ بھی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ فیض کی شاعری کے اثرات شاعروں کے علاوہ بعض نثر نگاروں پر بھی پڑے کہ انہوں نے ان کی نظموں کے کئی مصرعوں سے اپنی کہانیوں کو عنوانات کی حد تک فکر انگیز بنایا۔ بعض نے اپنی پوری پوری تخلیقات کے لیے انہی کے اشعار سے بنیادی خیال مستعار لے لیا۔ اپندر ناتھ اشک کے ناول ''گرم راکھ'' جو 1952ء میں لکھا گیا اس میں ان کی پہلی نظم کی گونج صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ ن۔

م۔ راشد نے ''نقشِ فریادی'' کے دیباچے میں اس بات کی بشارت دی تھی...... ''نقشِ فریادی'' ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔

فیض کی مشہور نظم جسے کئی گلوکار گا چکے ہیں۔ 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' اسی مجموعے کی پہلی نظم تھی' یہ نظم ایک جذباتی نوجوان ودانشور شاعر کی اندرونی کش مکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فیض جتنا عرصہ فوجی ملازمت میں رہے' کچھ نظمیں اسی دوران میں بھی لکھیں۔ جیسے...... تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے' پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے' میرے ہمدم میرے دوست اور سیاسی لیڈر کے نام...... جو گاندھی جی کے بارے میں تھی۔ پھر 1946ء میں فیض نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی۔ ان کے لیے پاکستان ٹائمز میں ایڈیٹر کی جگہ بھی خالی تھی۔ یہ اخبار ابھی نکلنا شروع نہیں ہوا تھا اور کانگریس و مسلم لیگ کی ملی جلی سرکار (اینٹرم گورنمنٹ) میں بھی کوئی جاب قبول کرنے کا مسئلہ تھا جو وزارت خارجہ کے محکمے میں خالی تھی۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل سے ان کے ڈپٹی سیکرٹری نے فیض احمد فیض کی سفارش کی ہوئی تھی لیکن فیض فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہے تھے کہ 1947ء میں ملک کی تقسیم ہو گئی اور وہ دہلی چھوڑ کر لاہور چلے گئے۔ لیکن یہاں فیض سے متعلق 1946ء کے ایک اور واقعے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی تقریب منائی جا رہی تھی۔ اس موقع پر جو مشاعرہ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) نے کرایا اس کے اسٹیج پر انہوں نے گاندھی جی اور مسٹر محمد علی جناح کو بھی یکجا کر دیا تھا۔ وہاں فیض بھی مدعو تھے۔ جوش' جگر' فراق وغیرہ کے ساتھ۔ اسی مشاعرے میں فیض نے گاندھی کے بارے میں اپنی نظم 'سیاسی لیڈر کے نام' سنائی تھی۔ جس پر انہیں خاطر خواہ داد نہیں مل سکی۔ اس زمانے میں انہیں جوش' جگر اور فراق کے مقابلے میں بڑا شاعر نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ باقر مہدی لکھتے ہیں...... ''اس زمانے میں ظہیر' سردار جعفری' مجتبیٰ حسین جیسے نقاد انہیں خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یعنی ان کی نظر میں شاعروں کی دوسری صف میں کیفی اعظمی زیادہ اچھے شاعر تھے۔ مجتبیٰ حسین تو سردار جعفری ہی کے گن گایا کرتے تھے۔

آزادی کے بعد فیض نے جب اپنی مایوسی کا اظہار اس نظم میں کیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

تو سردار جعفری نے یہ کہہ کر ان کا مذاق اڑایا کہ یہ نظم آر۔ ایس۔ ایس والے اور مسلم لیگی دونوں کہہ سکتے تھے۔

1951ء میں ''راولپنڈی کیس'' میں جب فیض جیل میں ڈال دیے گئے تو ان کے ساتھ کئی دوسرے لوگوں کے علاوہ سجاد ظہیر بھی تھے۔ ان دونوں کا ساتھ 1955ء تک رہا۔ یہیں سے فیض کی حقیقی مقبولیت کا آغاز ہوتا ہے جو قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر تھی۔ سجاد ظہیر نے جیل سے جو بیشمار خط اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو لکھے ہیں ان میں فیض کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ ان خطوط سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ فیض جب بھی کوئی نئی نظم لکھتے تھے تو جیل کے اندر اس خوشی میں ایک جشن سا منایا جاتا تھا۔ اس سے متعلق خبروں کے علاوہ ان کی نظمیں جیل سے باہر بھی کسی نہ کسی ذریعے سے یقیناً پہنچ جاتی تھیں جنہیں پاکستان و بھارت کے ترقی پسند رسالے ایک بیش قیمت تحفے کے طور پر چھاپ لیتے تھے۔ جیل کے باہر ان کی شہرت دن بہ دن بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ان کے اولین مجموعہ کلام کے دوران فیض کے ایک دانت میں شدید درد رہنے لگا تھا۔ جس کے علاج کے لیے انہیں کڑے پہرے میں جیل کے باہر ایک ڈاکٹر کے کلینک میں لے جایا جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہاں لے جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست نہ کیا جا سکا تو انہیں تانگے میں سوار کر کے لے جایا گیا۔ ان کے دونوں طرف اور آگے بھی بندوق بردار سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس روز کا قصہ خود فیض کی زبانی سنیے۔

''ہم لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ لاہور ہمارا تماشا دیکھ رہا تھا، پھر لوگوں نے ہمیں پہچان لیا۔ بازار میں ہمارا تانگا کھڑا تھا اور اس کے اردگرد یارانِ وفا کا ہجوم۔ اس میں نانبائیوں سے لے کر معروف صحافیوں تک سبھی شامل تھے۔ بالکل جلوس کی شکل بن گئی۔ میں نے زندگی میں ایسا دلکش جلوس نہیں دیکھا۔ اسی سے متاثر ہو کر میں نے یہ نظم لکھی۔''

آج بازار میں پابہ جولاں چلو، دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بہ سر چلو، خوں بہ داماں چلو، راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

فیض کو 1959ء میں بھی جیل جانا پڑا تھا جب جنرل ایوب خاں نے ملک میں پہلی بار فوجی نظام قائم کیا تھا۔ جیل میں رہ کر فیض نے کئی نظمیں لکھیں جو ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ صبا'' نام کے مجموعوں میں شائع ہوئیں۔ جیل میں انہی کی حوصلہ افزائی سے ان کے ساتھی قیدی چھوٹے چھوٹے مشاعرے بھی برپا کر لیتے تھے۔ میجر جنرل اکبر خاں، میجر جنرل نذیر احمد'

ائیر کموڈور محمود خاں جنجوعہ' بریگیڈیئر صدیق خاں' بریگیڈیئر لطیف خاں' لیفٹیننٹ کرنل نیاز محمد ارباب' لیفٹیننٹ کرنل ضیاء الدین' میجر اسحٰق محمد' میجر حسن خاں' کیپٹن ظفراللہ پوشنی' کیپٹن خضر حیات' سید سجاد ظہیر اور محمد حسین عطا راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیے گئے ان کے ساتھیوں میں تھے۔ ظفر اللہ پوشنی نے لکھا ہے کہ ہم سب جب مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت جاتے تھے تو آتے جاتے ہوئے فیض کا جیل میں لکھا ہوا یہ ترانہ گایا کرتے تھے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

مختلف جیلوں میں لکھی گئیں فیض کی کئی نظمیں بہت مشہور ہو گئیں بلکہ ان کے ترجمے بھی کئی سوشلسٹ ممالک میں کیے جا چکے ہیں اور ان کی اہمیت نہ صرف عوام میں ہے بلکہ ادب میں بھی انہیں پورا پورا احترام ملا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کی قید و بند کی نظموں کے بارے میں لکھا ہے...... "فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے مگر اس نے انہیں پگھلایا نہیں' بلکہ ان کی شخصیت کو قوت اور ان کی شاعری کو تب و تاب بخشی ہے۔"

صدر ایوب کی سخت پابندیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر فیض نے نظمیں لکھی تھیں۔

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے......

☆☆☆

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں......

☆☆☆

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پہ بکھر گئی ہو گی......

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ملاقات' زنداں کی ایک صبح' زنداں کی ایک شام' شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں' وغیرہ کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں دردمندی بھی ہے اور ایک نئی صبح کی آس بھی۔ اپنے ملک پر فوجی نظام کی لگائی ہوئی اظہار کی پابندیوں کی طوالت سے نراش ہو کر وہ کہہ اٹھے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ایک وقت ایسا آیا کہ فیض پاکستان چھوڑ کر کبھی روس' کبھی بیروت' کبھی لندن کبھی کینیڈا میں برسوں تک گھومتے پھرے۔ اپنے ملک سے باہر رہ کر بھی انہوں نے بے شمار نظمیں تخلیق کی تھیں...... کہاں جاؤ گے' شام' یہاں سے شہر کو دیکھو' دعا' لہو کا سراغ' سوچنے دو' ہم تو مجبور تھے اس دل سے' پاس رہو' ہارٹ اٹیک' غم نہ کر' غم نہ کر وغیرہ۔

یار لوٹ آئیں گے' دل ٹھہر جائے گا' غم نہ کر
زخم بھر جائیں گے' غم نہ کر
دن نکل آئے گا غم نہ کر
رت بدل جائے گی' غم نہ کر

1978ء میں بھارت آئے تو انہوں نے ایک نظم "دل من مسافر من" لکھی تھی جو پیش ہے۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سر کوئے ناشناساں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا
تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شب غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

اور فیض جب اپنے گھر لوٹے تو اس مرتبہ کسی نے انہیں گرفتار تو نہ کیا لیکن وہ اچانک چل بسے۔ اپنے وطن کی گلیوں پر نثار ہو گئے اور ایسا کر کے وہ اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے احتجاج اور فریاد کی ایک زندہ و پائندہ علامت بن گئے۔

☆☆☆

فیض ایوارڈ
2001ء کے موقع پر
سفیر پاکستان
عارف کمال
مصیب الرحمان
سلیمہ ہاشمی
شعیب ہاشمی
اظہر جاوید اور
دیگر شرکا

پاک و ہند مشاعرہ
بیادِ
فیض احمد فیض
۱۹۸۵ء

فیض احمد فیض
زیرِ نگاہ
ضیا محی الدین اور
افتخار عارف
اردو مرکز لندن
مشاعرہ بیادِ فیض

فیض امن میلہ
لاہور

فیض کو خراج تحسین کا عوامی انداز

ڈاکٹر اناسوورووا

فیض اور جدید اردو شاعری میں ''بے گھری'' کا موضوع

فیض نے اردو شاعری میں تغزل اور انقلابیت کی ایک نئی' تازہ اور زندہ تصویر پیش کی ہے۔ ایسی تصویر جس کے بارے میں کسی نے اس سے پہلے دیکھا نہ سنا۔ فیض کی شاعری اردو ادب میں ایک چمکتی ہوئی کرن بن گئی جو قارئین کے قلب ونظر کو منور کر گئی۔ امن اور آزادی کو پسند کرنے والی دنیا کے ہر کونے میں فیض کا کلام مشہور ہو گیا۔

فیض کی شاعری اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی مسائل کا اظہار کرتی ہے۔ فیض کی غزل اس اعتبار سے نئی غزل ہے کہ انہوں نے اردو غزل میں روایتی لفظیات اور استعارات کو عصری مسائل سے آشنا کیا۔ مثلاً فیض نے ''گھر'' اور ''غربت'' کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انہوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا۔

اردو غزل میں ''گھر'' اور ''غربت'' کے الفاظ کبھی علامت اور کبھی استعارے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر ''گھر'' تحفظ کی علامت ہے۔ ''غربت'' یا ''صحرا و بیاباں'' ''گھر'' کے مقابلے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ میر اور غالب کے یہاں یہ مضمون زیادہ پیچیدہ اور معنی سے لبریز ہے۔

جدید اردو شاعری میں ''گھر'' اور ''غربت'' جیسے الفاظ کا روایتی تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور ''غربت'' کی جگہ ''بے گھری'' لے لیتی ہے اور پھر یہی ''بے گھری'' کبھی کبھی سیاسی جلاوطنی کی علامت بن جاتی ہے۔

اس ''غربت'' میں شاعر کی اجنبیت اور تنہائی کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے گھر اور وطن کی یاد دل کے درد کا مرہم بن جاتی ہے۔ مثال کے لیے فیض کی غزل کا ایک شعر دیکھیے۔

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

فیض کی نظموں میں بھی جلاوطنی اور اس سے پیدا ہونے والی افسردگی یا گھر کی تمنا کے موضوعات بہت عام ہیں۔

قدیم غزل کی روایت کے مطابق ''گھر'' دل کا بھی استعارہ ہے جسے عشق کی آگ جلا کر برباد کر دیتی ہے۔ اگر فیض کا دل بھی ''گھر'' کا استعارہ ہے تو وہ بے اختیارانہ ''بے گھری'' ہونے اور جلاوطن بننے پر مجبور ہے۔

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم

شاعر اور اس کا دل دونوں گھر لوٹنے کے لیے بے چین و بے قرار ہیں۔

دیں گلی گلی صدائیں
کریں رُخ نگر نگر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

فیض کی شاعری میں یادِ وطن صرف اُن کا خاص تجربہ نہیں ہے بلکہ ان کے سب دوستوں اور رفیقوں کا تجربہ ہے۔

یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
یہ کون کب آیا، کب گیا ہے
نگاہ و دل کی خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دوسری نسل کے کئی اردو شعراء جو فیض کی شاعری اور شخصیت سے متاثر ہیں' وہ انہی موضوعات کو اپنے کلام میں مزید ترقی دے رہے ہیں۔ فیض کا ''سناٹا'' جو جلاوطنی اور غربت کی صفت ہے اور جس سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی لوگ بے گھر ہو جاتے ہیں۔ کشور ناہید کے لہجے میں احساس اس طرح سنائی دیتا ہے۔

ہم لوگوں کو

اپنے ہی وطن میں جلاوطن کر دیا گیا ہے
کہ ہم بے روح جاندار
قصہ گوئی سے بھی منحرف ہیں

افتخار عارف کے مجموعے "مہر دو نیم" میں بھی مرکزی معنویت "بے گھری" اور "دربدری" کی ہے اور اس موضوع کو تغزل اور جمالیات کے اعتبار سے انہوں نے بڑی وسعت دی ہے۔

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

ہر اک سے پوچھتے پھرتے ہیں تیرے خانہ بدوش
عذاب دربدری کس کے گھر میں رکھا جائے

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کشور ناہید اور افتخار عارف جیسے شعراء کے کلام میں نہ صرف موضوع بلکہ فیض کے اپنے نظریے کو بھی اپنایا گیا ہے۔

مغرب میں رہنے والے دوسرے اردو شعراء کا جو کلام دستیاب ہے اس میں "بے گھری" "جلاوطنی" اور اُس سے پیدا ہونے والی تنہائی کے موضوعات عام ہیں۔ ہر اجنبی سے گھر کا پتہ پوچھنے کا فیض کا انداز منیب الرحمٰن کے یہاں بھی ملتا ہے۔

ہر اجنبی سے پوچھ رہے ہیں نشانِ راہ
نوواردانِ شہر کو گھر کی خبر کہاں؟

منیب الرحمٰن۔ امریکہ

اک غول پرندوں کا ہے اور شام کا منظر
ایسے میں خیال آیا کوئی گھر نہیں اپنا

اشفاق حسین۔ کینیڈا

اجنبی دنیا کے ہر آباد گھر کو دیکھ کر
بخش اپنے گھر کی بربادی کا اندازہ ہوا

بخش لائلپوری۔ برطانیہ

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی
ہمارے گھر سے یہ بیغبری نہ جائے گی

شاہین۔ کینیڈا

کشور ناہید، افتخار عارف، فہمیدہ ریاض، اشفاق حسین اور دوسرے شعراء کے یہاں اس "بے گھری" کا احساس موجود ہے لیکن ہر ایک شاعر کی جمالیاتی خصوصیت کے مطابق اور حالاتِ زندگی کے پس منظر میں احساس کا رنگ بدلتا ہے۔ ان سب شعراء کے یہاں "گھر" اور "بے گھری" کے استعاروں کی نئی معنویت پائی جاتی ہے۔ قدیم شاعری کے مقابلے میں جہاں عاشق نے دیوانہ ہو کر صحرا و بیاباں کو خود اختیار کیا، جدید شعراء کے یہاں ہجرت اور دربدری کی مجبوری پر زور دیا جاتا ہے۔ عصری سماجی صورتِ حال کے لحاظ سے یہ صرف شاعرانہ دربدری نہیں بلکہ سیاسی جلاوطنی ہے۔ اس جلاوطنی کے حقیقی معنی کا اظہار فیض کے لفظوں میں "ہوا پھر سے حکم صادر" کے ذریعہ زیادہ وضاحت سے ہوتا ہے۔

بے گھری اور بے وطنی روایتی مضمون ہونے کے باوجود جدید شعراء کے یہاں اکثر و بیشتر ملتا ہے اور وہ آج کل کی دنیا میں انسان کی تنہائی، مایوسی اور اداسی جیسے احساسات کا مظہر بن جاتا ہے۔

فیض کا دوسرا موضوع جو گھر کی یاد اور گھر کی تمنا کی ترجمانی کرتا ہے، وہ وطن کی خود مختاری اور مجموعی طور پر عملی جمہوریت کے نظریے کا آئینہ دار ہے۔

ہجرت اور غربت کے موضوعات سے روسی شاعری بھی آشنا ہے۔ انیسویں صدی میں پوشکن اور لیرمونتوف جیسے عظیم ترین شعراء نے حکمرانوں کے جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کی اور ان موضوعات پر بہت شاہکار چیزیں لکھیں۔ بیسویں صدی میں جو شعرا کبھی سیاسی اور کبھی انفرادی وجہ سے مغرب میں جلاوطن ہو گئے، انہوں نے بھی بے گھری کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جلاوطنی اور بے گھری کے موضوعات ہمارے عہد کی انسانیت کی عالم گیر قدروں میں شامل ہیں اور ان کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ اس اعتبار سے جدید اردو شاعری عالم ادب کے ایک اہم رُجحان کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔

(ماسکو)

☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نیومی لیزرڈ
ترجمہ: اکرام بریلوی

فیض احمد فیض کا ترجمہ

”دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں“

فیض احمد فیض نہ صرف پاکستان کے ممتاز و مقبول شاعر بلکہ ہندوستان اور برصغیر کے موجودہ دور کے انتہائی نامور شاعر 20 رنومبر 1984ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ اپریل کے مہینے میں' میری اُن سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ہم اُن دنوں لندن میں اکٹھا کام کر رہے تھے۔ ہمیں کم و بیش پندرہ نظموں کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ بڑے ہشاش بشاش اور چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ مجھے ہمیشہ اُن کی صحت کا خیال دامن گیر رہتا تھا۔ انہیں صحت مند دیکھ کر بڑی طمانیت حاصل ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ میری ان سے دوبارہ لندن میں یا شاید پھر یہاں نیویارک میں' اور نہیں تو پاکستان میں ضرور ملاقات ہوگی! ہم اکثر باتیں کرتے ہوئے ہندوستان جانے کے منصوبے باندھا کرتے تھے۔

اب ایسا کبھی نہ ہو سکے گا! اب مجھے تنہا ان ملاقاتوں کی یادوں کو لے کر آگے بڑھنا ہوگا' اور ان کی شاعری کو تن تنہا انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا مرحلہ طے کرنا ہوگا۔ اس شعری عمل کی تخلیقی چہرہ نمائی کے لیے مجھے وہ تمام فکر انگیز و خیال آفریں باتیں ذہن میں رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا' جو میرے اور ان کے درمیان وقتاً فوقتاً شاعری سے متعلق مختلف النوع موضوعات' خصوصاً ان کی شاعری کے بارے میں ہوتی رہی تھیں۔ اب میری یادوں کے دامن میں ترجمہ کرنے کی لگن اور اُن کے شعری کلام کی دولت کے علاوہ کچھ بھی نہیں' جن پر انحصار کرتے ہوئے میں یہ کام فوراً شروع کر دوں۔ وہ سہارا تو ٹوٹ گیا جس نے یہ آس بندھائی تھی۔ موت' بسا اوقات شاعری تخلیقات کی اجمالی تشریح و تقطیع کر دیتی ہے ہر چند کہ اس ملک میں فیض کی شاعری سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں' حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ نہ صرف وہاں کے ذہین لوگوں بلکہ بہترین موسیقاروں نے برسوں اُن کی شعری کاوشوں کو سُر سنگیت میں سجایا اور سنوارا ہے۔ جب بھی انہوں نے مشاعروں کو زینت بخشی' پچاس پچاس ہزار سے زائد لوگوں نے ان مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے شرکت کی۔ یہ مشاعرے پرانے وقتوں کی یاد تازہ کرتے ہیں' جب نامی گرامی شعراء' اپنی شعری تخلیقات پر ستائش کی تمنا لیے' ان ادبی معرکوں میں روبرو دکھائی دیتے تھے۔ ہمارے کلچر میں شاعری کو خاص موقعوں پر ہی موسیقی میں ڈھالا جاتا ہے کیونکہ اس کو آرٹ کی دنیا میں بلند مقام دیا جاتا ہے۔ عام لوگوں سے اس کا دور کا ہی رشتہ ہوتا ہے۔ ہند و مسلم دنیا کی روایت کچھ اور ہے۔ وہ لوگ جن کا برائے نام پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتا ہے' وہ بھی فیض کی شاعری سے کماحقہ واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ انہوں نے ساز و آواز کے وسیلے سے ان کے گیت' اُن کی شاعری سُن رکھی ہے بلکہ وہ اُن کے شعری افکار سے بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ بہرہ ور ہیں۔ اس سے یہ ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ اُن کے ہاں ثقافت کی زبان اور روایت کس قدر جاندار اور مقبولیت کی ہمہ گیری لیے ہے۔

فیض نے دوسری جنگ عظیم میں' ہندوستان کی برطانوی افواج میں شامل ہو کر حصہ لیا' مگر جنگ کے بعد سے وہ ہندوستانی عوام کے جذبات و احساسات کے شارح اور ترجمان بن گئے۔ وہ برطانوی تقسیم کے ایکٹ کے مطابق پاکستانی تھے مگر اُن کا دل کُل ہندوستان پاکستان بلکہ پورے برصغیر کے عوام الناس کے ساتھ دھڑکتا تھا! اسی لیے اس وسیع و عریض خطہ ارض میں' جسے ذرا بھی شعر و شاعری سے لگاؤ ہے' وہ فیض کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔

فیض نے نہ صرف عوام کے اعتماد کو بڑی ہمت اور پامردی کے ساتھ قائم رکھا بلکہ وہ اُن کی زبان بن گئے۔ جب انہوں نے روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ادارت سنبھالی تو اس حیثیت میں انہوں نے نظم و نثر دونوں طرح سے امنِ عامہ اور سماجی انصاف کی حمایت میں آواز اٹھائی اور اس طرح وہ ظلم و تشدد کے مخالف کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ یہی ان کی ذاتی شناخت بن گئی۔ انہوں نے حکومت کی دشمنی مول لی اور 1951ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ سزائے موت کے فیصلے سے دو چار ہوئے۔ چار سال قید و بند کی

سختیاں جھیلنا پڑیں۔ پھر انہیں جیل جانا پڑا' جہاں بیشتر وقت انہیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ جن نظموں کا میں نے ترجمے کے لیے انتخاب کیا ہے' اُن میں سے اکثر و بیشتر اسی قیدِ تنہائی میں لکھی گئی ہیں۔

فیض نے عوام کے جذبات کی کئی طرح سے ترجمانی کی ہے' اور یہ خدمت انہوں نے صرف ادب و شاعری یا معلمِ اعلیٰ کا بلند درجہ حاصل کر کے درس و تدریس کے ذریعہ ہی انجام نہیں دی بلکہ اپنی پوری زندگی' ناخواندہ عوام کی تعلیم و تعلم میں گذار دی۔ وہ دراصل آسائشوں سے بلند ہو کر زندگی گذارنے کے قائل ہو گئے تھے اور اسی احساس نے انہیں عوام کا روحِ رواں بنا دیا۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ جب میں نے ہونو لولو کی ملاقات کے بعد' خدا حافظ کہتے ہوئے' اُن سے اُن کا پتہ مانگا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ صرف فیض' پاکستان لکھ دیں' خط مجھے مل جائے گا۔" اس کا جواز یہ ہے کہ پاکستان کی پوسٹل یونین فیض ہی کی شبانہ روز محنتوں کا ثمر ہے۔ یہ لوگ اُن کے اپنے لوگ ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ فیض کس وقت' کہاں ملیں گے؟

فیض انہیں لوگوں کے پاس سے آئے تھے جب ہماری 1979ء کی ایک سرد شام' اُن سے ہنالولو میں ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کو "ایسٹ ویسٹ سنٹر" کی طرف سے بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میرے پاس اس بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں شریک ہونے والے مندوبین کا سرکاری فوٹوگراف بھی ہے۔ فوٹوگراف میں کل چودہ شرکا ہیں مگر جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے' اس

شوکت علی، فیض احمد فیض، نیومی لیزرڈ

ادبی کانفرنس میں اس سے زیادہ لوگوں کا اجتماع تھا۔ اس ادبی کانفرنس میں آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' فجی' ملائشیا' جنوبی کوریا' جاپان' فلپائن' بنگلہ دیش' ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے شامل تھے۔ اس کے علاوہ جزائر الکاہل کے ساحلی علاقوں کے چند ممالک اور امریکہ کے مندوبین بھی شریک تھے۔ اس فوٹو گراف کی زیریں پٹی پر جلی حروف میں لکھا تھا' جدید ادب میں مختلف ثقافتوں کے اثر و نفوذ پر ورکشاپ' ہم سب کے سب غیر رسمی انداز میں تھے۔ ہم میں سے کسی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ ہرے بھرے لان پر آگے پیچھے دو قطاروں میں کھڑے سب ہی سنجیدہ نظر آرہے تھے' اور سب ہی موسم گرما کی پتلون اور قمیص میں ملبوس تھے۔ فیض اگلی قطار میں تھے۔ اُن کے چہرے پر سنجیدگی کی پرچھائیں بلکہ تھکن ابھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ اُس سہ پہر کے جلتے ہوئے سورج کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے! ان کی قمیص ذرا سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ قمیص کی جیب میں قلم اٹکا یا ہوا تھا۔ ان کی پیشانی کشادہ اور روشن تھی۔

وہ تاثرات جو تصویر میں نہیں۔ میری یادوں میں اس طرح زندہ و تابندہ ہیں: دور تک پھیلے ہوئے مناظر کے سلسلے' سنہرے سائے' دھندلے دھندلے سے نقوش۔ ہونولولو میں گذرے ہوئے اُس ایک ہفتے کی دلچسپیاں اور واقعات' قطار اندر قطار یادیں' جب سر اٹھاتی ہیں تو فیض ایک بڑی سی کانفرنس ٹیبل پر بیٹھے پے در پے سگریٹوں کے دھوئیں اڑاتے' ٹوٹتی ہوئی ہنسی میں چھوٹے چھوٹے جملوں اور فقروں میں بڑی پُر مغز' با معنی اور بلیغ باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ نرمی' مٹھاس اور درد و سوز' آرزو مندی سے بھری باتیں کوئی ان کی شخصیت کے وہبی جادو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا! بہت جلد ہم نے انہیں اپنے گروپ کا روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔ یہ کون اجنبی تھا' جس کے تاثرات اور ہلکا پھلکا انداز گفتگو ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑتا' روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا! جب اس نے مخصوص اور متنوع انگریزی زبان میں روانی اور تہذیب یافتہ لہجے میں تحیر کن تلفظ اور ربط کے ساتھ

الطاف گوہر' ڈاکٹر ضیاء اللہ شکیب' فیض احمد فیض' بیٹی لیز رڈ' افضل بخش اور اے جی کاردار

بولنا شروع کیا' میں سحر زدہ ہو کر سنتی رہی!

کانفرنس کے ان بکھیڑوں میں بھی ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ گئے۔ اور اس صحرائی جزیرے کا جبری قیام ہمارے لیے دلپذیر و دلآویز سرزمین میں بدل گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم دونوں ایک شکستہ جہاز' اور بہت سے لوگوں کے ساتھ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں میں پھنسے ہوئے' زندگی کا تسلسل اور گرمی قائم رکھنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ بہے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے ہی دن سے بادل ہمارے سروں پر گرجنے شروع ہو گئے تھے۔ تیز ہوائیں پاگل پن میں طوفان بنی جا رہی تھیں۔ موسلا دھار مینہ' بھاگتے برستے بادل' اچانک اور تیز بوچھاڑ کا سماں روز مرہ بن گیا تھا۔ بارش بار بار آتی اور اس کے ساتھ ایسٹ ویسٹ سنٹر کا خود کار فوارہ بندھے ٹکے' وقفوں سے چھڑکاؤ کر جاتا۔ کانفرنس چلتی رہی اور ہم' عام طور پر گیلی مٹی اور پانی میں دوسرے سیشن کی تیاری' کھانے پینے کی مصروفیات اور شام کے ہنگاموں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے' اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ خود کار فوارے کے چوڑے چکلے گھیر سے نکلتے ہوئے پانی کے تھپیڑوں کی زد میں نہ آجائیں مگر اس احتیاط کے باوجود منہ پر پانی کے چھینٹے بھی کھائے اور مٹی سے لتھڑی گھاس میں چل کر پاؤں بھی بھگوئے۔

میں فیض کو ہدایت دیتی چلتی رہی۔ انہیں اس کی ضرورت بھی تھی۔ ہمیں ایک ڈارمیٹری میں کمرے دیئے گئے۔ مجھے اپنے کمرے میں پہنچنے کے لیے تین منزلیں چڑھنا پڑتا تھا۔ فیض کو دو منزلیں سر کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اُن کی سانس کا دباؤ مجھے فکر مند کر دیتا تھا۔ کبھی کبھار تو انہیں آگے بڑھنے کے لیے دم لینے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ انہیں گراؤنڈ فلور پر کمرہ مل جائے' اور ہمیں اس میں کامیابی ہو گئی۔ ایک شام ہم ایسٹ ویسٹ سنٹر کے کمپاؤنڈ میں رات کے کھانے پر جا رہے تھے۔ کھانا

کھانے کے دوران ہم نے طے کیا کہ ان کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ اُس وقت تک مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ فیض کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ میں فیض کی شاعری کے اُن تراجم کو پڑھ چکی تھی جو وکٹر کیئرنن نے کیے تھے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ کیا میں ترجمے میں وہ بات پیدا کر سکوں گی جو اصل میں موجود ہے؟ کیا میں ان کی شعری کاوشوں کو انگریزی زبان میں منتقل کرتے ہوئے وہ جذبہ اور جان ڈال سکوں گی جو اردو زبان میں بین السطور مجلہ نشین ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ''کوشش کرنے میں کیا جاتا ہے۔''

کام شروع ہو گیا۔

اس کے بعد سے ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے۔ جب بھی فرصت ملی کانفرنس کی مصروفیات سے فراغت نصیب ہوئی' ہم بھاگ کر میرے یا ان کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ایک دوسرے کے سامنے میز پر بیٹھ گئے اور ایک باضابطہ نظام الاوقات کے مطابق کام کرتے رہے۔ فیض نے اپنی نظم کا ترجمہ کیا۔ میں نے جوں کا توں لکھ لیا۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہو گیا۔ میں نے نظم کے متعلق سوال کیے۔ سمجھنے کی کوشش کی۔ پوچھا' آپ نے یہ جملہ' یہ لفظ' یہ شکل' یہ محاکات' یہ استعارہ' یہ کنایہ ہی کیوں چنا؟ ان سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کلچر اور مزاج کا تفاوت درمیان میں حائل تھا۔ جو چیز اردو بولنے والے کے لیے آسان اور بامعنی' وہ امریکی قاری کے لیے لایعنی اور بے معنی تھی۔ میں ہر نئی بات' ہر ایجاد و ایجاز کی شاعرانہ خیال بندی کے رموز و اسرار کو دوبارہ زندگی بخشنے کی لگن میں' ہر شعری اختراع' ہر جدت' ہر نئی بات کی معنویت کی تہوں تک پہنچنا چاہتی تھی۔

مجھے ترجمے کا کام شروع ہی سے ایک طرح کی تلاش اور ایک قسم کی جستجو کا عمل دکھائی دے رہا تھا۔ میں سمجھنے لگی تھی کہ میری زبان اور میرے ادب کی روایت کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں کر سکتی! میں یہ بھی سمجھ گئی تھی کہ میرے اندر ترجمہ کرنے کے ساتھ صبر کی لامنتہا صلاحیت بھی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس لیے بھی تھا کہ میں خود شاعرہ ہوں اور تخلیق کے دوران اس صبر آزما اور رُوح فرسا عمل سے گذرتی رہی ہوں۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ ایسا کرنے میں کتنی دیر اور کتنا وقت لگتا ہے۔ نظم انگریزی زبان میں ڈھلتے ڈھلتے کتنے مراحل سے گذرتی ہے۔ کتنی مختلف شکلیں' کتنے چولے اور ہئیتیں بدلنے کے بعد مکمل ہوتی ہے کہ اسی عمل سے' میں انگریزی زبان میں شاعری کرتے ہوئے گذرتی ہوں۔ نظم کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا بطور خاص خیال رکھنا ہوگا کہ نظم میں وہی معنی پیدا و پنہاں رہیں' وہی رعنائی خیال قائم و دائم رہے جو فیض کے پیش نظر رہی ہے۔ اُس میں وہی جذبہ' وہی لہجہ' وہی گنگناتی ہوئی احساس کی گرمی و حلاوت' وہی دھیمی دھیمی سی لے اور رفتار میں وہی سبک خرامی اور نرمی ہو اور سب سے بڑھ کر انگریزی ترجمے میں وہی بات پیدا کی گئی ہو جو اردو میں جاری و ساری ہے۔

میں بخوبی جانتی ہوں متبادل محاورے اور محاکات' الفاظ اور مشتقات' استعارے اور کنائے' بات کہنے کا وہ فعال انداز اور پھر ان تمام عناصر میں وہی گرمی اور شدت پیدا کرنا اور اُس توازن و ترتیب سے پیدا کرنا جو اصل میں موجود ہیں کتنے جوکھوں کا کام ہے اس کا لحاظ رکھنا کہ کونسی صفت کہاں چسپاں ہوتی ہے اور کون سا مصدر اور مشتق کہاں صحیح بیٹھتا ہے' بڑی عرق ریزی اور حد درجہ صناعی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہی ایسی بیساکھیاں ہیں' جنہیں ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ کہیں ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوتا ہے اور کہیں ان کے بغیر چارہ نہیں'

تخلیق کے عمل کی طرح' ترجمے کے عمل کو بیان کرنا بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ اس کے بیان کرنے کا کوئی سکہ بند عالمانہ یا ادبی طریقہ نہیں۔ شاعری کے بارے میں لکھنے اور شاعری کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ لکھنے کا بہت سا کام بیان سے باہر ہے کیونکہ نہ تو یہ شعوری ہے اور نہ روزمرہ کے معمولات میں آتا ہے۔ یہ تو ایک بے ساختہ رَو ہے۔ یہ تو آمد و نزول کا معاملہ ہے۔ اگر لکھنے کا کام شعوری کوششوں اور روزمرہ کی پیش پا افتادہ تنگنائے میں پھنس کر رہ جائے تو شاعری دم توڑ جاتی ہے۔ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گی کہ شعوری کوشش و کاوش بہت اہم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی مضبوط زردبان ہے جس کی مدد سے چھلانگ لگا کر ہی شاعری کے ایوان رفعت میں رسائی ممکن ہے۔

سب سے پہلی نظم جو فیض نے مجھے ترجمے کے لیے دی وہ' آمد بہار' تھی فیض کی یہ دی ہوئی نظم دیکھیے:

Spring comes; suddenly all the time returns
all my young days that expired with our kisses,
that have been waiting in Limbo, come back
every time the roses bloom with your fragrance,
and the blood of your lovers.
All my misery returns,
all my melancholy of suffering of friends,
drunken after embraces of women beautiful as the moon.

The book returns replete with
the heart's suffering, the
questions left unanswered.
Spring comes.

یہ چھوٹی سی نظم نازک بھی ہے اور مخصوص قسم کے درد کی چبھن میں ڈوبی ہوئی بھی۔ ایسے درد کی ڈکھن میں ڈوبی ہوئی جو کسی خاص وجہ' کسی خاص سبب سے' کسی خاص موسم کے اثر سے مدتوں بعد' آخری بار اپنی تمام تر یادوں کے ساتھ عود کر آئے۔ اس نظم پر مجھے بڑی کدوکاوش کرنا پڑی۔ ہر امیج' ہر صورت' ہر تمثال کو خصوصی شکل دینا پڑی۔ اسلوب کے اظہار میں ڈرامائی انداز پیدا کرنا پڑا تا کہ شدتِ تاثر میں وہی گرمی اور حرارت باقی رہے جو اردو میں رچی بسی' گھلی گھلی ہے۔ میں نے فیض سے پوچھا نویں سطر میں The Book سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے کہا "وہ کھاتہ جس میں تجربے رقم کیے جاتے ہیں۔" اس نظم کا دوبارہ تخلیق کرنا مقابلتاً آسان تھا۔ حتمی شکل یہ ہوگی:

Spring Comes

Spring comes; suddenly all
those days return,
all the youthful days that died
on your lips,
that have been waiting in
Limbo, are born again
each time the roses display
themselves.
Their scent belongs to you; it is
your perfume.
The roses are also the blood of
your lovers.
All the torments return,
melancholy with the suffering of
friends,
intoxicated with embraces of
moon-bodied beauties,
All the chapters of the heart's
oppression return,
all the questions and all the
answers between you and me.
Spring comes, ready with all the
old accounts reopened.

"لیننگراڈ میں جنگی قبرستان" ترجمے کے لیے بہت مشکل نظم تھی۔ یہ نظم فیض نے قبرستان میں جا کر واپس آنے کے بعد لکھی تھی۔ دردوبست' شدید تاثراتی کیفیت' لفظوں کی صناعی صورت گری و تمثال کاری کے لحاظ سے یہ چھوٹی سی ایک ایسی نظم ہے جس میں کسی چیز کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لفظی ترجمہ دیکھیے:

On cold stone slabs
grey stone slabs
flowers are sprinkled
like a smattering of fresh, warm
blood.
The stones are all nameless

کولمبیا یونیورسٹی کے مجلّے میں نوامی لیزرڈ کے مضمون کا پہلا مصور صفحہ

and the eye (eyes) become restless in sleep over the timeless land of isolation morning begins to dawn.
On some distant horizon a wave of light is playing,
snatch of song, a whiff of perfume, a glimpse of a beautiful face
pass by like travellers
bringing the disturbance of hope.
I fill the cup of my heart
with my morning drink,
mix the bitternes of today with the poison of yesterday,
and raise a toast of my boon companions
at home and abroad
"to the beauty of earth, the ravishment of lips."

اس لفظی ترجمے کے اس انداز و نہج کے تمام جملے اور تراکیب تو میں مسترد نہیں کر سکی مگر نظم اور اس کی خوبصورتی کو مجروح کیے بغیر میں نے اجتہاد سے کام ضرور لیا ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اپنی اصلی ہیئت یا شکل میں اظہار کی فعال صورت میں' ترجمے میں در آئے ہیں۔ یہاں یہ بیان کر دینا بہت ضروری ہے کہ فیضؔ نے اس نظم کو لکھنے سے پہلے' اسے بِتا بھی ہے وہ جیل میں قید تنہائی کے اس تجربے سے عملی طور پر گذرے بھی ہیں۔ اس نظم کی مابہ الامتیاز خصوصیت اور سب سے انوکھی بات' اس کی غیر معمولی حلاوت اور مٹھاس ہے...... ایسی گھلی گھلی چاشنی جس کا نہ جذباتی

flowers and the woman carved in granite.
She is their mother now;
she makes them all small again,
watches them sleep forever.
Only she is awake, draped in her hard garland, weaving and reweaving
her other garland of sorrows.

ایک فطری دشواری جو لفظی ترجمے سے ترجمہ کرتے ہوئے بار بار پیش آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ نظم کے تار و پود' مالۂ و ماعلیہ کو خصوصی بنا کر' عام طور پر' نظم کا بامعنی خلاصہ پیش کر دیتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں یہ صورت حال اور زیادہ دشوار ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی زبان مروجہ اور روایتی مصادر و مشتقات سے عاری ہے۔ وہ صورت گری تمثال کاری میں حزن و ملال کی طلسم بندی سے زیادہ کام لیتے ہیں' چنانچہ فیضؔ کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے اظہار کا فعال انداز اختیار کرنا پڑا۔ دوسرے یہ بات بھی تھی کہ اردو زبان میں بعض جملوں کی بناوٹ اور فطری ساخت کچھ اور ہے جیسے شہر درد' تنہائی کا بن' روشنی کی لکیر' امیدوں کی جلوہ گری کی طرح کے جملے اور اُن کی بناوٹ انگریزی زبان کے لیے غریب اور اجنبی ہے۔ میں نے زبان کی اس بناوٹ اور اُن جملوں کی ساخت کو انگریزی زبان کے فعال' مخصوص اور دائمی متبادل لفظوں' جملوں اور تراکیب میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

نظم' قید تنہائی'' کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

On some distanct horizon a wave of light begins to play
and in my sleep the city of pain awakens

but every flower carries the name
of some unknown sleeper
and someone weeping in his memory
Finished with their blood
Shrouded in their blood
All the sons are fast asleep
The mother alone is awake
weaving the garland of her sorrows.

وہ پھول کیا تھے؟ کارنیشنز' ٹیولپ' گلاب۔ وہ ماں کون ہے؟ وہ ایک بت' قد میں زندگی سے بڑا' جو قبروں میں دفن' مُردہ سپاہیوں کو تک رہا ہے۔ یہ ہار کیا ہے؟ یہ پتھر کا ہار کیا ہے؟' سنگ تراشی کی صناعی کا ایک حصہ مجھے اس تاثر کو اسی ہیئت کے ساتھ نظم کی بُنت میں پرو کر پیش کرتا ہے' جس طرح فیضؔ نے اصل نظم میں پیش کیا ہے۔ نظم کی فائنل شکل یہ بنی:

The War Cemetery in Leningrad

These dabs of living blood
are carnations and tulips
sprinkled on the ice cold stone.
Each flower is named for one
of the unforgotten dead,
and of someons who weeps for him.
These men have finished their work;
there is the testament of the

اور لا اُبالی پن سے کوئی علاقہ ہے اور نہ اس میں "سکرین" کی ملاوٹ ہی محسوس ہوتی ہے۔ یہ مٹھاس، یہ گھلی گھلی چاشنی جس میں حزن و ملال کی لذت تو ہو مگر مایوسی کا شائبہ نہ ہو، فیضؔ کی شاعری کی انفرادی شان ہے، اور یہ ان کی سنبھلی ہوئی شخصیت اور کشادہ دلی کی غمازی کرتی ہے۔ وہ بیم و ہراس میں بھی استقامت و پامردی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے، جس نے مجھے اچانک پکڑ لیا۔ اب نظم کا حتمی ترجمہ ملاحظہ ہو:

Solitary Confinement

On the distant horizon a wave
of light
begins to play; in my sleep I live
in the city of loss. My eyelids
flutter in their restless dream
as morning moves forward
over the loneliness, the country
without borders.
A wave of light is dacing
over that distant horizon.
The merest retain, the ghost of
perfume,
the beloved face glimpsed for a
moment,
fortune me with hope, the final
disturbance.
They arrive and leave,
travellers who have no time to
stay.
I fill the cup of my heart
with my morning drink, today`s
gall
mixed with yesterday`s
bitterness.
I raise a toast to my friends
everywhere:
"Let us drink, my dear ones, to
human beauty,
to the loveliness of earth."

اور اس کے بعد یادوں کی یورش، پکنکی کھانے کے بعد فیضؔ اور میں یہ سوچ کر باہر نکلے کہ آج کیوں نہ شمالی ہندوستان کے کسی ریستوران میں کھانا کھایا جائے! ادبی کانفرنس میں آنے والے مندوبین کو کھانے کی مد میں صرف بارہ ڈالر یومیہ ملتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے ریستوران میں کھانا کھانے کی بات بنتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ہم "ایسٹ ویسٹ سنٹر" کی حدود میں گھسا پٹا کھانا کھاتے کھاتے تنگ آ چکے تھے۔ ہم نے پرواہ نہ کی، اور اپنی ترنگ میں ریستوران میں بیٹھے ہوئے دل کھول کر باتیں کیں۔ کھا پی کر، ریستوران سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ فیضؔ کا نام سنتے ہی، ایک اجنبی لڑکا بھاگا ہوا آیا اور فرطِ جذبات میں ان سے چمٹ گیا۔ پھر کیا تھا! فیضؔ کا نام جنگل کی آگ کی طرح سارے میں پھیل گیا۔ رفتہ رفتہ ہم اُس "بس بوائے" سے خاصے مانوس ہو گئے۔ اُس کا نام اعجاز رحمان تھا۔ وہ ایک مدت سے ہنالولو میں مقیم تھا۔ اُس کی مہمان نوازی مثالی تھی۔ اُس رات سے، وہ گھر فیضؔ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ ہوائی میں پاکستانی کمیونٹی بڑی تعداد میں رہتی تھی۔ اپنے ہم وطن شاعر کو خوش آمدید کہنے، اُس کے ساتھ کھانے پینے، اُس کے ساتھ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع ہونے لگے، محض اس لیے کہ اپنے محبوب اور پسندیدہ شاعر کی آواز سن سکیں۔

ایک اور نظم "جب خزاں آئی" کو سیاسی سیاق و سباق میں پڑھنا چاہیے۔ پاکستان میں ڈکٹیٹرشپ کے ساتھ جب سنسرشپ کی پابندی نافذ کی گئی تو صاف اور سیدھا سادہ اندازِ اظہار مشکل ہو گیا۔ چیزوں کو ان کے اصلی ناموں سے پکارنا مشکل ہو گیا تھا۔ رمز و کنایہ، ایمائیت و اشاریت ضروری ہو گئی۔ اُسی دورِ ابتلا کی ایک نظم ہے، اور اُس دور کے خاتمہ کی امید پر تمام ہوتی ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے:

And then one day such-wise
autumn came
naked trees of ebony torsos
stood arrayed
with yellow leaves of their
hearts
scattered all round on
roadways.
Whoever willed trampled them
underfoot
and not even a moan was heard.
Songster birds of dreams,
imaginings,
when they lost their sons
became strangers to their voice,
fell into the dust all by
themselves,
And the bird-hunter had not
even strung his bow.
Oh, God of Spring, have mercy
Bless these withered bodies with
the passion of resurrection,
their dead veins with blood.

Let some tree flower again

Let some bird sing.

اس نظم کے جس حصے کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑا وہ لفظی ترجمے کی ساتویں سطر سے لیکر گیارھویں سطر پر حاوی ہے۔ فائنل ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

When Autumn Came

This is the way that autumn came to the trees:
it stripped them down to the skin,
left their ebony bodies naked.
It shook out their hearts, the yellow leaves,
scattered them over the ground.
Anyone at all could trample out of shape
undisturbed by a single moan of protest.
The birds that herald dreams
were exiled from their song,
each voice torn out of its throat.
They dropped into the dust
even before the hunter strung his bow.
Oh, God of May, have mercy.
Bless these withered bodies
with the passion of your resurrection:
make their dead veins flow with blood.
Give some tree the gift of green again.
Let one bird sing.

وہ شاعر جس نے یہ نظمیں لکھیں، وہ اب ابدی نیند سو رہا ہے! لاکھوں انسانوں نے اُس کے مرنے کا سوگ منایا۔ میں آج بھی اس ناقابلِ فراموش غم کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں ترجمے کا کام ختم کر چکی ہوں۔ اب میں ہی ایک ایسی امانت دار ہوں اُن تجربوں کی جو ہم نے ایک ساتھ رہ کر کیے ہیں۔ ہم ملے۔ شاعری اور دوستی کے بندھنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے! ایک ساتھ کام کیا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ اور بھی زیادہ مضبوط اور پائیدار ہو گیا۔ فیض اپنا ادبی اور ثقافتی ورثہ دنیا کو دے گیا اور مجھے غیر معمولی رفاقتوں کا وہ ورثہ دے گیا جو ہماری مختلف اور متضاد ثقافتوں کے سروں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے!

اب کے سال خزاں کی آمد پر میں نے اردو پڑھنا شروع کر دی ہے۔ اب کے "بڑے دن" پر میں فیض کو ایک ایسا کاغذی تحفہ پیش کروں گی جس پر میرا نام فیض کے نام نامی کے ساتھ اردو زبان میں لکھا ہوا ہو گا۔

اب ایک حتمی نظم جس کا اوریجنل لفظی ترجمہ میرے پاس نہیں:

The Day Death Comes

How will it be the day comes?
Perhaps like the gift when night begins,
the first Kiss on the lips, given unasked,
the kiss that opens the way to marvelous worlds
while, in the distance, an April
of nameless flowers agitates the moon s heart.
Perhaps in this way: when the morning,
green with unopened buds,
begins to sway
in the bedroom of the beloved,
and the tinkle of stars as they rush to depart
can be heard on the silent windows.
What will it be like, the day death comes?
Perhaps like a vein screaming
with the premonition of pain
under the edge of a Knife, as a shadow,
the assassin holding the Knife,
spreads out with a wing span
from one end of the world to the other,
Whichever way death comes, or whenever,
in the guise of a disdainful
beloved who is always cold,
there will be the same words of
farewell to the heart:
"Thank God it is finished, the
night of the broken-hearted.
Praise be to the meeting of lips,
the honeyed lips I have Known."

فیض کی شاعری، فیض کی پُرخلوص خدمت، جو اُس نے عوام کے درمیان رہ کر کی، صلے اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہے۔ کیا وہ لوگ جو اس کی شاعری کے روحِ رواں ہیں، اُسے بھلا سکیں گے؟ فیض ان کے دلوں میں زندہ ہے اور میرے دل کے اندر بھی!

فیض زندہ رہے گا!

☆☆☆

لدمیلا واسی لیوا

"کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا"

20 نومبر 1984ء کے بعد سے اب کافی وقت گزر چکا ہے لیکن ابھی تک دل اس تلخ حقیقت کو نہیں مانتا کہ اب فیض احمد فیض زندہ نہیں ہیں، کہ اب پیارے، ہمارے اپنے فیض صاحب ماسکو کبھی نہیں آئیں گے، نہ ہی فون کر کے اپنی بھاری آواز میں کہیں گے" کیوں بھئی شکل کب دکھاؤ گی؟ میں نے آٹھ نئی چیزیں لکھی ہیں۔ سننا ہے تو آجاؤ۔"

مر گیا قدر دانِ فہم و سخن شعر ہم کو سنائے گا اب کون
مر گیا تشنہ مذاقِ قلم ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

اگرچہ حالی کے مرثیہ غالب کے یہ مصرعے بے اختیار یاد آئے پھر بھی شاید یہ اتفاقیہ بات نہیں۔ پہلے تو اس لئے کہ اب اُردو ادب پر تحریروں اور تقریروں میں غالب، اقبال، فیض کے نام ساتھ ساتھ لئے جاتے ہیں کیونکہ ان تینوں عظیم شعراء کے کلام میں ہر ایک کے زبردست انفرادی رنگ کے باوجود وہ مشترکہ باتیں پائی جاتی ہیں جو اردو شعر و شاعری کی غنائی روایات کے عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناموں کا یہ سلسلہ اردو ادب کی تاریخ 'اس کی روش و احوال کا آئینہ دار ہے' یہ نام اردو ادب کے مختلف ادوار کے نشان ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ذاتی طور پر بھی میں ہمیشہ فیض صاحب کو غالب سے وابستہ کرتی ہوں۔ یہ اس لئے کہ غالب کی مدد سے ہی فیض صاحب سے میری وہ ملاقات ہوئی جو **17** برس کی، فیض صاحب سے میری آشنائی کی ابتدا تھی۔ ان **17** برس کے دوران فیض صاحب میرے لئے اُستاد، ساتھی، دوست، اور بہت عزیز انسان رہے۔

ہوا یوں کہ ماسکو یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے اردو شاعری سے شوق ہوا۔ پھر لکھنؤ اور دلی میں جہاں میں طالبہ کی حیثیت سے زبان کی مشق کیلئے تقریباً ایک ایک سال کیلئے بھیجی گئی تھی میرا یہ شوق پختہ ہو گیا۔ میں نے اُردو شاعری کا مطالعہ کرتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ **1967**ء میں جب ماسکو میں مرزا غالب کی صد سالہ جوبلی منانے کی تیاری شروع ہوئی مجھ سے مرزا غالب کی غزلوں کا انتخاب اور ان کا روسی میں لفظی ترجمہ کرنے کی تجویز دی گئی تھی تاکہ بعد میں ایک اچھا تجربہ کار مترجم شاعر اس ترجمے کو منظوم شکل دے۔ میں بڑی خوشی کے ساتھ تیار تو ہوئی تھی لیکن فوراً ہی مجھے اتنی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا کہ میں بُری طرح بدحواس ہو گئی۔ تب میرے ایک واقف کار نے مجھ سے کہا" آج کل فیض احمد فیض ماسکو آئے ہوئے ہیں۔ تم ان سے کیوں مدد نہیں مانگتیں؟" پہلے میں حیران ہوئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہاں فیض احمد فیض اور کہاں میں 'کل کی طالبہ! وہ مجھ پر اپنا قیمتی وقت کیوں ضائع کریں گے؟" اُس وقت بھی میں فیض صاحب کا وہ مشہور شعر جانتی تھی جس کا ایک مصرع ہے" وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں۔" لیکن اُس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ مائل بہ کرم آنے والے خود فیض صاحب ہی تھے۔ اس لئے میں کافی گھبرا گئی تھی لیکن دیوان غالب میں سے ایک سو اشعار کا انتخاب کرنے اور پھر ان میں سے کافی اشعار سمجھنے میں بھی مشکلات نا قابل عبور معلوم ہو رہی تھیں۔ اس میں فیض صاحب جیسے غالب شناس سے بہتر کون میرا ہاتھ بٹا سکتا تھا؟ اور پھر اتنے بڑے شاعر سے ملنے کا شوق بھی بہت تھا۔ میرے دوستوں نے فیض صاحب سے ملنے کا انتظام کیا۔ ابھی تک مجھے یاد ہے کہ میں کس قدر گھبرائی ہوئی، شرمائی ہوئی فیض صاحب کے حضور آئی تھی۔ اپنے تعارف کے سارے الفاظ دماغ سے نکل گئے، جو کچھ کہنے کیلئے تیار کیا گیا تھا حتیٰ کہ اپنے آنے کا مقصد بھی، سب کچھ یکدم بھول گئی۔ بڑی مشکل سے **"I am very glad to meet you"** قسم کا کوئی انگریزی جملہ میرے منہ سے نکلا لیکن فیض صاحب نے میری حالت کو گویا دیکھا بھی نہیں۔ مسکراتے ہوئے کہا: "تم غالب پر کام کرنے والی ہو نا؟ اُردو تو آتی ہو گی؟ تم اپنے ساتھ غالب کا کوئی دیوان لائی ہو؟ کونسا ایڈیشن ہے، دکھاؤ" اسی انداز میں فیض صاحب نے کچھ اور کہا، کچھ پوچھا، میں نے جواب دیا۔ میری ساری گھبراہٹ، ساری پریشانی کافور ہو گئی تھی۔ ہماری بات چیت کافی دیر تک رہی۔ میں بھول چکی تھی کہ میں خود فیض احمد فیض سے بات کر رہی ہوں اور یہ کہ میری ان سے پہلی ملاقات ہے۔ ہاں، وہ" آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہربان" اور خوش قسمتی سے اس شعر کے دوسرے مصرعے کا جو مفہوم

ہے مجھے اس کا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔ پہلی ملاقات کے بعد بھی فیض صاحب نے مجھے بہت وقت دیا تھا۔ انہوں نے مجھے غالب کی غزلوں کے انتخاب کے ممکن اصول بتائے، غالب کے مشکل اشعار پڑھائے، ان کی خاص خوبیوں پر میری توجہ دلائی اور مجموعی طور پر اردو شاعری پر بھی کچھ سبق پڑھائے۔ اس طرح کے سبق لیتے رہنے کا مجھے 17 برس کے دوران اتفاق وقتاً فوقتاً نصیب ہوا۔ اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتی ہوں اور اس کیلئے فیض صاحب کی عمر بھر احسان مند رہوں گی۔

اُس بار 1967 میں ماسکو سے جاتے وقت فیض صاحب نے مجھ سے کہا تھا: ''کیوں بھئی، اب غالب سے تمہاری دوستی ہوگئی ہے نا؟ پھر میں جا رہا ہوں۔'' فیض صاحب چلے گئے لیکن ان کی باتیں، ان کے نئے اشعار، ان کے مذاق، سب کچھ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔ اُس وقت سے میں بڑی بے تابی سے مائل بہ کرم آنے والے فیض صاحب کی راہ دیکھتی رہی تھی۔ اسی طرح میرے علاوہ ماسکو میں اور بہت سارے لوگ تھے جن کیلئے فیض صاحب کا آنا ایک تقریب سے کم نہیں ہوتا تھا۔

13 فروری اپنی سالگرہ کا دن فیض صاحب نے کئی بار ماسکو میں گذارا تھا۔ فیض صاحب کی 70 ویں سالگرہ بھی یہیں ماسکو میں وسیع پیمانے پر بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔ ایوانِ ادب میں سب سے شاندار جلسہ ہوا تھا۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ فیض صاحب اپنی نظمیں اردو میں سناتے رہے اور روس کے بڑے بڑے شاعر ان نظموں کا اپنا اپنا ترجمہ پڑھ کر سناتے تھے۔ اس جلسے میں فیض صاحب نے ایک تقریر بھی کی۔ اُس دن فیض صاحب کو دیکھتے اور سنتے وقت کسی کو بھی ان کی عمر کا خیال تک نہیں آتا تھا اگرچہ یہ ان کی 70 ویں سالگرہ کا جشن تھا۔ ایک

پُرجوش، زندہ دل انسان بڑے دلکش انداز میں اپنی اور دنیا کی باتیں کر رہے تھے، ان میں بذلہ سنجی بھی تھی اور سنجیدہ فکر و خیال کا اظہار بھی۔ فیض صاحب نے ماسکو کے بارے میں بہت اچھے اور پُرخلوص الفاظ کہے تھے۔ ان کا مفہوم مجھے ابھی تک یاد ہے۔ انہوں نے کچھ اس طرح کہا ''ماسکو میرے لئے ایک عزیز شہر بنا۔ ماسکو نے بھی مجھے عظیم محبت اور مقدس نفرت کا سبق سکھایا، امن اور حسن سے محبت کا، جنگ اور تشدد سے نفرت کا سبق۔ ماسکو میں ہی میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ امن سے نہ صرف محبت کرنی چاہئے بلکہ اس کیلئے جدوجہد بھی کرنی چاہئے۔ امن کی خاطر مستقل اور غیر مصالحانہ جدوجہد کرنا ضروری ہے یہ جدوجہد ہر ایمان دار انسان کا فریضہ ہے۔'' یہ کوئی نمائشی الفاظ نہیں تھے، اس حقیقت کو ہال میں بیٹھنے والے لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔ ہمارے ایک بڑے شاعر سورکوف نے جو

ایک موثر ہتھیار بنا لیا۔'' اس طرح کے فیض کو، شاعر کو اور مجاہد کو ماسکو میں اور سارے سوویت یونین میں بھی لوگ جانتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

ایک عام خیال ہے کہ فیض صاحب کم گو آدمی تھے۔ لیکن نہ مجھے اور نہ ہی ماسکو میں رہنے والے فیض صاحب کے متعدد دوستوں کو اس بات کا کبھی احساس ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ اس لئے کہ فیض صاحب نسبتاً کم وقت کیلئے ہمارے یہاں آتے تھے اور زیادہ وقت مصروف رہتے تھے، ان کو خاموش رہنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا! ماسکو میں فیض صاحب کو سو طرح کے کام گھیر لیتے تھے: کسی کانفرنس یا اجلاس میں شرکت کرنا، کسی اخبار یا رسالے کیلئے مضمون لکھنا، ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر تقریر کرنا، دوستی انجمن کی میٹنگ میں جانا 1973ء سے ان سب کاموں کے علاوہ ''لوٹس'' کا کام بھی سنبھالنا تھا کیونکہ فیض صاحب، افرو ایشیائی

فیض، سرگئی براودین، ذولفیہ خانم، حمید غلام ایبک، اقر ریکس، نبی محمد وف اور دیگر تاشقند میں

فیض صاحب کے دوست تھے، ان کے بارے میں کہا تھا: ''فیض نے ایک انقلابی کی حیثیت سے خود اپنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھال لیا اور نغمے کو جدوجہد کا

ادیبوں کی ایسوسی ایشن کے اس ترجمان رسالے کے چیف ایڈیٹر بنے۔ پھر ان سارے ہنگاموں میں بھی فیض صاحب ''پرورشِ لوح و قلم'' کرتے رہے۔ کیا کیا

خوبصورت نظمیں اور غزلیں ماسکو میں لکھی گئیں'

لیکن ان سب مصروفیات کے باوجود فیض صاحب اپنے دوستوں کیلئے فرصت ضرور نکالتے تھے۔ بات کرنے کا فیض صاحب کا اپنا انداز تھا۔ شاید بولنے کے مقابلے میں وہ سنتے زیادہ تھے بیچ بیچ میں اپنا ''اچھا'' یا ''اوہو'' لگاتے ہوئے۔ لیکن وہ اس طرح سنتے تھے کہ گویا ان کیلئے ہمکلام کی باتوں سے زیادہ اہم اور دلچسپ کوئی بات تھی ہی نہیں۔ فیض صاحب کسی کا غم دل اور کسی کا غم روزگار سنتے تھے' کسی کی پرسش حال کرتے تھے' کسی کو مشورہ دیتے تھے۔ سوویت ادیب اور شاعر' ماسکو میں مقیم پاکستانی اور ہندوستانی' فیض صاحب سے ملنے کے خواہاں تھے' سب کیلئے فیض صاحب وقت نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے کتنا صحیح کہا تھا۔

''سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا''

وہ شامیں بھی ناقابل فراموش ہیں جب کسی کے یہاں محفل جم جاتی تھی اور فیض صاحب رات گئے تک اپنا کلام سناتے رہتے تھے۔ فیض صاحب کا اپنے اشعار سنانے کا انداز کچھ عجب سا تھا۔ اس میں وہ اثر نہیں تھا جو ان کے اشعار میں تھا۔ ایک بار میں نے فیض صاحب سے اس سلسلے میں ایک مذاق کرنے کی جرأت کی تھی۔ میں نے ان سے کہا: ''فیض صاحب منہ بند کرکے شعر سنانے کا آپ کا طریقہ مغلوں کے زمانے کے مشاعروں میں نہ چلتا! ان مشاعروں میں شاید ہی داد دی جاتی!'' فیض صاحب ہنس کر بولے ''اسی لئے میں نے بیسویں صدی میں پیدا ہونا زیادہ ٹھیک سمجھا!''

فیض صاحب کی حاضر جوابی' ان کی پرکشش شخصیت وہ خصوصیات تھیں جن پر سارا ماسکو فدا تھا۔

ماسکو میں فیض صاحب کی زندگی کی سنگلاخ راہ

فیض احمد فیض روسی ادیبوں کے ساتھ

میں ان کی ہم قدم ان کی ہم خیال اور ہم نفس' ان کی غم خوار اور ان کی رومانوی شاعری کی کردار بھی' فیض صاحب کی شریک حیات ایلس صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ اس سے بہت پہلے بھی جب میں اپنی ایک پسندیدہ کتاب ''دست صبا'' کھولتی تھی تو اس کے انتساب پر میری نظر کچھ دیر کیلئے رک جاتی تھی ''کلثوم کے نام'' اور پھر جب اس طرح کے اشعار پڑھتی تھی:

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

تو دل میں اُس خاتون سے ملنے کی بڑی خواہش پیدا ہو جاتی تھی جس نے شاعر کے دل میں اس قدر حسین جذبات اور اتنی سندر امنگوں کو اجاگر کیا۔ ایک دن فیض صاحب ایلس صاحبہ کے ساتھ ماسکو تشریف لائے اور میری دلی مراد بر آئی۔ لیکن جس دن ایلس صاحبہ سے ملاقات ہوئی' اس وقت زیادہ باتیں نہیں ہو پائیں' کیونکہ جب میں ان کے ہوٹل پہنچی تو ان کے کمرے میں میز پر کاغذوں کا پورا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ ہی ایلس صاحبہ کو ماسکو میں کسی نہ کسی کام میں مصروف پایا، عام طور پر یہ فیض صاحب کیلئے کوئی کام ہوتا تھا۔ ایلس صاحبہ ہر وقت فیض صاحب کا ہاتھ بٹاتی رہتیں۔ وہ ان کی صلاح کار' سیکرٹری' ٹائپسٹ' ایڈیٹر ہوتی تھیں۔ ہر ملاقات کے وقت ایلس صاحبہ مجھ سے فیض صاحب کے کام' ان کی صحت' ان کے مسائل' ان کی نظموں اور کتابوں کی اشاعت' یا پھر بیٹیوں کی' نواسوں کی' دنیا بھر کی باتیں کرتی تھیں، لیکن اتنی نہیں جتنی اس ملاقات میں۔ جب فیض صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ایلس صاحبہ کو فرصت تھی میں نے بڑی مشکل سے ان کو خود اپنے بارے میں کچھ بتانے کیلئے تیار کیا۔ پہلے تو وہ اپنے سکول کے بارے میں بتانے لگیں جو وہ لاہور میں چلاتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ ایلس صاحبہ کا گویا ''یاد کا کوئی دروازہ کھلا'' اور میں نے فیض صاحب سے ان کی پہلی ملاقات' ان کی شادی' اور پھر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرتے ہوئے' فیض صاحب کے ساتھ' زندگی کی راہ پر شانہ بشانہ قدم بڑھانے کے بارے میں ولولہ انگیز کہانی سنی۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن ایلس صاحبہ قلم اٹھا کر ''جو دل پہ گزری'' رقم کریں گی اور ''یادگار فیض'' کی خالق بن جائیں گی۔

مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ایلس صاحبہ ایک انگریز خاتون، جس نے فیض صاحب کو اپنا کر ان کے وطن کے رسم و رواج، زبان، رہن سہن کے طور طریقے بھی اپنائے، اس خاتون کی devotion ان کی وفاداری اور محبت کا ایک ہی پیمانہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ ہے خود فیض صاحب کے اشعار۔

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے
رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

ایلس صاحبہ سے مل کر میں خود فیض صاحب کو، ان کے خیالات اور احساسات بہتر طور پر سمجھ سکی اور واضح رہے یہ بات ان کی شاعری سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوئی۔

فیض صاحب سے میری ملاقات سے کافی عرصہ پہلے ان کا نام سوویت یونین میں مشہور ہو چکا تھا۔ ان کی اسیری کے بارے میں، ان کی جدوجہد کے بارے میں، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے بارے میں اخباروں اور رسالوں میں اطلاعات وغیرہ آتی رہتی تھیں۔ پھر فیض صاحب کے اشعار بھی ترجمہ کئے جانے لگے، پھر ان کی شاعری کا مجموعہ شائع ہوا اور سوویت قارئین فیض صاحب کے کلام سے واقف ہوئے۔ اس کیلئے سوویت ماہر ادبیات، فیض صاحب کی پہلی مترجم مریم سلگا نک نے بڑا کام سرانجام دیا سوویت ملک کے شعر شناسوں نے فیض میں ایک عظیم شاعر کو پہچانا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فیض صاحب کی نظمیں اور غزلیں روسی ترجمے میں پڑھی جاتی ہیں اور فیض کے ستعارے، تشبیہات اور ان کا حسن دوسری زبان میں منتقل کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے پھر بھی کلام فیض کے زیادہ تر ترجموں کو ایک تخلیقی کامیابی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس لئے کہ بہترین سوویت شاعر بڑی خوشی کے ساتھ فیض کے کلام کا ترجمہ کرتے ہیں کیونکہ فیض کے اور خود ان کے خیالات اور احساسات بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ سوویت شعراء نے فیض صاحب کی شاعری کو سمجھ لیا، اس کے انقلابی جوش و ولولہ اور اس کے حسن و شفقت کو محسوس کیا، اس کی موسیقی سنی اور یہ سب کچھ خود اپنی زبان کے صنائع، بدائع کے ذریعے خوبصورت نظموں میں ڈھالا ہے۔ اس طرح سوویت یونین میں بھی فیض صاحب کی آواز پورے زور و شور سے گونج اٹھی اور ہر ایک کے دل تک پہنچی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب میں فیض صاحب کی انٹرپریٹر کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، فیض صاحب کو صحت کی کوئی شکایت ہوئی۔ میں ان کو ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جب میں ڈاکٹر سے مریض کا تعارف کرانے لگی تو ڈاکٹر صاحب نے میری بات کو منقطع کر کے کہا: "آپ مجھے اتنا جاہل نہ سمجھئے کہ میں زندہ کلاسیکی شاعر کو نہ پہچانوں۔" اس چھوٹی سی مثال سے روس میں فیض صاحب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ماسکو میں فیض صاحب کی کوئی کتاب خریدنا ناممکن ہے، دکانوں میں آتے ہی وہ ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہے۔ فیض صاحب کی دوستی سے استفادہ کر کے ان کے ذریعے ہی مجھے 1977ء میں شائع شدہ ان کے کلام کا انتخاب ملا۔ جب میں اپنے آبائی شہر لینن گراڈ گئی تو یہ کتاب اپنی اماں کو پڑھنے کیلئے دی، جب ایک دن وہ بیٹھ کر فیض کی نظمیں پڑھ رہی تھیں میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے آنسو پونچھ رہی ہیں۔ میں بہت پریشان ہوئی پوچھا کیا بات ہے امی؟ انہوں نے کچھ کہے بغیر کتاب آگے بڑھائی۔ وہ اُس صفحے پر کھلی تھی جس پر ایک چھوٹی سی نظم کا ترجمہ تھا۔ نظم تھی "لینن گراڈ کا گورستان"، ہر سوویت انسان اور خاص طور پر ہر لینن گراڈ والے کیلئے یہ مقدس جگہ ہے۔ یہاں وہ لوگ مدفون ہیں جو دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں محاصرے کے 900 خوفناک دنوں کے دوران شہید ہوئے، بھوک اور سردی سے مر گئے یا ہٹلر کے سپاہیوں کا راستہ روکتے ہوئے اپنی جانیں نثار کیں۔ ہمارے خاندان سمیت لینن گراڈ میں کوئی خاندان نہیں ملے گا جو جنگ کے زمانے میں اپنے کسی عزیز سے محروم نہ ہوا ہو۔ اسی لئے اماں اس نظم سے اتنی متاثر ہوئیں۔

سرد سلوں پر زرد سلوں پر تازہ گرم لہو کی صورت
گلدستوں کے چھینٹے ہیں۔
کتبے سب بے نام ہیں لیکن ہر اک پھول پر نام لکھا ہے
غافل سونے والے کا، غم میں رونے والے کا.....

شاعر کے دل نے اس مقدس جگہ سے وابستہ ہمارے رنج و غم کے جذبے کو محسوس کیا، اپنا لیا اور وہ ایک متاثر کن نظم کے روپ میں عیاں ہوا۔ پھر کون کہے گا کہ فیض ہمارا اپنا شاعر نہیں ہے۔

فیض کی ساری شاعری ہم سوویت لوگوں کیلئے قابل فہم ہے اور ہمارے دلوں کو چھونے والی ہے۔ امن اور آزادی، ترقی اور انصاف کے فیض کے تصورات سے متعلق اعلیٰ نصب العین اور ان کی عمل آوری کے مکمل امتزاج میں فیض کی شاعری کی جان بخش قوت اور اس کی قوت کشش کا بھی راز ہے۔

فیض صاحب ساری عمر سیاسی اور سماجی میدان میں سرگرم عمل رہے۔ ظلم اور استحصال کے خلاف، ساری دنیا کی قوموں کی آزادی کی خاطر برسر پیکار رہے۔ ہر عظیم شاعر کی طرح فیض صاحب کا ہاتھ دنیا کی نبض پر رہتا تھا۔ ہر وقت وہ زمانے کے ہم نوا رہتے تھے۔ وہ دنیا کے واقعات کے مشاہد نہیں بلکہ ان میں شریک تھے۔

"حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو

اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے"......

"دستِ صبا" کے ابتدائیے کے یہ الفاظ فیضؔ کے فلسفہ زندگی کا لب لباب اور ان کے فن شاعری کا عقیدہ بھی ہے۔

ہم سوویت ملک کے قارئین اس عقیدے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور عزیز رکھتے ہیں۔ فیضؔ کی متعدد سیاسی نظمیں اور غزلیں خاص طور سے جدوجہد امن اور جدوجہد آزادی کے موضوع پر اس بات کی آئینہ دار ہیں۔

شاعر خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کیلئے ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے میں زبان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ خیال مجھے بار بار آیا تھا جب میں فیضؔ صاحب کو ان کے سوویت دوستوں' سوویت شاعروں کے درمیان دیکھتی تھی۔ جب ان سے پوچھتی تھی "فیض صاحب' آپ کی مدد کروں؟ ترجمے کی ضرورت ہو گی نا؟" وہ مسکرا کر کہتے تھے: "کیا ضرورت ہے' سب اپنے ہی لوگ ہیں!" شاعر اور دنیا۔ عوام کے سامنے شاعر کی ذمہ داری۔ یہ موضوع فیض کی شاعری کا ایک اہم ترین موضوع ہے۔ شاعر لوگوں کی عظیم برادری کا جذبہ بہت سی نظموں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے "شاعر لوگ" دراصل فیض صاحب نے اپنے ایک دوست' سوویت شاعر کاکسین کولیف کی نظم کو پسند کر کے اسے اردو میں منتقل کیا۔ نظم کا مفہوم محفوظ رہا لیکن اظہار خیال نے فیضؔ کا رنگ پکڑ لیا:

ہم نے ان پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پر آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ ان کے غم میں برستی رہی

سب غم زدہ لوگوں سے کتنا شدید احساس یگانگت ہے! "بڑا ہے درد کا رشتہ" ساری دنیا سے فیض

نیشنل کونسل آف آرٹس راولپنڈی کے زیرِ اہتمام تصویری نمائش کے موقع پر فیض صاحب مہمانوں کے ہمراہ

صاحب نے یہ رشتہ باندھا۔ یہ درد شاعر کے دل کو دکھاتا رہا' شاعر کو بے قرار کرتا تھا' اظہار چاہتا تھا۔ ورنہ شاعر کی ذات ذرہ بے نشان کی مانند رہتی۔ وہ کہہ اٹھتا

میرے درد کو جو زباں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولت دوجہاں ملے

فیض کے درد کو زباں مل گئی۔ یہ ان کی لافانی شاعری ہے۔ ہو سکتا ہے' فیضؔ کے بے شمار دوستوں' ان کے کلام کے لاتعداد پرستاروں کا پیار و محبت وہی "دولت دوجہاں" ہو جس کا ذکر شاعر نے اپنی نظم میں کیا۔

فیض صاحب اپنے دوستوں' ہم لوگوں سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوئے۔

13 فروری' فیض صاحب کی سالگرہ کا دن آنے والا ہے۔ اس کی یاد سے دل کو بڑی ٹھیس لگتی ہے۔ اب میں پھول لے کر فیض صاحب کے پاس نہیں جا سکوں گی نہ ہی لاہور میں ان کو مبارکباد بھیج سکوں گی۔ اب ان تک مبارکباد اور پیار کا پیغام پہنچانا ناممکن ہے۔ اب یہ کام اس جہاں کے کسی ذی روح کے اختیار میں نہیں۔

فیض صاحب ہم سے دور چلے گئے لیکن ان کے خوبصورت نغمے، کبھی ولولہ انگیز اور کبھی "ہلکے' شیریں' فیض صاحب کی پیاری باتیں' ان کی دلکش و دلفریب شخصیت کا عکس' ان کو جاننے والوں کے دلوں میں عمر بھر ایک سب سے بڑی دولت کی طرح محفوظ رہے گا۔

☆☆☆

اظہر جاوید

قطر میں فیض ایوارڈ......ایک رپورتاژ

قدرت کا بھی عجیب کمال ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ہمیشہ شہرت کی طلب سے بے نیاز رہتے ہیں مگر قدرت ان کا دامن شہرت اور مقبولیت سے بھر دیتی ہے۔ کچھ دُنیا دار ہمہ وقت شہرت کے تعاقب میں لگے رہتے ہیں' جوڑ توڑ کرتے ہیں' کبھی مار کے صفوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی صفیں سجا کر شہرت نوچنے کے لئے چھلانگیں لگاتے رہتے ہیں' لیکن قدرت نہ اُنہیں مقبولیت دیتی ہے نہ عزت۔

فیض احمد فیض' اُن خوش نصیبوں میں سے ہیں' جن پر قدرت مہربان رہتی ہے اور شہرت و مقبولیت ان پر فریفتہ ہوتی رہتی ہے۔

یہ گزشتہ برس کی بات ہے۔

''تخلیق'' کے خاص نمبر' ''خلیجی ریاستوں میں اردو'' کے لئے ایک تقریب دوحہ (قطر) میں منعقد کی گئی۔ یہ تقریب کئی حوالوں سے ایک یادگار اور زندہ حوالہ بن گئی۔ تقریب اُردو ادب کی بے لوث اور ممتاز شخصیت مصیب الرحمٰن نے اپنی منفرد تنظیم مجلس فروغ اُردو ادب کے زیر اہتمام منعقد کی تھی۔ مصیب الرحمٰن نے جس طرح خلیج میں رہتے ہوئے' پوری دُنیا میں اُردو شعر و ادب کو جو مقام اور معراج بخشی ہے' اُس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ اُن کی تحسین کے لئے کم لکھنا ہی بہت لکھنے کے مترادف ہے۔ واقعتاً وہ تن من دھن سے اُردو کی سیوا میں لگے ہوئے ہیں' مگر ''میوہ'' کھانے کی اُنہیں کوئی طلب نہیں کہ نہ وہ شاعر ہیں نہ ادیب...... بس اُردو سے محبت کرنے والے اور اسے زندہ سے زیادہ تابندہ اور پائندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

''تخلیق'' کے متذکرہ خاص نمبر کی ایک اور انفرادیت یہ بھی کہ اس کا سرورق بین الاقوامی شہرت یافتہ مصورہ سلیمہ ہاشمی نے تزئین کیا تھا۔ سلیمہ ہاشمی اپنی تمام عظمت اور مقبولیت کے باوصف رسائل کے سرورق نہیں بناتیں۔ اُنہیں اس طرف ''تخلیق'' ہی نے راغب کیا تھا۔ ''تخلیق'' کے لئے خاص تقریب ترتیب دی گئی تو منتظم نے سلیمہ ہاشمی کو بھی قطر میں مدعو کر لیا...... بھارت کی ادب پرور شخصیت کے ایل نارنگ ساقی بھی ''تخلیق'' سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس خصوصی تقریب میں بلائے گئے۔

یہ پس منظر ہے فیض ایوارڈ کے اجراء کا۔ ''تخلیق'' کی تقریب کے صدر قطر میں پاکستان کے سفیر جناب عارف کمال تھے۔ عام طور پر سفیر صاحبان بس سفیر ہی ہوتے ہیں۔ کسی بھی ادبی تقریب میں آئیں تو شاعروں' ادیبوں کو نصیحتیں کر کے اور ہدایات دے کر چلے جاتے ہیں۔ جناب عارف کمال نے تو حیران کر دیا جب سب لوگ' سلیمہ ہاشمی سمیت' اظہار خیال کر چکے۔ ''تخلیق'' کی خدمات کا اعتراف ہو گیا تو اُنہوں نے ایک اعلان کر کے چونکا دیا۔ سلیمہ ہاشمی کی موجودگی نے ایک نئی روایت کو جنم دیا' ایک تازہ حکایت کا آغاز کر دیا۔ نہ منتظم کے گمان میں تھا' نہ سلیمہ ہاشمی نے خیال کیا ہوگا' نہ ''تخلیق'' کی طرف سے کوئی اشارہ دیا گیا تھا۔ بس قدرت کی مہربانی کی ایک اور جھلک سامنے آئی۔ فیض کا نام سربلند ہونا تھا۔ سرخروئی نے بغیر کسی کوشش' طلب اور تقاضے کے فیض کی جھولی میں پڑنا تھا کہ عارف کمال نے کہا۔ ''میں قطر میں دو ایوارڈ جاری کر رہا ہوں۔ فیض ایوارڈ اور اقبال ایوارڈ۔ قطر میں تعلیم حاصل کرنے والے پاکستانی بچوں میں مضمون نویسی کا مقابلہ کرایا جائے گا اور جو بچی اور بچے اول نمبر پر آئیں گے' اُنہیں سفارت خانے کی طرف سے' پاکستان جانے آنے کا ٹکٹ ملے گا' تاکہ وہ بچے وہاں چند دن رہ کر ان عظیم شعراء کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکیں۔ ان کے خاندان والوں کو ملیں' اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہوں' لائبریریوں میں جا کر اُن کے فن پر لکھی ہوئی کتابوں سے فیض یاب ہوں۔''

سفیر پاکستان عارف کمال نے کہا ''میری خواہش ہے کہ جناب مصیب الرحمٰن یہاں قطر میں' اور جناب اظہر جاوید' پاکستان میں ان ایوارڈ کی تقسیم کا لائحہ عمل بنائیں' اور نئی نسل کو ان کی سوچوں کو اور ان کی تحریروں کو تنویر دینے کا اور فیض اور اقبال کے پیغام کو روشن رکھنے کا حیلہ' وسیلہ بنائیں۔''

فیض سے محبت زیادہ نکھر کر سامنے آئی۔ اقبال ایوارڈ بھی عمل میں آیا۔ ان دونوں کے لئے میں نے

جو عنوانات تجویز کئے تھے' ان پر قطر میں مقیم پاکستانی بچوں نے مضامین لکھے۔ دوحہ میں ایک کمیٹی سارے مضامین میں سے چھانٹی کر کے آٹھ دس منتخب مضامین پاکستان بھجواتی ہے۔ اس کا سارا انتظام بھی مصیب الرحمٰن کرتے ہیں۔ گویا سفارت خانے کی طرف سے یہ ڈھول بھی ان کے گلے میں ڈال دیا گیا ہے۔ پاکستان میں اقبال ایوارڈ کے لئے منصفین ہیں' ڈاکٹر انور سدید' ڈاکٹر خواجہ زکریا' ڈاکٹر یونس جاوید' عنوان تھا'' اقبال کا فلسفہ خودی'' یہاں پاکستان میں ہر قسم کی ذمہ داری مجھے ہی سونپی گئی تھی۔ فیض پر لکھے جانے والے مضامین کے لئے عنوان تھا۔'' فیض کی شاعری میں وطن کی محبت'' اور یہاں منصفین ہیں۔ ممتاز صحافی آئی اے رحمٰن' معروف افسانہ نگار اور صحافی حمید اختر اور دختر فیض بین الاقوامی شہرت یافتہ مصورہ سلیمہ ہاشمی۔

فیض ایوارڈ کے منصفین نے جو فیصلہ دیا اس کے نتیجے میں سین مجید اور محمد عاطف عباسی کے مضامین پہلے نمبر پر آئے۔ طے یہ تھا کہ فیض ایوارڈ کی تقریب طمطراق سے ہوگی اور اگر بیگم ایلس فیض تندرست اور صحت یاب ہوئیں تو انہیں بھی دوحہ میں مدعو کیا جائے گا مصیب الرحمٰن کے ہر کام میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہوتا ہے' اور بلا شبہ ان کی ہر تقریب حسن و خوبی میں' بے مثال ہوتی ہے۔ تقریب کا ڈول ڈالا گیا' تو سلیمہ ہاشمی' خوشبو کی طرح گرفت میں نہ آتی رہیں۔ کبھی مصوری کی نمائش میں شرکت کے لئے' کبھی لیکچر دینے کے لئے اور کبھی امن کانفرنس میں شامل ہونے کے لئے' وہ لندن' مصر اور بھارت جاتی رہیں۔ مصیب الرحمٰن تاریخیں بدلتے رہے (کروٹیں بدلنے کے ساتھ ساتھ) اپنے معاملات قابو میں آئے تو عالمی سیاست نے رُخ بدل لیا' اور خلیجی ریاستوں کے لئے پاکستانیوں کا ویزا عارضی طور پر روک دیا گیا مصیب الرحمٰن کو اصرار تھا کہ تقریب 2001ء ہی میں ہو' تا کہ اگلے برس' اگلا ایوارڈ جاری ہو سکے۔

خدا خدا کر کے 2001ء کا سورج غروب ہونے سے پہلے' دسمبر کے آخری ہفتے میں مصیب الرحمٰن نے فیض ایوارڈ کی تقریب میں سورج چاند دونوں جگمگا دیئے ...... یہ سورج اور چاند شعیب ہاشمی اور سلیمہ ہاشمی ہیں ...... سلیمہ ہاشمی تو گزشتہ برس اپنے فن گفتار' حسن سلوک اور حسن تمام کے سبب دوحہ کی

خواتین میں (اور مردوں میں بھی) اپنے دائمی نقش چھوڑ گئی تھیں سلیمہ ہاشمی تو بالکل فیض لگتی ہیں۔ وہی بے ساختہ پن' وہی دھیما مگر دل میں اُتر جانے والا انداز ...... کسی کو پہلی بار بھی یوں ملتی ہیں' جیسے برسوں سے دوستی ہو ...... یوں گھل مل جاتی ہیں' جیسے اُسی محفل کا

کچھ مصیب الرحمٰن کا رکھ رکھاؤ اور کچھ عارف کمال کا سجاؤ ...... یوں لگتا تھا دوحہ میں سلیمہ ہاشمی اور شعیب ہاشمی نہیں پہنچے' کوئی'' ہیروز'' آ گئے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بھی فیض سے محبت اور وابستگی کا کرشمہ ہی جھلک رہا تھا۔ جس دوپہر کو یہ لوگ دوحہ پہنچے۔

حصہ ہوں ...... شعیب ہاشمی تو انہیں پیار سے فیض کہہ کر ہی بلاتے ہیں اور شعیب ہاشمی کا بھی بظاہر بے نیازانہ لیکن انتہائی دوستانہ رویہ لوگوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتا ہے۔ فیض سے اُن کا دنیاوی رشتہ تو رہا ایک طرف' وہ فیض کے کلام کے حافظ ہی نہیں عاشق بھی ہیں اور فیض نے بھی انہیں عمر بھر دوست ہی سمجھا تھا۔

(میں بھی پانچویں سوار کی طرح ہمراہ تھا) اسی شام کو سفارت خانہ پاکستان میں قائداعظم پر ایک لیکچر تھا اور بعد میں مشاعرہ...... دونوں جگہ فیض کا نام روشن رہا...

آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

اور ''اس لو'' سے دوحہ چمکتا رہا' دمکتا رہا......

عارف کمال کو مطالعے کا چسکا ہے اور مصیب الرحمٰن کو بھی کتابوں کا چسکا...... شعیب ہاشمی تو ہیں ہی ایسی باتوں کے رسیا...... ادھر سفیر کی بیگم ثریا کمال اپنے طور پر سلیمہ ہاشمی سے آرٹ کی باتیں کرتی اور سنتی رہیں۔ ان کی بیٹیاں تو باقاعدہ شعیب ہاشمی کی دوست بن چکی تھیں۔

پاکستان ایجوکیشن سنٹر ایسا تعلیمی ادارہ ہے' جو سفارت خانہ پاکستان کی نگرانی میں چلتا ہے۔ یہاں کے پرنسپل ریحان صدیقی پہلے لاہور میں ایف سی کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ ہائیر سیکنڈری تک قائم اس سکول میں کم و بیش ساڑھے تین ہزار بچے اور بچیاں پڑھتی ہیں۔ اُردو میڈیم اور انگلش میڈیم میں...... اور خواتین و حضرات پر مشتمل سٹاف ڈھائی سو کے قریب ہے۔ وہاں دسمبر کی چھٹیاں تھیں' مگر فیض کے نام پر آدھے سے زیادہ سٹاف ممبرز اور بہت سی طالبات اور طلبا پہنچ گئے تھے ان میں سے کئی ایک نے فیض ایوارڈ کے لئے مضامین بھی لکھے ہوئے تھے۔ اس تقریب کو صبحِ فیض کا نام دیا گیا۔ دو تین بچیوں نے فیض کا کلام ترنم سے سنایا اور دو خواتین اور دو ایک مرد اساتذہ نے فیض کی شاعری پر مضامین پیش کئے۔ یوں فیض کے فیضان ان سے دوحہ بھی منور ہو گیا۔ سلیمہ ہاشمی اور شعیب ہاشمی نے بھی خطاب کیا۔

اگلے روز دوحہ کے شیزان ہوٹل میں فیض ایوارڈ کی تقریب تھی۔ یہ تقریب عشائیے سمیت منعقد ہوئی۔ شیزان کے منیجر جمشید اقبال لاہور کے رہنے والے ہیں' انہوں نے لاہوریوں اور پاکستانیوں کے دل پسند کھانے پکوانے کے لئے باورچی اور کئی خدمت گار بھی لاہور سے بلائے ہوئے تھے۔ یوں چٹخارے کے حوالے سے جمشید اقبال بھی شعیب ہاشمی کے ذاتی دوستوں میں شامل ہو گئے۔

فیض ایوارڈ کی تقریب کو انفرادیت کا روپ دینے کے لئے مصیب الرحمٰن نے بہت بڑا سرپرائز دیا۔ انہوں نے اپنے ذاتی نگار خانے سے فیض کی آواز اور نور جہاں کی گلوکاری کو مدغم کرایا تھا یہ ایک یادگار ویڈیو فلم بن گئی۔ بیس منٹ کی اس فلم میں نور جہاں نے لہک لہک کر سنایا ۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

یہ ایک ایسی تقریب کی جھلکی تھی' جس میں نور جہاں نے بھارت جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا' اور ان کے ساتھ سازندوں کو ہدایت دیتے ہوئے موسیقار نوشاد بھی دکھائی دیتے رہے۔ فیض کی آواز میں فیض کا کلام' ماحول کو ہلکی سی اداسی اور بہت سا لطف دے گیا۔ فلم کے اختتام پر اقبال بانو نغمہ سرا ہوئیں۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے

یوں لگا' فیض آج بھی اسی طرح سانسوں اور دھڑکنوں میں بسے ہوئے ہیں۔

مصیب الرحمٰن نے نہایت شائستگی سے تقریب کو سنبھالا دیئے رکھا۔ بیشتر بچوں نے اپنے مضامین کے اقتباسات سنائے' اور پھر اول آنے والی بچی اور بچے کو سفارت خانہ پاکستان کی طرف سے پاکستان جانے آنے کے ٹکٹ دیئے۔ سلیمہ نے اور شعیب نے فیض کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی بہت سی تقریبات میں فیض کا بت' بہت ساز کرنا ہوگا' مگر ان کے اپنے خیال میں اتنی محبت بھری اور ایسی منفرد تقریب پہلے کبھی' کہیں نہیں ہوئی۔

میں نے فیض ایوارڈ کا پس منظر اور پیش منظر بیان کیا' سلیمہ ہاشمی اور شعیب ہاشمی کا بھرپور تعارف پیش کیا' مگر یہ گرہ بھی لگائی کہ فیض انہی کے نہیں' ہمارے آپ کے بھی قریبی تھے۔ ہمارے دل و دماغ میں وہ کسی اور ہی جلوے سے فروزاں ہیں۔ سلیمہ ہاشمی نے فیض کی منٹگمری جیل کی مختصر سی روداد گلستانی انداز میں سنائی' کہ کس طرح جیل میں بھی فیض شجر کاری کرتے اور پھول اُگاتے رہے۔ طالبات اور طلبہ کے لئے فیض نے اپنی ایک نظم کی تشریح کی تھی' وہ فیض ہی کے سواد خط میں موجود تھی...... اپنے مضمون میں سلیمہ نے اسے بھی ٹانک دیا تھا۔ شعیب ہاشمی ہلکے پھلکے ہنستے کھلکھلاتے انداز میں بڑی گہری بات کر جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا...... فیض کو میں اشفاق احمد کے انداز میں ملامتی صوفی تو نہیں کہتا' مگر ان کی شاعری صوفیانہ ہے۔ اپنی ذات کی نفی کر کے انسان کی عظمت بیان کرنا صوفیا ہی کا کام ہے۔ سفیر پاکستان عارف کمال نے اقبال اور فیض کی ہم آہنگی' انسان دوستی اور وطن سے محبت کا احوال بیان کیا۔ انہوں نے بتایا' اور مصیب الرحمٰن نے بھی اشارۃً کہا تھا کہ یہ دونوں ایوارڈ اگرچہ سفارت خانے کی معرفت شروع ہوئے ہیں' مگر انہیں ایسا اسلوب دے دیا گیا ہے' کہ یہ قطعی غیر سرکاری واقعہ بن گئے ہیں' اور انہیں انشااللہ اسی طمطراق اور اسی محبت سے جاری رکھا جائے گا۔

☆☆☆

قیصر نجفی

فیضؔ......ایک رجحان ساز شاعر

ہمارے خیال میں وہ شاعر رجحان ساز تصور ہوتا ہے، جس کا اُسلوب سکہ رائج الوقت ہو۔ اُردو شعری ادب کم و بیش چار صدیوں پر محیط ہے۔ اس دراز عرصے کے دوران میں متعدد ایسے شعراء منظرِ عام پر آئے جو بلاشبہ صاحب طرز تھے، مگر ان میں معدودے چند ہی رجحان ساز کہلانے کے مستحق ٹھہرے، سترہویں صدی کی تکمیل ولیؔ دکنی کے ہاتھ میں تھی۔ اٹھارہویں صدی میر تقی میرؔ کے دامن میں سمٹ آئی۔ انیسویں صدی پر غالبؔ غالب آئے جبکہ بیسویں صدی اقبالؔ کے نام رہی۔ ان تمام شعراء کے اسالیب پسند خاص و عام تھے، جنہیں نہ صرف ان کے معاصرین نے بلکہ آنے والے ادوار کے سخنوروں نے بھی اپنانا باعث افتخار جانا۔ کئی ایک نے تو ان اسالیب میں اپنی افتاد طبع کی رنگ آمیزی کر کے اپنی شعری انانیت کی وہ دھاک بٹھائی کہ اقلیم سخن کو زیر نگیں کر لیا۔ البتہ اقبالؔ کا رنگ و آہنگ قبول عام کی سند حاصل کرنے کے باوصف شعرائے کرام کا عمومی شعری رویہ نہ بن سکا۔ جس کی علمی و ادبی، فکری و فنی یا بعض دیگر وجوہ جو بھی ہوں، ایک بنیادی وجہ وہ منفرد نوعیت کا ڈکشن ہے، جو صرف اور صرف اقبالؔ سے مخصوص ہے۔ اُردو شعراء میں اقبالؔ وہ واحد سخنور ہیں جنہوں نے ابلاغ و ترسیل فکر کے لیے اساتذہ کی لفظیات سے معانی و مفاہیم مستعار لینے کے بجائے اپنی ایک الگ شعری لغت تشکیل دی ہے۔ جس میں نئی نئی تراکیب و مرکبات لفظی ہی نہیں، نویہ نو استعارات، تشبیہات اور تلازمات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے شعر میں اقبالؔ کے فکر و فلسفہ کی گونج تو سنائی دیتی ہے۔ مگر ان کے اسلوب کا رنگ و آہنگ نظر نہیں آتا۔ لیکن تاریخی نفسیات اس امر کی متقاضی تھی کہ بیسویں صدی میں بھی مطلعِ فن پر کوئی ایسا آفتاب صفت شاعر ابھرے، جس کے اسلوب کی کرنیں افقی و عمودی ہر طرح کے پھیلاؤ پر قدرت رکھتی ہوں اور جو قبولیت عام کی سند کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کا عمومی شعری رویہ بنانے کا بھی اہل ہو۔ ہمارے خیال میں تاریخ کی اس ضرورت کو فیض احمد فیضؔ نے پورا کیا ہے۔ ایک عصر پر ان کی شعری اسلوب کی چھاپ ہمارے دعوئی پر صاد ہے۔

آج کل ادبی حلقوں میں یہ بحث اپنے عروج پر ہے کہ اقبالؔ کے بعد اُردو کا عظیم شاعر کون ہے۔ ہر حلقے نے اپنے تئیں یہ دستارِ فضیلت اپنے اپنے ممدوحین کے سر پر باندھ رکھی ہے، مگر متفقہ طور پر اس عظمت کا سزاوار تاحال کسی کو نہیں گردانا گیا ہے۔ دیگر صدیوں کی طرح بیسویں صدی کی علمی و ادبی کہکشاں بھی ایسے درخشندہ ستاروں سے مزین ہے، جنہیں یگانوں کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ شعر و سخن کے حوالے سے بھی تاریخ ادب اُردو کے صفحات پر چند ایسے نام جگمگ جگمگ کر رہے ہیں جو مہر و مہ سے بڑھ کر تابناک ہیں۔ ان میں جوشؔ، فراقؔ، ن م راشدؔ، مجید امجدؔ، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، اور فیض احمد فیضؔ کے اسمائے گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ہم فی الوقت اس مجادلے میں کہ اقبالؔ کے بعد عظیم شاعر کون ہے فریق بننا نہیں چاہتے بلکہ اس بحث کے پتھر کو چوم کر رکھ دینے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں کے دوران میں شعراء کی نسل کو جس شاعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ فیضؔ ہیں۔

اقبالؔ کی طرح فیضؔ بھی ایک نظریاتی شاعر تھے۔ فیضؔ نے مارکسی نظریات سے اپنی فکر کی تہذیب کی، اقبالؔ بھی کارل مارکس کے افکار سے متاثر تھے۔ انہوں نے تو ان کی شان میں ایک نظم بھی کہہ ڈالی۔ اقبالؔ کے درج ذیل اشعار اُس شعری رجحان کو نشان زد کرنے کے لیے منظرِ عام پر آئے جو مستقبل قریب میں برصغیر ہند و پاک کے شعراء کا عمومی شعری رویہ بننے والا تھا اور جس کے تکمیلی مراحل تک کی صورت گری کا قرعہ فیضؔ کے دستِ ہنر کے نام نکلا۔

تو خالق و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں\
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو\
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی\
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبالؔ اور فیضؔ کا کارل مارکس کے اقتصادی

نظریہ حیات سے ہم آہنگ طرزِ فکر Great men think alike کے مصداق ہے۔ ہمارا خیال ہے اگر زندگی اقبالؔ سے صرف ایک دہائی اور وفا کرتی تو 1935ء میں قائم ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وہ اس حد تک ضرور تعاون کرتے جس حد تک وہ ان کے مذہبی عقائد سے متصادم نہ ہوتی۔ اقبالؔ نے مارکس کی اشتراکیت کو صرف اس کے اقتصادی پہلوؤں کے تناظر میں خوش آمدید کہا ہے' کیونکہ وہ اسلام کے بنیادی فلسفہ معاشرت "مساوات محمدی" سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ سہی' بڑی حد تک اس کے قریب ضرور ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے قبل ہی اُردو شاعری کی کلاسیکی روایت اپنی اکتا دینے والی یکسانیت' بے رنگ نشاط انگیزی اور معنی کش مبالغہ آرائی کے باعث مقبولیت کھو چکی تھی۔ سرسید کی مقصدیت اور حالیؔ کی جدید شاعری کی تحاریک نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی۔ ادبی منظرنامہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ سرسید اور حالیؔ کی تحریکوں نے عوام کے مذاقِ ادب ہی کو نہیں قلمکاروں کے فکری و فنی عمل کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ مقصدیت فن کا آدرش بن گئی' نئے نئے رجحانات سامنے آئے۔ نظم و نثر دونوں میں حقیقت نگاری نے رواج پایا' جو سرسید کی تحریک کے بعد اُردو کی دوسری بڑی تحریک تھی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر نئی اشتراکیت پسند نظریات عام ہوئے۔ جن کا غربت و افلاس کی چکی میں پسے ہوئے لوگوں نے بڑا خیر مقدم کیا۔ کسانوں' محنت کشوں' اور مزدوروں نے ان نظریات کو اپنی جائے پناہ تصور کیا۔ نوجوانوں نے انہیں اپنے مستقبل کی ضمانت گردانا۔ ترقی پسند تحریک کے سبب اُردو شاعری کو زندگی سے سرشار موضوعات نصیب ہوئے' اور اُردو شاعری کا دامن ایسے علمی و ادبی جواہر سے مالا مال ہوگیا' جن کی پہلے کسی دور میں نظیر نہیں ملتی۔ جوشؔ' فیضؔ' علی سردار جعفری' سجاد ظہیرؔ' احسانؔ' مخدومؔ' ساغرؔ' نیاز حیدرؔ' مجازؔ' جذبیؔ' ساحرؔ' جاں نثار اخترؔ اور دوسرے درجنوں شعراء اس تحریک کے علمبردار ہوئے۔

ہرچند ترقی پسند شعراء میں فکری ہم آہنگی تھی مگر اسلوب بیان کے اعتبار سے ہر ایک نے اپنی ایک الگ انفرادیت قائم کی۔ تاہم فیضؔ کے علاوہ سبھی رجحان ساز اُسلوب پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ فیضؔ کے طرزِ کلام نے ایک عصر کو اس لیے اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ خالی خولی پمفلٹ سازی یا نعرہ بازی کے سطحی جذبات سے عبارت نہیں تھا۔ اس میں محض خارجی واردات کی ہاؤ ہو نہیں تھی بلکہ داخلی کیفیات کی کراہ بھی شامل تھی۔ سب سے بڑھ کر فیضؔ کے اُسلوب شعری کی کشش کا راز اس امر میں مضمر تھا کہ اسے لوگوں نے اپنے جذبات کے رنگ و آہنگ سے مملو پایا۔ غالبؔ کے بعد "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کی اگر کسی کی شاعری نے معراج پائی ہے تو وہ بلاشبہ فیضؔ ہیں۔

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں
پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں
فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
زردار کی تربت پہ بھی کمخواب کی چادر
نادار کی میت بھی ترستی ہے کفن کو

اُردو غزل کی روایت غم جاناں کے اظہار سے وابستہ ہے۔ قارئین صدیوں سے ایوان اُردو غزل میں اسی ایک غم کی گونج سنتے چلے آ رہے تھے۔ اس حوالے سے اساتذہ فن نے اظہار و بیان کی تمام تر انتہاؤں کو چھو لیا تھا۔ ان کے خوشہ چین انہی کے چبائے ہوئے نوالوں پر اکتفا کر چکے تھے۔ نتیجتاً فکر و فن پر ایک جمود کی کیفیت طاری ہوگئی اور فکری و فنی سطح پر کسی نوع کی تبدیلی وقت کی آواز بن کر دل و دماغ سے ٹکرانے لگی لہٰذا جب حالیؔ کی خشک مزاج جدت پسندی نے درِ سخن پر دستک دی تو قارئین نے ناک بھوں نہ چڑھائی اور جب ترقی پسند مصنفین نے غمِ روزگار کو غزل کا نفس ناطقہ بنایا تو اسے بھی انہوں نے گوارا کر لیا۔ لیکن جب فیضؔ نے شعری جمالیات کو مجروح کیے بغیر غمِ جاناں' غمِ دوراں اور مقصدیت کی دردمندی کو ایک اکائی بنا کر اپنی شاعری کے آئینے میں منعکس کیا تو قارئین کو فیضؔ کی شاعری جامِ جہاں نما لگی جس میں ان کی زندگی کے ہر شعبے کا عکس موجود تھا۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے
یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

1857ء کے بعد برصغیر ہند و پاک پر برطانوی سامراج کا غلبہ نہ صرف ایک تاریخ کے اختتام کا نقطہ آغاز تھا بلکہ ایک تہذیب کے قصر کو منہدم کرنے کی پہلی ضرب بھی تھی۔ سامراجی طاقتوں نے اس تہذیب کے پرداختہ لوگوں کے قول و فعل اور فکر و عمل پر قدغنیں لگا کر ریاستی دہشت گردی' سیاسی جبر' تہذیب کشی' ثقافتی غارت گری اور حقوق کی پامالی کے جو جگر سوز اور روح فرسا مظاہرے کیے ان کے خلاف زبان بے زبانی سے احتجاج کرنا بھی جرم تھا۔

مجھے یہ کہہ کر اب پکڑا گیا ہے
کہ تیرا زرد چہرہ بولتا ہے

ترقی پسند شعراء نے نہایت پامردی سے قفل زباں بندی کو توڑا، ظلم، جبر، ناانصافی، استحصال اور سماجی و معاشرتی ناہمواری کے خلاف احتجاج کی ایک ایسی طرز فغاں ایجاد کی، جس نے اقتدار کے ایوانوں کو متزلزل کر دیا۔ اس فغاں کی سب سے زیادہ تیز، درد انگیز اور اثر آفریں لے فیض کی تھی۔ جسے عوام و خواص کی ہر سطح پر مقبولیت نصیب ہوئی۔ فیض کے لہجے میں ایک طرف باوقار، جرأت مندانہ اور پُرجوش گھن گرج تھی تو دوسری طرف دلگداز، پرسوز اور دردمندانہ دھیما پن تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وطن عزیز پر مسلط آمریت کے خلاف بھی ان کی مزاحمتی شاعری کا یہ اُسلوب رہا اور یہی وہ اُسلوب تھا جس نے ایک نصف صدی کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔

رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ فقیہان حرم آتے ہیں

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جان گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فراز دار و رسن سے پہلے

☆☆☆

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں پر
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

فیض کا احتجاجی رویہ یاسیت و قنوطیت کے احساسات و جذبات سے پاک ہے۔ ان کی تمام تر شاعری رجائیت، امید و بیم اور خوش آئند مستقبل کی بشارت سے مملو ہے۔ قارئین کو ان کا اداس لہجہ بھی اس لیے پسند ہے کہ وہ یاس و نومیدی پر منتج نہیں ہوتا۔ ویسے بھی انسان فطری طور پر رات کو اس لیے گوارا کرتا ہے کہ اس کے بعد دن نکلتا ہے۔ فیض انسانی نفسیات کی اس رمز سے بخوبی آگاہ تھے۔ لہٰذا وہ حقیقت حال پر پردہ بھی نہیں ڈالتے اور مایوس بھی نہیں ہونے دیتے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو فیض کے معاصرین میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے۔ اپنی رجائیت پسندی کے حوالے سے بھی فیض دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چند چاک گریباں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں
دست فلک میں گردش ایام ہی تو ہے

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

فیض کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ترقی پسندانہ خیالات و افکار کو اس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ برآمد کیے ہوئے نہیں لگتے۔ فیض مارکسی نظریات کے پرچارک تھے، جو بلاشبہ ہماری تہذیب یا روایت کے لیے اجنبی تھے۔

بریں بنا اکثر ترقی پسند شاعروں کے یہاں ایک عجب احساس اجنبیت کی کارفرمائی ہے۔ گویا وہ مارکس کے اجتماعی شراکت کی فلسفیانہ اقدار کو اردو شاعری کی نفسیات سے ہم آہنگ نہ کر سکے ہوں۔ مگر فیض نے اپنی فنی مہارت کے بل بوتے پر ان اقدار کو ہماری تہذیب و روایت کے جزو لاینفک کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس عمل میں انہوں نے کہیں بھی شعری جمالیات کو مجروح نہیں ہونے دیا اور نہ ہی کسی ایسی فکر کو در آنے کی اجازت دی ہے جو ہماری تہذیب و تمدن سے متصادم ہو۔

جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں، کبھی رسوا سر بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سر گوشۂ منبر

گڑکے ہیں بہت اہل حکم برسر دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت
اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل پہ بہ جز داغ ندامت
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

اُردو شاعری میں سیاسی رنگ کی آمیزش حالیؔ، شبلیؔ، اکبرالٰہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، اقبالؔ اور جوشؔ نے کی۔ فیضؔ کے یہاں یہ رنگ عجب شاعرانہ حسن اور فکری جمال کے ساتھ موجود ہے۔ دراصل فیضؔ کو بنفسہٖ اس خارزار میں چلنا پڑا لہٰذا انہوں نے تمام تر سیاسی تجربات و مشاہدات کو آپ بیتی کے طور سے پیش کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی ژرف نگاہی نے اسے جگ بیتی کے تعمق و وسعت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ قید و بند کی صعوبتوں نے ان کے سیاسی شعور میں مزید گہرائی اور گیرائی پیدا کر دی۔ بنا بریں اپنے مخصوص لیکن ہمہ گیر سیاسی نظریات کے طفیل انہیں بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی اور روس نے ان کی شاعری کی عظمت اور افکار و نظریات کی اصابت کے اعتراف میں انہیں ''لینن ایوارڈ'' سے نوازا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ سیاسی افکار و خیالات کی ترجمانی شاعرانہ حسن کو غارت کر دیتی ہے اور شاعری ایک سیاسی منشور بن کر رہ جاتی ہے۔ تاہم یہ الزام فیضؔ کے کلام پر نہیں لگایا جا سکتا۔ انہوں نے لیلائے وطن کے عشق اور اپنی محبوبہ کے عشق دونوں کو اس خوبی سے فکری وحدت کے سانچے میں ڈھالا کہ شعریت کا رنگ دوبالا ہو گیا۔ فیضؔ کے یہ دو عشق ان کی شعری نفسیات کے ترجمان بن کر سامنے آئے ہیں اور یہی وہ عناصر ہیں جو انہیں اپنے عہد کے نوجوان شعراء کا آئیڈیل بناتے ہیں۔

جو آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

فیضؔ کی شاعری نے اپنی انبساط انگیز غنایت اور رقص آمیز صوتی آہنگ سے بھی قارئین کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ وہ ایک ماہر موسیقی کی طرح مترنم الفاظ کا انتخاب کر کے ایسی فنی چابکدستی سے انہیں ترتیب دیتے ہیں کہ ان کے ہر مصرع اور ہر شعر میں ساز و آواز کی سی روح پرور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بحروں کی نغمگی اس پر مستزاد ہے۔ فیضؔ کی تراکیب اور مرکبات لفظی میں بھی ایک شاعرانہ حسن پایا جاتا ہے۔ خاص کر ان کے استعارے، تشبیہیں اور علامتیں جب دھنک رنگ فضا قائم کرتے ہیں تو لذت ہائے چشم و گوش میں کسی کمی کا احساس نہیں رہتا۔

رنگ، پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام
پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے پیاں کیا کیجئے
کس خواب کو جھوٹے افسوں سے تسکین دل ناداں کیجئے
شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریحِ نظر اب زیست کا درماں کوئی نہیں

اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم مرجاں
جگمگ جگمگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر

یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

ایسے شعراء بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں' جو اچھے نظم نگار بھی ہوں اور اچھے غزل گو بھی۔ فیض کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ جہاں ایک صاحب طرز نظم نگار ہیں وہاں ایک انقلاب آفرین غزل گو بھی ہیں۔ غزل ایک ظالم صنف سخن ہے' غزل کے آداب سے کماحقہ' عہدہ برآ ہونا ہی ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ چہ جائیکہ اس میں کوئی انقلاب پیدا کرنا۔ یہ اعزاز ترقی پسند تحریک کو حاصل ہے کہ اس نے زندگی آمیز موضوعات سے اُردو غزل کو روشناس کرایا۔ مگر ان موضوعات کو فنکارانہ مہارت سے استعمال کرکے غزل کو نظم کے پیرہن پر وسعت نشان بنانا فیض کا کارنامہ ہے۔ نظمیہ رنگ و آہنگ کی غزلیں عام طور پر تغزل سے عاری ہوتی ہیں' جبکہ فیض کی غزلوں کی نمایاں خوبی ہی تغزل ہے۔ فیض داخلیت کے حوالے سے پنجاب کے متوطن ہونے کے باوصف دبستان دہلی کے نمائندے لگتے ہیں۔

خوشا نظارۂ رخسار یار کی ساعت
خوشا قرار دل بے قرار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی تو کس مصرف
خرام ابر سر کوہسار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانی دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

رقیب ہماری شاعری خصوصاً غزل کی روایت کا اہم نمائندہ ہے۔ اساتذہ کے یہاں رقیب کے حوالے سے مضامین میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یعنی یا تو انہوں نے رقیب کا تمسخر اڑایا ہے یا اس کی کردار کشی کی ہے' یا پھر اس کے خلاف شکایت کا لہجہ اختیار کرکے محبوب کو اپنا ہمنوا بنانے کی سعی کی ہے۔ فیض نے رقیب کے کردار کو ایک نئے رخ سے پیش کرکے غزل کے حوالے سے اپنی انقلابی سوچ کا جو مظاہرہ کیا ہے' وہ قابل داد ہے۔ انہوں نے رقیب کو اتنی اہمیت دی ہے کہ عاشق کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ فیض نے رقیب کو اپنے خیالات کا ترجمان بنانے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ نظریات کے ابلاغ میں رقیب کا علامتی کردار غزل کی ایک نئی روایت کی نشاندہی کرتا ہے' جس کا سہرا بلاشبہ فیض کے سر ہے۔

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہمارے خیال میں فیض کی شاعری کی بنیادی خوبی عصری آگہی ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ اپنے عہد کا شعور شاعر کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ فیض کو فیض ان کے عصری شعور نے بنایا ہے۔ وہ اپنے عہد میں سانس لیتے ہیں اور گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و حوادث سے صرف نظر نہیں کرتے۔ عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے۔ اس تناظر میں انہوں نے اپنی شاعری کے کینوس کو جو وسعت دی ہے وہ بلاشبہ ہمہ گیر ہے۔

آ جاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آ جاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آ جاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آ جاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال

اب کوئی طبل بجے گا نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہو گا
اب کوئی جنگ نہ ہو گی، نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہو گا
کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
پیہم خونخوار درندے کی طرح آئے گا
اب کوئی جنگ نہ ہو گی مے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہو گا
ساقیا! رقص کوئی رقص صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگ حنا کی صورت

اگر ایک جملے میں فیض کی شاعری کا احاطہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی شاعری فکر و عمل کی ایک ایسی ڈگر استوار کرتی ہے' جس پر چل کر لوگ انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر عزت نفس، آزادی افکار، بھگوی سے نجات، حب وطن اور اعلیٰ انسانی اقدار کی منازل پر پہنچ سکتے ہیں۔

ہمیں اس موقع پر اہل علم اور صاحبان نقد و نظر سے اتنا کہنا ہے کہ اقبال کے بعد شاعرانہ عظمت کا تاج کسی کے سر پر رکھنے سے پہلے یہ ضرور سوچیں کہ اگر فیض نہ ہوتے تو اُردو شاعری کے ارتقاء میں تعطل پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ اقبال کے بعد شاعری کا کوئی ایسا واضح رجحان سامنے نہیں تھا جسے بیسویں صدی کی نوجوان نسل اپنا آدرش بنا کر مشق سخن کرتی یا اسے اپنی شاعرانہ منزل قرار دیتی، فیض نے اپنے رجحان ساز اسلوب سے ایک صدی کی شعری ریاضت کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔

☆☆☆

زاہدہ جبیں

انسان......فیضؔ کا بنیادی موضوع

فیض احمد فیضؔ کا فن کسی تعارف کا محتاج نہیں فیض...... آبروئے چمن' نثارِ سروسمن' غرورِ دار ورسن' جمالِ درد کا اسم' نغمگی کا طلسم' شب وروز کا گواہ' مزدور کی نوا تھا۔ فیضؔ عوام کا عاشق بھی اور معشوق بھی۔ ہمارا یہ عاشق ہمارے لئے تن و من کی بازی لگاتا رہا۔ ہمارے ہی لبوں کی مہروں کو توڑنے کے لیے ہر حلقہ زنجیر میں زبان رکھے منتظرِ فردا تھا۔ وہ ہمارا تھا اور ہمارے لئے ہی صلیب ودار پہ سجنے کا اہتمام کرتا رہا۔ ہم نے ساتھ نہ دیا' ہم نے ہی گواہیاں دیں اس کے خلاف پر وہ ہماری راہ تکتا اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر گیا۔

فیضؔ نے بڑی شاداب زندگی گزاری' وہ دنیا اور اہلِ دنیا سے کچھ لینے والے نہ تھے بلکہ دینے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے شاعری کو اپنے دور کے دکھ درد سے آشنا کیا۔ اردو کو نیا لہجہ اور نیا آہنگ بخشا۔ ''یادِ ماضی سے غمگین اور دہشتِ فردا سے نڈھال ''لوگوں کو انہوں نے ایک تازہ ولولہ اور جینے کی نئی آس دی۔ سہمے ہوئے لب بستہ انسانوں کو جرأتِ گفتار دی۔ ہر عہد اپنے ایک شاعر کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔

بقول مشتاق احمد یوسفی ''فیضؔ اپنے عہد کی آواز نہیں بلکہ ان کا عہد ان کی آواز بن گیا''

اردو شاعری میں بلکہ سارے اردو ادب میں بہت کم شخصیتوں کو بین الاقوامی سطح پر شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ شاعری میں فیضؔ سے پہلے اقبالؔ نے قومی سرحدیں پار کی ہیں اور ان کا کلام مختلف یورپی اور مشرقی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ فیضؔ نے نظم اور غزل دونوں کو اپنے شاعرانہ تصور کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ کسی تضاد یا بعد کے بجائے دونوں آئینوں میں اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں دکھائیں جو ایک مجموعی نظریہ حیات کی تشکیل کرتی ہیں۔ فیضؔ نے خود اپنی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ن۔ م۔ راشد ''نقشِ فریادی'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''اپنی ابتدائی نظموں میں فیضؔ ایک بورژوا حسن پرست اور انحطاط کا دلدادہ شاعر نظر آتا ہے۔ اس زمانے کی نظمیں ہری ہری' گلابی ملبوں میں لپٹی ہوئی' خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی ہیں۔ زندگی سے ان کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔''

کسی بھی شاعر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اس دور کے سماجی' سیاسی اور معاشرتی حالات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ جدید ذہن جس کی ترجمانی فیضؔ کرتا ہے بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ابھرا۔ یعنی دو عظیم جنگوں کا درمیانی وقفہ جب ایک خلفشار کا درد اور دوسرے کا اندیشہ لوگوں کے حواس پر طاری تھا۔ اور خطرات کی دھوپ سے تلملاتے ہوئے انسان ہلکے سے ہلکے سائے کی طرف لپک رہے تھے۔ اپنی بے چارگی کا احساس اور سہاروں کی جستجو شدید تھی۔ گردو پیش کی غیر یقینی حالت نے پناہ گاہوں کی تلاش پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ پرواماندگی' موجودہ سے ناآسودگی اور آئندہ کے لیے یاس۔ جدید انسان کا ذہنی سرمایہ یہی کچھ تھا۔ دوسری جانب حالات کی کربناکیوں سے نجات کی فکر بھی لاحق تھی۔ کوئی ایسا صحیح نظام اجاگر نہیں ہوا تھا جو سرمایہ داری اور جمہوریت کے نقائص کی تلافی کر سکے۔ مگر کارخانہ قدرت میں سب ممکن ہے۔ نتیجتاً اشتراکیت کا دیو خانہ خالی میں آبیٹھا اور نوجوانوں نے اسے اپنا پیر مان لیا۔ اشتراکیت پسندوں نے نظامِ زندگی میں جنسی ونفسی تسکین کا اہم خانہ خالی رکھا۔ نفس ان کے نزدیک اعصاب سے کوئی مختلف چیز ہے ہی نہیں۔ اس سیاسی پس منظر میں اصل قابلِ لحاظ چیز درد داغ اور جستجو و آرزدگی کی وہ کیفیت ہے جو قلب وروح میں جاگزیں ہوگئی۔ انسان کی شخصیت سالم نہیں رہی۔ محرومیوں اور ناآسودگیوں نے ہر دل محشر آرزو کر دیا۔ ہزاروں تمنائیں سینے میں دبی دبی سسکنے لگیں۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ ذہنوں میں رومان اور انقلاب کا امتزاج تھا۔ شکست خوردہ شعور ایک طرف طاؤس و رباب کی جانب لپک رہا تھا تو دوسری طرف شمشیر و سنان کے تخیل کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلی صورت باعثِ تسکین تھی اور دوسری نجات کے لیے ضروری معلوم ہوتی تھی۔ دل و دماغ میں اور جذبہ وفکر میں کشمکش برپا تھی۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار کی یہ باہم آویزش ہماری نسل کے نمائندہ شاعر فیضؔ کے ہاں بہت نمایاں

ہے۔ ان کے کلام میں رومان وانقلاب کی چاندنی اور دھوپ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔

دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جاں! فقط چند ہی روز

فیض کے تمام کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ فیض کے خیالات' تفکرات موضوعات ایک ہی محور کے گرد گھومتے ہیں اور وہ محور ہے۔ ''انسان۔'' غم جاناں ہو یا غم دوراں' وطن میں جمہوریت کے لیے آواز بلند کریں یا بین الاقوامی سطح پر گردن کا طوق توڑ کر ڈھال بنانے میں افریقہ کا حوصلہ بلند کر رہے ہوں یا ایرانی طلباء کو ظلم کی اندھیری رات میں گلشن بغاوت اگانے کا درس دے رہے ہوں یا فلسطینیوں کے ''دیدہ بینا'' کو وادئ سینا کے نظارے کی دعوت دیتے ہوئے ان کے ''پندار جنوں'' کو اپنے غموں کی چارہ گری کے عزم وعمل کا پیغام دے رہے ہوں ان کا بنیادی موضوع صرف اور صرف انسان ہے۔

فیض کا انسانیت سے پیار جغرافیائی حدود کی پرواہ کیے بغیر تمام عالم کو سیراب کر رہا ہے۔ وہ ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' پر یقین رکھتے ہیں۔ انہیں صرف اپنے گردوپیش اپنے شہر یا اپنے ملک کے واقعات اور بدبختیاں ہی خون کے آنسو نہیں رلاتیں بلکہ ہر ملک اور ہر خطے میں پر جہاں جہاں بھی انہیں ظلم کے سائے بڑھتے نظر آتے ہیں وہ بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں۔ ایران ہو یا افریقہ پاکستان ہو یا امریکہ ان کے لیے سبھی ایک ہیں۔ غیر ملکی واقعات سے متعلق ان کی جو تخلیقات ہیں ان میں بھی اتنا ہی درد اور اثر ہے جتنا اپنے ملک کے حالات پر تبصرے میں وہ استعماری سرمایہ داری اور خاص طور پر مشرقی ممالک کی بے بسی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان ملکوں میں جو جدوجہد جاری ہے اور خاص طور پر جو قربانیاں دی جا رہی ہیں ان کو نہایت درد سے بیان کرتے ہیں:

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس کی ضد پر
ہم نے اس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظیر
جس میں جز صنعت خون سر پا کچھ بھی نہ تھا

اٹھ آئی کہیں سے پھر گھٹا وحشی زمانوں کی
فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانوں کی
قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی
کھلا نیلام ذہنوں کا، لگی بولی زبانوں کی

افریقہ میں آزادی کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والوں اور استعمار پرستوں کے درمیان جو مجادلہ جاری ہے اس سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
''آجاؤ افریقا''
آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
''آجاؤ افریقا''

نظم ''تاریک راہوں میں مارے گئے'' کے متعلق ''زنداں نامہ'' کے دیباچے میں میجر اسحاق جنہوں نے قید و بند کا زیادہ عرصہ فیض صاحب کی رفاقت میں گزارا لکھتے ہیں۔

''اس نظم کی آفاقیت عجیب وغریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ نظم کربلا' پلاسی' سرنگا پٹم' مدکی' جھانسی...... سٹالن گراڈ' ملایا' کینیا...... مراکش بھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اور تہران' کراچی' ڈھاکہ اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد سب ایک ہی جانفزا نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

''ایرانی طلبہ کے نام'' میں ان طلبہ کو خراج تحسین پیش کیا جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے اور ارض عجم سے سوال کرتے ہیں۔

یہ کون جواں ہیں ارض عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارض عجم! اے ارض عجم!
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی'' بے کل چاندی
کس کام آئی' کس ہاتھ لگی؟

فیض کم گو' نفاست پسند اور عالی حوصلہ انسان تھا۔ لفظوں کے جوہری' فکری کمال اور لسانی جمال کے تاجدار' غزل کے بے تاج بادشاہ' فکر میں روایت شکن' لفظوں میں روایت پسند' لفظوں سے ایسی وضعداری نبھائی کہ کاروبار گلشن میں داخل ہوا تو تخلیقی جدتوں سے ہمکنار ہو کر تازہ بستیاں آباد کرنے لگا۔ فیض کے عہد کا نوعمر ذہن اپنی زندگی کو مفہوم دینے کا شدت کے ساتھ آرزو مند تھا۔ انفرادی زندگی کا مفہوم اجتماعی انسانی زندگی کے ساتھ رشتہ استوار کرنے سے پیدا ہوتا

ہے۔ فیض نے انسان کے حوالے سے اپنا معروضی جواز فراہم کیا۔

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

فیض انسان کے ہر روپ سے محبت رکھتے تھے۔ غم جہاں ہو کہ غم یار یا تیر ستم وہ ہر ایک کے واسطے سے فراخ بانہوں کا ہار لئے موجود تھے۔ فیض کی زندگی فن' اخلاق' کردار بھی کچھ ایک شائستہ وضعداری اور شستہ دلداری سے عبارت ہے۔ وہ گرے نہ جھکے' بکے نہ رکے' دل پہ چلنے والی آریوں کی داستان رقم کرتے رہے۔ دوستوں دشمنوں سبھی سے عاشقی کو نبھایا۔

غم جہاں ہو رخ یار ہو کہ دست عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

ان کی زندگی سلوک سے عبارت تھی۔ ان کا کلام بلندی پستی کی آنکھ مچولی سے آزاد ہے۔ ان میں اٹھان ہی اٹھان ہے۔ بلندی ہی بلندی ہے۔ ہمہ وقت اپنی مسکراہٹ کی بارش سے انسانوں کے دلوں پر جمی کدورت کی میل کو دھونے میں مصروف رہے۔ اور دوسروں کو بھی غموں اور نفرتوں کے زہر کو مٹانے کے لیے مسکراہٹ کے تریاق کا مشورہ دیتے رہے اور کہتے رہے کہ جو تلخ راتیں گزر گئی ہیں جو تلخ باتیں بیت چکی ہیں جو حرف بے مروت دلوں کو مکدر کر رہے ہیں انہیں بھلادیں۔ جو وارداتیں انسان پر گزر رہی ہیں۔

کوئی ان کی دھن بنائیں
کوئی ان کا گیت گائیں
چلو پھر سے مسکرائیں
چلو پھر سے مسکرائیں

فیض ایک نظریاتی اصول پسندی اور ایک قسم کی انسانی اخلاقیات کے علمبردار ہیں۔ ایک اور خوبی جو انہیں اپنے ہم خیالوں سے بھی ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ وسیع النظر ہیں۔ ان کی انسانی ہمدردیوں کا جو انداز اشعار میں رونما ہوا ہے وہ مخلصانہ ہے اصلاح کشمکش پر بنیاد نہیں رکھتی بلکہ تعاون پر استوار و پائیدار رہ سکتی ہے۔ انسانی بہبود پیکار سے روبعمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے خلق خدا کے تمام افراد اور طبقات کے درمیان بلاتمیز اخوت و محبت درکار ہے۔

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارہ
غم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونق خاک آشیاں ہے وہی

فیض اعلیٰ درجے کے شیشہ ساز ہیں وہ اپنی تمناؤں کے باوصف خارا شگاف نہیں۔ یہی شیشہ سازی ذرا پگھلے ہوئے انداز میں فیض کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ فیض عشق و محبت کے پرستار تھے مگر انہوں نے اپنے عشق کو حیات کے محروم انسانوں کی طرف منتقل کر دیا جو ان کے محبوب وطن کے غریب انسان تھے وہ بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی دنیا میں حسن خوباں اور عشق خوباں کو ایک ہی حقیقت نہ مانتے تھے۔ وہ خیال طرۂ لیلیٰ کو اپنی زندگی کا محور ماننے کے لیے تیار نہ تھیا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض نے جس انسان کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس کی زندگی کا زائچہ انسان کی آزادی کے ساتھ منسوب کیا۔ اس اعتبار سے فیض انسان کی آزادی کا شاعر ہے اور ایک ایسی دنیا کی معرفت اور دریافت کا خواہشمند ہے جہاں آزادی اپنی بہترین صورتوں کے ساتھ ممکن ہے اور اس طرح جدید انسانی فلسفے کی تائید کرتا ہے۔ فیض نے اپنے عہد کے جس انسان کو دریافت کیا وہ ناموافق اقتصادی حالات سے دوچار ہوتا ہوا انسان تھا۔ اس انسان کے اردگرد بھوک' افلاس اور بیماری کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ فیض کی شاعری جہاں انسانی دکھوں کی نشاندہی کرتی ہے وہاں اس صورتحال سے نکلنے کی صورت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اگر روزگار فراہم کیا جائے اور بھوک سے جو امراض پیدا ہوئے ہوں ان کا علاج مہیا کیا جائے تو شاید انسان کا دکھ دور کیا جا سکے۔ فیض کے شعری فلسفے اس اعتبار سے ماحول اور مظلوم انسان کے باہمی رشتہ میں مرکزی اہمیت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماحول کے ایسے تصور میں برصغیر اور برطانوی استعمار کو حوالے کے طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔ بھوک بیماری اور افلاس انسان کے ابتدائی مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

کیوں داد غم ہمیں نے طلب کی برا کیا
ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لا دوا نہ تھے

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پس قتل عام ہوتی رہی
جو کچھ بھی بن نہ پڑا فیض لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

جب ہر طرف دکھ درد اور فریب کا راجہ ہولی کھیل رہا ہو۔ جہل و جعل کا بازار گرم ہو' اولاد آدم بھوک سے بلک رہی ہو آزادی و انصاف کے خزانوں پہ کالے ناگ پھن پھیلائے ناچ رہے ہوں ناتوانی اور غربت جرم بن جائیں اور دولت و اقتدار قہر خداوندی بن کر افلاس کے گھروندوں میں تاخت کی ہولی کھیل رہے ہوں ایسے میں ہوشمند شاعر اور باضمیر انسان کیونکر خیالی پیکروں کے چرنوں میں بیٹھ کر زلفوں کی درازی کی دعائیں مانگ سکتا ہے۔ اسے

اصلی محبوبوں سے بھی رخصت لینا پڑتی ہے۔اور۔

مگر کیا کریں اپنی راہیں جدا ہیں

کہہ کر معذرت کرنا پڑتی ہے فیضؔ کے ہونٹوں سے وہی بانسری لگی ہوئی ہے جو کوئے محبوب میں ان کے ساتھ تھی اور ان کی لے بھی وہی ہے مگر نغمے بدل گئے ہیں اور وہ اس بانسری پر پیار کے نہیں انقلاب کے گیت گاتے ہیں۔ یہ بانسری ان کے خزینۂ شعری کی متاع بے بہا ہے اور فیضؔ اس بانسری پر۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

کا نغمہ گنگنانے لگے کیونکہ زندگی لب و رخسار کی جنت نہیں کچھ اور بھی ہے۔ انسانی شخصیت میں اس قدر رکھاؤ پیدا ہوئے کہ تکمیل عشق سے طمانیت حاصل نہیں ہوتی۔ اپنی ذات میں پیمبروہی کا منصب ادا کرنا پڑتا ہے۔ فیضؔ نے عشق کو تکمیل شخصیت کا جزو قرار دیا۔

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں

ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

بقول ڈاکٹر عبدالغنی ''فیضؔ کے ہاں الجھا ہوا سہی' انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف ایک ارتقاء ہے۔ غمِ ذات بڑھ کر غمِ کائنات ہوا چاہتا ہے۔ فیضؔ کسی نظریہ حیات کے حامل ہوں ان کی اجتماعی بصیرت اور احساسِ ذمہ داری قابل تحسین ہے۔''

فیضؔ اس صبح کی تلاش میں تھا جو وطن میں ہریالی اگا دے' پھول کھلا دے۔ آزادی' انصاف' صداقت کے چہرے چمکا دے۔ افلاس اور جہالت کا راستہ کھوٹا ہو۔ ہر طرف خوشحالی ہو ہر لحاظ سے وہ ایک بہت بڑے آئیڈیلسٹ تھے جو انہونی کو ہونی بنانے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ بوکھلائے' جھنجھلائے نہیں بلکہ دھیمے دھیمے انداز میں اس سویرے کی راہ تکتے رہے جو کہیں بھی نہیں آیا اور شاید کبھی نہ آئے لیکن فیضؔ اس سحر کا پتہ لینے کے لیے جنگ آزما ہیں جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل۔

دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل

یہ کڑی رات بھی یہ سائے بھی، تنہائی بھی

درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار

جس میں گرمی بھی ہے حرکت بھی توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر

منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے

خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے

دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے

فیضؔ انسانوں کی اجتماعی جدوجہد کو زندگی اور فن کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ دستِ صبا کے ابتدائیہ میں فرماتے ہیں۔

''حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت' زندگی کا ہی تقاضا نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔''

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے

مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارہ اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا

بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

فیضؔ کی شاعری نہ تو خون کے دریا بہاتی ہے اور نہ ہی توپوں سے ہولناک شعلے اگلواتی ہے۔ بلکہ نئی زندگی اور نئے نظام کی بشارت نہایت دھیمی لے میں دیتی ہے۔ جس میں ایک رچی ہوئی دردمندی اور کانٹے میں تلے ہوئے خلوص کا گداز ہے۔

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی

دوکانیں خالی ہوتی ہیں

یاں پربت پربت ہیرے ہیں

یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر

پردے لٹکاتے پھرتے ہیں

ہر پربت کو ہر ساگر کو

نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

فیضؔ فلسفے کی اس نگری تک بنیادی قدر حیات انسان دوستی کے ذریعے پہنچے۔ اگر ان کو انسان سے اٹوٹ محبت نہ ہوتی تو وہ ایک مشہور رومانی شاعر کی زندگی جی کر ایک معروف روایتی شاعر کی موت مر جاتے۔ مگر وہ انسانی محبت کی بے بادبان کشتی میں بیٹھ کر ظلم کے جوار بھاٹوں میں اتر گئے۔ اس بحرِ ظلمات میں جبر کے گھوڑے اور بھوکی فوجیں رات کو ہی نبرد آزما تھیں۔ فیضؔ ظلم و تعدی کے آسمان سے ستارے نوچ کر بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی انسانیت کے قدموں میں ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ استحصال کے چاند ستاروں کو کوٹ پیس کر نوالوں میں ڈھال کر اولادِ آدم کی تشنہ لبی اور شکم گرسنگی کے آنسو پونچھنا چاہتے تھے۔ وہ پسِ دیوارِ زنداں رہے مگر وطن کے لیے روشنیوں کے خواب دیکھتے رہے۔ وہ اپنے آنسو کے تیشے سے کوہکنی کا کام لینا چاہتے تھے۔ نظم ''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'' میں فرماتے ہیں۔

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی تیرے حسن کی

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم

اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم

مختصر کر چلے درد کے فاصلے

کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم

جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیضؔ کو محبوب کا دلکش حسن اب بھی محبت کے ان لطیف جذبوں میں ڈوب جانے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کا غم غم دہر کے جھگڑے مٹا دیتا ہے۔ جس کی صورت سے عالم میں بہاروں کو ثبات ہے جس کا حصول تقدیر کو نگوں کر دے لیکن ان کی نظر جا بجا بازار میں بکتے ہوئے اور خاک و خوں میں لتھڑے ہوئے جسموں کی طرف لوٹ جاتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ۔

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

فیضؔ کے اپنے زخم اور دکھ تو کچھ اتنے زیادہ نہ تھے جیل' جلاوطنی اور جہالت نے قدم قدم پر جوان کا ساتھ دیا تو یہ کوئی عجیب اور انہونی بات نہیں ۔ سر' سرداروں کے ہی کٹتے ہیں۔ فیضؔ زخم کھاتے رہے مسکراتے رہے اور سلواتے رہے تاکہ قاتل کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔ لیکن پھر انہوں نے اپنی نامرادی اور ناشادی کو بھلا کر اپنی رام کہانی یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ ''میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں'' انہیں اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہو گیا کہ ان کی زندگی کا مقصد صرف اپنی ذات کی کامیابی سے وابستہ نہیں ہے بلکہ انہیں دنیا کے غموں کا چارا کرنا ہے۔ پاپ کے پھندے اور ظلم کے بندھن کاٹنے کے لیے انہیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے سوچا'' کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں''

غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا
کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں

بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

فیضؔ امراء کی دولت کی تقسیم چاہتے تھے تاکہ غریبوں کے دکھوں کا کچھ مداوا ہو سکے۔

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

فیضؔ کی محبت اور انسان دوستی نے اردو شاعری کے روایتی رقیب روسیاہ کے گلے میں گویا باہیں ڈال دی ہیں پھر اس سے دوستانہ سرگوشیوں میں محبوب سے وابستگی کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''رقیب سے'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کس طرح عشق کو معلم بنا کر عاجزی و دردمندی کا درس لیا۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرماں کے، دکھ درد کے، معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے

فیضؔ ہمارے ایسے شاعروں میں سے ہیں جنہیں زندگی اور اس کے شیوۂ حسن سے محبت ہے۔ اور اسی محبت کی وجہ سے ان کا اور زندگی کا جھگڑا ابھی چلا آتا ہے۔ بقول آل احمد سرور

''فیضؔ کو آتش خانوں میں مقدس آنچ ملی مگر اس نے انہیں جھلسایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو تب و تاب عطا کی۔ فیضؔ نے اپنی چنگاری پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے ہوائے رہگذر سے دہکایا اور اس سے شمع کا کام لیا ہے۔''

فیضؔ نے زندگی کو پہچانا۔ اس کے ارتقاء اور انسانیت پر ایمان لائے ایک بہتر زندگی کے جہاد میں تن من دھن سے حصہ لیا اور اپنے خوابوں کی خاطر تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوئے 'حسن کے اداشناس ہوئے تب کہیں جا کر ان کے کلام میں نغمگی پیدا ہوئی۔ ایک ایسی نغمگی جس کی لے میں تمام انسانیت کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ زنداں کی تاریکیوں میں فیضؔ نے انسانیت تہذیب اور حسن و عشق کی شمع روشن رکھی۔ دوری نے زندگی کی حسین نعمتوں' لطیف یادوں' پر کیف لذتوں کو دھندلا اور گلزور نہیں کیا۔ انہیں خواب و خیال کا ہالہ دے کر حسین اور دلآویز بنا دیا۔ ''اے روشنیوں کے شہر'' میں زنداں کے کہر کی دیوار فیضؔ کو یوں اکساتی ہے ۔

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو

یہ زنداں نصیب شاعر وفن کار قفس کے جھروکوں سے وطن کی بدنصیب گلیوں میں لاچارگیوں کو بال کھولے روتا دیکھتا تو اس کے دل کا لہو لفظوں میں پگھل پگھل کر آنسوؤں میں ڈھلتا اور اس آگ کو وہ شعر کی کٹھالی میں سونا بناتا۔ اس کی تپش کو جھونکا بنا کر جھلتی انسانیت کی دکھتی آنکھوں کے لئے مرہم کے طور پر بھیج دیتا ہے۔

فیضؔ انسان کو مایوسی اور ناکامی سے دلبرداشتہ نہیں کرتے بلکہ ان کے ہاں یقین کی ایک سرشاری موجود ہے۔ اگر وہ ایک فرد کے ذاتی دکھوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو مایوسی کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ لیکن فیضؔ نے اپنی محبت کی ناکامی کو زمانے کی ناکامی کے ساتھ دیکھا تو انہیں اپنا غم انتہائی حقیر لگا۔ فرماتے ہیں

''ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں' کدورتوں' مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی محدود اور حقیر شے ہے اس کی وسعت اور

پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں خاص طور پر انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔''

فیض کی شاعری اور زندگی دونوں انسانیت کی دشمن قوتوں کے خلاف ایک پرعزم اور باحوصلہ جنگ اور جدوجہد ہے۔ فیض نے یہ جنگ اس عزم اور ایقان کے ساتھ لڑی کہ بالآخر ایک دن انسانیت کش طاقتوں کو ناکام و نامراد ہونا ہے۔ وہ طبقاتی تقسیم ہو یا رنگ و نسل کے امتیازات' آمروں کے ہاتھوں انسانی لہو اور شرف آدمیت کی پامالی ہو یا امن عالم کو لاحق جنگ اور تباہی کے خطرات فیض کی شاعری ان تمام قوتوں کے خلاف آبرومندانہ نبردآزمائی کا عہد کرتی ہے۔ فیض فرماتے ہیں۔

''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی ہے آئندہ بھی کبھی شکست سے ہمکنار نہیں ہوگی''

جسم پر قید ہے جذبات پر زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پر تعزیریں ہیں
لیکن فوراً تسلی دیتے ہیں۔
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیض کی شاعری معاشی و معاشرتی حقائق کی تلخیوں کو برداشت کرنے اور لوگوں کے ساتھ کیے گئے وعدوں کو نبھانے کی شاعری ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ اور غیر انسانی رویوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور لوگوں کو جبر سے نجات کا یقین دلاتا ہے۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

فیض انسانوں کو بے بسی سے مرتے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کے نزدیک اپنے آپ کو قاتل کے سپرد کر دینا مردانگی نہیں ہے۔ نہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ظالم کے آگے سرنگوں ہو کر گزر کرو تو شاید اسے رحم آ جائے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ترس نہیں کھائے گا۔ مظلوم کی چیخ و پکار اور آہ و بکا ظالم کا حوصلہ بلند کرتی ہے۔ فیض ظلم سہنے کو ظالم کی حمایت سمجھتے ہیں اور خاموشی کو ظالم کی پشت پناہی قرار دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس عالم کے ہر خطہ کا انسان آزاد' باوقار اور پرسکون زندگی گزارے اور جب کوئی طاقت اس کے حقوق کو پامال کرے تو اس کے خلاف آواز بلند کرے۔

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
گر تن نہیں زباں سہی آزاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

فیض ایسی امید آفرینی سے کام نہیں لیتے جس کا انجام انسانیت کی شکست ہو۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ بڑا کٹھن سفر ہے لیکن فیض کو اس میں اجالوں کی کرنیں نظر آتی ہیں۔

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے

بقول سبط حسن ''غم زمانہ سے ان کا گہرا لگاؤ ان کی انسان دوستی اور حب وطن ان کی انقلاب پسندی اور آرزومندی سب دردِ عشق کے استعارے ہیں''

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

فیض کی اعلیٰ شاعری کے موضوع میں انسان اور حکمران دو قوتیں بخوبی دکھائی دیتی ہیں۔ تیسری دنیا میں انسان کی آزادی کا تصور مشروط ہو چکا تھا۔ ظالم قوتیں انسانیت کو فنا کرنے پر آمادہ ہو چکی تھیں۔ جب طاغوتی قوتیں آنکھوں کو تہ تیغ کر دیتی ہیں اور خوابوں کا گلا گھونٹ دیتی ہیں تو فصل گل غرور کے انگارے لے کر آتی ہے اور برسات میں گہر برسنے کے بجائے خس و خار کے انبار سے اٹا ابر برستا ہے۔ فقیہان حرم دست صنم چومتے ہیں اور صدق و صفا کا در فرش پر بند ہو جاتا ہے تو عرش پر باب دعا پر قفل پڑ جاتا ہے۔ لیکن فیض جب ظالم کے حد سے بڑھتے ظلم کو دیکھتے ہیں تو خدا سے سوال کرتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم تیرے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟
پھر دکھوں سے کراہتی انسانیت کے لیے
آخر کار خدا ہی کا سہارا لیتے ہیں۔
جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی راہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

فیض کی شاعری کا بڑا وصف یہ ہے کہ انہوں نے قوم پر ہر دور ابتلاء میں سب باتیں اور واردتیں اپنی گرفت میں لے لی ہیں۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

اپنی محبتوں اور الزام تراشیوں کے باب میں فیض کے ذاتی اور شعری لہجہ میں اس ادا کی ہمیشہ ہی بہتات رہی ہے۔ سامراج کے چنگل میں پھنسے ہوئے تیسری دنیا کے مظلوموں کا نوحہ فیض نے بے حد درد مندی سے بیان کیا ہے۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
کسی کو بہر سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی، نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا

''یہاں سے شہر کو دیکھو'' میں بھی یہی رونا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہار گل میں جو پہنچے ہیں شاخ گل کو گزند

فیض انسان دوستی کے اس پس منظر کا حوالہ بھی دیتے ہیں جہاں غریبوں اور زیردستوں کی وہ ٹکسال جہاں سامراجی ٹکسالیوں کے ردعمل سے یہ کھوٹے سکے ڈھالے جاتے ہیں جو دراصل فیض کے موضوعات تغیر وانقلاب کی محرک ہے۔ فیض کا کہنا ہے کہ صرف وہی ادیب اور شاعر زبان اور قلم سے غریبی اور بالادستی پھیلانے والوں کے خلاف قلمی جہاد کرتے ہیں جو انسانیت سے محبت کرتے ہوں۔

فیض کی انسان دوستی میں بین الاقوامی سطح پر سامراجی قوتوں اور ان کے حواریوں کی ان سازشوں کا دکھ اور شعور بھی شامل ہے۔ جن کے تحت شہری آزادی پر مسلح پہرہ داری مسلط کر دی جاتی ہے۔ جمہوریت اور جمہوری اداروں کا قتل عام ہوتا ہے۔ تحریر، تقریر اور آزاد سفر کی راہوں میں خاردار باڑیں کھینچ دی جاتیں ہیں۔

فیض نے تمام انسانیت کے دکھ کو اپنا کر اپنی ذات کو گم کر دیا۔ فیض کے کلام میں اکثر ''ہم'' کی ضمیر کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ فیض کا اجتماعی شعور ہے جو جدلیاتی فلسفے کی تہذیب سے آیا۔ Rem De Gourmont نے کہا تھا۔

''ایک مخلص انسان کی جدوجہد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی تاثرات کو آفاقی اصولوں میں ڈھال دے''

فیض پر یہ بات صادق آتی ہے۔

سو پیکاں تھے پیوست گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
او وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

بقول حرمت الاکرام ''فیض کی شاعری میں ایک نوع کا باطنی پھیلاؤ ہے جس کی حدیں دور تک پہنچتی ہیں اور جہاں انہیں اجنبی صورتیں بھی محروم دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ان کے جذبہ یگانگت...... اور ابھرنے والی انسانی اخوت کی دلیل ہے''

فیض صاحب اپنی جان کی قربانی دینے کو انقلاب کی خشت اول قرار دیتے ہیں۔ وہ بھڑک اٹھنے' بڑک مارنے والے بھبکے باز نہ تھے۔ وہ خلوص کی مرہم بنا کر لاچار انسانوں کے زخم پر رکھتے ہیں۔ غالب کی طرح فریادی نقوشِ انسانی کو کاغذی پیراہن پہنا کر ذوقِ قدح سے بزم چراغاں کرنے کا سامان کرتے رہے۔

بقول ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ''ان کی فکر ان کے مطالعے مشاہدے اور گہرے احساس کے بطن سے جنم لینے والے بین الاقوامی انسانی شعور کی لطافتوں کی آئینہ دار ہے''

فیض کی فکر انسانی محبت اور فرزند آدم کے درد مشترک کا مرثیہ' نوحہ' بین' ماتم اور مرہم ہے۔ اکثر انقلاب نفرت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں لیکن فیض کے انقلاب کے چاروں اطراف محبت و آشتی کی بوندیں ترنم ریز نظر آتی ہیں۔ وہ بے بس اور لاچار انسانوں کو زندہ رہنے اور سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ دیتے رہے۔ وہ تو ان لوگوں کے لیے روتے رہے جن کو گردش حالات نے رونے کی فرصت دی نہ رونے کا سلیقہ سکھایا۔

رونے والوں سے کہو ان کا بھی رونا رو لیں
جن کو گردش حالات نے رونے نہ دیا

فیض انسانی محبتوں کے غم کو بہت بیش قیمت گردانتے ہیں۔ اور ناامیدی کے نزدیک بھی جانے سے کتراتے ہیں۔ شورش گیتی میں قرینہ گم ہونے پر وہ پکارتے ہیں۔

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا
کھو گیا شورش گیتی میں قرینہ اپنا

انہیں یقین تھا کہ درد تھم جائے گا رات ڈھل جائے گی اسی لیے مشورہ دیتے ہیں کہ ''غم نہ کر غم نہ کر''

اب کبھی شام بجھے اگر نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

وہ عزم ہمت رکھنے والے انسان ہیں جنہوں نے جگر میں ٹوٹنے تیروں کا تیشہ بنالیا۔

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا

فیض مارشل لاء میں عوام کا استحصال سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی حکومت عوام کے لیے چاہتے تھے۔ نظم ''نثار میں تیری گلیوں کے'' میں فرماتے ہیں۔

بنے ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

لیکن وہ زندگی کے مصائب، زنداں کی تنہائیوں اور عقوبت خانوں کے آلام سے بالکل نہیں گھبرائے۔ اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ فرماتے

ہیں۔

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

فیض کی شاعری ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں جا کر کسانوں اور مزدوروں کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہی ہیں۔ فیض نے اپنے کلام کے ذریعے کلرکوں' وکیلوں' ٹیچروں' طالبعلموں' گاموں ماجھوں کے دکھ میں شمولیت اختیار کی ہے۔ ''سرِ وادیِ سینا'' کا ''انتساب'' اس کا ثبوت ہے۔

پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں' والیِ ماسوا' نائب اللہ فی الارض دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

فیض کو انسانیت کی توہین کسی طور گوارا نہ تھی۔ منافقت سے دامن بچا کر مظلوم کے حق میں آواز بلند کرتے ہوئے وہ ظلم کے جاہ و منصب اور حشم سے بالکل نہ گھبرائے۔

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، خم کا، مے کا، پیمانے کا نام

فیض شخصی آزادی کے قائل ہیں۔ وہ جب قوم پر جبر و استبداد کی فضا مسلط دیکھتے ہیں تو انہیں یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ بادہ گساروں کو سکوں میسر کیوں نہیں ہے۔ وطن کے جانثاروں کو کہیں اماں نہیں۔ دلفگاروں پہ قاتل کو پیار کیوں نہیں آتا۔ ''یہاں سے شہر کو دیکھو'' میں کچھ یہی صورتحال ہے۔

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش

جو کوئی تیز چلے راہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی
جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی؟

''ادھر نہ دیکھو'' میں بھی فیض نے صاحب دستار اور صاحب قلم کی قسمت کا رونا رویا ہے اور حق کی راہ میں دار چڑھنے والوں کی عظمت کو سلام کیا ہے۔

فیض امن کے امین اور علمبردار ہیں۔ امن ایوارڈ ملنے پر انہوں نے جو تقریر ماسکو میں کی اس میں بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو۔ اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیرِ کائنات کو چلو۔''

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

کوئی طاقت نہیں اس میں زور آزما
کوئی بیڑا نہیں ہے کسی ملک کا
اس کی تہہ میں کوئی آبدوزیں نہیں
کوئی راکٹ نہیں کوئی توپیں نہیں
یوں تو سارے عناصر ہیں یاں زور میں
امن کتنا ہے اس بحرِ پرشور میں

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی متفکر ہیں کہ۔

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

اور کبھی اعلان کرتے ہیں۔

''اب کوئی جنگ نہیں ہو گی مئے و ساغر لاؤ''

فیض کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جس میں سارے جہاں کا درد بھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سامراجیت کے خلاف اور غریبوں' بے کسوں' مزدوروں اور فاقہ مستوں کی ہمدردی میں جو جذبات ادا کیے گئے ہیں وہ فیض کے سوزشِ دروں کی غمازی کرتے ہیں۔

جب کبھی بیٹھ کر روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض انسانی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ ''تیرا سرمایہ' تری آس یہی ہاتھ تو ہیں'' میں بھی انسان کو جہدِ مسلسل کے ذریعے نجات کا راستہ دکھایا ہے۔ فیض کے کلام میں زندگی کا سمندر لہریں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سمندر میں غربت و فلاکت کے عفریت بھی ہیں اور ظلم کی طاغوتی قوتیں بھی' حسن و جمال کی رعنائیاں بھی ہیں اور عشق و محبت کی جنوں سامانیاں بھی، غلامی و محکومی کی زنجیریں بھی ہیں اور آزادی و حریت کی شمشیریں بھی۔ غلام انسان کا تن' من' دھن' زبان کچھ اپنا نہیں ہوتا وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے لیکن فیض مظلوم کو جرأتِ اظہار دیتے ہیں۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

پھر فرماتے ہیں

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روز آنہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی؟ اجداد پہ کیا گزری ہے

مرنے کی حسرت میں جینے والی مخلوق پریوں نوحہ کناں ہیں۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

فیض جگر دریدہ' الم رسیدہ' داماں تر' زباں بریدہ' زخم گلو' شکستہ پا' ملال سفر اور مسافر رہ صحرائے ظلمت شب کو 'امید سحر کی بات سنو' کہہ کر حوصلہ دلاتے ہیں

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

لاکھ ظلم و ستم ہوں' لاکھ جبر و استبداد کیے جائیں طاغوتی قوتیں لاکھ چاہیں کہ گلستان حریت، سرسبز و شاداب نہ ہو۔ وہ جذبات کو لاکھ پابند کرنا چاہیں لیکن بے پناہ قوت کے باوجود بالآخر انہیں اپنی شکست تسلیم کرنا پڑے گی۔

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

فیض آہستہ آہستہ شعوری یا غیر شعوری طور پر نغمات حریت اور وطنیت میں سوز دروں شامل کر کے درد و تپش پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں امید' عزم اور استقلال کی بہتات ہے غم ہے مگر حوصلے کے ساتھ' سوز ہے مگر آتش دل کی گرمی کے ساتھ۔ وطن کی محبت میں کرب ہے مگر توانائی کے ساتھ۔

فیض عوام کا دکھ اپنا کر عوام دوست بنے۔ وہ جانتے ہیں نغمہ جراح نہیں، مونس و غمخوار بے شک ہو۔ گیت آزار کا مرہم تو ہیں لیکن نشتر نہیں۔

محمد علی صدیقی کا کہنا ہے کہ" فیض احمد فیض کی شاعری اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ جدید اردو شاعری کے ان بانیوں میں سے ہیں جنہوں نے شاعری کی دیوی کا پجاری بننے کی بجائے اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔"

فیض اپنے فلسفہ و فکر پر تادم آخر قائم رہے۔ کوئی قہر کوئی مہر ان کا راستہ نہ بدل سکا۔ وہ لوہار کا ہتھوڑا رکھنے والے سنار تھے۔ وہ رکے تو کوہ گراں بنے چلے تو جاں سے گزر گئے لیکن کوچہ یار کو یادگار بنا گئے۔ اپنے قتل نامے کے سر محضر لگی مہروں کو دیکھ گئے۔ جان ہار کر بازی جیت گئے۔ اور اپنے چارہ گروں کو نوید دے گئے' قرض حیات چکانے کی خبر صف دشمناں تک پہنچا گئے۔

میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض کے مرنے پر چیتھڑوں میں لپٹے بدن اور زخموں میں نہائے زخم پکار اٹھتے ہیں کہ فیض ہمارا تھا فیض ہمارا ہے اور رہے گا۔ فیض کے مرنے سے غریبوں کی دنیا اجڑ گئی۔ ادب تہذیب اور ثقافت کی گود خالی ہو گئی۔ شاعری بے نور ہو گئی۔ بے نواؤں اور بے رداؤں کے سروں پر سے شفقت و مروت کی چھت ہٹ گئی۔ فیض کی عظمت کا اقرار قرۃ العین حیدر کے ان جملوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

"فیض صاحب کی شاعری کبھی کملا نہیں سکتی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آج فلسطین ایران و الجیریا کا شاعر پہچان سکتا ہے۔"

فیض محض اس صدی کا شاعر ہی نہیں آنے والے دور کا شاعر بھی ہے اس لیے کہ وہ دکھی انسانیت کا شاعر ہے۔ احتجاجی لب و لہجے کا شاعر ہے نرم اور گداز لطافتوں کا شاعر ہے۔ محبتوں اور چاہتوں کا شاعر ہے۔ شعور حیات و کائنات کے ساتھ ساتھ شعور ذات کا شاعر ہے۔ اُن جیسے شاعر مادر گیتی روز روز جنم نہیں دیتی۔ ایسے انسانوں کے لیے تاریخ کو مدتوں منتظر رہنا پڑتا ہے۔ زندگی سالہا سال دیر و حرم کا طواف کرتی ہے۔ فیض نے خود بھی چیلنج کیا ہے۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے، کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

محمد اعجاز خاور

فیضؔ اور خدا شناسی

فیض احمد فیضؔ عصرِ حاضر کے شعراء میں اپنے مخصوص لہجے اور جداگانہ اندازِ فکر کی وجہ سے ایک ایسا مقام رکھتے ہیں جس تک پہنچنے کے لیے تہذیبی شعور کو اپنے معروضی حالات سے ہم آہنگ کر کے روایات کے شکنجے میں جکڑی انسانیت کے شب و روز کا نوحہ لکھنا پڑتا ہے۔ انسانی معاشرت کے حزن و ملال اور دکھوں کی تصویر کشی کرتے کرتے فیضؔ صاحب پر لادینیت کی جو چھاپ لگی اس کی تردید یا تصحیح کرنا فیضؔ صاحب نے شاید اپنے قلندرانہ مزاج کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا افواہ اور فتویٰ بازی کی فیکٹریاں ہمارے گرد و پیش میں جس حساب سے پروپیگنڈہ جاری رکھے ہوئے ہیں اتنی شدت سے اس کا جواب دینے کا عمل سُست روی کا شکار ہے اور پھر مثبت سوچ رکھنے والے ہمیشہ کردار کشی اور تنقیص سے بے نیاز رہے ہیں اس لیے اپنے کام سے کام رکھنے کے عمل نے کئی ایک ابہامات کو در آنے کا راستہ دیا ہے۔

اسی مخصوص تناظر میں جب ہم غور کریں تو عام انسان کی زندگی میں تبدیلی لانے کا خواب دیکھنے والے فیضؔ کا صرف اتنا جرم ناقابلِ معافی بن گیا کہ اُسے اپنی مٹی سے غیر مشروط اور سچا پیار تھا "پنڈی سازش کیس" ہماری سیاسی و قومی تاریخ میں ایسا بدنما داغ ہے جس نے تمام خوبصورت مناظر میں کلفت اور بدمزگی کا احساس شامل کر دیا۔ پنڈی سازش کیس کی تفصیلات میں گئے بغیر اتنا کہنا کافی ہے کہ "سازشی" اس آزاد ارضِ وطن میں "جاگیرداروں" کی ہوسِ زر اور اقتدار پرستی سے کبیدہ خاطر تھے طبیعت پر بوجھ کے اس احساس کے زیرِ اثر آپس میں مل بیٹھ کر "کڑھتے" تھے۔ حکمرانوں کی بے اعتدالیوں کے باوجود اُن کا تختہ نہ اُلٹنے کا ارادہ رکھنے والے دھرتی کے یہ بیٹے انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی نظر میں اس لیے کانٹا بن گئے کہ وہ اپنی شناخت اور پہچان پر کوئی سودا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو انگریز جنرل گریسی نے جاتے سے ایک "ینگ ترک پارٹی" کی نشاندہی کی تھی اور اُن پر نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ یہی "ہدایت" درحقیقت سامراجیت کا ایجنڈا ہے جس کی بنیاد پر یہ سازش کیس بنا اور یہیں اُس رویے نے جنم لیا کہ سیاست ایک "گناہ کبیرہ" ہے اس میں دخل دینے والا "بدکار" ہے حالانکہ پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے سوچنا کونسا جرم ہے جب کہ حقیقی سیاست تو یہی ہے لیکن ہمارے دیس میں "پاپ کا گڑھا" بھی یہی بنا دی گئی ہے۔ اس کیس کے بارے میں فیضؔ صاحب کا یہ شعر مکمل ترجمانی کرتا ہے اور "استغاثے" کا منہ چڑانے کے لیے کافی ہے:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

اس مقدمے کی سماعت کے دوران حکومتی کار پردازوں اور روایتی فتویٰ فروشوں نے فیضؔ صاحب کی انسان دوستی کو جرم بنانے کے لیے اُنھیں دہریت اور کیمونزم کی تنگنائے میں دھکیل کر "قابلِ نفرت" بنانے کی سرتوڑ کوششیں کیں اور کیسا شرمناک تضاد ہے کہ فیضؔ صاحب کو لینن امن ایوارڈ دینے والا روس کافر اور اسلام دشمن ٹھہرا اور کیمونسٹ چین ہمارا بھائی اور مربی۔ بہرحال فتح محمد ملک اپنی کتاب "فیضؔ؛ شاعری اور سیاست" میں لکھتے ہیں کہ "درحقیقت فیضؔ بھی مولانا حسرت موہانی کے انداز کے اشتراکی تھے؛ نہ تو اُن کی اشتراکیت کا دہریت سے کوئی علاقہ تھا نہ روایت شکنی سے کوئی نسبت؛ اور نہ ہی اپنی اسلامی شناخت سے حجاب۔ اپنی منفرد دینی شناخت سے ہی فیضؔ "اصلی کامریڈ" کا مقام پا سکے تھے۔ ایک ایسے اشتراکی کا مقام جس کا ذاتی نصب العین درویشی تھا تو اجتماعی مسلک انقلاب......"

فیضؔ صاحب کی کتاب "زنداں نامہ" میں میجر اسحاق اپنی "روداد قفس" میں فیضؔ صاحب کے قید و بند کے شب و روز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "حیدر آباد جیل میں اُن کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا" کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب' کشف المحجوب' احیاء العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے' کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے اور کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔"

ادب لطیف کے فیض نمبر میں خالد حسن لکھتے ہیں ''اس دینی مسلک سے محبت فیض کو بھی اُسی بارگاہ سے عطا ہوئی جس سے فیضیاب ہونے پر اقبال کو ہمیشہ ناز رہا۔ سید میر حسن اور اُن کے معاصر علمائے سیالکوٹ سے تلمذ پر فیض عمر بھر نازاں رہے اور انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس دینی فیضان کا ذکر بڑی محبت کے ساتھ کیا ہے۔'' خالد حسن کا کہنا ہے کہ ''فیض نے بچپن میں آدھے سے زیادہ قرآن حفظ کر لیا تھا۔'' فیض صاحب کی بڑی بہن بی بی گل کے بقول ''حفظ کا یہ سلسلہ فیض صاحب کی آنکھوں کے دُکھنے کی وجہ سے موقوف ہو گیا تھا مگر گھر کا مذہبی ماحول اور افغانستان سے آتے سے ہمراہ آنے والی افغان خاتون سردار جان جو کہ گھرداری کی نگران تھیں۔ وہ عربی اور فارسی خوب جانتی تھیں!! فیض صاحب کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں دخیل رہیں۔'' فیض صاحب کی شخصیت سازی اور علمی خزانوں تک دسترس میں ان کی عربی اور فارسی دانی کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ فیض صاحب ایک خود آگاہ انسان تھے۔ اُن کی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ فیض صاحب' ابراہیم ادھم کے مسلک سے تعلق رکھنے والے مجذوب تھے مگر اُن کی جذب کی کیفیت بے خودی کی نہیں تھی بلکہ خود شناسی اور خود آگاہی پر مبنی تھی پھر یہ کہ وہ باشرع نہیں تھے اس لیے شاید انہیں اقبال کے مردِ مومن کا درجہ نہ دیا جا سکے مگر اس کے باوجود وہ بہرحال ان اوصافِ حمیدہ سے متصف تھے جو انہیں ایک مذہب شناس ثابت کرتی ہیں اس لیے اُن کے معاشرتی برتاؤ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نکتے سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی تناظر میں اُن کے ہم عصروں کی آراء اور اُن کا اپنا نقطۂ نظر دیکھتے ہیں کہ دہریت کا الزام پانے والا کس قدر خدا شناس تھا۔

فیض احمد فیض اور میر رسول بخش تالپور

فیض صاحب نے اپنی شریکِ حیات کو ایک خط میں لکھا ''خیر ان تفریحات سے ہمیں جتنی دلچسپی ہے تمہیں معلوم ہے اگرچہ ہم بھی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ صرف میں اور تم جانتے ہیں کہ دراصل ہم کچھ INHIBITED صوفی قسم کی چیز ہیں لیکن عام لوگوں سے یہ بات چھپائے رکھتے ہیں تاکہ شاعرانہ شہرت پر حرف نہ آئے۔'' فیض کی شاعرانہ شہرت چاہے کچھ بھی ہو اور اُن کا نظریۂ شعر بے شک عہدِ حاضر کی آب و باد و خاک میں پروان چڑھا ہو مگر پھوٹا تو مسلمانوں کی شعری روایت سے ہی ہے۔ سوویت یونین میں فرصت اور یکسوئی کے لمحات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''شعر لکھنے کے لیے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور دوری' ربط اور علیحدگی' فکر اور سرخوشی INVOLVMENT اور DETACHMENT دونوں ضروری ہیں اور وہ کیفیت بھی جسے صوفیا کی اصطلاح میں ''انشراحِ قلب'' کہتے ہیں جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اور حسنِ عالم کے درمیان ''غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا''...... ہماری علاقائی شعری روایت پر گفتگو کے دوران فیض صاحب کہتے ہیں'' بھئی صوفی تو بڑی چیز

ہے نا۔ وہ زمان و مکاں اور رنگ و ملت کی سرحدیں پھلانگ چکا ہوتا ہے۔ اس نے بھید پالیا ہوتا ہے اس لیے صوفی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی مخصوص علاقے ہی میں پیدا ہو۔ یہ تو "اصلی کا مریڈ ہیں" فیض کے ہاں اشتراکیت اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے، اپنے اشتراکی عقائد اور اپنی مسلمانی میں تضاد کی بجائے ہم آہنگی کا احساس اجتہاد ہرگز نہیں۔ یہ رویہ ہماری دینی فکر میں پہلے سے نمودار ہو چکا تھا اور فیض نے اسے ورثے میں پایا، جو لوگ اسے اجتہاد کی بجائے "بدعت" تصور کرتے ہیں انہیں اس کو تاریخ کے سیاق وسباق میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

مرزا ظفر الحسن سے ایک گفتگو کے دوران کہتے ہیں "ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر اور مطالعہ حسن فطرت سے نہیں رہا پھر بھی اُن دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی کوچے ہیں ان میں بھی اپنا ایک حسن ہے۔ جو دریا وصحرا کو ہسار یا سرو وسمن سے کم نہیں البتہ اُس کو دیکھنے کے لیے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہیے۔"

چنانچہ جب فیض 1935ء میں محمود الظفر اور رشید جہاں کے سٹڈی سرکل میں شامل ہوئے اور انہیں کمیونسٹ مینی فیسٹو پڑھنے اور بحث کرنے کیلئے دیا گیا تو انہوں نے اس انقلابی دستاویز سے وہی کچھ سیکھا جو ایک روشن خیال مسلمان سیکھ سکتا تھا۔ اپنے اس دور کو یاد کرتے ہوئے فیض لکھتے ہیں۔ "اس دور میں ہم نے جو سبق سب سے پہلے سیکھا یہ تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گردوپیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک فرد کی ذات اپنی سب محبتوں، کدورتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پنہائی کا پیمانہ باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔"

"فیض کی بیٹی راوی ہیں کہ ایک صبح فیض نے سب کو اکٹھا کیا اور یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ آؤ دعا مانگیں بیٹی نے متعجب ہو کر پوچھا کہ نماز پڑھی نہیں پھر کیوں دعا مانگیں؟ مگر فیض اس حیرت واستعجاب کا خیال کئے بغیر اپنی نظم "دعا" پڑھنے لگے۔

ممتاز ادیب اور ڈرامہ نگار اشفاق احمد فیض صاحب کے بارے میں اُن کی کتاب "شام شہر یاراں" میں "ملامتی صوفی" کے نام سے فیض صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں "فیض صاحب نے صوفی ازم کا اکتساب کسی سلسلہ میں بیعت کر کے نہیں کیا۔ نہ ہی میرے اندازہ وتحقیق کے مطابق انہوں نے ورد، وظیفہ یا چلہ کشی کی ہے۔ انہوں نے صوفیاء کا تیسرا راستہ اختیار کیا ہے جو مجاہدے پر محیط ہے۔ اس کو بزرگانِ دین ادب اور تواضع کا نام دیتے ہیں یہ ادب، ایسا دھیما پن، اس قدر درگزر، کم سخنی اور احتجاج سے گریز۔ یہ صوفیوں کے کام ہیں۔ ان سب کو فیض صاحب نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اُوپر سے ملامتی رنگ اختیار کیا ہے کہ اشتراکیت کا گھنٹہ بجاتے پھرتے ہیں کوئی قریب نہ آئے اور محبوب کا راز نہ کھل جائے۔ واہ بابا ٹل واہ! کیا کہنے! چوری کرّتے بھن گھر رب دا۔ اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ۔

میرا تعلق چونکہ اُونچے خانوادے سے ہے اور میں مسلمان بادشاہوں کا پرستار ہوں اور ملوکیت کو ہی اسلام سمجھتا ہوں اس لیے میری اور بابا ٹل کی نہیں بن سکتی لیکن کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے، خاموش اور چپ چاپ میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرور کائناتؐ کے زمانے میں ہوتے تو اُن کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے جب بھی کسی بدزبان، بد اندیش یہودی دکاندار کی درازدستی کی خبر پہنچتی تو حضورؐ کبھی کبھی ضرور فرماتے۔ آج فیض کو بھیجو، یہ دھیما ہے، صابر ہے، بردبار ہے، احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھالیتا ہے۔ ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے۔"

فیض صاحب کے ہاں خدا شناسی کی فکر اپنے جوبن اور آب وتاب کے ساتھ ملتی ہے۔ دہریت کا الزام دینے والے فیض کے فیض سے کوسوں دور ایک ایسے پروپیگنڈے کے زیر اثر یہ اعتراض کرتے ہیں جس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا یہ ملک۔ فیض صاحب نے ایک ترانہ لکھا تھا جو اُن کی کتاب "دست صبا" میں شامل ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں پر جمہور اور جمہوریت کے ساتھ پچھلی نصف صدی سے آنکھ مچولی کھیلی جارہی ہے وہاں جب بھی منظوم پیرائے میں حالات کی منظر کشی کی ضرورت محسوس ہوئی، یہ ترانہ عوام کے جذبات کی ترجمانی کا ذریعہ بن گیا۔ یہ ترانہ قومی حمیت اور ملی غیرت کا جس قدر مضمون اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اُس سے کہیں زیادہ اپنے اندر خدا شناسی اور تقویٰ کی گہری چھاپ رکھتا ہے۔ اس کی ہر ہر لفظ میں مشیت الٰہی کا اظہار واعلان موجود ہے۔ پہلا شعر ملاحظہ فرمایئے۔

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اگر اسے سرسری انداز میں دیکھا جائے تو یہ ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر جاری قبضے کو واگزار کرانے کی منظر کشی ہے۔ درحقیقت یہ منظر اتنا وقیع اور پُر معنی نہیں جتنا کہ یہ روزِ محشر سے تعبیر کرنے سے ہوجاتا ہے کیوں کہ فرد عمل پر جزا و سزا اور میزان ہوگا، مبنی بر حقیقت اور حتمی، انصاف روزِ محشر کو ہی ہوگا اس لیے اس منظر کشی کی مُراد دُنیوی سے زیادہ اخروی ہے۔ پھر دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے اس لیے اس میں وقوع پذیر ہونے والے افعال وکردار ہر دو مقامات کا موضوع بحث بنتے

ہیں۔ ’’دربار وطن‘‘ ایک ایسی علامتی تشبیہ ہے جسے قرآنی آیت: ’’اناللہ وانا الیہ راجعون‘‘ کے تناظر میں دیکھا جائے تو نوع انسانی کا اصلی گھر ملک عدم ہی بنتا ہے۔ ایمان مفصل کے مطابق مرنے اور پھر قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنے پر یقین کامل کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے۔ جزا اور سزا کے لیے دنیا میں کیے گئے اعمال کے پاپ اور پن کا حساب ہوگا گویا ہمارا آج کا خلوص نیت وعمل ہمارے کل کی کھیتی ہے اس تناظر میں اس ترانے کا دوسرا اور تیسرا شعر سورۃ القارعہ کی قرآنی فکر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ملاحظہ فرمائیے:

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

اس سورہ میں رب ذوالجلال قیامت کا منظر یوں بتاتا ہے۔ ’’وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی۔ کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی۔ اور تو کیا سمجھا۔ کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی۔ جس دن ہوں گے لوگ پتنگے جیسے بکھرے ہوئے۔ اور پہاڑ ہوں گے جیسے دُھنی ہوئی رنگی ہوئی اون۔ سو جس کے اعمال وزنی بھاری ہوں گے۔ وہ آرام میں رہے گا۔ اور جس کے اعمال ہلکے ہوں گے۔ اس کا ٹھکانہ گڑھا ہے۔ اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔‘‘

قیامت کا یہ منظر فیض صاحب نے اس ترانے میں اپنی مقدور بھر فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ مصور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جن لوگوں کو فیض صاحب نے خاک نشین کہہ کر مخاطب کیا ہے‘ درحقیقت یہ اہل حق کی جماعت ہے‘ جنہوں نے اس دنیا میں اہل مال وزر اور وسائل پر قابض تخت و تاج کے وارثان کے جبر کے نتیجے میں صبر سے کام لیا اور جو انعام خداوندی کے قریب ہیں۔ اُن کی دنیا کی کمائی اس دنیا میں ہی دھنی ہوئی روئی کی مانند اُڑتی پھرے گی اور کسی کام نہیں آئے گی جو ساری زندگی خدا اور خلق خدا سے برسرپیکار رہے۔

اپنی اسی نظم میں فیض صاحب نے فلسفہ فنا و بقا کو یوں موضوع بنایا ہے۔

بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اُٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

پھر ایک جگہ قرآنی فکر کے مطابق فردِ عمل‘ جزا اور سزا کو یوں بیان کیا ہے۔

ہر ایک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہو گی
یہیں عذاب و ثواب ہو گا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں حساب و کتاب ہو گا

فیض صاحب کے ہاں ہمیں آفاقیت کے مضامین ملتے ہیں۔ اُن کا موضوع انسانیت ہے اور انسانیت کا کوئی رنگ‘ کوئی نسل یا کوئی زبان نہیں ہے کہ اسے ان کے ذریعے پہچانا جائے۔ اعلیٰ انسانی مشترک اقدار میں دکھ‘ تکلیفیں اور خوشیاں‘ سوچنے اور بولنے کی بے لوث آزادیاں شامل ہیں جنہیں فیض صاحب نے بطور خاص اپنا موضوع بنایا ہے۔ فیض صاحب کے ناقدین اپنی تنقیص میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جس بات میں آفاقیت کا عنصر شامل ہو اس کی وسعت پذیری کا ادراک کوئی کوتاہ اندیش نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم جو پوری بنی نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے اتارا گیا ہے اُس کا مخاطب کوئی مسلمان یا مومن نہیں ہے بلکہ پوری نسلِ انسانی کو ’’یا ایھا الناس‘‘ کہہ کر عربی‘ عجمی‘ گورے اور کالے کی تفریق ختم کی گئی ہے۔ اسی قرآنی اندازِ فکر کے تناظر میں فیض صاحب بھی رنگ و نسل‘ تہذیب وثقافت اور عقیدے کی سرحدیں منہدم کرتے ہوئے آفاقیت کے لازوال رشتوں کی صداقت کے علمبردار ہیں اور کسی بھی آفاقی اصول‘ نظریے یا پیغام میں یہ باتیں بنیادی عناصر کے طور پر شامل ہوتی ہیں مگر فیض صاحب کو صحابی رسول حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح ’’خطرہ‘‘ سمجھا گیا اور انہیں وطن دشمن قرار دے کر اسلامی فکر کا مخالف بنا دیا گیا۔ فیض دشمنی کے غیر صحت مند رویے کا شکار ہونے سے پہلے فیض شناسی بہت ضروری ہے کہ فیض خدا شناس مرد خود آگاہ تھے۔ صرف سنے سنائے پروپیگنڈے کے تحت تعصب کا شکار رہنا کسی لحاظ سے بھی حقیقت پسندانہ اندازِ فکر نہیں ہے‘ وہ فہم جو اس لایعنی تعصب کے لیے بلا سوچے سمجھے ضائع کیا جاتا ہے‘ اُسے فیض کی فکر کو سمجھنے پر خرچ کرنے کے بعد ہی کوئی رویہ اختیار کرنا جائز ہے۔ جو ہوا فیض اُس سے فیض حاصل نہ کر سکا اُس کے فیوض و برکات کی کرنوں کی کمزوری نہیں بلکہ اپنے فہم سے ان کرنوں کو اپنے اندر منعکس نہ کر سکنے والوں کی بدقسمتی ہے۔

☆☆☆

"وہ جو فیض تھا......"

"فیض ہمارے ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں جنہیں زندگی اور اس کے ہزار شیوہ حسن سے محبت ہے اور اس کی وجہ سے ان کا اور زندگی کا جھگڑا ابھی چلا جاتا ہے فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے۔مگر اس نے انہیں جھلسایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو جب وتاب عطا کی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور

☆

"ایک انگریزی نقاد کے نزدیک اعلیٰ ارفع شاعری میں تین "ایس" پائے جاتے ہیں وہ ہیں (SENSE) ،ساؤنڈ (SOUND) اور سجیشن (SUGGESTION)۔ہم انہیں اردو میں مغز' موسیقیت اور رمزیت کہہ سکتے ہیں میری رائے میں فیض کی شاعری میں یہ تینوں' ایس' بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، بلاشبہ فیض ایک ترقی پسند شاعر ہیں مگر اول اور آخر شاعر ہیں خطیب یا مبلغ نہیں۔"

کنہیا لال کپور

☆

صرف میرے اکیلے ہی کے لئے نہیں' اور صرف پاکستان یا ہندوستان کی نئی نسل کے لئے ہی نہیں بلکہ کراچی سے کیوبا اور کیوبا سے ٹوکیو تک رجعت پرستی کی چلچلاتی کڑی دھوپ میں تیسری دنیا کے ادب اور سیاست کے لق ودق ریگزاروں کے بیچوں بیچ فیض احمد فیض جلتی بھنتی جھلستی ترقی پسند نئی نسل کے لئے بھی بلاشبہ ٹھنڈی میٹھی، حیات بخش چھاؤں والا ایک گھنیر اور خت ہے۔"

ابراہیم جلیس

☆

"ایک بڑا شاعر ہنگامی تجربوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا وہ جو کچھ کہتا ہے' کلاسیکی انداز سے کہتا ہے اور اس کی آواز ہزاروں لاکھوں دلوں کی گہرائیوں میں گونجنے لگتی ہے۔ فیض ایک ایسا ہی بڑا شاعر تھا۔اس نے ہنگامی تجربوں کے بجائے ہماری شاعری کی کلاسیکی علامتوں کو نئے مفاہیم دیئے ہیں۔"

میرزا ادیب

☆

"فیض بڑے شاعر ہیں۔اگر اس کا معیار یہ ہے کہ ان کی شاعری بے حد حسین ہے تو یقیناً کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔فیض بڑے شاعر ہیں کہ انہوں نے نئے Images دیئے ہیں، نیا انقلابی آہنگ دیا ہے اور ان کے اس انسانیت کی جدوجہد کے آہنگ میں پورے ایشیا' پورے عرب اور پوری دنیا کی تحریک آزادی شامل ہو جاتی ہے۔"

علی سردار جعفری

''اب فیض صاحب ہماری تاریخ کا بھی ایک حصہ ہو گئے ہیں۔ وہ تاریخ جو کہ مُردہ نہیں ہوا کرتی بلکہ جو ذہنی زندگی کو کہتے ہیں جو ہمارا ایک جیتا جاگتا ماضی Living Past ہے جس سے ہمارا حال Present متشکل ہوتا ہے، جو ہماری زندگی کا ایک Living Impulse، ایک زندہ قوت متحرکہ ہے۔''

کرار حسین

☆

''فیض کی شاعری میں ایسی تروتازگی اور پھبن ہے جیسی سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد اوس کے اڑتے ہی سبزہ وگل پر آجاتی ہے اور یہ ایک ایسا صحت مند تصور ہے جو ان کی شاعری کو پژمردہ (MORBID) یا غمناک (MELANCHOLIC) نہیں ہونے دیتا۔ یہ تصور اُن کے ہاں ایک فکری تحریک (INTELLECTUAL MOVEMENT) کی صورت اختیار کر گیا ہے یعنی خیال خود شہ بن گیا ہے اور ذہن کو آگے بڑھنے اور زندہ رہنے پر اُکساتا رہتا ہے۔''

اکرام بریلوی

☆

''فیض کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ جو کچھ خود اُس پر بیتی اس کے باوجود اُس کی انسان سے محبت ٹوٹی نہ وہ اس کی پیدائشی اچھائیوں سے مایوس ہوا' نہ اس کو کوئی دُکھ دیا۔ محبت اور انسان دوستی اس کا عقیدہ تھا اور وہ کسی حال میں اس سے منحرف نہیں ہوا۔ نیکی کر بہ دریا افگن' اس کی زندگی کا اصول رہا۔''

پیر علی محمد راشدی

☆

''فیض کی شاعرانہ شخصیت کی ترکیب جن عناصر سے ہوتی ہے بلکہ جن عناصر سے اس میں وزن و وقار پیدا ہوتا ہے وہ اپنا زور دکھائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے شاعرانہ مذاق میں ہمارے تمام کلاسیکی ادب کا رنگ رچا ہوا ہے۔ وہ جذباتی طور پر روایت کی گرفت میں رہے اور فکری طور پر روایت سے آگے شاعرانہ تخلیق میں جذبات فکر پر حاوی رہے ہیں' فیض نے ان میں خاصا توازن قائم رکھا ہے۔''

شان الحق حقی

☆

''دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جن کے نام سے ان کا ملک پہچانا جائے۔ پاکستان کی پچاس سالہ زندگی میں جن گنی چنی شخصیات کو یہ اعزاز حاصل ہوا' ان میں فیض احمد فیض کا نام بھی شامل ہے۔ فیض صاحب یقیناً اپنے ملک کی پہچان تھے اور عالمی سطح پر دانشوروں اور ادبی سماجی حلقوں میں پاکستان کے تعارف کیلئے ان کا نام کافی سمجھا جاتا تھا۔''

آغا ناصر

☆

''ایک وہ زمانہ تھا جب شیراز اور اصفہان سے آنے والے حافظ وسعدی کے اشعار لاتے تھے مگر ہمارے دور میں فیض احمد فیض ہیں جو بیروت' لندن اور ماسکو سے واپسی پر اپنی شاعری کی سب سے عمدہ اور اعلیٰ سوغات لاتے تھے اور اپنی نادر اور پسندیدہ موضوعات والی جو نظمیں اپنے ساتھ لاتے تھے' انہیں وطن عزیز کے اہل دل اور اہل ذوق، عوام و خواص، تبرک کے طور پر اپنی آنکھوں سے لگاتے اور انہیں سننے سنانے کیلئے بزم آرائیاں ہوتیں' سونی شامیں نشاط انگیز اور سہانی ہو جاتیں۔''

شوکت صدیقی

”میرے دل اُتے قیامت گزر چلی اے میں کیہہ کراں!“

پنجابی کے منفرد اور مشہور شاعر استاد دامن نے ہسپتال سے ماڈل ٹاؤن پہنچ کر مرحوم فیض کا آخری دیدار کیا تھا۔ جب استاد دامن کو فیض کے انتقال کی خبر ملی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے انہوں نے اپنے ملاقاتیوں سے فیض کے ساتھ گزرے ہوئے اچھے وقت کا بار بار تذکرہ کیا اور ضد کر کے اپنے تیمارداروں کو مجبور کر دیا کہ وہ انہیں فیض کا آخری دیدار کروانے کیلئے ماڈل ٹاؤن لے جائیں۔ استاد دامن اپنے دیرینہ دوست فیض کی میت کے پاس دیر تک بیٹھے رہے۔ جب میت کو عام لوگوں کے دیدار کے لئے باہر لایا گیا تب بھی استاد دامن میت کے پاس بیٹھے روتے رہے۔ قتیل شفائی، فخر زماں اور مشتاق کنول انہیں مسلسل دلاسا دیتے رہے۔ جب فیض کا جنازہ اٹھایا گیا تو استاد دامن ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ان کے ایک بزرگ مداح نے جب ان سے کہا کہ استاد جی! آپ حوصلہ کریں فیض اپنے کلام اور افکار سے زندہ رہے گا' آپ کو روتا دیکھ کر ہمارا حوصلہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو استاد دامن نے اپنی کمزور گلوگیر آواز میں کہا ”ہن ضبط نہیں کر سکدا آں۔ میرے دل اتے قیامت گزر چلی اے میں کیہہ کراں......“ یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگے۔ بعدازاں استاد دامن کو ان کے دو مداح سہارا دے کر موٹر گاڑی تک لائے تو ان کے لئے قدم اٹھانا بھی محال ہو رہا تھا۔ یاد رہے کہ استاد دامن دل کے عارضہ، شوگر اور سانس کی تکلیف کے باعث چند دنوں سے سروسز ہسپتال میں داخل تھے۔ فیض صاحب کے انتقال کے بعد ان کی حالت بگڑتی چلی گئی اور 3 دسمبر کی شام وہ اپنے عزیز دوست کے راستے پر چل دیئے۔

فیض صاحب رہائی کے بعد پی ایل ورکرز سے خطاب کر رہے ہیں

یہ قرض اُتر جائے

ہم مشکور ہیں

جناب افتخار عارف' محترمہ سلیمہ ہاشمی' محترمہ منیزہ ہاشمی' محترم شعیب ہاشمی' محترم اظہر جاوید' محترم ڈاکٹر یونس جاوید' محترم قاضی جاوید' محترم قمر یورش' محترم ذوالفقار حسین زلفی اور دیگر تمام احباب کے' جنہوں نے اس سلسلے میں ہماری مواد اور مشوروں سے اعانت فرمائی۔

اس شمارے میں مندرجہ ذیل کتب ورسائل سے استفادہ کیا گیا۔

- ☆ ''فیض فن وشخصیت نمبر'' مرتبہ صابر دت
- ☆ ماہنامہ ''افکار'' کراچی فیض نمبر
- ☆ ماہنامہ ''پلک'' لاہور
- ☆ ''ذکرِ یار'' فیض فاؤنڈیشن
- ☆ ''شبستان'' دہلی فیض نمبر
- ☆ ماہنامہ ''سپوتنک'' لاہور
- ☆ ''ادبِ لطیف'' لاہور فیض نمبر
- ☆ ہفت روزہ ''مزدور جدوجہد'' لاہور
- ☆ ''نیا دور'' (کتاب سلسلہ)
- ☆ ماہنامہ ''سرگذشت'' کراچی
- ☆ ''عہد نامہ'' (کتاب سلسلہ)
- ☆ ''فیض کے مغربی حوالے'' مرتبہ اشفاق حسین
- ☆ ''محبت کے پھول'' مرتبہ کامریڈ تنویر احمد خان
- ☆ ''گمشدہ لوگ'' آغا ناصر
- ☆ ماہنامہ ''جفاکش'' کراچی
- ☆ ''فیض احمد فیض شاعر اور شخص'' ڈاکٹر آفتاب احمد